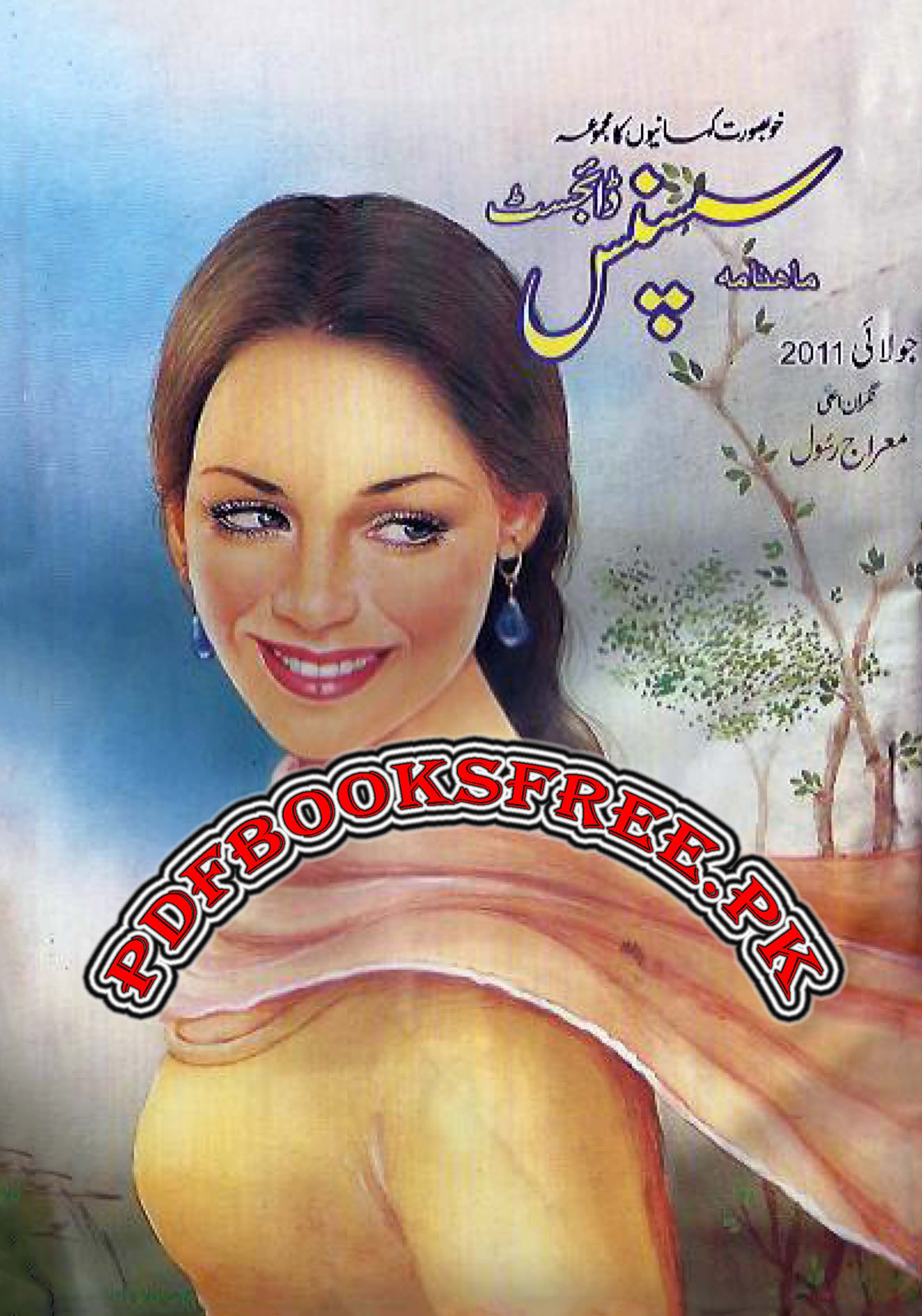
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
جولائی 2011
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
PDFBOOKSFREE.PK

سسپنس ڈائجسٹ

11 — انشائیہ — جون ایلیا
خواہشوں کے جنگل میں ایک صاحب دانش کی آواز ... ایک لازوال تحریر

12 — خطوط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی محفل شگفتہ، قارئین کی تیغ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

20 — بعد از خرابی — ڈاکٹر سید امجد
ماضی کا آئینہ، با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

59 — کچھ نہیں ہوگا — منظر امام
"لکھ پڑھ کر اگر تم کو دیکھ" ... معاشرے کی بگڑتی صورت حال

67 — اگر — ش صغیر ادیب
اپنے گھر کا خواب دیکھتے دیکھتے رشتوں کی پہچان کھو دینے والی آنکھوں کا ماجرا

74 — واپسی — محی الدین نواب
عکس در عکس چہروں کا سلسلہ، ایک صحرا نورد کی طویل داستان

115 — بوڑھا شیر — تنویر ریاض
کسی کی چاہت میں اپنا عکس دیکھنے والے ایک عاشق کا کارنامہ

130 — سینہ زوری — مرزا امجد بیگ
ایک معصوم صورت حسینہ کا خباثت بھرا احوال

جلد 41 • شمارہ 06 • جون 2011 • زر سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021)35802551 فیکس: (021)35386631 E-mail:jdcgroup@hotmail.com

158 — دھوکا — کاشف زبیر
ایک رائگاں سفر ... ایک مسافر بے نوا کا قصہ

172 — محفلِ شعر و سخن — قارئین
آپ کے شعروں کی ایک انجمن رنگ رنگ، آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

175 — بہاء الدین ولد — طیب نسیم بلگرامی
ایک باکمال شخصیت کے اندرونی سوانح ... جو بہت بڑی شخصیت تھی

190 — اناڑی
سازشی، تجسس اور دلچسپی سے بھرپور کہانی ... ایک اناڑی کی داستان

229 — اپنا گھر — مریم کے خان
مغربی معاشرے کی کربناک حکایت ... ایک ستم رسیدہ کا غم

239 — حضرت یرمیاہ — رضوانہ ساجد
بنی اسرائیل کی سرکشی ... بت پرستی اور انبیائے کرام کی جہد مسلسل کا احوال

251 — اصلی نقلی — ثمر عباس
بے نقاب ہو کر بھی عقل پر پردے ڈالنے والی حسینہ کی دلکش چال

258 — انجانے پہلو — ایچ اقبال
سنسنی خیز حالات، عاشق متحمل کا شکار ایک حسینہ کی پُرخطر داستان

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
طابع: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خواہش

جون ایلیا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

☆☆☆

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت کراچی

پراسراریت نمبر

کیا دسمبر 2012ء میں کرۂ ارض فنا ہو جائے گا

اہرام، خلا سے آنے والے اجنبیوں کی تعمیر یا کچھ اور

خدائی کا وہ جھوٹا دعوے دار جس نے نیا چاند پیدا کر دکھایا

امریکی سرزمین پر قدرت کی بنائی منحوس لکیروں کا احوال

برمودا جو بحری اور ہوائی جہازوں کو نگلتا رہا ہے

بحراوقیانوس کی تہ میں پراسرار شہر

جادوگر جو کہہ دیتا، وہی نظر آتا

جاپان کا انوکھا جوگی، پراسرار شخصیات

سطر سطر اسرار و تجسس کے پردوں میں لپٹی تحریریں

اگست 2011ء کے سرگزشت میں ملاحظہ کریں

زحمت سے بچنے کے لیے

آج ہی آرڈر بک کرائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ کا خط

عزیز قارئین

السلام علیکم!

جولائی 2011ء کا سسپنس آپ کے زیرِ نظر ہے... ہم ہر بار کوشش کرتے ہیں کہ ان سطور کے مزاج میں کچھ بدلاؤ آ جائے مگر سوئے اتفاق... مزاج بدل رہا ہے نہ حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی متوقع ہے۔ مسائل کی زنجیر ہے کہ کڑی در کڑی اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں کراچی میں ایک بار پھر دہشت گردی کا ایک خوفناک مظاہرہ ہوا اور تقریباً 17 گھنٹے تک پی این ایس مہران پر معرکہ جاری رہا...... اس موقع پر وطن کی دفاعی افواج نے جس فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقابلہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ دہشت گردوں کا مہران بیس پر حملہ صرف ایک بڑا سانحہ ہی نہیں بلکہ [illegible] لمحۂ فکریہ بھی۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو امن و امان اور حالات پر [illegible] ...... حال ہی میں بجٹ کا نزول آیا... اعداد و شمار کا سلسلہ حسبِ معمول جاری ہے۔ اس بجٹ میں عام آدمی کے لیے کوئی خوش خبری نہیں البتہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں 15 فیصد... اضافے کا اعلان بھی ہے مگر عوام کا احساس [illegible] پاکستان سے وابستہ ہیں مگر پرائیویٹ اداروں کے ملازمین اور مزدور پیشہ افراد کا کوئی پرسانِ حال نہیں...... اس کے علاوہ [illegible] حکومت کی بے حسی [illegible] ...... البتہ موسم [illegible] ...... رحمتِ خداوندی [illegible] (آمین)

اور اب دستک دیتے ہیں اپنی محفل کے دروازے پر...... کھٹ کھٹ کھٹ......

⊕ حسنین خان بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے ہماری محفل میں شامل ہوئے ہیں۔ "اس ماہ شمارہ 17 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے [illegible] اس کے حال پر چھوڑ کر [illegible] محفل میں قدم رکھے۔ کرسیِ صدارت پر محمد شکیل حیدر کو براجمان پایا۔ بھائی شکیل صاحب آپ [illegible] ... آپ کا شعر [illegible] ... آپ کے والد صاحب کی [illegible] آپ کو تعزیت [illegible] جیل [illegible] ... حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کے بارے میں کہا ہے [illegible] ...... شکیل صاحب [illegible] حسنین صاحب [illegible] ...... (آپ کی فرمائش طاہر جاوید مغل صاحب تک پہنچا دی گئی ہے)

⊕ محمد اسماعیل اعجاز، گوجرہ [illegible] سے محفل میں تشریف لائے ہیں۔ "آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھ ناچیز کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اب آتے ہیں اپنے رسالے "سسپنس" کی طرف۔ اس دفعہ بھی سب سے پہلے سسپنس [illegible] اس دفعہ بہت اچھا تبصرہ [illegible] ... کراچی کے حالات پر [illegible] ...

غمگین انداز میں گویا کراچی کے حالات پر دل خون کے آنسو روتا ہے... جون ایلیا نے کہا ہے کہ اس شہر کا چارہ گر، [illegible] ... اس شہر کے چارہ گر [illegible] ... کراچی کی عظمت [illegible] ... جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ گلیاں [illegible] ... امن و محبت [illegible] ... آپ کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام۔ [illegible] ... صدارت پر [illegible] ...... آپ نے [illegible] ... مردوں کے بارے میں آپ کی [illegible] ... قرآن مجید میں [illegible] ... رمضان پاشا صاحب [illegible] ... طاہر جاوید مغل صاحب [illegible] ... آخرت کی منزل [illegible] ... "سسپنس" [illegible] ... شیطان [illegible] ... "مشکل کی چوری" بہت دلچسپ تحریر تھی۔ [illegible] ... (تبصرے کا شکریہ)

⊕ محمد نعمان بیاج [illegible] سے لکھتے ہیں۔ [illegible] ... سسپنس [illegible] ... جون ایلیا کی [illegible] ... محفل میں [illegible] ... شکیل صاحب [illegible] ... انصار صاحب [illegible] ... کراچی [illegible] ... منظر امام صاحب کی کہانی "تسلسل" [illegible] ... "مشکل کی چوری" [illegible] ... (خط لکھنے کا شکریہ "من لگ کے")

⊕ راجا محمد ثاقب نواز، ٹانک [illegible] ... "جون کا سسپنس [illegible] ..."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناکل گرل گری کے چہرے سے بے نیاز نظر آئی۔ [illegible] ملک خداداد کے عوام کے جذبات ہر روز تبدیل ہو رہے ہیں۔ شب و روز ایک یا تماشا ہے جو ہو رہا ہے۔ [illegible]

[illegible]

ہمایوں سعید راج، [illegible] سے چلے آرہے ہیں "میک اپ کٹ [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر وسیم خالق گوپانگ، گجرات سے تشریف لائے ہیں "نائٹ گرل [illegible]

[illegible]

[illegible]

ایم ڈبل اے رشید ایاری، مانسہرہ سے محفل میں آئے ہیں "جون 2011ء کا شمارہ خلاف معمول 17 تاریخ کو مل گیا۔ [illegible]

[illegible]

این ایس آر مدثر، مدینہ ٹاؤن، کراچی سے لکھتے ہیں "کافی عرصے بعد آپ کی محفل میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں [illegible]

[illegible]

رمضان پاشا، کراچی سے تبصرہ کرتے ہیں "جون 2011ء کا سسپنس مقررہ تاریخ کو ہی بازار میں آ گیا تھا۔ [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Jd

صاحب لگتا ہے آپ کا ادب سے گہرا لگاؤ ہے اس لیے ہر بات میں ادب کا کچھ زیادہ ہی دھیان کرتے ہیں۔ حسنین عباس بلوچ، [illegible]

[illegible]

✱ طاہرہ یاسمین، کشمیر [illegible]

[illegible]

✱ ریاض بٹ، حسن ابدال [illegible]

[illegible]

✱ حافظ فیض الرحمن، منڈی بہاؤالدین [illegible]

[illegible]

اور اب ان قارئین کے نام جن کے خطوط شامل محفل نہ ہو سکے۔

[illegible]

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعد از خرابی

ڈاکٹر ساجد امجد

ستارے وہی اچھے ہوتے ہیں جو روشن ہوں مگر... ستارہ کتنا ہی روشن ہو، آسمان سے ٹوٹ جائے تو ستارہ نہیں رہتا... یہ بھی حقیقت ہے کہ بادشاہت کی دنیا میں رشتوں کی حکمرانی نہیں ہوتی لیکن... داراشکوہ کی موت پر محل میں اتنا گہرا سناٹا تھا کہ شہزادی جہاں آرا کی سانسوں کا زیروبم صاف سنائی دے رہا تھا... جو دن بیت جاتے ہیں انہیں کوئی بادشاہ زادہ بھی تمام دولت کے عوض واپس نہیں لاسکتا جبکہ یہاں تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا رہی تھی... اپنے دادا شاہ جہاں کی طرح اورنگزیب کا بیٹا محمد سلطان بھی ایسی ہی لافانی محبت میں گرفتار ہو گیا جو کبھی محبوبہ کے لیے تاج محل تعمیر کراتی ہے تو کبھی جہانگیری دربار میں علم بغاوت بلند کرا دیتی ہے... اورنگزیب عالمگیر... ایک عہد ساز بادشاہ... ایک منصف مزاج حکمران... اس کے باوجود بادشاہت کی اس بساط پر اسے کبھی شہ کبھی مات ہوتی رہی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

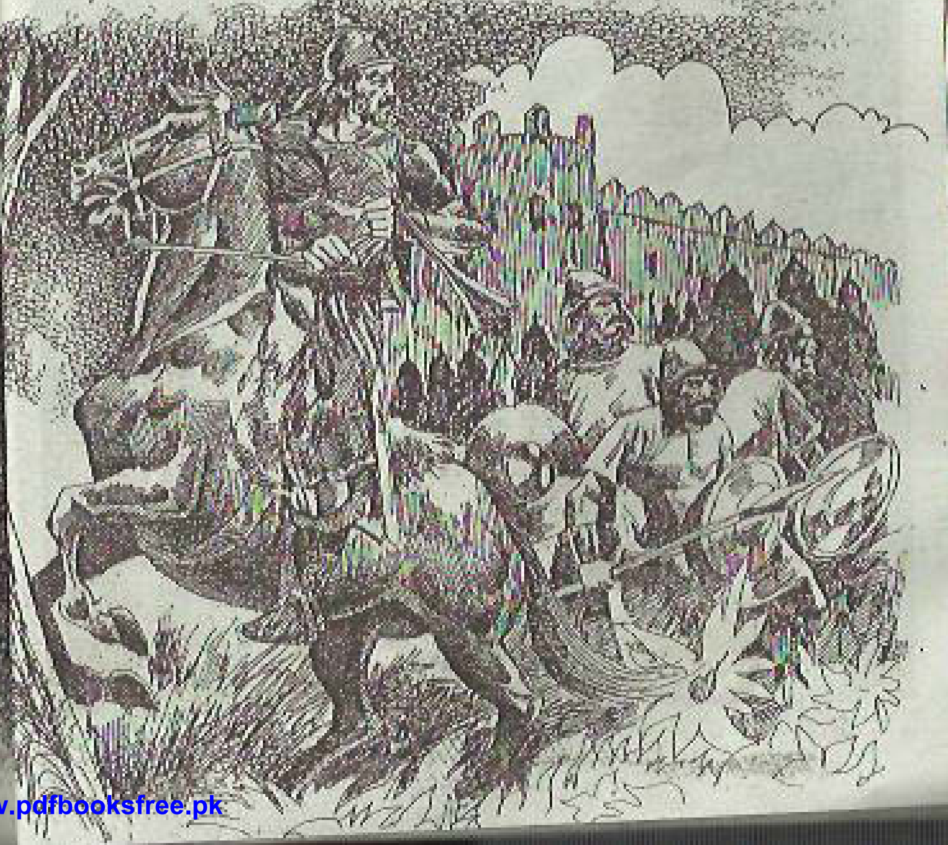

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہندوستان اب شہاب الدین محمد شاہ جہاں کے زیرِ نگیں نہیں رہا۔ اب اقلیمِ مغلیہ کا والی شہنشاہ محمد اورنگزیب عالمگیر ہے۔"

اورنگزیب کی آواز اتنی بلند ہو گئی تھی کہ اب مزید وضاحت نہیں کی جا سکتی تھی۔ بادشاہت کی دنیا میں رشتوں کی حکمرانی نہیں ہوتی۔ شہزادی جہاں آرا بیگم نے بھی بس چند لمحے بھائی کی بے رخی کو برداشت کیا اور پھر سر جھکاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شہزادی جہاں آرا بڑے بھائی دارا شکوہ کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی تھی اور یہ اطلاع لے کر آگرہ واپس جا رہی تھی کہ برسات کی ایک اندھیری رات میں دارا شکوہ کا سر اس کے بدن سے جدا کر دیا گیا۔

گھڑسواروں کی حفاظت میں شہزادی کا رتھ شہر سے باہر جانے والے راستے پر دوڑ رہا تھا۔ شہر کے لوگ بہت دور تک رتھ کے پیچھے دوڑتے رہے۔

دلی دروازے تک بھی عام رہا پھر سواری آگے بڑھ گئی، لوگ پیچھے رہ گئے۔ آگرہ تک کا یہ سفر روز میں طے ہوا۔ اس وقت تک یہ خبر پرانی ہو چکی تھی کہ شاہ جہاں کا چہیتا بیٹا دارا شکوہ اپنے بھائی اورنگزیب کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

یہ بس قیدی جو کل تک شہنشاہِ ہند تھا، جہاں آرا کے انتظار میں تھا۔ وہ اسی کے کہنے پر دلی کی طرف روانہ ہوئی تھی اور اب واپسی کا دن آ گیا تھا۔

شہزادی جہاں آرا کے قافلے نے آگرہ میں قدم رکھا تو چراغوں کے جلنے کا وقت ہو گیا تھا۔ قلعۂ آگرہ کا دروازہ کھولا گیا۔ اس کا رتھ قلعے میں داخل ہوا۔ وہ رتھ سے اتری اور بھول گئی کہ وہ شہزادی ہے۔ تقریباً دوڑتے ہوئے باپ کی خدمت میں پہنچی جو اس وقت جھروکے میں بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں جمنا کے اس پار جمی ہوئی تھیں۔ تاج محل سے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا۔ اچانک آہٹ ہوئی تو اس نے گردن گھما کر دیکھا۔

"آؤ جہاں آرا، ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا مگر یہ کیا، ادب آداب سب بھول گئیں؟ شہزادیوں کو زیب نہیں دیتا کہ یوں بے حواس ہو جائیں۔"

"حواس میں رہنے کو رہ کیا گیا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے تم کیا خبر لائی ہو لیکن پھر بھی ......"

"میں اور آپ مل کر بھی دارا کو نہیں بچا سکے۔" شہزادی نے کہا اور سسکنے لگی۔

"یہی ہونا تھا۔" شاہ جہاں نے آہ کھینچی۔ "ہم نے کہا تھا، ہمارے سوا اورنگزیب سے کوئی نہیں لڑ سکتا...... مگر دارا نے ہمیں جانے ہی نہیں دیا اور اب تو ہم جا ہی نہیں سکتے۔ گستاخ اورنگزیب امن و امان کے نام پر ہماری قید میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں کوئی نہیں جو ہمیں رہائی دلائے۔ ایک مہابت خان سے امید تھی، وہ امید بھی دم توڑ گئی ہے۔"

جھروکے میں اتنا سناٹا تھا کہ جہاں آرا کی سانسوں کا زیروبم صاف سنائی دے رہا تھا۔ یہاں آکر بادشاہ کی اداسی میں اضافہ ہو جاتا تھا، کیونکہ تاج محل یہاں سے صاف نظر آتا تھا۔ جہاں آرا نے یہاں سے اٹھ جانے کی درخواست کی اور باپ کو لے کر کمرۂ خاص میں آ گئی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ دارا شکوہ کے قتل پر بادشاہ نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جہاں آرا پر اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

کمرے کے باہر پہرے داروں کے چلنے پھرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ یہ پہرے دار اب سے پہلے کمرے کے باہر متعین نہیں تھے۔ دارا کے قتل کے بعد پہرے میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اس اضافے ہی سے شاہ جہاں نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ظہور میں آیا ہے اور اب جہاں آرا اس واقعے کی تفصیل کے ساتھ حاضر تھی۔

مزید کئی خطوط رکھے ہوئے تھے جو اورنگزیب نے شاہ جہاں کے نام لکھے تھے۔ شاہ جہاں نے یونہی ایک خط اٹھایا اور کہیں کہیں سے پڑھنے لگا۔ ایک جگہ یہ عبارت درج تھی۔

"ہم جانتے ہیں کہ آپ کو اس فدوی کے تخت اور ملک کے معاملات کے درہم برہم ہونے میں حضور والا کی تحریک کارفرما رہی ہے اور یہ بھائی آپ ہی کی ہدایت پر ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں......"

ایک جگہ لکھا تھا۔ "آں حضرت اس مرید کو تعلق پسند نہیں کرتے اور جو کچھ ہاتھ سے نکل چکا ہے اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ دوبارہ حاصل ہو جائے اور اس فدوی کی ساری کوششوں پر جبکہ وہ احکامِ دین کے اجرا اور مہماتِ مملکت کے انتظام میں مصروف ہے، پانی پھر جائے۔"

پھر وہ اس عبارت پر پہنچا۔ "مجھے تو اس وقت اطمینان ہوگا جبکہ وہ دو مفتر پرداز جو دو مرتبہ بے غیرتی کے ساتھ میرے مقابلے سے بھاگ گئے ہیں، ممالکِ محروسہ سے بھاگ جائیں یا اللہ کی توفیق و مدد سے گرفتار ہو کر اپنے تیسرے بھائی کے ساتھ ملحق ہو جائیں۔"

یہ خط بہت پہلے کا تھا لیکن آج اس کے معنی ہی کچھ اور

قتل ہو چکے تھے۔ وہ مفتر پردازوں میں سے ایک دارا شکوہ گرفتار ہو کر...... اور قتل بھی ہو گیا تھا۔ شجاع باقی تھا۔ مراد پہلے ہی قید خانے کے اندھیروں میں تھے۔ اورنگزیب اس عزم کا اعادہ کر رہا تھا کہ جب تک دونوں شخصوں سے نجات نہ پا لے گا، اس وقت تک اسے اطمینان حاصل نہیں ہوگا۔

شاہ جہاں نے آخری سطریں جلدی جلدی پڑھیں۔

"انشاء اللہ تعالیٰ جب مدعیانِ ملک کا معاملہ ان دو صورتوں میں سے کسی ایک طرح طے پا جائے گا تو پھر بلاوجہ ان حفاظتی تدابیر (نظر بندی) کو باقی نہیں رکھا جائے گا۔"

"جہاں آرا" شاہ جہاں کی آواز میں عجیب سی تشویش تھی۔

"ظلِ سبحانی!"

"ہمیں خدا کی قدرت نے چار بیٹوں سے نوازا تھا۔"

"بجا ارشاد فرمایا۔"

"دارا ہمیں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ یہ ہمارا اقتدار کہ وہ ہم سے چھین لیا گیا۔ ایک تخت کا دعوے دار بن بیٹھا ہے۔ دو اور بھی تو ہمارے بیٹے ہیں۔ سنا ہے اورنگزیب کی نگاہ سے چار ایک جیسے ہاتھی روانہ ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک ہاتھی کے ہودے پر مراد سوار تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اورنگزیب کی قید میں ہوگا۔ رہ گیا شجاع تو وہ ہندوستان کی وسعتوں میں کہیں گم ہے۔ کیا ہم اسے کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ کیا اس کا انجام بھی دارا شکوہ کی طرح ہوگا۔ اب تو ہم تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شجاع کو بچا لو۔ ہم کتنے بے بس باپ ہیں۔"

"شجاع مقابلے پر ڈٹا ہوا ہے۔ فرار ہو جاتا ہے مگر پھر مقابلے پر آ جاتا ہے۔ وہ بنگال سے نکل چکا ہے۔ قلعۂ الہ آباد ہاتھ سے جا چکا ہے لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ اورنگزیب کا بیٹا شہزادہ محمد سلطان اس کے تعاقب میں ہے۔ معظم خان (میر جملہ) کی سپہ سالاری میں شجاع کو گھیرا جا رہا ہے۔"

"شجاع کا لشکر؟"

"اس کا لشکر تھوڑا ہے۔ وہ جگہ جگہ گھیرا جا چکا ہے۔ ازسرِنو توپ خانہ اور فوج تیار کر کے مقابلے کے لیے نکلتا ہے۔"

"خدا اس کی حفاظت کرے۔ کاش ہم اسے ایک مرتبہ دیکھ سکتے۔"

☆☆☆

شاہی لشکر شہزادہ شجاع کا تعاقب کرتا پھر رہا تھا۔ ہر بار شجاع کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا تھا لیکن ہر بار وہ ازسرِنو مقابلے پر آ جاتا تھا۔ سال بھر ہونے کو آیا تھا لیکن شجاع ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ الہ آباد سے آگے نکل کر شاہی لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ دریائے گنگا درمیان میں حائل تھا۔ دوسری جانب شجاع کی فوجیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔

ایک دن شجاع نے اپنے چند با اعتماد آدمیوں کو کشتیوں میں سوار کیا اور دوسرے کنارے کی طرف بھیج دیا۔ ان آدمیوں نے توپ خانے کے داروغہ امیر قلی سے شناسائی کی صورت نکالی اور لشکر میں پہنچ گئے۔ بیش قیمت جواہرات ساتھ لائے تھے جو انہوں نے چپکے سے داروغہ کی خدمت میں پیش کر دیے۔

"شہزادے سے ملاقات کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟"

"یہ کیسے ممکن ہوگا۔ ملاقات کے لیے کسی تعلق کی، اعتبار کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"یہ اعتبار کیا کم ہے کہ شہزادہ شجاع اور شہزادہ سلطان کے درمیان چچا، بھتیجے کا رشتہ ہے۔"

"یہ رشتہ اگر مضبوط ہوتا تو دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہوتے۔"

"شہزادہ شجاع اپنے بھتیجے کے لیے ایک جذبہ رکھتے ہیں۔"

"شہزادہ سلطان کے جذبات کیا ہیں۔ یہ بھی تو معلوم ہو۔"

"ایک سال تک جنگل جنگل مارے مارے پھرنے کے بعد شہزادہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہو رہے ہوں گے۔"

"وہ صرف یہ سوچ رہے ہیں کہ ان کے والد نے میر جملہ کو ان کا اتالیق اور سپہ سالار بنا کر سخت غلطی کی ہے۔ لشکر کا تمام انتظام اور فوجوں کی ترتیب وغیرہ میر جملہ کے ہاتھ میں ہے۔ شہزادہ اسے اپنی حق تلفی سمجھتا ہے بلکہ اب تک شجاع کے خلاف جو کامیابی نصیب نہیں ہوئی اس کا ذمے دار بھی میر جملہ کو سمجھتا ہے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے بلکہ یہ اختلاف اب اتنا واضح ہو گیا ہے کہ لشکر میں انتشار کے آثار صاف دکھائی دینے لگے ہیں۔ کچھ امرا میر جملہ کی حمایت کرتے ہیں، کچھ شہزادے کے ساتھ ہیں۔"

"یہ آپ نے نئی بات بتائی۔ اب ہمیں اجازت دو۔ ہم شہزادے سے ملاقات موخر کرتے ہیں۔ اس نئے انکشاف کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ پہلے یہ باتیں شہزادہ شجاع سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گوشہ گزار کر دی جائیں۔ وہ ان باتوں کی روشنی میں کیا حکم دیتے ہیں، امید رکھتا ہوں گا۔''

شہزادہ شجاع کے پیچھے ہوتے ہی یہ آدمی دارو غہ امیر قلی سے پرانی شناسائی رکھتے تھے اور دارو غہ ان میں سے تھا جو میر جملہ اور شہزادہ سلطان کے درمیان اختلافات بڑھ جانے میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ لوگ دراصل طوطوں کی طرح کھاتے کھانے میں تکلف برتتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ کام ہو جائے اور انہیں دارالخلافہ کی طرف اذن الغیب ہو۔

وہ افراد شجاع کی طرف لوٹ گئے لیکن اپنی خوش خبری کے ساتھ گئے تھے کہ انہیں خفیہ طور پر دوبارہ آنا تھا۔ شجاع کے لیے یہ خبر حوصلہ افزا تھی کہ شاہی لشکر میں افراتفری کا ماحول ہے۔

چند روز نہیں گزرے تھے کہ شجاع کے دریا سے چند لوگ ایک مرتبہ پھر دارو غہ امیر قلی کے خیمے میں دیکھے گئے۔ اس مرتبہ یہ لوگ شہزادے کے نام شجاع کا خط اور قیمتی تحائف لے کر حاضر ہوئے تھے۔ اس عرصے میں دارو غہ نے میدان ہموار کر لیا تھا اور شہزادہ ملاقات کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

شہزادے کی اقامت گاہ لشکر سے آدھے کوس کے فاصلے پر ایک باغ میں تھی جبکہ میر جملہ کا خیمہ تقریباً اتنے ہی فاصلے پر لیکن مخالف سمت پر تھا۔ کل وقوع ایسا تھا کہ اگر دارو غہ احتیاط سے کام لیتا تو لشکریوں کو یا میر جملہ کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ شہزادے کی سرگرمیاں کیا رخ اختیار کر رہی ہیں۔

دارو غہ نے اس ملاقات کے لیے رات کے اندھیرے کا انتخاب کیا۔ کسی مشعل بردار کو ساتھ لیے بغیر وہ ان اجنبی مہمانوں کے ہمراہ شہزادے کی اقامت گاہ پر پہنچ گیا۔ یہاں بھی وہ دارو غہ توپ خانہ تھا۔ شہزادے سے کسی وقت بھی ملاقات کر سکتا تھا۔ شہزادے کے محافظوں نے کوئی باز پرس نہیں کی اور وہ بلا روک ٹوک خیمۂ شاہی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ وہ دو افراد بھی تھے جو شجاع کا مراسلہ لے کر آئے تھے۔

اس وقت شہزادے کے حضور اس کا کوئی ملازم نہیں تھا جب ان مہمانوں نے ایک بیش قیمت خوان جس پر ہیرے جڑے ہوئے تھے اور مرواریدوں کی تھالی اس کی خدمت میں پیش کی۔

''یہ تحائف آپ کے چچا حضور شہزادہ شجاع نے آپ کی خدمت میں روانہ کیے ہیں۔ انہیں قبول فرمائیں۔''

''ان سے کہنا ہم نے آپ کی محبت قبول کی۔''

''یہ خط بھی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ہدایت کے مطابق اسے تنہائی میں پڑھیے گا۔''

''ان سے کہیے گا، خط پڑھنے کے بعد اس کا جواب روانہ کر دیا جائے گا۔''

''شہزادہ شجاع ان ریشہ دوانیوں کی جانب سے بے حد فکر مند ہیں جو آپ کے خلاف کی جا رہی ہیں۔''

''کیسی ریشہ دوانیاں؟''

''چچا فرماتے ہیں، کیا میر جملہ آپ پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں؟''

''ہم ان کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔''

''آپ کی جواں مردی سے یہی امید ہے لیکن میر جملہ کی حمایت دارالخلافہ سے کی جا رہی ہے۔''

''ہمیں خود شک ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔''

''یہ ثبوت کیا کم ہے کہ آپ کی اہمیت کو رفتہ رفتہ کم کیا جا رہا ہے۔''

''ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میر جملہ ہمیں اپنے طور پر بے عزت کر رہے ہیں یا اس کے پیچھے کوئی اور ہے۔''

''آپ کے چچا حضور نے تمام معلومات جمع کر لی ہیں اور اس خط میں تحریر بھی کر دی ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو حقیقت کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔''

''چچا جان سے کہیے گا، ہم بہت جلد ان سے رابطہ کریں گے۔''

اس طرز کلام کا مطلب یہ تھا کہ شہزادہ اب اس ملاقات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اب اسے خط پڑھنے کی جلدی تھی۔

یہ مہمان جس خاموشی سے آئے تھے اسی احتیاط سے رخصت ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد شہزادے نے لفافہ چاک کیا اور تحریر پر نظریں جما دیں۔

''شہزادہ محمد سلطان پر واضح ہو کہ اپنے تمام بھتیجوں میں سب سے زیادہ ہم اسے چاہتے ہیں۔ اس میں کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ وہ ہمیں اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے بیٹی اختر عزیز بانو اس سے منسوب کر دی تھی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ادھر والد بزرگوار مرض الموت میں مبتلا ہوئے ادھر اورنگزیب نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ شقاوت قلبی کی حد کر دی۔ والد کو ان کے محل میں نظر بند کر دیا۔ دارا کو قتل کر دیا۔ مراد قید میں ہے۔ تم اپنے باپ کا حکم مان کر میری گردن کے درپے ہو۔ مجھے اپنی پروا نہیں لیکن تمہارے تحیر سے ارحم ہوں۔ میں نے بہت بہاریں دیکھی ہیں لیکن تم نوخیز ہو۔

تمہارا باپ حرص و طمع میں ایسا مبتلا ہوا ہے کہ تاج و تخت کے کسی دعوے دار کو آزاد دیکھنا نہیں چاہتا۔ اسے اپنی اولاد تک پر بھروسا نہیں۔ خاص طور پر وہ تمہاری بہادری سے خائف رہتا ہے۔ اسی لیے وہ تمہیں خود سے دور رکھتا ہے۔ پہلے قلعۂ اکبر آباد میں ظل سبحانی کی خدمت میں چھوڑ دیا اور پھر میرے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن میری تحقیق کے مطابق میر جملہ کو اس ہدایت کے ساتھ تمہارے ہمراہ بھیجا ہے کہ وہ تمہیں کوئی اہمیت نہ دے تاکہ تم اس غرور میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ تم شہزادے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میر جملہ خدانخواستہ تمہیں راستے ہی سے ہٹا دے۔

یہ وقت تو وہ تھا کہ تمہاری شادی کے بارے میں سوچا جاتا۔ مجھے ضرور خیال ہے۔ عزیز بانو تمہیں یاد کرتی رہتی ہے لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ تم تو خود میرے خون کے پیاسے ہو۔ رشتے کی بات کیا آگے چلاؤں۔ اگر مجھے اپنا بزرگ سمجھتے ہو تو خط کا جواب ضرور دینا۔ میں تمہاری مدد کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔

عزیز بانو تمہاری امانت ہے۔ تم سے منسوب ہے۔ جب چاہو آ کے مانگ سکتے ہو۔''

جیسے جیسے خط پڑھتا جا رہا تھا، بچپن کی باتیں یاد آتی جا رہی تھیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ واقعی اسے جان بوجھ کر دارالخلافہ سے دور رکھا جا رہا ہے۔ میر جملہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے پیچھے بھی گہری سازش ہے۔ ابا حضور واقعی ہر اس آدمی سے ڈرتے ہیں جو تخت کا وارث ہو سکتا ہے۔ چچا مراد اور چچا شجاع دونوں اسی لیے ان کے عتاب کا نشانہ بنے ہیں۔

ان سازشوں سے دور اسے عزیز بانو کا چہرہ نظر آیا۔ بھرے بھرے ہونٹ، ستواں ناک، گداز بدن، سپید شہابی رنگ۔

اسے یاد آیا کہ جب وہ اکبر آباد میں تھا تو چچا کی حویلی پر تقریباً روز جانا ہوتا تھا اور اس کا سبب عزیز بانو تھی جس نے ایک روز میری ایک گستاخی کے جواب میں وعدہ لیا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گا۔

میں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ گھر پہنچ کر ابا جان سے ضد کی تھی کہ میں عزیز بانو سے شادی کروں گا۔ میری عمر ابھی کم تھی اس لیے شادی تو نہیں البتہ دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ پھر چچا حضور بنگال چلے گئے۔ عزیز بانو بھی ساتھ چلی گئی۔ وقت نے سب کچھ بدل دیا۔ ایسا ہوا کہ چل کر عزیز بانو کو دوبارہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

وہ وارے گام پر بھی ہوئی ہے۔ ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ہم اس سے شادی کریں گے۔ کیا شہزادوں کے وعدے جھوٹے ہوتے ہیں؟ اگر نہیں تو برات لانے کے بجائے ہم لشکر لے کر کیوں آئے ہیں۔

شہزادے نے صبح ہوتے ہی دارو غہ امیر قلی کو طلب کیا۔ اسے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس کے لیے پیغام رسانی کا فریضہ انجام دے سکے۔ آدمی قابل اعتبار بھی ہو اور ہوشیار بھی۔ یہ احتیاط بھی مدنظر ہے کہ لشکر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ اس کا مطلب ہے یہ آدمی لشکر سے باہر کا ہونا چاہیے۔ دارو غہ نے وعدہ کر لیا کہ وہ ایسے کسی آدمی کو ڈھونڈ نکالے گا۔

وہ سیر و تفریح کے لیے دریا کے کنارے کنارے دور نکل جاتا تھا۔ اس نے وہاں کی کشتی والوں کو دیکھا تھا۔ سب کشتی والے جانتے تھے کہ وہ شاہی لشکر کا دارو غہ توپ خانہ ہے اور لشکر سے یہاں سیر کے لیے آتا ہے اس لیے ادب سے سلام کر لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہ پوچھنے کی ہمت بھی کر لیا کرتے تھے کہ شجاع کی فوجوں سے کب مقابلہ ہوگا۔

ان ملاحوں کو بھی معلوم تھا کہ شجاع ان دنوں جہانگیر نگر میں ہے اور اس کا لشکر دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ جنگ کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی اس لیے لوگ بہت کم سفر کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ ملاح بے کاری کے دن گزار رہے تھے۔ ان ملاحوں کو سکوں کا لالچ دے کر کوئی بھی کام لیا جا سکتا تھا۔ دارو غہ نے ان میں سے ایک سے بات کی۔ یہ شخص نوجوان بھی تھا اور چرب زبان بھی۔ دارو غہ کو یقین تھا کہ یہ شخص خوش اسلوبی سے یہ کام کر سکے گا۔

''تم کبھی جہانگیر نگر گئے ہو؟''

''کوئی ایک مرتبہ۔ بہت دفعہ گیا ہوں۔''

''تم میرے کام سے وہاں جاؤ گے؟''

''جا تو سکتا ہوں لیکن اس پار شجاع کی فوجیں پڑی ہوئی ہیں۔ جاسوسی میں دھر لیا گیا تو کوئی چھڑانے والا بھی نہیں ہوگا۔''

''تم جاسوسی کرنے نہیں جاؤ گے۔ تمہیں ایک خط شجاع تک پہنچانا ہوگا۔''

''شوق تو مجھے بہت ہے کہ میں شجاع کو دیکھوں۔ میں نے آج تک کوئی شہزادہ نہیں دیکھا۔ تمہارا کام بھی ہو جائے گا اور میں شجاع کو بھی دیکھ لوں گا لیکن معاملہ ذرا خطرے کا ہے۔'' ملاح نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہیں اس کام کی ایک شرط مل جائے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ایک اشرفی! اور وہ بھی سچ کہہ رہے ہو؟"
"ہاں ایک اشرفی اور پھر ہر پھیرے سے ایک اشرفی ملا کرے گی۔"
"بس ڈر لگتا ہے لشکر میں پکڑا نہ جاؤں۔"
"تمہارے پاس شہزادہ سلطان کی مہر کا خط ہوگا۔ کوئی روکے گا تو اسے وہ خط دکھانا۔ پھر تمہیں کوئی نہیں روکے گا بلکہ تمہیں شجاع کے پاس چھوڑ کر آئے گا۔"
"تو پھر کب چلوں حضور؟"
"ابھی کہاں، کل صبح دس بجے اسی گھاٹ پر مل جانا۔ میں تمہیں خط دوں گا، وہ لے جانا اور ہاں، اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو مت بتانا کہ میری تمہاری کیا بات ہوئی ہے۔ نہ جانے سے پہلے، نہ آنے کے بعد۔ اگر کسی کو کچھ معلوم ہوا تو پھر تمہاری خیر نہیں۔ میں بھی تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔"
"آپ فکر ہی نہ کریں۔ مر جاؤں گا کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

وہ ملاح دوسرے دن شجاع کے نام خط لے کر روانہ ہوگیا۔ شام تک جواب لے کر واپس بھی آگیا۔ پھر مراسلت کا یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہوگیا۔ یہی ملاح ادھر سے خط لے کر جاتا اور وہیں سے جواب لے کر آجاتا تھا۔

شہزادہ نوجوان تھا، ناتجربہ کار تھا اور چچا کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ کرنے لگا تھا کہ اس کی ہر بات کا یقین کرلیا جائے۔ رفتہ رفتہ اسے یقین آنے لگا کہ اورنگزیب غلطی پر ہے اور شجاع کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ میر جملہ کی طرف سے جو غلط فہمیاں دل میں پیدا ہو رہی تھیں، ان میں بھی مسلسل اضافہ ہونے لگا۔ اب تو وہ ان خطوط پر سوچنے لگا تھا کہ شجاع اور مراد کی طرح وہ بھی باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کردے۔ تکلف تھا تو صرف اتنا کہ دارا کا انجام بھی دیکھ چکا تھا۔ مراد کی گرفتاری سے بھی واقف تھا اور اب شجاع کی دربدری بھی دیکھ رہا تھا۔

اس نے کئی مرتبہ شجاع سے مشورہ چاہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے لیکن شجاع کوئی مشورہ دینے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ صرف یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اورنگزیب کی جانب سے بدظن کر رہا تھا۔

مراسلت بھی جاری تھی، تحائف کا سلسلہ بھی نہیں رکا تھا۔ اس ملاح کے دن پھر گئے تھے جو پیغام رسانی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

ایک روز وہ جہانگیر نگر سے لوٹا تو بضد تھا کہ یہ لفافہ وہ داروغہ کے حوالے نہیں کرے گا بلکہ اپنے ہاتھ سے شہزادے کو پیش کرے گا۔ اس کی یہ ضد عجیب سی تھی لیکن وہ بھی کچھ جا رہا تھا کہ اسے یہی ہدایت کی گئی ہے۔ داروغہ کو مجبور ہونا پڑا اور اسے شہزادے کی خدمت میں پیش کردیا۔

یہ شاہی محل نہیں تھا، محض شاہی خیمہ تھا جو عارضی طور پر بنایا گیا تھا لیکن ملاح غریب خیمے کی آرائش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مستعد محافظ ہتھیاروں سے لیس کھڑے تھے۔ ہاتھی جھوم رہے تھے۔ گھوڑوں کی قطاریں میدان جنگ کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ شہزادے پر نظر پڑی تو وہ سوچنے لگا کہ انسان ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔ شہزادہ ایسا ہے تو بادشاہ اورنگزیب کیسا ہوگا جس کا نام اس نے اکثر سنا تھا۔

وہ بے چارہ شاہی آداب سے کہاں واقف تھا۔ اپنے انداز میں سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ اسے کوئی لفافہ شہزادے کی خدمت میں پیش کرنا ہے۔ داروغہ نے یاد دلایا تو اسے یاد آیا۔ اس نے جیب سے لفافہ نکالا اور شہزادے کی خدمت میں پیش کردیا۔

"اس لفافے میں ایسی کون سی بات ہے کہ اسے ہمارے حضور پیش کرنا ضروری ہوگیا تھا؟" شہزادے نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن کل جب میں جہانگیر نگر گیا تو شہزادہ شجاع موجود نہیں تھے۔ اسی لیے میں آپ کے خط کا جواب نہیں لا سکا۔ میں جب وہاں سے واپس ہونے لگا تھا تو محل کی ایک کنیز میرے پاس آئی تھی اور اس نے یہ لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے تاکید کی تھی کہ یہ لفافہ آپ کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں نہ دوں۔"

شہزادہ اب بھی کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس نے ملاح کو رخصت کیا اور لفافے کا بھید جاننے کے لیے اسے چاک کیا۔

پہلی سطر پڑھتے ہی اس پر راز کھل گیا کہ لفافہ کیوں اتنی احتیاط سے بھیجا گیا ہے۔ یہ خط اس کے چچا کی جانب سے نہیں تھا بلکہ شہزادی عزیز بانو نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"شہزادہ والا جاہ! کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے بچپن کی تمام باتیں فراموش کردیں۔ اگر فراموش نہ کی ہوتیں تو یوں ہمیں برباد کرنے پر آمادہ نہ ہوگئے ہوتے۔ آپ کو تو یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں آپ سے منسوب ہوئی تھی۔

آپ اپنے والد کو مشورہ دیں کہ وہ میرے والد عالی کو معاف فرمادیں۔ ہندوستان کی سلطنت میں کچھ حصہ ہمارا بھی ہے۔ ہمیں بنگال میں پڑا رہنے دیں۔ خود پورے ہندوستان پر حکمرانی کریں۔ آپ کو بھی بادشاہ زادہ ہونا مبارک ہو۔

میں زندگی بھر آپ کا انتظار کروں گی۔

خط کا جواب بھیجنے کی کوشش نہ فرمائیے گا۔ کسی کے ہاتھ پڑ

گئے تو رسوائی ہوگی۔ میں خود ہی کبھی کبھی یاد کرلیا کروں گی۔

آپ کو پہلے کی طرح چاہتی ہوں مگر اب یہ کہاں ممکن۔

بدنصیب

"شہزادی عزیز بانو"

اب تک کی مراسلت نے اسے پہلے ہی باپ سے بدگمان کر دیا تھا۔ عزیز بانو کے خط نے تو جیسے قیامت برپا کردی۔ وہ سوچ رہا تھا، میرے باپ نے نہ صرف چچا جان کے درمیان نفرت ڈالی ہے بلکہ میری محبت بھی مجھ سے چھین لی ہے۔ اس لشکر کشی کا اس کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا کہ میرا ہونے والا سسر یا تو مارا جائے گا یا گرفتار کرلیا جائے گا۔ عزیز بانو کے دل پر کیا بیت جائے گی۔ میرے دادا اکبر آباد میں قیدی کی زندگی گزار رہے ہیں اور میں آزاد ہوں۔ میں اگر چچا شجاع کے ساتھ مل جاؤں اور دادا کو آزاد کر کے حکومت ان کے حوالے کردوں تو وہی دن لوٹ کر آسکتے ہیں جنہیں میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ وہ بہت دیر تک راستے کی مشکلات پر غور کرتا رہا تھا۔

خیمے کے دروازے پر میر جملہ باریابی کی اجازت کا منتظر کھڑا تھا۔ میر جملہ کا نام سنتے ہی اس کا خون کھولنے لگا۔ یہی وہ شخص ہے جو میری اتالیقی کے نام پر میرے باپ کے کان بھرتا رہتا ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو اسے میری نگرانی پر مامور کردیا گیا ہے۔ پھر کوئی مشورہ دینے چلا آیا ہوگا۔ میں اس کا پابند نہیں ہوں کہ اس سے مشورے کروں۔ عزیز بانو کا خط اب تک اس کے سامنے رکھا تھا۔ وہ آنکھیں اس خط سے باہر جھانکتی نظر آرہی تھیں جن میں شکوہ بھی تھا، غصہ بھی تھا، ملال بھی تھا۔ یہ آنکھیں کہہ رہی تھیں، اس کے سوا کسی سے نہ ملا جائے۔ اس نے کہلوا دیا کہ شہزادہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا۔

میر جملہ کے لیے اس کا یہ پیغام غیر معمولی تھا۔ وہ اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹ تو گیا لیکن اس کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ کسی طوفان کی آمد آمد ہے۔

سورج ڈوبنے کا وقت آگیا تھا۔ ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا لیکن شہزادہ اپنے اردگرد اندھیرا ہی اندھیرا دیکھ رہا تھا۔ اس خیمۂ شاہی میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس وقت اس کے جی میں نہ جانے کیا سمائی کہ شاہی پوشاک تبدیل کر کے عام لباس پہن لیا۔ مرصع زیورات بھی اتار کر ایک طرف رکھ دیے۔ باہر نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور باغ جلفرا سے باہر نکل گیا۔ نکلتے نکلتے کہہ گیا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے نہ آئے۔ وہ باغ سے نکلا اور لشکر کی جانب جانے والا راستہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل گیا۔

وہ دریا کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب رات ہوگئی تھی۔ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ شہزادہ بھی چاند کی طرف دیکھ لیتا کبھی دریا کے چوڑے سینے پر آنکھیں جما دیتا۔ اگر اس دریا کو پار کرلیا جائے تو دوسرے کنارے پر عزیز بانو سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ کتنے دن ہوگئے اسے دیکھے ہوئے۔ اب تو شاید اسے پہچان بھی نہ سکوں۔ کتنی خوبصورت ہوگئی ہوگی وہ۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں لیکن مل نہیں سکتا۔ میں اپنے باپ کی قید میں ہوں۔ میر جملہ میرا نگراں ہے۔ باپ کی قید سے فرار ہوئے بغیر عزیز بانو سے ملاقات ممکن نہیں۔

وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا۔ یہ دریا نہیں، یہ خلاف میرے باپ کا بچھایا ہوا جال ہے۔ وہ چاہتے ہیں ہمیشہ اس جال میں الجھا رہوں اور وہ ہندوستان پر حکومت کرتے رہیں۔ ان کے راستے میں جو بھی آئے اسے چیونٹی کی طرح مسل دیں۔ میں چیونٹی نہیں ہوں۔ میں شجاع اور مراد بھی نہیں۔ میں شہزادہ سلطان ہوں۔ مجھے تخت نہیں اپنی محبت چاہیے۔ چچا جان اور دادا حضور ہی میری مدد کرسکتے ہیں۔ میرے دادا نے بھی اپنی محبت حاصل کرنے کے لیے اپنے باپ سے بغاوت کی تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ میں بھی اپنے باپ سے ٹکراؤں گا۔ اسی خود فراموشی میں اس نے اپنے گھوڑے کا منہ دریا کی طرف موڑ دیا۔ چاہتا تھا کہ گھوڑے کو دریا میں ڈال دے اور تیرتا ہوا دریا پار کر جائے۔ اس کے کانوں میں بہت سے گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بہت سے مشعل بردار گھوڑے دوڑاتے چلے آرہے تھے۔ اس کا مطلب ہے میر جملہ نے میرے قتل کا سامان کرلیا ہے۔ پھرتی سے اس نے تلوار نکالی اور مقابلے کے لیے تیار ہوگیا۔ مشعل بردار سامنے آئے تو معلوم ہوا اس کے محافظ ہیں جو اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک چلے آئے تھے۔

کسی کو کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کس ارادے سے یہاں آیا تھا اور کیا کرنے والا تھا۔ کسی نے سوچا ہوگا تو یہی کہ شہزادہ سیر کے لیے نکلا اور راستہ بھٹک گیا۔

اس کے ساتھی اسے قیام گاہ پر واپس لے آئے۔

☆☆☆

معظم خان (میر جملہ) امرا کے درمیان گھرے بیٹھے تھے۔ وہ شہزادے سے ملنے گئے تھے لیکن شہزادے نے ان سے ملنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ ایسی بے عزتی تھی جسے وہ فراموش نہیں کرسکتے تھے۔ عام حالات میں ممکن ہے انہیں یہ احساس نہ ہوتا لیکن لشکر میں ہونے والی چہ میگوئیاں ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کانوں میں پہنچتی رہی تھیں۔ پہنچانے والوں نے یہ خبریں ان
تک پہنچا دی تھیں کہ شہزادہ ان اختیارات کو اچھی نظروں سے
نہیں دیکھ رہا ہے جو دربار شاہی سے میر جملہ کو حاصل تھے۔
ان امرا کے نام بھی ان تک پہنچ گئے تھے جو شہزادے کو
میر جملہ کی طرف سے بھڑکانے میں پیش پیش تھے۔ کوئی اور
موقع ہوتا تو میر جملہ ان امرا کی ناک میں نکیل ڈالنے کے
لیے اکیلے کافی تھے لیکن یہاں معاملہ شہزادے کا تھا۔
شہزادے کے خلاف کوئی قدم اٹھانا آفتاب شاہی کو دعوت دینا
تھا اسی لیے انہوں نے ضروری سمجھا تھا کہ مشورہ کر لیا جائے۔
ذوالفقار خاں، اسلام خاں، فدائی خاں، آفر خاں،
راجا اندر من بندیلہ اور دوسرے تجربہ کار امرا جنہیں میر جملہ
سمجھتے تھے کہ ان کے وفادار ہیں، سب کو طلب کر لیا تھا۔
"آپ حضرات دیکھ رہے ہیں کہ شہزادہ مجھ سے روز
بروز متنفر ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو وہ مجھ سے ملاقات کرنے کا
بھی روادار نہیں۔ یہ بات لشکر میں سب کی زبان پر ہے جس
سے خلفشار پیدا ہو رہا ہے۔ عام سپاہی حیران ہے کہ وہ کس کا
حکم مانے، کس کا حکم ٹھکرائے۔ امرا میں بھی دھڑے
بندیاں ہو گئی ہیں۔ اب تک ہماری جتنی جھڑپیں شجاع سے
ہوئی ہیں ان میں شجاع کو شکست ہوئی ہے لیکن اب شاید ایسا
نہ ہو کیونکہ شہزادے کی ناراضی سے باہمی اتحاد ختم ہوتا جا رہا
ہے۔ شجاع ہر مرتبہ بچ کر نکل جاتا ہے، دیکھیے تو اس میں بھی کوئی
سازش نظر آ رہی ہے۔ ہندوستان میں جتنی طاقتیں حضرت
شہنشاہ عالمگیر کے خلاف ہیں، ان کی نگاہیں شجاع پر لگی
ہوئی ہیں۔ وہ جب تک ہم سے بچا رہے گا، حضرت شہنشاہ
کے رعب میں کمی آتی جائے گی۔ دکن میں مرہٹوں کا زور
بڑھتا جا رہا ہے اور شہزادہ اندرونی خلفشار کو ہوا دے رہا
ہے۔ آپ لوگ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"
معظم خاں کی تقریر ختم ہوئی تو اسلام خاں اپنی جگہ
سے کھڑے ہوئے۔ "کیا حضرت نے شہزادے کی عدم
توجہی کا سبب جاننے کی کوشش کی؟"
"اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ نوجوان ہے اور اسے
معظم خاں کے اختیارات سخت ناپسند ہیں۔ تمام فوجی
امور اور فوج کی تعیناتی کے اختیارات معظم خاں کے ہاتھوں
میں ہیں۔ یہ بات شہزادے کو گراں گزرتی ہے۔" فدائی
خاں نے اپنی رائے دی۔
اسلام خاں نے اس سے اختلاف نہیں کیا لیکن اس
بیان میں اضافہ کرنا بھی ضروری سمجھا۔ "میری معلومات کچھ
اور بھی کہتی ہیں۔ میرے علم میں کچھ باتیں آئی تھیں لیکن
معاملہ اتنا نازک تھا کہ اب تک میں نے زبان بند رکھی ہے
لیکن اب شاید ضروری ہو گیا ہے کہ اظہار کر دوں۔"
"آپ بیان فرمائیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ
ہیں۔" ذوالفقار خاں نے کہا۔
"مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادے اور شجاع کے درمیان
خفیہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہے۔ گھاٹ پر کوئی ملاح ہے جو
واسطے کا کام دے رہا ہے۔ یہاں سے خط لے کر جہانگیر نگر
جاتا ہے اور جواب لے کر واپس آ جاتا ہے۔"
"اسلام خاں، آپ کو معلوم ہے، آپ شہزادہ والا جاہ
پر کتنا بڑا الزام لگا رہے ہیں۔ کیا میں آپ کو شمار بھی ان لوگوں
میں کروں جو میرے اور شہزادے کے تعلقات خراب کرنا
چاہتے ہیں؟" معظم خاں نے کہا۔
"میں آج تک اسی لیے خاموش تھا۔ میں نے اب بھی
یہ نہیں کہا کہ میرے پاس کوئی ثبوت ہے لیکن لشکر میں کچھ
لوگوں کے درمیان یہ باتیں گردش کر رہی ہیں۔"
"معاملہ شہزادے کا ہے۔ شہنشاہ کے علم میں لائے
بغیر اس معاملے کی تحقیق بھی نہیں کی جا سکتی۔ شہنشاہ سے یہ بھی
پوچھا جائے کہ تحقیق کے بعد اگر یہ بات سچ ثابت ہو جائے تو
پھر کیا کیا جائے۔"
بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ کسی قاصد کو
اورنگزیب کی خدمت میں بھیجا جائے۔ تمام معاملات ان تک
پہنچائے جائیں۔ جب تک قاصد واپس نہیں آ جاتا اپنے طور
پر چھان بین بھی کی جاتی رہے۔
اسی رات کے کسی حصے میں ایک سانڈنی سوار دہلی کی
جانب دوڑ پڑا۔
معظم خاں (میر جملہ) کو یہ تو معلوم تھا کہ جو امرا اس
کے سامنے بیٹھے ہیں وہ اس کے وفادار ہیں لیکن یہ معلوم نہیں تھا
کہ ان میں سے کوئی شہزادے کا وفادار بھی ہو سکتا ہے۔ یہ
اجلاس ختم ہوا تھا کہ اس کی تمام کارروائی شہزادے تک پہنچ
گئی۔ اس نے اپنے رفیق امرا، دلاور، امیر علی اور میر تزک
قاسم علی کو اپنے پاس بلایا۔ اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ
سازش پکڑی گئی ہے۔ میر جملہ کچھ بھیجنے والا نہیں۔ اس نے
اپنے امیروں کے سامنے یہ ضرور کہا ہے کہ اورنگزیب کے
علم میں لائے بغیر کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائے گا لیکن وہ
اتنا انتظار نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ اس ملاح تک پہنچ گیا جو اس
مراسلت کا ذریعہ بنا ہوا ہے تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔
"امیر علی خاں، ہم کسی مناسب وقت پر اس مراسلت
کو خود ہی ظاہر کر دیں گے جو ہمارے اور چچا حضور کے

درمیان ہو رہی ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ میر جملہ سے
کسی اور رنگ میں پیش کرے۔ جب اسے یہ معلوم ہے کہ
اہل گھاٹ کے ملاحوں سے ہمارا رابطہ ہے تو یہ معلوم کرنا اس
کے لیے دشوار نہیں ہوگا کہ اس رابطے کا ذریعہ کون ہے۔ وہ
اس ملاح تک پہنچ گیا تو نہ صرف یہ کہ بھانڈا پھوٹے گا بلکہ
ہمارے جرم میں وہ غریب ملاح اپنی جان سے
ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"
"شہزادہ فکر نہ کریں، اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" امیر علی
نے کہا۔
"معظم خاں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو گے یا اس کو ذہنی
طور پر معذور کر دو گے؟"
"قدموں کے وہ نشان مٹا دوں گا جن پر چل کر معظم
خاں آپ تک پہنچ سکتا ہے۔"
"ہمارے جرم کی سزا اس ملاح کو ملے گی؟"
"رعایا اسی لیے ہوتی ہے کہ بادشاہوں کے کام
آئے۔"
"ہم اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہیں، وہ اسی طرح کی
خبریں ہمارے لیے لاتا رہے۔ اسے مرنا نہیں چاہیے۔"
"وہ زندہ رہے گا لیکن معظم خاں کی پہنچ سے دور
ہوگا۔"
"ہم یہی چاہتے ہیں۔"
"ایسا ہی ہوگا۔"
امیر علی خاں کو معلوم تھا کہ اگر راز کھلا تو شہزادے سے
پہلے وہ آفتاب شاہی کا نشانہ بنیں گے۔ انہیں کچھ تو کرنا تھا۔
وہ میر کے ہمراہ گھاٹ کی طرف گئے اور اس ملاح سے ملے۔
"تمہارے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟"
"میری بوڑھی ماں ہے سرکار۔ ایک بہن ہے۔ اس کا
میاں مر چکا ہے۔ آپ کی عنایت سے اتنی دولت مجھے مل گئی
ہے کہ اب شادی بھی کر لوں گا۔"
"کوئی لڑکی دیکھی ہے؟"
"ابھی تو نہیں دیکھی سرکار۔"
"تمہیں کچھ دن کے لیے یہ کشتی بانی چھوڑنی پڑے
گی۔"
"مجھے تو کوئی اور کام آتا بھی نہیں۔"
"تم کچھ دن کے لیے جہانگیر نگر چلے جاؤ۔"
"کیوں مالک؟"
"یہاں کچھ لوگوں کو شک ہو گیا ہے کہ تم شہزادے کے
خط لے کر جہانگیر نگر جاتے ہو۔"
"یہ کوئی غلط کام ہے کیا؟"
"نہیں، غلط کام تو نہیں لیکن شہزادے کے دشمنوں کو
پسند نہیں۔ وہ شہزادے کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے تمہارے پیچھے
پڑ جائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔
جب خطرہ ٹل جائے گا تو تمہیں بلا لیا جائے گا۔"
"وہاں جا کر کیا کام کروں گا؟"
"تم شہزادہ شجاع کے مہمان ہو گے۔ وہ اپنے لشکر میں
کوئی کام تمہیں دے دیں گے۔"
وہ غریب آدمی کسی طرح بھی جانے کے لیے تیار نہیں
ہو رہا تھا لیکن جب اسے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوا تو اسے
جانا پڑا۔ اس نے راتوں رات اپنے گھر والوں کو کشتی میں
بٹھایا اور جہانگیر نگر پہنچ گیا۔ یہ آخری خط تھا جو وہ اپنے ساتھ
لے کر گیا تھا۔ اس خط میں شہزادہ شجاع سے سفارش کی گئی تھی
کہ اس کی جان کی حفاظت کی جائے اور اس کی نوکری کا
بندوبست کر دیا جائے۔
دو دن نہیں گزرے تھے کہ معظم خاں کے سپاہیوں
نے دریا کے گھاٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اسے یہ
معلوم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ملاح کون تھا جو شہزادے
کے لیے کام کر رہا ہے لیکن وہ جس چڑیا کے پر کاٹنے نکلا تھا وہ
چڑیا اڑ چکی تھی۔ ملاح اور اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ کہیں
غائب ہو گیا ہے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں چلا گیا۔
معظم خاں کے سپاہیوں نے ملاح کے کئی ساتھیوں کو گرفتار
کر لیا۔ انہیں ہر طرح کی دھمکیاں دیں لیکن کسی کو کچھ معلوم
ہی نہیں تھا تو بتاتے کیا۔
شہزادے کو معلوم ہو گیا تھا کہ معظم خاں نے اس کی
اجازت کے بغیر ملاحوں کو گرفتار کیا ہے لیکن اس نے باز پرس
ضروری نہیں سمجھی۔ اس معاملے میں وہ اپنی دلچسپی ظاہر کرنا
نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی انتظار کر رہا تھا کہ اورنگزیب کی طرف
سے کیا پیغام آتا ہے۔
وہ سانڈنی سوار جسے معظم خاں نے روانہ کیا تھا، واپس
آیا تو شاہی فرمان اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس شاہی فرمان
میں شہزادہ محمد سلطان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے اختیارات
معظم خاں کے سپرد کر کے انہیں وہیں چھوڑ دے اور خود حضور
شاہی میں پیش ہو جائے۔
معظم خاں ایک مرتبہ پھر شہزادے کے خیمے کے
سامنے کھڑا تھا اور باریابی کی اجازت کا منتظر تھا۔ شہزادہ سوچ
رہا تھا کہ اس کی سردمہری کے باوجود معظم خاں اس کے
دروازے پر آیا ہے تو کوئی خاص بات ضرور ہے۔ اسے یہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معلوم ہو گیا تھا کہ سانڈنی سوار دلی سے واپس آ چکا ہے۔ کوئی نہ کوئی پیغام ضرور لایا ہوگا۔ ممکن ہے یہ پیغام اس کے حق میں اور معظم خاں کے خلاف ہو۔

شہزادے کی جانب سے اجازت باریابی مرحمت ہوتے ہی معظم خاں اندر آ گیا۔

"شہنشاہ، ملک اورنگزیب کی جانب سے فرمان صادر ہوا ہے۔ آپ کو دربار میں طلب کیا گیا ہے۔"

"آپ بزرگ ہیں لیکن مذاق بھی خوب فرما سکتے ہیں۔"

"یہ پیغام زبانی نہیں ہے۔ آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔" معظم خاں نے شاہی فرمان شہزادے کے سامنے کر دیا۔

"عقل سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ ہم شہزادے ہیں، ان کے ملازم نہیں کہ ان کے حکم پر جنگلوں میں پڑے رہیں۔" شہزادے نے میر جملہ پر طنز کیا۔

"بجا ارشاد فرمایا شہزادے۔ ستارے وہی اچھے ہوتے ہیں جو روشن ہوں۔" میر جملہ نے اپنا وار کیا۔

"ستارہ کتنا ہی روشن ہو آسمان سے ٹوٹ جائے تو ستارہ نہیں رہتا۔"

"ہم لشکر کا معائنہ آپ کے چلے جانے کے بعد ہی کریں گے۔"

"ہمیں تیاری میں ایک ہفتہ سے بھی کم لگے گا۔"

"شہزادہ محترم مجھے اجازت دیجیے۔" میر جملہ نے کہا اور باہر نکل گیا۔

شہزادے کو یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ میر جملہ کا تیر اپنے نشانے پر پہنچا ہے۔ اسے میر جملہ سے نہیں بلکہ شہزادہ شجاع سے دور کرنے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ شہزادہ شجاع سے دور جانا عزیز بانو سے دور لے جاتا تھا جو اس کی جوانی کو کسی طرح بھی گوارا نہیں تھا۔

اس وقت شہزادہ محمد سلطان میں اپنے دادا شاہجہاں کی جوانی جلوہ افروز تھی۔

"امیر قلی خاں، اگر ابا حضور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شاہی فرمان کی زنجیر ہمارے پیروں میں ڈال کر ہمیں اپنے احکامات کا پابند بنا سکتے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔ بے شک ہم عزیز بانو کے مجرم ہیں کہ اتنے دنوں تک ہم اسے فراموش کیے رہے لیکن یہ اب نہیں ہوگا۔ ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے۔"

"حضور، یہ وقت ہوش کا ہے، جوش کا نہیں۔"

"ہم چاہیں تو اپنے لشکر کے ساتھ دلی کی دھجیاں بکھیر سکتے ہیں لیکن ہمیں نہ شاہی لشکر درکار ہے۔ نہ شاہی دربار، ہماری منزل محبت ہے۔ ہم بھائیوں کی گردن کاٹنے کے روادار نہیں۔ ہم اگر کبھی شہنشاہ بنے تو وہ شہنشاہ بنیں گے جو محبت کی یادگار کے لیے تاج محل تعمیر کراتے ہیں۔"

شہزادہ اس وقت جوانی دیوانی کا پوری طرح ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے کسی نتیجے کی پروا کیے بغیر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بادشاہ کے بلاوے پر دربار جانے کے بجائے عزیز بانو کے پاس جائے گا۔ یہ فیصلہ وہ اس وقت کر رہا تھا جب راستوں کے پتھر بھی اورنگزیب کا نام سن کر تھرا اٹھتے تھے۔ دارا شکوہ کے عبرت ناک انجام کو دنیا دیکھ چکی تھی۔ جس کو جھکا تھا معافی کا لفظ اسے یاد نہیں۔ یہ محبت کی طاقت تھی جو شہزادے کو باپ سے بغاوت کا سبق سکھا رہی تھی۔

"قاسم علی!"

"شہزادہ محترم......؟"

"ہمیں کوئی ایسا آدمی فراہم کرو جو ہمارا پیغام بیگم حضور تک لے جائے۔ ہم نے سوچ لیا ہے کہ ہم ان کے پاس چلے جائیں گے۔ اگر ہم دلی گئے تو ہمارا انجام ہمارے دوسرے چچا مراد بخش سے مختلف نہیں ہوگا۔"

"حضور، لشکر سے آپ کا چلے جانا زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہے گا۔"

"ہم چاہتے بھی نہیں کہ چھپا رہے۔"

"الزام ہم پر بھی آئے گا۔"

"تم ہمارے ساتھ ہو گے۔"

"ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"اس سے پہلے کہ ہم لشکر سے نکلیں، ہماری آمد کی اطلاع بیگم حضور کو ہو جانی چاہیے۔ ان کی رضامندی کے بغیر ہم لشکر نہیں چھوڑ سکتے۔"

"یہ پیغام اتنا اہم ہے کہ کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ میر جملہ نے یقیناً جاسوسوں کا جال بھی پھیلایا ہوا ہوگا۔"

"ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہ تو اس خیال میں ہوں گے کہ ہم دلی کی راہ لینے والے ہیں۔"

"اس کے باوجود احتیاط لازم ہے۔"

امیر قلی اور قاسم علی شہزادے کو مجبور کر کے اس مقام تک لے آئے تھے۔ اب ان کی بقا بھی اسی میں تھی کہ شہزادے کو میر جملہ سے دور کر دیں اور خود بھی اس کے ساتھ نکل جائیں۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ خاندان کی یہ لڑائی بہت جلد دم توڑ جائے گی۔ اس وقت اگر شجاع کا ساتھ دیا تو شہزادہ بھی احسان مند رہے گا اور شجاع بھی زندگی بھر اس احسان کو تسلیم کرے گا۔

ان دونوں امرا کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ میر جملہ نے بادشاہ کے حضور صرف شہزادے کی شکایت نہیں لکھی ہوگی بلکہ ان کا نام بھی آیا ہوگا۔ اگر تحقیق ہوئی تو ساری باتیں سامنے آئیں گی لہٰذا ضروری تھا کہ شہزادے کو باپ کے خلاف بھڑکا دیا جائے جبکہ وہ بھی بھڑکنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

پھر اتنی خطرناک تھی کہ اگر شہزادے کے مصاحب اس کا ساتھ نہ دیتے تو وہ عمل تو درکنار ارادہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خود مصاحبین بھی اس منزل پر پہنچ گئے تھے کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ امیر قلی اور قاسم علی دونوں نے ملاحوں کا روپ دھارا اور جہانگیر نگر پہنچ گئے جہاں شجاع سے ان کی ملاقات ہوئی۔ دونوں مصاحبوں نے شجاع کو پیغام دیا کہ معظم خاں اور شہزادے کے درمیان چپقلش اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب وہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ شہزادہ آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں اگر آپ بھی چاہیں۔

شجاع نے یہ خوش خبری سنی تو اس نے اسے عطیۂ خداوندی سمجھا۔ مصاحبوں کو یقین دلایا کہ وہ شہزادے کا استقبال کرے گا۔

اس گفتگو کے دوران شجاع کا بیٹا بلند اختر بھی موجود تھا۔ شجاع نے پر امید آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی خوشی کی روشنی میں نہایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "شہزادہ سلطان میرا بھائی ہے۔ میں اورنگزیب نہیں ہوں کہ اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹنے کے لیے تلوار بے نیام کرتا پھروں۔ شہزادہ سلطان ہمارے مہمان بن کر آئیں گے۔ میں خود انہیں لینے جاؤں گا۔ انہیں بس اتنا کرنا ہوگا کہ اپنی قیام گاہ سے دریا کے کنارے تک پہنچ جائیں۔ اس کے بعد تقدیر بھی انہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔"

"شاباش بلند اختر۔" شہزادہ شجاع نے بیٹے کے لیے کلمات تحسین ادا کیے۔

"آپ کی اجازت سے جان بیگ بھی میرے ہمراہ جائے گا۔ بھروسے کا آدمی ہے اور بہادری میں بے مثال ہے۔ بہت اچھا تیر انداز بھی ہے۔"

کشتی، دریا اور تیر انداز کے الفاظ نے تو امیر قلی کو وہ ملاح یاد آ گیا جو شہزادے کے پیغامات شجاع تک پہنچایا کرتا تھا اور جسے میر قلی نے جہانگیر نگر پہنچا دیا تھا۔

"شہزادۂ عالی وقار،" امیر قلی نے شجاع کو مخاطب کیا۔

"آپ کو وہ ملاح تو یاد ہوگا جس کے ذریعے شہزادہ سلطان

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

جولائی 2011ء کے دلہن نمبر کی ایک جھلک

اگر ملنا نہیں ہمدم
ذکیہ بلگرامی کے ناول کی آخری قسط

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
شیریں حیدر کے قلم سے

خوشبو کا سفر
عالیہ بخاری کا ناول ایک نئی مہک کے ساتھ

راحت وفا کا ناول ایک تھی نیناں
نفسیاتی احساسات و خیالات سے مزین

میمونہ خورشید اور رضوانہ پرنس
کے پُر تاثر ناولٹ سچے جذبوں سے مزین

عطیہ عمر، عالیہ حرا، سلمیٰ غزل، تحسین اختر، راحت راجپوت اور دیگر مصنفات کے
دلہن نمبر کے حوالے سے تحریر کردہ خاص افسانے

آپ کی آمد کا شدت سے منتظر ہے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں، کمال ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے پیغامات حضور تک پہنچایا کرتے تھے۔"

"ہاں وہ تو ہے، کیا ہوا اسے؟"

"اسے تو شہزادہ سلطان نے آپ کے پاس بھیجا تھا کیونکہ وہاں اس کی جان کو بے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ کیا وہ یہاں نہیں آیا؟"

"یہاں آیا ہوتا تو میں آپ سے کیوں پوچھتا؟"

"اس کا مطلب ہے یا تو میر جملہ کو اس کا سراغ مل گیا یا پھر وہ کسی اور طرف نکل گیا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ یہاں رہا تو جان کو خطرہ لاحق رہے گا۔"

تھوڑی دیر کے لیے ماحول پر اداسی کا راج ہو گیا تھا لیکن اسی وقت جان بیگ حاضر خدمت ہوا اور باتوں کا رخ کسی اور طرف ہو گیا۔ جان بیگ سپاہی پیشہ شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے وفاداری ظاہر ہوتی تھی لیکن چہرے پر ایسی سفاکی بھی تھی کہ دیکھنے والوں کی رگوں میں خون جمنے لگے۔ امیر قلی نے بہت سے بیمار لوگ دیکھے تھے لیکن ایسی وحشت کسی چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

شہزادے کو پیغام بھجوا دیا گیا تھا کہ وہ اپنا خزانہ، ہیرے جواہرات وغیرہ اور جو سامان چاہے دریائے گنگا کے کنارے بھجوا دے۔

شہزادے نے خواجہ سرا کی مدد سے محل کی عورتوں اور ہیرے جواہرات اور خزانے کو دریائے گنگا کے کنارے بھجوا دیا۔

شجاع کا بیٹا بلند اختر چند کشتیاں اور مزدور لے کر پہنچ گیا۔ اندھیری رات نے پردے ڈالے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اور شہزادہ سلطان، شجاع کے پاس پہنچ گیا جو شہزادہ کا تایا تھا لیکن باپ (شاہ جہاں) کی بیماری کا سنتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اور ابھی تک خود کو بادشاہ ہی سمجھ رہا تھا۔ اورنگزیب نے بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اسی لیے دونوں کے درمیان جھگڑا چلا آ رہا تھا۔ شجاع کئی مرتبہ شکست کھا کر فرار ہو چکا تھا لیکن سخت جان تھا کہ نہ مارا گیا نہ گرفتار ہو سکا تھا۔

شہزادہ سلطان کے لیے ایک جدا مکان کا بندوبست کیا گیا تھا۔ دو دن بعد اسے شہزادہ شجاع کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ شہزادے نے دستور کے مطابق اسی طرح نذر پیش کی جس طرح بادشاہوں کے حضور نذر پیش کرنے کا طریقہ تھا۔ شجاع نے انتہائی مہربانی کی، کورنش اور نذر قبول کرنے کے بعد شہزادے کو گلے سے لگایا اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔

دربار برخاست ہوا تو شہزادے کو محل سرا لے جایا گیا جہاں سے اپنی چچی اور محل کی دوسری عورتوں سے ملاقات کرنی تھی۔ محل سرا کے دروازے میں قدم رکھتے ہی اسے عزیزہ بانو کا خیال آیا تھا۔ پہرے پر کھڑی ہوئی عورتوں نے تیز نگاہوں سے شہزادے کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اعلان سنا۔ کوئی پردے کے پیچھے پکار رہا تھا۔ اعلان کر رہا تھا کہ شہزادہ محمد سلطان قدم رنجہ فرمانے والے ہیں جسے پردہ مطلوب ہو وہ پردہ کر لے۔

شہزادے کو کشاں کشاں اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں اس کی چچی اس کی منتظر تھیں۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو کنیزیں اس کی چچی کے گرد حلقہ بنائے کھڑی تھیں۔ شہزادے پر نظر پڑتے ہی تتلیوں کی طرح اڑ گئیں۔ شہزادہ آگے بڑھا اور چچی کی آغوش میں سر رکھ دیا۔ چچی نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ اپنی چچی کو بہت دن بعد دیکھ رہا تھا۔ انہیں اتنی بوڑھی نہیں ہونا چاہیے تھا جتنی وہ نظر آ رہی تھیں۔ اس کی وجہ بنگال کی مرطوب آب و ہوا بھی ہو سکتی تھی اور یہ وجہ بھی کہ کئی برس ہو گئے تھے ان کا شوہر شاہی لشکر سے بھاگا پھر رہا تھا اور انہیں بھی دربدری کے دکھ جھیلنے پڑ رہے تھے لیکن شجاع اپنے بھائی دارا سے زیادہ خوش قسمت تھا کہ اس کا لشکر ابھی تک اس کے ساتھ تھا۔ ابھی ناامیدی نے اس کے حوصلوں کو تنگ نہیں کیا تھا۔

"بیٹا! میری خود غرضی کو بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم یہاں چلے آئے لیکن تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب بہادروں کی کہانیاں ختم ہو گئیں۔ تمہارا باپ تمہیں کبھی چین سے نہیں رہنے دے گا۔"

"میں دارا شکوہ یا مراد بخش نہیں ہوں چچی جان۔"

"تمہارے باپ کا ستارہ اس وقت عروج پر ہے۔ اس کے پاس بہت طاقت ہے۔ جو شاہ جہاں جیسے بادشاہ کو قید کر سکتا ہے تم تو پھر اس کی اولاد ہو۔"

"چچا جان نے مجھے ترغیب دی تھی کہ یہاں چلا آؤں۔"

"ڈوبنے والا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ یہ تو تمہارے سوچنے کی بات تھی۔ ملک میں ہر طرف بدامنی ہے۔ راجپوت اور مرہٹے پھر سے سر اٹھانے لگے ہیں۔ ایک نئی قوت انگریزوں کی ہے جو آگے بڑھ رہی ہے۔ اورنگزیب بھائیوں کے پیچھے لگا رہا تو کہیں مخالف قوتیں مغلوں کی بساط ہی نہ لپیٹ دیں۔"

"یہ تو بادشاہ حضور کے سوچنے کا مقام ہے۔ انہوں نے ادنیٰ ملازموں کو میری نگرانی پر مقرر کیا ہوا تھا پھر یہ امید بھی کر

... میں اپنے چچا سے مل کر آ جاؤں گا۔"

"میری منشا تمہاری دل شکنی نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ آنے والے وقت کے لیے تیار رہو۔ تمہارا لشکر سے ہار کر آنا ہو جائے تو ایسے حالات پیدا نہیں کریں گے۔"

ملاقات خوشگوار ماحول میں ختم نہیں ہوئی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی چچی اس کے یہاں چلے آنے کے حق میں نہیں۔ وہ وہاں سے اٹھا تو ایک بوجھ سا تھا جو اس کے دل پر تھا۔

وہ راہداری سے گزر رہا تھا کہ ایک دریچے سے دو کالی آنکھوں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ شہزادے کی آنکھیں ان آنکھوں میں پیوست ضرور ہوئی تھیں لیکن وہ آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ وہاں سے گزرنے کے بعد اسے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کہیں یہ عزیزہ بانو تو نہیں تھی۔

وہ اپنے مسکن پر آیا تو بہت اداس تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنی چچی کی باتوں کا خیال آ رہا تھا۔ وہ میرے آنے سے خوش نہیں ہیں۔ اسی لیے انہوں نے عزیزہ بانو کو بھی مجھ سے ملنے نہیں دیا۔ کیا عزیزہ بانو کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک اور جنگ کرنی پڑے گی؟ کیا یہاں آ کر میں نے غلطی کی؟ کیا مجھے واپس چلا جانا چاہیے؟ کتنے ہی سوالات تھے جو اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ میر قلی اور حسن علی بھی اس کے پاس نہیں تھے کہ ان سے مشورہ کرتا۔ انہیں یہاں آتے ہی لشکر گاہ میں بھیج دیا گیا تھا۔

وہ ان خیالوں میں گھرا بیٹھا تھا کہ شجاع کے محل کی ایک کنیز حاضر ہوئی۔ وہ ایک رقعہ لے کر حاضر ہوئی تھی جو عزیزہ بانو نے اس کے ذریعے بھیجا تھا۔

"آپ ہمیں نہ دیکھ سکے لیکن ہماری دلی مراد پوری ہوئی۔ ہم نے آپ کو اچھی طرح سے دیکھ لیا۔ امی جان نے ہمیں منع کر دیا تھا ورنہ ہم ملاقات کو ضرور آتے۔

جب بچوں کو جب خرچ کے لیے پیسے نہیں ملتے تو وہ چوری کرنے لگتے ہیں۔ ہم آپ سے چوری چھپے ملاقات کے لیے مجبور ہو گئے ہیں۔ آج رات ہم آپ سے ملاقات کے لیے آئیں گے۔ آپ کے محل کے پچھواڑے جو باغ ہے وہاں ایک بارہ دری بنی ہوئی ہے۔ ہم ایک کنیز کے ہمراہ اس بارہ دری میں آپ کا انتظار کریں گے۔ ہم جانتی ہیں جو آپ کے گوش گزار کر رہی ہیں۔"

کنیز وہ رقعہ دے کر چلی گئی لیکن شہزادے کو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا گئی۔ عزیزہ بانو مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہے پھر مجھے کسی اور سے کیا۔

وہ شام سے رات کا تصور کیے بیٹھا رہا، پھر جیسے ہی رات کے آنے کا شور مچا وہ خاموشی سے اٹھا اور مکان سے نکل کر باغ میں پہنچ گیا۔ وہ اس باغ میں پہلی مرتبہ آیا تھا اور پھر اس وقت اندھیرا بھی تھا۔ چاندنی کی مدھم روشنی درختوں سے چھن کر ضرور رہی تھی لیکن صرف اتنی کہ پاؤں رستہ ڈھونڈ سکیں۔

وہ پریشان ہو رہا تھا کہ بارہ دری کہاں ڈھونڈے۔ وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آیا تو اسے چاندنی میں نہائی ہوئی، سنگ مرمر کی عمارت نظر آئی۔ یہ عمارت ایک ایسے رخ پر بنائی گئی تھی کہ چاند کی کرنیں اس پر براہ راست پڑ رہی تھیں اور یہ یوں بھی چاند کی بارھویں رات تھی۔ یہی وہ بارہ دری تھی جہاں عزیزہ بانو نے اسے بلایا تھا۔ وہ پشت کی جانب ہاتھ باندھے ٹہلتا رہا اور پھر سنگ مرمر کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں ان درختوں کی طرف لگی رہیں جہاں سے عزیزہ بانو آ سکتی تھی۔

بہت دیر گزر گئی۔ اب اسے اس انتظار سے کوفت ہونے لگی تھی۔ وہ سامنے آ کر کھڑے ہونے لگے تھے کہ دور، جھاڑی کے درختوں کے پاس دو سایوں کو متحرک دیکھا۔ اس وقت عزیزہ بانو کے سوا کون ہو سکتا تھا اور یہ دوسرا سایہ؟ اسے یاد آیا کہ رقعے میں کسی کنیز کا ذکر تھا کہ وہ اس کے ساتھ آئے گی۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بارہ دری کے نزدیک پہنچ کر دونوں سائے جدا ہو گئے۔ ایک سایہ پیچھے رہ گیا اور دوسرا اس کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

"کیا ہم یقین کر لیں کہ ہم اپنے ماضی میں پہنچ گئے ہیں۔ شہزادہ سلطان ہمارے روبرو ہیں۔"

"تم ہمیں سلطان کہہ سکتی ہو تاکہ ماضی مکمل ہو جائے۔"

"یہ کنیز اس گستاخی کی متحمل کب ہو سکتی ہے۔"

"کیا ماضی میں آپ یہ گستاخی نہیں فرمایا کرتی تھیں؟"

"اس وقت کی بات اور تھی۔ ہم آپ کے ہم رتبہ تھے۔ اب آپ شہنشاہ ہند کے بیٹے ہیں محض شہزادے نہیں اور ہم اس چراغ کے مانند ہیں ہوا کے جھونکے جس کی تاک میں ہیں۔"

"ہم اس چراغ کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔"

شہزادے نے کہا اور اسے خود میں چھپا لیا۔ اسے محسوس ہوا چراغ کی لو تھرتھرا رہی ہے۔ عزیزہ بانو اس کی باہوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔

"عزیزہ بانو ہم نے یہ تو نہیں سوچا تھا کہ ہم سے ملو گی تو تمہاری آنکھوں میں آنسو ہوں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ بھی تو نہیں سوچا ہوگا کہ ہم کس حال میں ہیں گے۔ آپ کی تو میں میرے والد کے خون کی پیاسی ہو چکی ہوں گی۔"

"اتنی سی بات پر شہزادیاں رویا نہیں کرتیں۔"

شہزادے نے اسے خود سے الگ کیا اور اس کے پھول رخساروں سے شبنم کے قطرے صاف کرنے لگا۔ "آپ کو یاد ہے ایک مرتبہ بچپن میں کھیلتے کھیلتے آپ کے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ ہم نے آپ کو گود میں اٹھالیا تھا اور اسی طرح آنسو پونچھے تھے۔"

"اور تکلیف بچانے آپ کی سرزنش بھی کیسی کی تھی۔"

"اب سرزنش کرنے والا کوئی نہیں اس لیے آئندہ رونے کی کوشش نہ کیجیے گا۔" شہزادے نے اس کے مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "یہ بتاؤ ہم محل سرا میں گئے تو ملاقات کو کیوں نہیں آئیں؟"

"امی جان نے منع فرمادیا تھا۔"

"کیا وہ نہیں چاہتیں کہ ہمارا ماضی، حال سے گزر کر مستقبل میں داخل ہو۔"

"وہ یہ نہیں چاہتیں کہ ہماری وجہ سے آپ پر کوئی افتاد آئے۔"

"اگر افتاد ہی آنی ہے تو جلدی آئے۔ ہم چچی جان سے تمہیں مانگ لیں گے۔"

یہ کہ کر شہزادی کے چہرے پر جو رنگ آئے ہوں گے، چاندنی کم روشنی انہیں دکھا نہیں سکی ہوگی۔ صرف اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ شرم کے رنگوں سے بہار بن ہی چکی ہے۔

"اب ہمیں جانا ہوگا۔ ہمارا زیادہ دیر غائب رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"کل ہم اسی جگہ آپ کا انتظار کریں گے۔"

☆☆☆

شہزادے کا فرار چھپنے والا نہیں تھا۔ بہت جلد یہ راز افشا ہوگیا کہ شہزادہ دربار میں حاضری کے لیے روانہ نہیں ہوا ہے بلکہ شجاع کے پاس پہنچ گیا ہے۔ یہ خبر جمعہ کے سارے لشکر میں پھیل گئی۔ یہ خبر ایسی تھی کہ ہر طرف بددلی نے پاؤں پھیلا دیے۔ ارادے متزلزل ہونے لگے۔ بہت سے لوگ لشکر چھوڑ کر جانے کی تیاری کرنے لگے تھے کہ معظم خان نے استقلال سے کام لیا اور سوار ہو کر لشکر میں گشت لگایا۔ مورچوں کا معائنہ کیا، فوج کو تسلی دی۔ فوج کو یقین دلایا کہ شہزادہ حسن بغاوت کا مرتکب ہوا ہے اس کی سزا اسے سرکار شاہی سے ضرور ملے گی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس بغاوت میں شہزادے کے شریک نہ بنیں۔ ہمیں حکم شاہی کے مطابق شجاع سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے لیے تیاری کریں۔

فوج کو مصروف رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ جنگ چھیڑ دی جائے تاکہ لوگ شہزادے کے فرار کو بھول جائیں۔ اس نے بہار کے صوبے دار داؤد خان کو خط لکھا کہ وہ کمک لے کر فوراً پہنچے۔ اسے یہ خبر بھی مل گئی کہ دربار سے دلیر خان کو متعین کردیا گیا ہے اور وہ روانہ بھی ہو چکا ہے۔

یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ برسات کا موسم سر پر آگیا۔ دریا کی طغیانی، سیلاب اور فوج کی دل شکستگی کے پیش نظر معظم خان کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ وہ اکبر نگر سے تین کوس کے فاصلے پر کسی بلند مقام پر چھاؤنی ڈال دے اور بارش کا موسم گزرنے کا انتظار کرے۔ بارش کا موسم شدت اختیار کر رہا تھا۔ کمک پر آنے والے راستے ہی میں ٹھہر گئے تھے۔ شجاع اس کی بے بسی سے غافل نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ معظم خان کے پاس ابھی اتنی فوج نہیں ہے کہ مقابلے پر آسکے۔

اس سے پہلے کہ تازہ کمک معظم خان تک پہنچے، شجاع نے اپنی فوج کو حرکت کر دیا۔ اس کی فوج دریاؤں کے بیچ پر سوار ہوئی اور چھوٹے جہازوں کے ذریعے اکبر نگر تک دھاوے مارتی رہی اور معظم خان پر کئی اچانک حملے کیے۔ بادشاہی فوج کو دشمن کے مقابلے میں شکست اٹھانی پڑی۔

ان پے در پے شکستوں سے بددل ہو کر شاہی فوج کے قدم اکھڑنے لگے تھے کہ یہ صورت حال دیکھ کر معظم خان قلب لشکر سے نکل آیا اور آگے بڑھ کر حملہ کردیا۔ یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ اس میں شجاع کے کئی نامور امرا یا تو مارے گئے یا زخمی ہوگئے۔ اس کے باوجود شجاع کا پلہ بھاری رہا۔ اسی حال میں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ معظم خان کے پاس اس وقت چونکہ خود فوج نہیں تھی اس لیے وہ کسی بڑی جنگ میں الجھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

دونوں طرف برسات کا موسم گزرنے کا انتظار کیا جارہا تھا۔

شجاع، جہانگیر نگر سے اکبر نگر آکر ٹھہر گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ معظم خان جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ بارش تھمتے ہی جنگوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس نے اس فرصت کا فائدہ اٹھایا اور اپنا وعدہ پورا کردیا۔ شہزادہ سلطان اور عزیز بانو عقد کے بندھن میں بندھ گئے۔

شادی کے ہنگاموں سے گزرنے کے بعد شجاع نے مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ لشکر کو آراستہ کیا اور خشکی کے لیے توپ خانہ ترتیب دیا۔ اس سرزمین پر لڑائی کا دارومدار زیادہ تر دریا پر اور بحری جنگی بیڑے پر تھا لہٰذا چند ہزار اہل کشتی کو اختیار کیا گیا۔

شجاع نے ہدایت کی کہ شہزادہ محمد سلطان چند دن اکبر نگر میں ایام عروسی بسر کرنے کے بعد لشکر میں حاضر ہو جائے اور بادشاہی لشکر پر ہر طرف سے فوج کشی کردی۔

معظم خان کے پاس تازہ کمک پہنچ چکی تھی۔ بہار کا صوبے دار اپنے لشکر کے ساتھ حاضر ہوگیا تھا۔ دلیر خان بھی مع افغانوں کا لشکر لے کر حاضر ہوگیا۔

شجاع کے پاس اگر خاطر میں بارہ ہزار لشکر تھا تو معظم خان کے پاس بھی بہادروں کی کمی نہیں تھی۔ اس کا ثبوت خشکی پر لڑی جانے والی ان جنگوں سے ہوگیا جو چند ہی دنوں کے درمیان لڑی گئیں۔ ان جنگوں میں معظم خان کے کئی آزمودہ افسر اپنی جانوں سے گئے لیکن ہر لڑائی میں شجاع کو شکست ہوئی البتہ ابھی تک اس کا دریائی بیڑا محفوظ تھا اور یہی اس کی اصل قوت تھی۔

معظم خان بڑی سرگرمی سے شہزادہ محمد سلطان کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اسے گرفتار کرکے اورنگزیب کی خوشنودی حاصل کی جائے لیکن لشکر میں اس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ معظم خان حیران تھا کہ شہزادہ کسی محاذ پر نظر کیوں نہیں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ خبر ہی غلط ہو کہ وہ شجاع کے پاس چلا گیا ہے۔ وہ اس خبر سے بے خبر تھا کہ وہ اکبر نگر میں ایام عروسی بسر کر رہا ہے۔ وہ ابھی لشکر میں پہنچا ہی نہیں۔ پھر ایک دن مخبروں کی اطلاع آئی کہ وہ اس فوج کے ساتھ دیکھا گیا ہے جو دریائے گنگا کے دوسرے کنارے پر بلند اختر (شجاع کا بیٹا) کی کمان میں ہے۔ اب معظم خان کی پوری توجہ اس طرف تھی۔

بلند اختر نے ایک ایسے گھاٹ پر توپ خانہ نصب کر رکھا تھا جہاں بعض مقامات پر دریا پایاب تھا۔ شجاع کی فوج اس گھاٹ پر مورچے بنا کر بادشاہی لشکر کے انتظار میں بیٹھ گئی۔

معظم خان نے اپنے ایک امیر آغر خان کو ہراول دستے کا افسر بنا کر اس طرف بھیجا۔ یہ فوج گشت لگا کر دیکھتی پھر رہی تھی کہ دریا کس مقام پر پایاب ہے۔ ایک جگہ لکڑی کے ستون نصب تھے جو نشان دہی کر رہے تھے کہ یہاں دریا پایاب ہے۔ یہاں سے دریا کو پار کیا جاسکتا ہے۔ اس پایابی کے باوجود عالم یہ تھا کہ پانی پیٹ تک چڑھا ہوا تھا۔ اس کے باوجود آغر خان فوج سے آگے نکلا اور اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اس کی ہمت دیکھ کر دلیر خان کو بھی جوش آیا۔ اس نے بھی اپنے ہاتھی کو دریا میں اتار دیا۔ اس کا بیٹا عربی گھوڑے پر سوار ہو کر منظر دیکھ رہا تھا۔ باپ نے ایسا جوش مارا کہ باپ کی پیروی میں وہ بھی دریا میں اتر گیا۔ بس پھر کیا تھا، لشکری ایک ایک کر کے چھلانگیں لگانے لگے۔

شجاع کا چھپا ہوا توپ خانہ اسی وقت کے انتظار میں تھا۔ اشارہ ملتے ہی توپوں نے گولے اگلنا شروع کردیے۔ مورچوں پر متعین بندوقچیوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ شاہی فوج کا حال یہ تھا جیسے کسی کو ہاتھ پاؤں باندھ کر مارا جائے۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ نہیں کرسکتے تھے سوائے اس کے کہ مرتے رہیں، غرق ہوتے رہیں۔ بارود کا دھواں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں غضب یہ ہوا کہ گولوں کی زد میں آکر وہ ستون گر گئے جو پایاب راستے کی نشان دہی کرنے کے لیے لگائے گئے تھے۔ سپاہی اس طرف نکل گئے جہاں پانی کی گہرائی انسانی قد سے بھی زیادہ تھی۔ گولہ باری اس تسلسل سے ہو رہی تھی کہ ایک سپاہی آگے بڑھتا تو دس گولوں کی زد میں آکر زخمی ہوتے تھے اور دریا کی تہ میں اتر جاتے تھے۔ دریا کا پانی خون بن کر بہہ رہا تھا لیکن اب پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں تھی، آگے بڑھتے رہنے ہی میں عافیت تھی۔

بلائیں تھیں جو پیچھے رہ گئی تھیں، کچھ لوگ تھے جو گھوڑوں کو تیراتے ہوئے آگے نکل گئے۔ پیچھے دیکھنے کی فرصت کسی کو نہیں تھی، جو ہونا تھا ہو گیا۔

یہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا کہ کچھ لشکر دریا عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ دشمن کے سوار اور پیادے منتظر تھے کہ گھبرائے ہوئے سپاہیوں کو دریا عبور کرتے ہی تلواروں پر رکھ لیں۔

آغر خان، دلیر خان کے ہاتھی کے آگے گھوڑا دوڑاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ اچانک ایک فیل بان اپنے مست ہاتھی کو دوڑاتا ہوا اس کے مقابل لے آیا۔ آغر خان نے کاوہ دہانے کے بجائے ہاتھی کی سونڈ پر پے در پے کئی حملے کردیے۔ ہاتھی ایسا غضب ناک ہوا کہ گھوڑے کو مع سوار اپنی سونڈ میں لپیٹا اور زمین پر پٹخ دیا۔ آغر خان نے گرتے گرتے گھوڑے کی پیٹھ چھوڑ دی تھی اس لیے گھوڑا الگ گرا، آغر خان اپنے گھوڑے سے دس بیس قدم دور جا کر گرا۔ آغر خان کو سخت چوٹیں آئی تھیں۔ اس کا گھوڑا بھی زخمی تھا لیکن وہ پھرتی سے اٹھا، اس سے پہلے کہ مست ہاتھی اسے کچلتا، وہ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ چاہتا تھا کہ گھوڑے پر دوبارہ حملہ آور ہو لیکن ہاتھی، گھوڑے کی صورت سے ڈرنے لگا تھا۔ آگے بڑھنے کو تیار نہیں تھا۔ آغر خان نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھوڑے کو وہاں سے ہٹا لیا اور ہاتھی کے پیچھے پہنچ گیا۔ فیل بان کے قریب ہو کر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ فیل بان نیچے گر گیا۔ اس کے گرتے ہی آخر خان گھوڑے کی پشت سے اچھلا اور ہاتھی کے سر پر جا بیٹھا۔ ہاتھی جانتا تھا کہ یہ اس کا فیل بان نہیں، وہ کسی صورت قابو میں آنے کو تیار نہیں تھا۔ اتنی دیر میں دلیر خان اپنے ہاتھی کو لے کر اس بے قابو ہاتھی کے پاس آ گیا اور ڈرانے کے لیے اس ہاتھی کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ اپنے مہاوت سے چیخ کر کہا کہ وہ بے قابو ہاتھی کو اپنی تحویل میں لے لے۔ مہاوت نے ہاتھی پر قبضہ جمایا۔ ایک ترکی گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ آخر خان ہاتھی سے گھوڑے پر آ گیا۔ بہادر مغلوں اور پٹھانوں کی بڑی جمعیت اس کے گرد جمع ہوئی۔ اس نے صرف سواروں کو ساتھ لیا اور دشمن کی فوج کے مقابلے کے لیے آگے بڑھ گیا۔

یہ معرکہ ایسا خونریز تھا کہ دونوں طرف کے نامور لوگ اس کی نذر ہو گئے۔ جنگ کا کل وقوع ایسا تھا کہ بادشاہی فوج کا نقصان بہت زیادہ ہوا لیکن جنگیں تو ہمتوں کا کھیل ہوتی ہیں۔ آخر دشمن کا ہراول تاب نہ لا کر میدان سے بھاگ نکلا۔ شجاع کا بیٹا اور اس کے ہمراہ آیا ہوا شہزادہ سلطان بھی ایسا بدحواس ہوا کہ باپ کے پاس جا کر ہی دم لیا۔ شجاع اس وقت قریبی ضلع ''ٹانڈہ'' کی اطراف میں موجود تھا۔

ہراول کے فرار ہو جانے کے بعد اتنا موقع مل گیا تھا کہ شاہی فوج اپنی تھکن اتار سکے۔ اس فتح نے حوصلے بیدار کر دیے تھے۔

جنگ ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا تھا۔ شاہی فوج نے دو تین دن اسی مقام پر رک کر اپنی صف بندی کی اور پھر معظم خان نے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ٹانڈہ کی اطراف میں شجاع کی فوجیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شہزادہ سلطان، عزیز بانو کے ساتھ ٹانڈہ میں موجود تھا اور جنگ کے اتار چڑھاؤ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ جنگ اب عجیب و غریب صورت اختیار کر چکی تھی۔ آمنے سامنے کی لڑائی نہیں تھی کہ دنوں میں فیصلہ ہو جاتا۔ جنگ بڑی ڈھیلوں میں جاری تھی۔ دریا کے پار جنگل میں شاہی افواج کا مقابلہ کر رہے تھے۔

جب کئی مہینے اسی عالم میں گزر گئے تو شجاع نے ایک اہم جنگی چال چلی۔ اس نے دشمن کو دھوکا دیے اور دریا کے دوسرے کنارے پر اٹھانے کے لیے اپنا مستقر بدل لیا۔ فوج کا ایک دستہ ساتھ لیا اور اکبر نگر پہنچ گیا۔ باقی فوج کو بھی ہدایت کی گئی کہ رفتہ رفتہ اکبر نگر پہنچنے کی کوشش کرے۔ شہزادہ سلطان بھی اس کے ہمراہ اکبر نگر پہنچ گیا۔

معظم خان کو علم اس وقت ہوا جب فائدہ ہو چکی تھی۔ تعاقب کرنے کی عاقبت نااندیشی تھی۔ شجاع کی فوج اس علاقے میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مورچے خالی نہیں کیے جا سکتے تھے۔

''شہزادہ سلطان؟''

''وہ بھی شجاع کے ساتھ ہی فرار ہوا ہے۔''

''موقع دیکھ کر کچھ فوج اکبر نگر کی طرف بھیج دی جائے گی لیکن ابھی کوئی خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔''

اب حال یہ تھا کہ ایک طرف ٹانڈہ تھا دوسری طرف اکبر نگر۔ دونوں طرف شجاع کی فوجیں تھیں۔ درمیان میں شاہی فوج تھی۔ اب اگر دو محاذ کھل جاتا تو شاہی فوج دونوں طرف سے گھر کر رہ جاتی۔

جنگ کی خبریں مسلسل اورنگزیب تک پہنچ رہی تھیں۔ شہزادہ سلطان کے شجاع سے مل جانے اور اب اکبر نگر جانے کی خبریں پہنچیں تو بادشاہ نے خود بھی جنگ پر جانا مناسب سمجھا۔

بادشاہ کے کوچ کا غلغلہ بلند ہوا تو لشکر میں اس طرح شادیانے بجنے لگے جیسے شاہی فوجوں کو فتح حاصل ہو گئی ہو۔ شجاع کی فوجوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ حیران و سرگرداں ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایسا کیا واقعہ ظہور میں آیا ہے کہ فتح کی نوید دی جا رہی ہے۔ جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ اورنگزیب نے کوچ کیا ہے۔ اورنگزیب کی دہشت ایسی تھی کہ محض کوچ کی خبر سن کر شجاع کی فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ یہ بزدلی دیکھ کر شجاع کا بیٹا قلب سے نکلا اور فوجوں کو دم دلاسے دے کر لڑنے پر آمادہ کرتا رہا۔

ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ خبر بھی عام ہوئی کہ اس کا بیٹا شہزادہ معظم بھی دکن سے آ کر حاضر خدمت ہوا ہے۔ دونوں باپ بیٹوں کی فوجیں دریائے گنگا کے کنارے ایک منزل پر آ کر ٹھہر گئی ہیں۔

یہ خبریں اکبر نگر پہنچیں تو سب کے ہوش اڑ گئے۔ اسے شجاع کی شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اپنا انجام و عواقب کسی لکھی ہوئی تحریر کی طرح دکھائی دینے لگا۔ عشق کی فراوانی، جوانی کے جوش و جذبے اور ناتجربہ کاری نے اسے شجاع کے دام میں پھنسا دیا تھا لیکن اب جو غور کیا تو اپنی تباہی صاف نظر آئی۔ گوہر مقصود تو ہاتھ آ چکا تھا۔ عزیز بانو اسے مل چکی تھی۔ اب کوئی مجبوری نہیں تھی جو اسے شجاع کے پاس روکے رکھتی۔ وہ وہاں سے جانے کی فکر کرنے لگا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ عزیز بانو اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی جا سکتا تھا۔ وہ ٹانڈہ میں تھی اور شہزادہ اکبر نگر میں۔ شجاع کی اجازت کے بغیر اس کا ٹانڈہ جانا ممکن نہیں تھا اور شجاع کا اجازت دے دینا بھی ناممکن تھا۔

شجاع کو شک ہو گیا تھا کہ شہزادہ اس کا ساتھ چھوڑ دے گا پھر وہ اتنا تنہا ہو گیا تھا کہ شہزادے کو جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو وہ ایک پل کے لیے بھی شہزادے کو خود سے دور نہیں رہنے دیتا تھا۔ کبھی کبھی تو شہزادے کو یہ محسوس ہونے لگتا تھا جیسے وہ شجاع کی قید میں ہے۔ وہ اس قید سے رہائی کے لیے کوشاں تھا کہ قدرت نے خود انتظام کر دیا۔ ٹانڈہ سے قاصد آیا اور اس نے عزیز بانو کی بیماری کی اطلاع دی۔ اس نے وہ رقعہ شجاع کو دکھایا اور اپنی بیوی کی خبر گیری کے لیے ٹانڈہ جانے کی اجازت طلب کی۔ شجاع اب بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ جائے لیکن بیٹی کی بیماری کا سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے اجازت دے دی۔ ٹانڈہ پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ قدرت اس کا واقعی ساتھ دے رہی ہے۔ عزیز بانو بیمار نہیں تھی بلکہ شہزادے کو بلانے کے لیے اس نے یہ بہانہ کیا تھا۔ اپنی بیماری کا خط لکھ دیا تھا کہ وہ گھبرا کر جلد سے جلد چلا آئے۔

''عزیز بانو آپ کے خط نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔''

''آپ اپنے سخت دل کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔''

''آپ کو ایسے بہانے بھی آتے ہیں، یہ تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔''

''غور سے دیکھیے، کیا ہم آپ کو بیمار نظر نہیں آتے؟''

''ہاں، آپ تو واقعی بیمار ہیں۔ ٹھہریے ہم کسی طبیب کو طلب کرتے ہیں۔'' وہ کھڑا ہونے کے لیے بستر سے اٹھنے لگا۔

''شہزادے، ہماری بیماری کا علاج کسی طبیب کے پاس نہیں۔'' عزیز بانو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ہمارا علاج تو یہ ہے کہ ہم آپ کو دیکھتے رہیں اور عمر گزر جائے۔''

''شاہی فوجیں چھاؤنی ڈالے بیٹھی ہیں۔ انہیں اب ہماری جان سے زیادہ ہماری تلاش ہے۔ اس وقت بھی ہم جس طرح آئے ہیں وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ہو گا کہ ہم آپ کے قریب رہیں۔''

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
اندھیری رات کے مسافر 325/-
ثقافت کی تلاش 150/-
قیصر و کسریٰ 380/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
گمشدہ قافلے 350/-
داستان مجاہد 200/-
پردیسی درخت 325/-
یوسف بن تاشفین 325/-
معظم علی 325/-
خاک اور خون 350/-
کلیسا اور آگ 300/-
قافلہ حجاز 350/-
محمد بن قاسم 300/-
پورس کے ہاتھی 180/-
انسان اور دیوتا 280/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-
آخری چٹان 325/-
سو سال بعد 150/-
سفید جزیرہ 225/-
شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
042-37220879
041-2627568
051-35539609
021-2765086
061-4781781
022-2780128

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہمیں بھی اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے چلیے۔''

''میدان جنگ عورتوں کے لیے نہیں ہوتا ہے۔''

''میدان جنگ سے دور لے چلیے۔ کہیں بھی چلیے۔ اب ہم آپ کو اکیلے نہیں جانے دیں گے۔''

''شہزادی، ہم!... بات نہیں؟''

''کنیز کی سماعتیں التجا کر رہی ہیں۔ جو کہنا ہے کہیے۔''

''تنگی وقت یہ ہے کہ اب چچا حضور کی شکست یقینی ہے۔ وہ معظم خاں کا مقابلہ زیادہ دیر تک نہیں کر سکتے۔ جنگ ختم ہونے میں آ رہا ہے کہ خود ابا حضور شاہی فوج کی مدد کو پہنچ گئے ہیں۔ چچا حضور کی شکست کا مطلب ہم سب کی تباہی ہوگا۔''

''ہم کہیں اور کیوں نہیں چلے جاتے۔ کسی گاؤں، کسی بستی میں عام لوگوں کی طرح زندگی گزار لیں گے۔ آپ کی جان تو محفوظ رہے گی۔ میرے جسم پر قیمتی پوشاک نہیں ہوگی لیکن آپ تو ہوں گے۔ میرا لباس تو آپ ہیں۔''

''ہم پاتال میں بھی جا کر رہے تو شاہی فوجیں ہمیں ڈھونڈ نکالیں گی۔ ہم مجرم کہلائیں گے۔ جنگ میں پکڑے ہوئے قیدی نہیں۔ ہمارے لیے کوئی معافی نہیں ہوگی۔ حضرت دارا شکوہ نے بھی ہتھیار رکھ دیے تھے۔ وہ بھی عام زندگی گزارنا چاہتے تھے لیکن کیا ہوا۔ زمین ان پر تنگ کر دی گئی، گرفتار ہوئے اور قتل کر دیے گئے۔ تمہارے عشق میں ہم نے بھی ایک قدم اٹھایا اور فراری کہلائے۔ اب ہمارا بھی اسی طرح تعاقب کیا جائے گا۔''

''تو کیا ہمیں اپنی مرضی سے جینے کا کوئی حق نہیں؟''

''اب تو ہم اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتے۔ یہ بادشاہ دیکھنے میں جتنے بہادر ہوتے ہیں اندر سے اتنے ہی ڈرپوک ہوتے ہیں۔ جو ان کے حکم سے سرتابی کرتا ہے سمجھتے ہیں وہ ان سے ان کا تخت چھین لے گا۔ جو ان کی مرضی کی زندگی نہیں گزار سکتا، یا اسے اپنی مرضی کی موت دیتے ہیں۔ دستور شاہی یہی ہے۔''

''شہزادے پھر ایسا ہے کہ ہم اپنی مرضی کی موت کا انتخاب کرتے ہیں۔ اگر ہم ایک ساتھ جی نہیں سکتے تو کیا ایک ساتھ مر بھی نہیں سکتے۔''

''جان سلطان! ابھی ایک راستہ ہے۔ ہم تمہیں لے کر ابا حضور کی خدمت میں جائیں گے۔''

''کیا وہ معاف کر دیں گے؟''

''ابھی تو امکان ہے کیونکہ شاہی فوجوں کو ابھی فتح حاصل نہیں ہوئی۔ فتح کے بعد اگر ہم وہاں پہنچے تو اسے میری مرضی نہیں، مجبوری سمجھا جائے گا۔''

''میں آپ کی ہمنوا ہوں۔ آپ جو بھی فیصلہ کریں میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''اگر ابا حضور نے ہمیں معاف فرما دیا تو ہم تمہارے والد کی جاں بخشی کی بھی سفارش کریں گے۔''

''میں ان کے پیروں پر سر رکھ کر آپ کی اور اپنے والد کی سفارش کروں گی۔ یاد ہے جب بچپن میں آپ کے ساتھ کھیلتے ہوئے میرے پاؤں میں موچ آ گئی تھی تو میری وجہ سے انہوں نے آپ کو کتنا ڈانٹا تھا پھر میرے کہنے پر ہی آپ کو معاف بھی کر دیا تھا۔ میرے کہنے پر وہ اب بھی معاف کر دیں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اپنا ارادہ کسی پر ظاہر مت کرنا حتیٰ کہ خواجہ سراؤں پر بھی نہیں۔ ہمیں یہاں سے نکلنے میں چند دن لگیں گے۔ اس وقت تک کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔''

☆☆☆

معظم خاں کا ایک امیر اسلام خاں دریا کے دوسرے کنارے پر بادشاہی لشکر لیے پڑا تھا۔ شہزادے نے خفیہ طور پر اسے اپنی آمد کی اطلاع دی اور ہدایت کی کہ ایک فوج کنارے کے قریب متعین رکھے۔

اسلام خاں کی جانب سے مثبت جواب ملنے کے بعد اس نے چند کشتیوں کا انتظام کیا۔ اپنی کشتی میں اشرفیاں اور جواہرات رکھے۔ دوسری کشتیوں میں بھاری ساز و سامان لادا۔ ایک کشتی میں چار خواجہ سراؤں کے ساتھ عزیز بانو کو بٹھایا۔ خواجہ سراؤں اور کشتی چلانے والوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ شہزادہ مچھلی کے شکار اور دریا کی سیر کو جا رہا ہے۔ ان انتظامات کے بعد وہ اس گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا جس پر اسلام خاں اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

یہ کشتیاں اپنے سفر پر رواں دواں تھیں۔ وہ کنارے سے کچھ ہی دور آئے گئے تھے کہ اس نے دیکھا، کچھ کشتیاں اس کے تعاقب میں ہیں۔ یہ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ ان کشتیوں میں کون ہو سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ شجاع کو اس کے فرار کا علم ہو گیا ہے اور ان کشتیوں میں اس کے آدمی تعاقب کر رہے ہیں۔

دوسرے گھاٹ پر اسلام خاں کے فوجیوں نے دیکھا کہ کچھ کشتیاں ہیں جو شہزادے کا تعاقب کر رہی ہیں تو انہوں نے بھی مدافعت کے لیے اپنے بحری بیڑے کو آگے روانہ کر دیا۔ اب دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ اسلام خاں کا بحری بیڑا اس کشتی کی خاص طور پر حفاظت کر رہا تھا جس پر شہزادہ سوار تھا۔ اس افراتفری میں دوسری کشتیاں نظر

اوجھل ہو گئیں۔ چند گولے اس کشتی کے قریب آ کر پھٹے جس پر عزیز بانو سوار تھی۔ شہزادے نے پلٹ کر دیکھا۔ کشتی سے دھواں اٹھ رہا تھا پھر اس نے اسے غرق ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کشتی کو بچانے کے لیے اس نے اپنے پاس بلائے تھے وہ اس کی نظروں کے سامنے ڈوب رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ دریا میں کود پڑے۔ عزیز بانو کو بچا لے یا خود بھی اس کے ساتھ ڈوب جائے لیکن اس وقت تک اسلام خاں کے لوگ اس کی کشتی کو گھیر چکے تھے۔ کشتی میں موجود اس کے خادموں نے بھی اسے پکڑ رکھا تھا۔ اتنی دیر میں گھاٹ آ گیا اور شہزادے کو کشتی سے خشکی پر اتار لیا گیا۔

شہزادے کے کہنے پر چند غوطہ خور پانی میں گئے بھی کہ عزیز بانو کی لاش کو نکالیں لیکن گھنٹوں کی کاوش کے بعد بھی لاش نہیں مل سکی۔

معظم خاں نے شہزادے کے لیے ایک مختصر خیمہ حاضری روانہ کر دیا تھا۔ شہزادے کو وہاں پہنچا دیا گیا۔ اس کی بری حالت تھی۔ بار بار عزیز بانو کو یاد کرتا تھا اور بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔

غرق ہونے والی کشتی پر سوار خواجہ سراؤں میں سے ایک کو بچا لیا گیا تھا جو شہزادے کی تسلی کے لیے اسلام خاں نے اس خواجہ سرا کو شہزادے کے پاس بھیجا اور اس کی زبانی کہلوایا کہ عزیز بانو کشتی کے ساتھ غرق نہیں ہوئی بلکہ شجاع کے آدمی اسے پہلے ہی اپنی تحویل میں لے چکے تھے۔ کشتی پر گولہ باری اس کے بعد ہوئی ہے۔ عزیز بانو زندہ ہے اور اپنے باپ کے پاس پہنچا دی گئی ہے۔

اس اطلاع کے بعد شہزادے کی حالت کچھ سنبھلی۔ وہ اس سے بچھڑ گئی تھی لیکن زندہ تھی۔ دوبارہ ملنے کی امید کی جا سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ معافی ملنے کے بعد وہ لشکر کے ساتھ خود جائے گا اور عزیز بانو کو لے کر آئے گا۔

شہزادے کے یہاں پہنچنے کے تین دن بعد معظم خاں اس سے ملنے کے لیے آیا۔ جب تک شہزادہ لشکر میں تھا اس نے معظم خاں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب حالات نے ایسی کروٹ بدلی تھی کہ شہزادہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ معظم خاں بھی ایسا ظرف تھا کہ شہزادے کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے بزرگانہ شفقت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''معظم خاں، کیا ہمارا قصور ایسا ہے کہ معافی کا منہ نہ دیکھے۔''

''شہزادے سلامت، بادشاہوں کے دل دریاؤں سے بڑے ہوتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ شہنشاہ آپ کی کوتاہی کو درگزر فرما دیں گے۔''

''معظم خاں، ہم نے جو بھی کیا اس کے پس منظر میں ہمارا جذبۂ محبت تھا۔ عزیز بانو ہم سے منسوب تھیں۔ ہماری غیرت کا تقاضا تھا کہ ہم انہیں حاصل کریں۔ خدا شاہد ہے کہ ہمیں نہ تو اقتدار کی ہوس تھی نہ اپنے والد کے خلاف بغاوت کا ارادہ۔ ہم اپنے چچا کے پاس گئے ضرور تھے لیکن ہم نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ گوہر مقصود ملتے ہی ہم واپس آ گئے مگر افسوس کہ عزیز بانو ایک مرتبہ پھر ہم سے بچھڑ گئی۔ ہماری مظلومیت کے صدقے ہمیں معافی ملنی چاہیے۔''

''شہزادہ مکرم، آپ یہ تمام باتیں ایک عرضداشت میں بیان فرما دیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اپنے سفارشی عریضے کے ساتھ اسے بادشاہ کے حضور بھیج دیں گے۔ یہ تک لکھ دیں گے کہ ہماری خدمات کے طفیل آپ کو معافی دے دی جائے۔''

''اگر ہمیں معافی نہیں ملی؟''

''پھر میں وہی کروں گا جو حکم شاہی ہوگا۔ اس سے زیادہ کی توقع مجھ سے نہ رکھیے گا۔''

شہزادے نے عرضداشت لکھ دی۔ معظم خاں نے وعدے کے مطابق اپنی جانب سے شہزادے کے حق میں سفارشی خط لکھا اور یہ دونوں عریضے اورنگزیب کی خدمت میں روانہ کر دیے۔

بادشاہ کی جانب سے فرمان صادر ہوا کہ شہزادے کو حضور شاہ میں روانہ کر دیا جائے۔ معظم خاں نے شہزادے کی خدمت میں مبارکباد پیش کی اور اپنے ایک امیر فدائی خاں کی تحویل میں دے کر ضروری ساز و سامان کے ساتھ روانہ کر دیا۔

اسے جس عزت و تکریم کے ساتھ لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ بادشاہ کی نوازشوں سے فیض یاب ہوا ہے۔ اس کا سابقہ قصور معاف کر دیا گیا ہے۔

وہ ابھی راستے میں تھا کہ گرز برداروں کا داروغہ اللہ یار خان اس کے سامنے آ گیا۔ شہزادہ گرز برداری کے طریقے سے بھی واقف تھا اور اللہ یار بھی اس کے لیے انجان نہیں تھا۔ یہ گرز بتایا ہی اس لیے گیا تھا کہ جب کسی خاص آدمی کی گرفتاری مطلوب ہوتی تھی تو گرز برداروں کو بھیجا جاتا تھا۔ یہ نہایت تیز رفتاری سے سفر کرتے تھے۔ اللہ یار کے پہنچنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ اسے گرفتار کیا جا رہا ہے۔

''اللہ یار، ہمارے لیے کیا حکم ہوا ہے؟''

''آپ کو سر راہ قید میں لے لیا جائے اور دریا کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راستے کشتی پر سوار کر کے سلیم گڑھ (پرانی دہلی کے قلعوں میں سے ایک گڑھی) پہنچا دیا جائے۔"

"کیا تم ہمیں حضور کی خدمت میں پیش کر سکتے ہو؟"

"مجھے صرف یہ کہا گیا ہے کہ آپ کو سلیم گڑھ پہنچا دوں۔"

شہزادے نے گردن جھکا دی۔ اس وقت یقیناً اسے عزیز بانو یاد آئی ہوگی جس نے کہا تھا وہ حضور کے قدموں پر سر رکھ دے گی اور شہزادے کے لیے معافی طلب کرے گی۔ اب اس کے لیے معافی طلب کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ صرف فدائی خان تھے جو اس کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ اللہ یار خان گرز بردار کے ساتھ سلیم گڑھ چلا جائے۔

شہزادہ سلیم گڑھ سے بھی واقف تھا اور وہاں قید ہونے والوں کے نصیبوں کو بھی جانتا تھا مگر کیا کرتا۔ وہ شہزادہ تھا لیکن مجبور بھی تو تھا۔

اس بدنصیب کو سلیم گڑھ پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

شجاع کو پے در پے شکستوں کا سامنا تھا۔ شہزادہ سلطان اس کا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کی چہیتی بیٹی اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکی تھی۔ اس کے محل کی عورتیں اس کے ساتھ دربدر ماری ماری پھر رہی تھیں۔ ہر جگہ سے شکست کی خبریں آ رہی تھیں اور جب اس کا بحری بیڑا بھی تقریباً تباہ ہو کر رہ گیا تو اس کی کمر بالکل ہی ٹوٹ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر فرار کی ٹھانی۔ اس وقت اس کا ہمراز اس کا بیٹا بلند اختر تھا۔ اس نے جب اپنا ارادہ اپنے بیٹے پر ظاہر کیا تو اس نے بھی مصلحت کو آواز دی اور باپ کی رائے سے اتفاق کیا۔

"ہمارے سپاہی حوصلہ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ کسی وقت بھی ہمیں مکمل شکست ہو سکتی ہے۔ پریشانی میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اب مجھے اپنے سپاہیوں پر بھروسا نہیں رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ سامان سمیٹنے کی بھی فرصت نہ ملے، ہمیں کسی محفوظ مقام پر چلے جانا چاہیے تاکہ ہم لشکر کو از سرِ نو ترتیب دے کر دوبارہ مقابلے پر آ سکیں۔"

"اب ہمارے لیے محفوظ جگہ کون سی رہ گئی ہے۔ جب اپنا علاقہ ہی پناہ نہ دے سکا تو کون سا علاقہ ہمارے لیے عافیت ہے گا؟"

"میں نے اسی وقت کے لیے چاٹگام کے راجا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ ہم پر کوئی وقت پڑا تو ہم اس کے علاقے میں پناہ لیں گے۔" بلند اختر نے کہا۔

"اب اور کون سا وقت پڑے گا۔ شکست ہمارے سامنے ہے۔ شاہی فوجیں غالب آ رہی ہیں۔" شجاع نے کہا۔

"اس سے پہلے کہ شاہی فوجوں کو علم ہو، ہمیں یہاں سے نکلنے کا بندوبست کرنا چاہیے۔"

تیاری مکمل کرنے کے بعد اس نے دو کشتیوں میں ساز و سامان بھرا جس میں مرصع آلات، طلائی ظروف، جواہرات، خزانہ اور سلطنت کے شایانِ شان مال و اسباب تھا۔ محل کی عورتوں کو بھی کشتیوں میں سوار کر دیا۔

بارہ ہاتھی جو مال سے لدے ہوئے تھے دریا تک لائے گئے مگر کشتیوں پر بار کرنے سے پہلے ہی بادشاہی افواج تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئیں۔ شجاع تو اپنے اہل خانہ کے ساتھ فرار ہو گیا اور ہاتھیوں پر لدا ہوا اسباب فوجوں نے لوٹ لیا۔

شجاع نکل گیا اور بنگال کا وسیع ملک معظم خان کے لیے چھوڑ دیا۔

شجاع کو اب بھی امید تھی کہ چاٹگام کا راجا اسے پناہ دے گا۔ شاید وہ اس کے پاس رہ کر از سرِ نو ایک لشکر ترتیب دے گا اور اپنا علاقہ دوبارہ حاصل کر لے گا۔

وہ مشکلوں کے پہاڑ عبور کرتا ہوا رخنگ (چاٹگام) کے راجا کے پاس پہنچ گیا اور اس سے گزارش کی کہ وہ اپنے علاقے سے متصل قلعوں میں سے ایک پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دے۔ راجا اب تک اس کی دوستی کا دم بھرتا آیا تھا لیکن اس وقت اس نے آنکھیں پھیر لیں۔

"تم سے میری کوئی ایسی دوستی نہیں کہ تمہاری خاطر شاہی فوجوں کی دشمنی مول لے سکوں۔ تمہیں پناہ دی تو شاہی فوجوں کا رخ میری طرف ہو جائے گا۔ مجھے معاف کرو اور آگے بڑھو۔ میرے علاقے کی زمین تمہارا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔"

"راجا جی، تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ شاہی فوجوں کے آنے سے پہلے میں یہ علاقہ خالی کر جاؤں گا۔"

"وہ تم تو ہو ہی سدا کے بھگوڑے۔ بھاگ سکتے ہو تو ابھی سے کہیں بھاگ جاؤ۔ میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو۔"

"راجا جی، اتنے گھمنڈ میں مت رہو۔ میں تمہیں بتائے بغیر بھی تمہارے کسی قلعے پر قبضہ کر سکتا تھا۔"

"میرے آدمیوں نے چوڑیاں نہیں پہنی ہوئی ہیں۔"

"میرے پاس اب بھی اتنے سوار امیر ہیں کہ تمہارے ویران قلعوں پر قبضہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔"

"شجاع، بہت بھولے ہو تم، میرے علاقے میں ہو۔"

"علاقہ اس کا ہوتا ہے جس کی تلوار تیز ہوتی ہے۔"

"... مکمل دے رہے ہو۔"

"... میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔" شجاع نے کہا اور راجا ... سے باہر آ گیا۔

... ہوئے وہاں گفتگو شجاع نے اپنے ساتھیوں ... اور مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس کے ... نے رائے دی کہ قلعے پر زبردستی قبضہ کر لینا چاہیے ... اس کے حق میں نہیں تھا۔

"میں راجا کی طاقت کا اندازہ نہیں، کہیں ایسا نہ ہو ... مارے جائیں۔ ہمیں راجا کو منانے کے لیے ... کوشش کرنی چاہیے۔"

"راجا ہمارا ہم مذہب بھی نہیں اور فطری طور پر بزدل بھی واقع ہوا ہے اس لیے وہ کبھی تیار نہیں ہوگا۔" شجاع کے بیٹے بلند اختر نے زور دے کر کہا۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگر وہ نہ مانا تو بھی قدم ہم بعد میں بھی اٹھا سکتے ہیں۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ جب تک کوئی انتظام نہیں ہو جاتا ہم یہیں میدان میں پڑاؤ ڈالے رہتے ہیں۔"

"اگر راجا نے اس سے پہلے ہی حملہ کر دیا؟"

"پھر ہم آزاد ہوں گے کہ اس سے مقابلہ کریں۔"

سب لوگوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شجاع کے مشورے کو تسلیم کیا اور یہ طے پایا کہ زبردستی کے بجائے گفت و شنید کا راستہ اختیار کیا جائے۔

راجا کو راضی کرنے کے لیے وہ اپنے امیروں کو اس کے پاس بھیجتا رہا لیکن ہر مرتبہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ راجا اس روز روز کی سفارت سے تنگ آ چکا تھا۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ شجاع کو پناہ دینے کے الزام میں اورنگزیب کی فوجیں کہیں اس پر چڑھائی نہ کر دیں لہٰذا اس نے کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ رات اس میدان میں شجاع کے پڑاؤ کی آخری رات تھی۔ وہ راجا کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد کسی طرف نکل جانے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن تقدیر کوئی اور ہی صورت لے کر آئی تھی۔

رات کے کسی پہر میں راجا کے آدمیوں نے اس کے پڑاؤ کو گھیر لیا۔ اندھیرا ایسا تھا کہ تلواروں کی چمک بھی دکھائی نہیں دی اور ہر طرف خون بکھر گیا۔ کچھ دیر تک چیخوں کا شور بلند ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مقابلے کی نوبت ہی نہیں آئی اور مقابلہ ختم ہو گیا۔ شجاع سخت جان تھا کہ بچ گیا۔ لاشوں کے درمیان سے کچھ اور لوگ بھی زندہ رہے۔ ان

لوگوں کی تعداد بمشکل تیس چالیس ہوگی۔ ان میں امیر قلی بھی تھا جو شہزادہ سلطان کے ساتھ بھاگ کر اس کے پاس آیا تھا اور اب تک اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ شجاع کے بیشتر ساتھی اور اس کے اہل و عیال قتل کیے جا چکے تھے۔ اس کے بیٹے بلند اختر کی لاش اس کے سامنے پڑی تھی۔ اس نے بیٹے کا صدمہ برداشت کر لیا تھا لیکن جب اس بدنصیب کی لاش دیکھی جو اس کی بیوی تھی اور اس کے ساتھ ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی تو اپنے آنسوؤں کو روک نہیں سکا۔

باقی ماندہ ساتھیوں نے اس پر آخری احسان کیا۔ گڑھا کھودا اور تمام لاشوں کو اس میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ شب خون مارنے والوں نے دن کی روشنی میں حملہ کر دیا۔ مقابلے کی سکت کہاں تھی۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی بھی ساتھ نہیں تھا۔ سامنے جنگل تھا۔ وہ اس جنگل میں داخل ہو گیا۔ وہ اس جنگل میں داخل ضرور ہوا تھا لیکن پھر کبھی واپس نہ آ سکا۔ کسی جنگلی قبیلے نے اسے مار ڈالا، کوئی جانور کھا گیا یا ڈاکوؤں نے اسے لوٹ کر قتل کر دیا۔ کچھ خبر نہ مل سکی۔

☆☆☆

حریفان اورنگزیب میں سے دو شہزادے اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ دارا شکوہ اور شجاع۔ دارا شکوہ کا بیٹا سلیمان شکوہ ابھی تک مفرور تھا لیکن اب ہندوستان میں کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اورنگزیب کے کسی مخالف کو اپنی پناہ میں رکھ سکے۔ سلیمان شکوہ سری نگر کے زمیندار کی پناہ میں تھا۔ زمیندار ایک ہی دھمکی میں سلیمان شکوہ کو حوالے کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اورنگزیب کے حکم پر راجا جے سنگھ کا بیٹا کنور رام سنگھ اسے لینے کے لیے گیا اور اس جانے آنے کی دیر تھی کہ اسے بھی اورنگزیب کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ اورنگزیب نے اس کی خطاؤں کو معاف کیا اور اسے قلعہ گوالیار میں قیدی بنا کر بھیج دیا گیا جہاں اس کا چچا مراد بخش بھی قید کی زندگی گزار رہا تھا۔

اورنگزیب نے بظاہر ہر بغاوت پر قابو پا لیا تھا اور چاہتا تھا کہ شاہ جہاں کی نظربندی ختم کر دے لیکن اس سے پہلے وہ یہ چاہتا تھا کہ شاہ جہاں اس کی معافی کا فرمان جاری کرے اور اسے بادشاہ تسلیم کرے۔ اس نے تقصیر کی معافی کے لیے باپ کی خدمت میں کئی خط ارسال کیے لیکن شاہ جہاں اب پتھروں میں قید رہتے رہتے پتھر بن گیا تھا۔ اسے اورنگزیب کا جب بھی کوئی مراسلہ موصول ہوتا، اس کی آواز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے قلعہ اکبرآباد کوچ اٹھا۔

''میں اسے معاف کروں جس نے میرے دارا شکوہ کو مجھ سے چھین لیا۔ جس کی وجہ سے شجاع برما کے جنگلوں میں بے موت مارا گیا۔ مراد قلعہ گوالیار میں بند ہے۔ سلیمان شکوہ دارا کی نشانی تھا، اسے بھی اس نے مجھ سے چھین لیا۔ میرا پوتا شہزادہ سلطان محمد اس لیے اس کے عتاب کا نشانہ بنا ہوا ہے کہ اس نے کچھ روز قلعے میں رہ کر میری خدمت کی تھی۔ وہ ہر اس چیز کو مٹا دینا چاہتا ہے جو مجھے عزیز تھی۔ مجھے ملک ہندوستان بھی عزیز تھا جس میں اب فرقہ واریت پھیلی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے میں اسے بادشاہ تسلیم کروں۔ میں کہتا ہوں مجھے اتنی طاقت مل جائے کہ میں اس سے خاندانِ مغلیہ کی تباہی کا حساب لوں۔''

اس تقریر کے دوران ہی جہاں آرا بیگم کی کمزور آواز بلند ہوئی۔ ''آپ کی ضد بالکل بجا ہے لیکن پھر بھی آپ اورنگزیب کا قصور معاف فرما دیں۔ ایک ملک میں دو بادشاہ رہیں تو تباہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جو بچ گیا ہے وہ بھی لٹ جائے گا۔''

''اس نے کس کو معاف کیا ہے جو میں اسے معاف کروں۔ اسے اس بوڑھے کا اس قدر خوف کیوں ہے؟ اس کا جی چاہتا ہے وہ کر رہا ہے۔''

جہاں آرا مزید سمجھانے کی کوشش کرتی تو اس کے پاس ایک ہی حربہ تھا۔ وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو جاتا یا تلاوت میں مشغول ہو جاتا۔

یہ مراسلت ممکن ہے کوئی نتیجہ سامنے لاتی کہ دکن سے وحشت ناک خبریں آنے لگیں۔ مرہٹہ سردار سیواجی نے اپنے ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔ شاہ جہاں کی بیماری کے زمانے میں اورنگزیب عالمگیر نے بیجاپور کا محاصرہ کر رکھا تھا اور فتح سے قریب تھا کہ دارا شکوہ کے کہنے پر شاہ جہاں نے اس جنگ میں شریک امرا کو واپس بلا لیا تھا اور اورنگزیب کو مجبوراً محاصرہ اٹھانا پڑا تھا۔

اس وقت سے لے کر اب تک وہ حصولِ تخت کی الجھنوں میں ایسا گرفتار ہوا تھا کہ اس طرف توجہ نہ دے سکا۔ اس کے خوف سے مرہٹے دبکے بیٹھے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تو ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ سیواجی کو کھل کر کھیلنے کا اس سے زیادہ اور کیا موقع نصیب ہو سکتا تھا۔ اس نے ہر طرف دست درازیاں شروع کر دیں۔ چالیس قلعے تیار کرائے۔ جزیروں میں بحری قوت کا سامان کیا۔ مرہٹوں کی باقاعدہ فوج تیار کی اور رفتہ رفتہ بیجاپور کے اضلاع پر متصرف ہو گیا۔

اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تیموری حدود حکومت میں بھی دست درازیاں شروع کر دیں۔ یہ خبریں دربار شاہی میں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ اورنگزیب اب تک رقیبانِ سلطنت کے معرکوں میں مشغول تھا لیکن اب مزید وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اورنگزیب نے شائستہ خان امیرالامرا کو ان ہنگاموں کو فرو کرنے کے لیے دکن کی طرف روانہ کیا۔

امیرالامرا حکم شاہی ملتے ہی ''پونہ'' اور ''چاکنہ'' کے ارادے سے جو ان دنوں سیوا کے مستقر اور مرکز بنے ہوئے تھے، روانہ ہوا۔

سیوا ان دنوں ایک مقام ''سوپ'' میں تھا۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ شاہی فوج ''سیوگاؤں'' میں داخل ہوئی ہے، وہ سوپ سے نکل بھاگا۔ امیرالامرا نے بغیر کسی جدال کے قصبہ سوپ پر قبضہ کر لیا۔

سیوا نے اپنا علاقہ خالی ضرور کر دیا تھا لیکن وہ غافل نہیں تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو چھاپے مارنے اور رسد لوٹنے پر مامور کر دیا۔ جیسے ہی رسد اور باربرداری روانہ ہوتی، اس کے آدمی اطراف و اکناف سے نکلتے، قزاقانہ حملے کرتے اور اونٹ، گھوڑے، آدمی جو بھی ہاتھ لگتا، لشکر کے خبردار ہونے تک لے کر نکل جاتے۔ جو شاہی فوج ان کا پیچھا کرتی، کچھ کو زخمی کرتی، کچھ ہلاک ہوتے اور ادھر ادھر منتشر ہو جاتے، یہی منظر کسی دوسری منزل پر دہرایا جاتا۔

ان اذیت ناک حملوں سے گھٹتے بڑھتے، لڑتے بھڑتے شاہی لشکر سیوا پور پہنچا جسے سیوا نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ پھر پونہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر وہاں سے سوار ہو کر قلعہ چاکنہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ یہ قلعہ مضبوط بھی تھا اور مرہٹوں کا گڑھ بھی۔ اسے فتح کر لینے ہی میں سیوا کی شکست تھی۔ بالآخر کئی مہینوں کی کاوش کے بعد یہ قلعہ بھی فتح ہو گیا لیکن سیوا بچ نکلا تھا۔ اس کی سرکوبی کی [illegible] تھی۔

امیرالامرا نے پونہ کو اپنا صدر مقام بنایا اور اس محل میں قیام کیا جو سیوا نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا اور ہر طرف سیوا کے تعاقب کے لیے فوجیں بھیج دیں۔

☆☆☆

معظم خان نے شجاع کے خلاف معرکوں میں جس جی داری کا مظاہرہ کیا تھا اس کے صلے میں بادشاہ نے اسے ''خان خاناں'' کا لقب عطا فرمایا اور بنگال کی صوبے داری مستقلاً اس کے نام کر دی اور اس ولایت کے حکام کے تقرر و تنزل کے سارے اختیارات بھی اسی کو تفویض کر دیے۔

[illegible] جہاں کے سامنے ہی سے آسام کا راجا فتنہ و فساد برپا کر رہا تھا۔ لڑائی بھی ادھوری رہ گئی تھی۔ اس راجا کی [illegible] اتنی جرأت ہو گئی تھی کہ صوبہ بنگال کی سرحدوں پر حملہ [illegible] شاہی علاقے کی مال گزار رعایا کو ہر سال پکڑ کر [illegible] اپنے ملک میں قید کر کے انہیں طرح طرح کی [illegible] دیتا تھا۔ شجاع کی بغاوت کے دنوں میں اس کا [illegible] اور بھی بڑھ گیا تھا۔ معظم خان نے جہانگیر نگر اور بنگال [illegible] متعلقوں کے بندوبست سے فارغ ہونے کے بعد آسام کی مہم پر توجہ دی۔

دربار شاہی سے اجازت ملتے ہی معظم خان (خان خاناں) نے قلعہ گیری کے سامان، توپ خانہ اور بحری بیڑا [illegible] لڑنے کا ساز و سامان تیار کرایا اور اس علاقے کی طرف کوچ کیا۔ وہ آسام کے گھنے جنگلوں میں داخل ہو گیا۔ جنگل اس قدر خوفناک اور دشوار گزار تھے کہ ہوا کو بھی راستہ نہ ملے۔ اس بہادر سپہ سالار نے ان جنگلوں کو صاف کرا کے راستے بنائے اور اونچے پہاڑی دروں پر قبضہ کیا۔

جنگل کا راستہ طے کرنے کے بعد نہایت سخت لڑائیاں لڑیں۔ ان لڑائیوں میں ہزاروں کافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آخر وہاں کے بت خانوں میں اذان اور تکبیر بلند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سے پہلے اس سرزمین میں کبھی اذان کی آواز نہیں گونجی تھی۔

آسام سے متصل ایک اور ریاست کوچ بہار تھی۔ یہاں کا راجا بھیم نرائن تھا۔ یہ بھی کافر تھے اور مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتے تھے۔ آسام کی فتح کی خبر پہنچی تو اورنگزیب نے خان خاناں کو حکم دیا کہ وہ کوچ بہار پر فوج کشی کرے۔ یہ مہم بھی کوئی کم خطرناک نہیں تھی۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے بھی خطرناک جنگلوں سے گزرنا تھا۔ یہ جنگل زہریلے درختوں اور حشرات الارض سے بھرا ہوا تھا۔ یہ سفر بڑا حوصلہ آزما تھا۔ آسمان نے یہ منظر بھی دیکھا کہ خان خاناں، مزدوروں کے ساتھ بیلچہ اٹھائے راستہ ہموار کر رہا ہے۔ اسی جاں فشانی کا نتیجہ تھا کہ شاہی فوج بلائے بے درماں کی طرح بھیم نرائن کے سر پر پہنچ گئی۔ مقابلے کی تاب کہاں تھی۔ وہ تو جنگلوں کے حصار میں محفوظ بیٹھا تھا۔ یہ درخت ہی کٹ گئے تو اس کی حفاظت کون کرتا۔ وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر پہاڑوں پر چلا گیا۔ صدر مقام کسی جنگ کے بغیر شاہی لشکر کے قبضے میں آ گیا۔ ہر جگہ بت توڑ دیے گئے اور اسلامی احکام نافذ کر دیے گئے۔

بھیم نرائن کا بیٹا [illegible] نرائن، خان خاناں کے پاس

Mob: 0300-2219514/0344-2693828
Tel: 021-34519074
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
بذریعہ ڈاک
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام اور پتہ ضرور لکھیں
نوٹس برائے داخلہ
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
[illegible]
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 گلبرگ... کراچی 75080

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آ گیا اور خان خاناں کی تبلیغ پر اس نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے باپ کو گرفتار کرانے میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کی پیشکش کی۔

آسام اور کوچ بہار کے راجا ساجان فرار ہو کر پہاڑوں میں چلے گئے تھے۔ جب تک ان کی گرفتاری عمل میں نہیں آتی، امن و امان قائم نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا اب خان خاناں پہاڑوں اور گھاٹیوں میں انہیں تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

دکن میں بھی صورت حال اس سے مختلف نہیں تھی۔ مرہٹہ سردار سیوا جو بھاگتا پھر رہا تھا۔ امیر الامرا کی مدد کے لیے بادشاہ نے راجا جسونت سنگھ کو بھی دکن روانہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

شہزادہ مراد بخش شاہی کی آرزو کی سزا بھگت رہا تھا۔ کچھ دن سلیم گڑھ میں قید رہنے کے بعد اسے قلعہ گوالیار میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس کی محبوبہ سوبن بھی اس کی درخواست پر قلعہ میں بھیج دی گئی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے اس معزز قیدی کے لیے ایک معقول رقم خرچ کے لیے مقرر تھی جس میں اس کا خاطر خواہ گزارہ ہو رہا تھا۔

یہ قیدی اب تخت کی طرف سے تو مایوس ہو چکا تھا لیکن آزادی کا طلب گار ضرور تھا۔ کئی مرتبہ بادشاہ کے پاس عرضداشت بھیج چکا تھا لیکن بادشاہ کے خیال میں ابھی وقت نہیں آیا تھا کہ اسے رہا کیا جائے۔

اس کی دریا دلی یہاں بھی رنگ دکھا رہی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب اس نے دولت خرچ کر کے اورنگزیب کے بہت سے آدمی توڑ لیے تھے اور پیچھے پیچھے ایک بڑا لشکر تیار کر لیا تھا۔ اس کی پاداش میں اسے قید کیا گیا تھا۔ یہاں بھی اس نے یہی طریقہ کار اختیار کیا۔ قلعے کے اندر جو لوگ خدمت پر مامور تھے۔ انہیں نوازتا رہتا تھا۔ اس کی اس دریا دلی سے اس کے بہت سے ہمدرد پیدا ہو گئے تھے۔ اپنے پاس سے کھانا پکوا کر قلعے کے باہر بھیجتا رہتا تھا۔ ادھر سے گزرنے والے مسافروں تک جب یہ کھانا پہنچتا تو وہ پوچھتے ضرور تھے کہ یہ کھانا کس کی طرف سے ہے۔ انہیں بتایا جاتا تھا کہ شاہ جہاں کا بیٹا، اورنگزیب بادشاہ کا بھائی یہاں قید ہے۔ یہ کھانا اس کی طرف سے کھلایا جاتا ہے۔ ان مسافروں کے دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں اور دلوں میں ہمدردی پیدا ہوتی تھی۔ کچھ لوگ یہ بھی سوچتے تھے کہ اس ان داتا شہزادے کو کسی طرح قلعے سے باہر نکال لینا چاہیے۔ شہزادے کو کچھ علم نہیں تھا، جو کچھ کر رہے تھے اس کے ہمدرد کر رہے تھے۔

ایک دن ایک آدمی آیا جو بظاہر [illegible] کے لیے کہہ رہے کی

صفائی کے لیے آیا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر شہزادے سے بات کی۔

"آپ سے محبت کرنے والے ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ آپ یہاں قید رہیں۔"

"میں بھی یہ کب چاہتا ہوں لیکن کیا کروں قسمت جو دکھا رہی ہے، دیکھ رہا ہوں۔"

"آپ کے بہت سے جاں نثار ہیں جو آپ کو یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔"

"یہ ناممکن ہے۔ دیکھتے نہیں یہاں قدم قدم پر نگرانی کی جاتی ہے۔ میرا کون سا لشکر ہے جو مجھے یہاں سے نکال لے جائے گا۔"

"قلعے کے باہر ایک لشکر تیار ہو چکا ہے جو آپ کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔"

"کیا ان کے پاس اتنے ہتھیار آ گئے ہیں کہ وہ اورنگزیب کا مقابلہ کر سکتا ہے۔"

"ابھی جنگ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"ورنہ ایسی تو میں بھی بہت کر چکا۔"

"آپ کی رہائی کے لیے ایک کمند اور آپ کی رضامندی کی ضرورت ہے۔ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، ایک جگہ کمند لگا دی جائے گی۔ آپ اس کمند کے ذریعے باہر آ جائیں گے۔ یہ انتظام بھی کر لیا گیا ہے کہ آپ کو کہاں رکھا جائے گا۔"

"مجھے یہ خوشخبری کب ملے گی؟"

"شاید کل رات۔"

شہزادے کی سادگی نے یہ سوچا ہی نہیں کہ یہ ایک سازش ہے۔ اس کا بھانڈا پھوٹ بھی سکتا ہے۔ اس نے سازش کرنے والوں سے رابطہ کر لیا۔

اس کے ہمدردوں نے قلعے کی فصیل پر ایک جگہ کمند لگا دی اور خفیہ طور پر مراد کے پاس اطلاع بھجوا دی۔

مراد نے بھی اس اطلاع کو خفیہ رکھا تھا یہاں تک کہ سوبن کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا لیکن جب آدھی رات گزر گئی اور رخصت کا وقت آ گیا تو اس سے رہا نہیں گیا۔ "بے چاری سوبن مجھے نہ پا کر پریشان ہوگی۔ میں اسے بتا کر جاؤں۔ یہ تو میری درخواست پر یہاں رہ رہی ہے۔ جب میں نہیں رہوں گا تو اسے خود بخود رہا کر دیا جائے گا۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ جب وہ باہر آ جائے گی تو میں اسے اپنے پاس بلوا لوں گا۔"

اس نے سوئی ہوئی سوبن کو چپکے چپکے بیدار کیا۔ وہ نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے دیکھا مراد کہیں جانے کے لیے تیار

"شہزادے! آپ اتنی رات گئے کہاں چلے؟"

"ایک جگہ آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔"

"آخر کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ سب بے سدھ سو رہے ہیں۔ پہرے دار تک ہوش میں نہیں ہیں، کون سن لے گا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کوئی جاگ نہ جائے ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"کیسا کھیل؟"

"دیکھو، اس قلعہ سے مجھے نکال لے جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ کمند لگا دی گئی ہے۔ میں اس کے ذریعے باہر چلا جاؤں گا۔ اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ اگر زندگی نے وفا کی اور حالات سازگار رہے تو ہماری پھر ملاقات ہوگی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلو۔"

"اگر تم بھی میرے ساتھ گئیں تو تمہاری بدنامی کی بات ہوگی۔ وہ لوگ جو میری عزت کرتے ہیں، کیا سوچیں گے کہ میں ایک غیر عورت کے ساتھ فرار ہوا تھا۔"

"میں اتنی بری تھی تو مجھے یہاں بلایا کیوں تھا۔"

"تم بری نہیں ہو لیکن میرے ساتھ تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ جب میں نکل جاؤں گا تو یہ لوگ تمہیں خود ہی باہر نکال دیں گے۔ پھر میرے آدمی تمہیں مجھ تک پہنچا دیں گے۔"

یہ سن کر وہ بے وقوف واویلا کرنے لگی۔ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "تم مجھے کس کے سپرد کر کے جا رہے ہو۔ میں بھی ساتھ جاؤں گی ورنہ تمہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔"

شہزادے نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن اس وقت تک محافظ ہوشیار ہو چکے تھے انہوں نے یہ کلمات سن لیے تھے کہ تم مجھے کس کے سپرد کر کے جا رہے ہو۔

سوبن غصے میں تو تھی ہی، ان سے پوچھا تو اس نے سب کچھ بتا دیا۔ محافظوں نے مشعلیں روشن کر کے وہ کمند ڈھونڈ نکالی جس کے ذریعے شہزادے کو باہر جانا تھا۔ قلعے میں سنسنی پھیل گئی۔ محافظوں نے شکر ادا کیا کہ بروقت اطلاع مل گئی ورنہ سب کی گردنیں ماری جاتیں۔ اسی وقت اورنگزیب کو خبر کر دی گئی۔

اورنگزیب اپنے بھائی مراد بخش کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی بادشاہت کو کوئی خطرہ نہیں رہا تھا لیکن اس نئے واقعے نے اسے چوکنا کر دیا۔ اس نے تصویر کا دوسرا رخ دیکھا۔ شہزادہ مراد قلعے سے فرار ہو گیا تو وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ آگرہ سے قریب ہی گوالیار میں تھا اور لشکر ترتیب دے سکتا تھا۔ اس کی گرفتاری کے بعد اس کا جو لشکر منتشر ہو گیا تھا اس کے گرد آ کر جمع ہو جاتا۔ اس کے پاس نہ جانے کہاں سے دولت آ گئی تھی۔ وہ بے دریغ نثار کر رہا تھا۔ توپ خانہ بھی اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ پھر وہ اکبر آباد میں داخل ہوا۔ اس نے شاہ جہاں کو آزاد کرایا۔ شاہ جہاں کو لے کر دہلی کی طرف بڑھنے لگا۔

یہ محض تصور تھا لیکن یہ حقیقت کا روپ بھی تو دھار سکتا تھا۔ خان خاناں اس سے دور تھا۔ امیر الامرا دکن میں سیوا کی بیخ کنی میں مشغول تھا۔ راجا جسونت سنگھ بھی دکن جا چکا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا اسی کو کرنا تھا۔ عقل کا فتویٰ یہ تھا کہ فتنہ و فساد کی جڑ کاٹ دی جائے اور خلق خدا کی فلاح و بہبود کے واسطے شرع کا حکم بھی یہی ہے کہ بانیٔ فساد کو قتل کر دیا جائے۔ شہزادہ مراد نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا تھا۔ اس نے کوئی جنگ بھی نہیں کی تھی کہ اس کا خون مباح ہو جاتا۔ کوئی عذر نظر نہیں آ رہا تھا جسے جواز بنا کر مراد کو قتل کر دیا جاتا اور یہ ضروری بھی تھا۔ اگر اس کے ہمدرد اسے آزاد کرا لیتے تو وہ اس کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ وہ اس کے قتل کے لیے جواز ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے علی نقی کا قتل یاد آ گیا۔ علی نقی، مراد بخش کا دیوان اور مشیر تھا۔ یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب مراد بخش نے شاہ جہاں کی بیماری کا سن کر احمد آباد میں (جہاں کا وہ صوبے دار تھا) اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کر دیا تھا۔

علی نقی ایک دیانت دار اور منتظم آدمی تھا لیکن نہایت سخت گیر تھا۔ کسی کو سزا دینے میں دیر نہیں لگاتا تھا۔ اسی لیے اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ ایسے ہی کسی دشمن نے اس کی طرف سے ایک جعلی خط دارا شکوہ کے نام لکھا۔ اس کی تحریر علی نقی کے "خط" سے ملتی جلتی تھی اور اس میں یہ لکھا گیا تھا کہ وہ بہت جلد دارا شکوہ کے پاس آنے والا ہے۔

اس خط کو لکھنے والے نے ایسی تدبیر کی کہ یہ خط چوکیداروں کے ہاتھ پڑ جائے جو ان دنوں لشکر کی نگرانی اور راستوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ یہ سازش کامیاب رہی اور خط چوکیداروں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس خط کو لا کر مراد بخش کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اس خط کو دیکھ کر اور پڑھ کر اس کا ردعمل وہی ہونا چاہیے تھا۔ اس نے فوراً علی نقی کو طلب کیا۔

طلوع آفتاب کے بعد کا وقت تھا۔ نماز فجر سے نمٹنے کے بعد علی نقی تلاوت کلام پاک میں مصروف تھا کہ شاہی ہرکارے حاضر ہو گئے۔ یہاں تک کہ لباس بدلنے کی مہلت نہ دی اور اپنے ساتھ لے کر چل دیے۔ وہ غریب یہی سمجھا کہ کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت ہی اہم معاملہ درپیش ہوگا جو یوں عجلت میں طلب کیا گیا ہے۔ وہ مشیر تھا۔ مراد بخش ہر معاملے میں اسی سے مشورہ طلب کرتا تھا۔ وہ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مراد بخش برچھی ہاتھ میں لیے کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔

اسے دیکھتے ہی شہزادے نے سوال کیا۔ ”جو شخص اپنے ولی نعمت کے ساتھ نمک حرامی کا ارادہ کرے اس کی سزا کیا ہے؟“

علی نقی کا ضمیر صاف تھا اسے یہ گمان بھی نہیں گزرا کہ یہ سوال خود اس کی بابت پوچھا جا رہا ہے۔ اس نے جواب دیا ”اس کو سخت سزا ملنی چاہیے۔“

”پھر اس خط کے لکھنے والے کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“ مراد بخش نے وہ خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

علی نقی نے اس خط کو غور سے پڑھا۔ اسی کا خط تھا، اسی کے دستخط تھے لیکن ظاہر ہے وہ خط اس نے نہیں لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ خود کو خیانت سے پاک سمجھتا تھا۔ شہزادے کا بزرگ بھی تھا اور اس سے بہت قریب بھی لہٰذا گستاخانہ انداز میں جواب دیا۔

”آفرین ہے اس دشمن پر جس نے یہ سازش تیار کی اور شہزادے کی عقل و دانائی پر افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے سلطنت عطا کی اور اس کو اتنی تمیز نہیں کہ وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں میں فرق کر سکے۔“

مراد بخش پہلے ہی غصے میں بھرا بیٹھا تھا اس گستاخی پر وہ مشتعل ہو گیا۔ ہاتھ کی برچھی علی نقی کے سینے میں گھونپ دی۔

اس واقعے کو کئی سال گزر گئے تھے لیکن اس وقت ضرورت پڑی تو اورنگزیب کو یاد آ گیا۔ اگر علی نقی کے بیٹے اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کریں تو خون کا بدلہ خون کے تحت مراد بخش کے قتل کا فتویٰ لیا جا سکتا ہے۔

اورنگزیب نے علی نقی کے بیٹوں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے باپ کے خون کا دعویٰ کریں۔ بڑے بیٹے نے دعویٰ کرنے سے انکار کر دیا لیکن دوسرا بیٹا تیار ہو گیا۔ بادشاہ نے علی نقی کے بیٹے کو گوالیار بھیج دیا اور فرمان جاری کیا۔

”شرعی ثبوت بہم پہنچنے پر قصاص کی کارروائی کی جائے۔“

علی نقی کے بیٹے نے گوالیار کے قاضی کے سامنے باپ کے خون کا دعویٰ کیا۔ اس دعوے کے جب تمام حقائق بیان کیے جا چکے تو شہزادہ مراد بخش کو بھی عدالت میں طلب کیا گیا۔ مراد بخش کو یہ سمجھنے میں کیا دیر لگتی کہ گڑے مردے کیوں اکھاڑے جا رہے ہیں۔ کیا فیصلہ کر لیا گیا ہے جس پر صرف عمل کرنا باقی ہے۔ اس نے اپنا قتل کا اقرار کر لیا لیکن یہ کہنا بھی ضروری سمجھا۔

”اگر حضرت خلافت پناہ اپنے قول و قرار کو ملحوظ رکھ کر مجھے مراد کے خون سے ہاتھ اٹھا لیتے تو ان کی وجاہت کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ تاہم اگر میرے وجود بے سود کو مٹانے ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس قسم کے آدمیوں سے میرا مقابلہ کروا کر کیوں ذلیل کرتے ہیں۔ جو جی میں ہے کر گزریں۔“

قاضی نے سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ قاضی کے حکم سے دو جلاد آگے بڑھے۔ تلوار کے دو ہاتھ مار کر شہزادے کو قیدِ زنداں اور قیدِ حیات دونوں سے نجات دلا دی۔ قلعہ گوالیار میں دفن کر دیا گیا۔

کسی نے تاریخ کہی ”آہ وائے بہر بہانہ کشتہ“
(افسوس کسی نہ کسی بہانے قتل کر دیا)

☆☆☆

کوچ بہار اور آسام دونوں جگہوں پر قبضہ تو ہو گیا تھا لیکن دونوں جگہوں کے راجاؤں کی گرفتاری میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی جبکہ یہاں کی آب و ہوا ایسی تھی کہ لوگ دھڑا دھڑ بیمار ہو رہے تھے۔ بارش کے ختم ہونے کے بعد یہاں کی آب و ہوا بڑی خراب ہو جاتی تھی۔ خاص طور پر ان علاقوں اور کوہستانوں میں جہاں زہریلے درختوں کی کثرت ہوتی تھی کیونکہ بارش میں یہ درخت گیلے ہو جاتے تھے پھر جو بارش ہوتی تھی تو ان درختوں کا اثر ہوا میں سرایت کر جاتا تھا۔ اس کے سبب مسافر جو وہاں کی آب و ہوا کے خوگر نہیں تھے، مر جاتے تھے۔ ندیوں کا پانی تک زہریلا ہو جاتا تھا۔

اس موسم کا اثر شاہی لشکر پر بھی ہوا۔ طرح طرح کی بیماریاں پھوٹ پڑیں۔ ایک طرف یہ بیماریاں تھیں، دوسری طرف اناج کی قلت تھی۔ غذا کی کمیابی نے ضعف و کمزوری میں اضافہ کر دیا تھا۔ جانور تک ذبح کرنے کی نوبت آ گئی۔ فکر یہ ہونے لگی کہ اگر تمام جانور کھا لیے گئے تو واپسی کے لیے باربرداری کے جانور بھی میسر نہیں آئیں گے۔ خان خاناں خود بھی کسی موذی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا لیکن وہ کسی طرح سے اپنا مرض چھپا رہا تھا۔ ایسے میں آسام کے با اثر لوگوں کی مدد سے صلح کی بات چیت ہوئی۔ صلح کی شرط میں قرار پایا کہ راجا ایک لاکھ بیس ہزار تولہ چاندی اور بیس ہزار تولہ سونا، پچاس ہاتھی اور راجا کی بیٹی بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے گا۔

اس وقت چونکہ بڑے بڑے سردار اور امیر واپسی کے لیے تنگ کر رہے تھے، خود خان خاناں جان لیوا مرض میں مبتلا تھا لہٰذا اس پیشکش کو قبول کر لیا گیا۔

کوچ بہار میں بھی بغاوت ہو گئی تھی جیسا اوپر بتایا گیا کہ قتل کر کے لشکر کوچ بہار کی دوبارہ تسخیر کے لیے ... خان خاناں کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ ... علاج کی حدوں سے گزر چکا تھا۔ جب امید ... ہونے لگی تو اس نے باشندوں امیروں کو جمع کیا اور ... ان کے ہاتھ میں دے دی۔

لشکر کوچ بہار کی آخری سرحد پر خضر پور پہنچا تھا کہ خان خاناں دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔

☆☆☆

امیر الامرا شائستہ خان، پونا کے اس محل میں قیام پذیر تھا جو سیوا جی مرہٹے نے خاص اپنے لیے تعمیر کرایا تھا۔ اب وہ پہاڑوں اور کھائیوں میں چھپتا پھر رہا تھا۔ شاہی فوجیں اسے گرفتار کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ پونا شہر فوجی نگرانی میں تھا۔ کوئی شخص، خاص طور پر مرہٹے ہتھیار باندھ کر داخل نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ہتھیاروں کے بغیر بھی اجازت نامہ لیے بغیر شہر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

سیوا جی جب بھاگتے بھاگتے تھک گیا تو اس نے اپنے قدیم طریقے سے کام لیا۔ شب خون کا منصوبہ بنایا اور اپنی جمعیت کے پیدل دستے کے کچھ آدمیوں کو کوتوال کے پاس بھیجا۔ ان لوگوں نے شادی بیاہ کا بہانہ بنا کر دو سو مرہٹوں کے لیے شہر میں داخلے کا اجازت نامہ لے لیا اور وہ ایک فرضی دلہا کو گھوڑے پر بٹھا کر ڈھول تاشے بجاتے ہوئے رات کے اول حصے میں شہر میں داخل ہو گئے۔ پھر یہ بٹے شہر کے ایک حصے میں جمع ہو گئے اور ہتھیار باندھ کر جمع ہو گئے۔ شائستہ خان مرہٹوں کی طرف سے اتنا بے فکر ہو چکا تھا کہ ان کے شہر میں داخل ہونے کے بعد ان کی نگرانی کا کوئی بندوبست ہی نہیں کیا۔

جب دو تہائی رات کی نوبت بجی تو مرہٹے چھپتے چھپاتے اندھیرے کی چادر اوڑھے محل کی طرف رینگنے لگے۔ یہ لوگ اس محل کی ایک ایک اینٹ سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ باورچی خانہ محل کی دیوار سے متصل ہے۔ یہاں ایک چھوٹا دروازہ ہے جسے مٹی اور اینٹوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے وہ دروازہ تلاش کیا اور نقب لگا کر باورچی خانے میں داخل ہو گئے۔

رمضان کا مہینا تھا اس لیے چند باورچی سحری کے انتظام کے لیے جاگ گئے تھے۔ کچھ سو رہے تھے۔ ان مرہٹوں نے باورچیوں پر حملہ کر دیا۔ زخمیوں کی دبی دبی آوازوں کا شور بلند ہوا تو محل کا ایک آدمی جس کا حجرہ باورچی خانے کے برابر میں تھا، جاگ گیا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور امیر الامرا کو ان آوازوں سے باخبر کیا۔ امیر الامرا ہنسنے لگا۔

”باورچی سحری پکانے کے لیے اٹھے ہوں گے۔“

”چیخوں کی آوازیں آ رہی ہیں جیسے کوئی نقب لگا رہا ہو۔“

”باورچی دیگچیں صاف کر رہے ہوں گے۔“

تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ چند کنیزیں دیوار میں نقب لگنے کی اطلاع لے آئیں۔ اس اطلاع کے بعد امیر الامرا گھبرا گیا۔ تیر کمان لے کر باہر نکل آیا۔ اتنی دیر میں مرہٹے اندر آ چکے تھے۔ امیر الامرا نے ان میں سے ایک پر تیر چلا دیا مگر ایک مرہٹہ قریب آ گیا۔ اس نے ایسی تلوار چلائی کہ امیر الامرا کا انگوٹھا کٹ گیا۔ مرہٹے اتنا گھبرا گئے تھے کہ پانی سے بھرے حوض میں گر گئے۔ کنیزوں نے یہ موقع غنیمت جانا اور زخمی شائستہ خان کو وہاں سے ہٹا کر محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔

مرہٹوں کے دوسرے گروہ نے چوکی خانہ پر حملہ کر دیا اور سپاہیوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ مرہٹوں نے محل کے تمام دروازے بند کر دیے اور قتل عام شروع کر دیا۔ اس حملے میں شائستہ خان کا بیٹا مارا گیا۔ اس شب خون میں حرم خاص کی دو عورتوں کو بھی ہلاک کیا گیا۔

اس خون خرابے کے بعد مرہٹے محل سے باہر نکل گئے۔ واقعے کی خبر بادشاہ کو ہوئی تو سخت برہم ہوا اور اسے امیر الامرا کی بے احتیاطی سے تعبیر کیا۔ امیر الامرا کو معزول کر کے شہزادہ معظم کو اس مہم پر مامور کر دیا۔ امیر الامرا کے ساتھ اتنی رعایت کی کہ اسے بنگال کا صوبے دار بنا کر بھیج دیا۔

اس واقعے کے بعد سیوا جی نے کچھ زیادہ ہی ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیے۔ بندرگاہ سورت کے متوازی ساحل سمندر پر چیول اور پال ناٹی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ جو جہاز کعبۃ اللہ کی طرف جاتے تھے وہ ان کو لوٹ لیتا تھا۔

عالمگیر نے مہاراجا جے سنگھ کو جو راجپوت ہے پور کا راجا تھا اور سپہ سالاری کا منصب رکھتا تھا، اس مہم پر مامور کیا۔ فوج کا ہمراہ دلیر خان کو مقرر کیا۔ راجا جے سنگھ اورنگ آباد پہنچا اور شہزادہ معظم کے پاس باریاب ہوا۔

شہزادہ معظم سیوا جی کی فتنہ انگیزیوں سے پریشان بیٹھا تھا کہ راجا کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ راجا اس سے ملاقات کو آ گیا۔ سیوا جی کی رام کہانی اس کے سامنے پیش کی گئی۔ معلوم یہ ہوا کہ راج گڑھ کو اس نے دارالسلطنت بنا لیا ہے جہاں اس کا سکہ بھی جاری ہو گیا ہے۔ رودر مال اور پورندھر دو مضبوط قلعے ہیں جہاں اس کے تمام اہل و عیال اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رشتہ دار ہیں۔ اگر ان قلعوں پر قبضہ کرلیا گیا تو سیوا کی کمر ٹوٹ جائے گی۔

نقشے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ شہزادہ معظم، دلیر خان اور راجا جے سنگھ ان نقشوں پر جھکے ہوئے تھے۔ فوجوں کی روانگی کے راستے اور پڑاؤ کے مقامات کا تعین کیا جارہا تھا۔ اس مجلس میں ایک مقامی مرہٹہ بھی شامل تھا جسے پیسے دے کر خرید لیا گیا تھا۔ یہ شخص ان غیر معروف اور خفیہ راستوں سے واقف تھا جو عام گزرگاہ نہیں تھے۔ اس نے کئی ایسی معلومات فراہم کیں جن سے یقین ہوگیا کہ فتح مسلمانوں کا مقدر ہوگی۔

دلیر خان روانہ ہوا تو وہ مرہٹہ بھی بھیس بدل کر ساتھ تھا۔

دلیر خان پانچ مہینے کی مدت میں یلغار کرتا ہوا وجرہ رودر مال اور پورندھر کے قلعوں کے درمیان پہنچ کر قلعوں کو فتح کرنے کی تدبیر کرنے لگا۔

وہ قلعہ رودر مال کا محاصرہ کرچکا تھا کہ راجا جے سنگھ بھی پہنچ گیا۔ اس کے پہنچنے کے بعد محاصرہ سخت ہوگیا۔ چاروں طرف سے حملے ہونے لگے۔

شاہی لشکر گولہ باری اور آتش باری کی آڑ لے کر مسلسل آگے بڑھتا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ قلعے کے ایک برج کو بارود سے اڑا دیا گیا اور لشکری یہاں تک پہنچ گئے۔ سیوا نے دیکھا کہ اب قلعہ پورندھر بھی فتح ہوجائے گا جس میں سیوا کے تمام اہل و عیال محصور تھے۔ مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی لیکن راجا جے سنگھ کو سیوا کی مکاری کی وجہ سے اعتبار نہیں تھا اس لیے حکم دیا کہ حملہ اور سخت کردیا جائے۔ سیوا نے جو یہ صورت دیکھی تو چند برہمنوں کو لے کر قلعے سے باہر نکل آیا۔ سیوا کا حال یہ تھا کہ بدن پر کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے راجا کے سامنے کھڑا تھا۔

”ادنیٰ گناہ گار غلاموں کی طرح حاضر ہوا ہوں۔ اب آپ کو اختیار ہے، مار دیجیے یا چھوڑ دیجیے۔ تمام بڑے بڑے قلعے پیش ہیں۔ میرا بیٹا سنبھاجی ملازمان شاہی میں داخل کیا جائے۔ میں مطلق احسان کی قلعے میں بسر کروں گا لیکن جب بھی ضرورت ہوگی فوراً حاضر ہوجاؤں گا۔“

جے سنگھ نے اس کی معافی قبول کی اور دلیر خان کو کہلا بھیجا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔

دلیر خان نے اپنی طرف سے تلوار، دو عربی گھوڑے مع ساز طلائی سیوا کو عنایت کیے۔ اپنے ہاتھ سے سیوا کی کمر میں تلوار باندھی لیکن سیوا نے تھوڑی دیر بعد تلوار کھول کر رکھ دی۔

”میں بغیر ہتھیار کے خدمت گزاری کروں گا۔“

اس سے پہلے جے سنگھ نے سیوا کی معافی کے لیے دربار شاہی میں خط بھیجا تھا چنانچہ وہاں سے فرمان اور خلعت آگیا۔ سیوا کو پہلے خلعت اور فرمان قبول کرنے کے آداب سکھلائے گئے چنانچہ فرمان کے استقبال کے لیے سیوا تین کوس تک پیدل گیا اور آداب تسلیمات بجالا کر جاں بخشی کا فرمان اور خلعت حاصل کی۔

قلعوں کی سپردگی کے متعلق عذر معذرت قیل و قال کے بعد طے پایا کہ وہ اپنے 35 قلعوں میں سے 23 قلعوں کی چابیاں دے دے گا اور چالیس لاکھ روپے کا محصول جمع کرا دے گا۔ بارہ چھوٹے کم آمدنی والے قلعے اس کے قبضے میں رہیں گے اور اس کا آٹھ سالہ بیٹا سنبھا جی لشکر کے ساتھ حضور میں جائے گا۔ سیوا اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہے گا لیکن جس وقت بھی اسے بادشاہی کام پر طلب کیا جائے گا وہ حاضر ہونے کا پابند ہوگا۔

اس معاہدے کے بعد اس کو خلعت، گھوڑا، جیغہ، تلوار اور ہاتھی دیا گیا اور ہتھیار باندھ لینے کی فرمائش کی اور اس کے بیٹے کو پنج ہزاری کا منصب اور اذن تسلیمات دیا گیا۔

☆☆☆

قلعہ اکبر آباد میں معمول سے زیادہ خاموشی تھی۔ روشنیاں روشن ہوئی تھیں لیکن کوئی اندھیرا تھا جو امڈا چلا آرہا تھا۔ مجرموں سے نظر بندی کی سختیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ قلعے میں سرکاری ملازموں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ شاہی ملبوسات، سامان آرائش، ظروف، جواہرات کے کمرے سربمہر کردیے گئے۔ یہ کمرے صرف اسی وقت کھولنے کا حکم تھا جب اورنگ زیب کا حکم ہو اور اس کے با اختیار افسر موجود ہوں۔ صرف خادم کرم اور اعلیٰ کو شاہ جہاں سے ملاقات کی اجازت تھی اور وہ بھی اورنگ زیب کے خاص آدمیوں کی موجودگی میں۔

شاہ جہاں اس وقت ایک نیم تاریک کمرے میں موجود تھا۔ پچھلے دونوں سے وہ اسی تکلیف میں مبتلا تھا جو کچھ سال پہلے سے لاحق ہوئی تھی۔ یہی وہ بیماری تھی جس کو بہانہ بنا کر شہزادوں کے درمیان خون ریز جنگیں شروع ہوئی تھیں یعنی پیشاب رک گیا تھا۔ شاہ جہاں سخت تکلیف میں تھا۔

”اے خدا اب میرا کون سا شہزادہ بچا ہے جس کے قتل کا سامان کرنے کے لیے تو نے مجھے بیمار ڈال دیا۔ میں نے اپنے جوان بیٹوں کی موت کے صدمے سہے ہیں۔ اف یہ کیسی کڑی تکلیف مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ موت

سونا گھاٹ کا پجاری، انکا، اقابلا...
جیسی یادگار اور سدا بہار داستانیں جو آج بھی قارئین کے دلوں میں زندہ ہیں
دل ربا، پُر تحیر، پُر تجسس اور سنسنی خیز کہانیوں کے خالق
انوار صدیقی
کے قلم سے
ایک نئی
سلسلے وار
دلچسپ کہانی
کشکول
بہت جلد ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ میں پیش کی جارہی ہے
ازل سے برسرِ پیکار، خیر و شر کی متضاد قوتوں کی آویزش کی داستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی دعا کرنا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا لیکن میں یہ دعا تو کر سکتا ہوں کہ مجھے اس تکلیف سے نجات دے۔''

بندرا بن جراح ابھی ابھی دیکھ کر گئے تھے۔ ان کی دوا سے اتنا ہوا تھا کہ تکلیف کا احساس زائل ہو گیا تھا۔ اسی وقت کسی نے آکر بتایا کہ سید محمد قنوجی تشریف لائے ہیں۔ سنبھل کر بیٹھنا چاہا لیکن نقاہت نے اٹھنے نہیں دیا۔

سید محمد قنوجی زاہد و متقی اور عالم فاضل شخص تھے۔ شاہجہاں کے پاس پابندی سے حاضر ہوتے تھے اور قرآن حکیم کے نکتے اور حدیث رسول کے رموز بیان فرماتے تھے۔

سید محمد قنوجی نے خوش الحانی سے ایک سورت تلاوت فرمائی اور پھر اس کی تشریح و تفسیر بیان کی۔ درمیان میں احادیث مبارکہ بھی بیان ہوتی رہیں۔ قریب دو گھنٹے بعد وہ اٹھ کر گئے تو جہاں آرا بیگم کمرے میں تشریف لائیں۔ خیر و عافیت دریافت فرمائی۔ باپ کا حکم ہوا کہ "کیمیا اکبری" سے کچھ اقتباسات پڑھ کر سناؤ۔ سعادت مند بیٹی نے اقتباسات پڑھ کر سنانے شروع کیے لیکن تھوڑی دیر میں محسوس کر لیا۔ بیٹی سے بہانہ کیا کہ نیند کا غلبہ ہے اور آنکھیں بند کرلیں۔ جہاں آرا کچھ دیر سرہانے بیٹھی بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی، پھر اٹھ گئی اور اسی خواجہ سرا کو اندر بھیج دیا جو شاہ جہاں کے سرہانے بیٹھا جاگا کرتا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کسی زحمت اٹھانی نہ پڑے۔

روز بروز تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔ تکلیف بھی ایسی کہ دیکھنے والوں کے ہاتھ پاؤں پھولے جارہے تھے۔ اطبا ہر وقت سرہانے بیٹھے رہتے لیکن حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ مسلسل تکلیف اور قلت غذا سے کمزوری ایسی ہوگئی کہ بستر سے اٹھنا تو دور کروٹ بدلنا بھی مشکل ہوگیا۔ آخر نویں دن پیشاب کی تکلیف رفع ہوگئی۔ درد میں بھی کمی آگئی۔ یہ امید ہونے لگی کہ شاہ جہاں اب آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے لگے گا لیکن یہ چراغ سحری تھا جو بھڑک رہا تھا۔ اگلی منزل بجھنے کی تھی۔

پندرہ دن کی صبر آزما تکلیف نے طاقت سلب کرلی تھی۔ شہزادی جان کو ایسی لگی تھی کہ ہر دم منہ پھیر کر گزر رہی تھی۔

اقربا تو آس لگائے بیٹھے تھے لیکن خود شاہ جہاں کو احساس ہو گیا تھا کہ رحمت پروردگار میں داخل ہونے کا وقت آپہنچا۔ تجہیز و تکفین کا سامان خود ترتیب دیا۔ شہزادی جہاں آرا بیگم کو دعا دی کہ ان آٹھ برسوں میں وہ ایک پل کے لیے بھی ان کی خدمت سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ شہزادی کو ہدایت کی کہ میرے بعد اکبر آبادی بیگم اور دیگر بیگمات کا خیال رکھنا۔ بانو بیگم کی دل جوئی سے غافل نہ ہونا کیونکہ میری اولادوں میں سب سے بڑی ہے۔

جہاں آرا بیگم ان ہدایات کو دل میں جگہ دیتی رہی لیکن پھر چونکہ اس کا دامن صبر لبریز ہو گیا۔ جانتا تو سب ہی کو ہے، ابا کا وہ شہنشاہ ہند ہوتے ہوئے آٹھ سال سے قیدی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اب بے بسی کی موت نے اسے رلا دیا۔

''شہزادی! تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ تیرے باپ کو قید سے رہائی مل رہی ہے۔''

''میں اکیلی بھی تو رہ جاؤں گی ابو۔''

''تو اکیلی کہاں ہے۔ تیرے تین بھائی تجھ سے بچھڑ گئے لیکن ایک بھائی شہنشاہ ہندوستان بھی تو ہے۔ اس کی دشمنی مجھ سے ہے لیکن تو اس کی بڑی بہن ہے۔ جب میں نہیں رہوں گا تو وہ تجھ پر نوازشوں کی بارش کردے گا۔''

یہ جملے ایسی بے بسی سے ادا ہوئے تھے کہ شہزادی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ تمام اہل حرم میں کہرام مچ گیا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

شہزادی کو ذرا ہوش آیا تو بہن ہونے کے فرض نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ زندہ بھائی کا خیال آیا۔ اس کی عاقبت خراب نہ ہو۔ قریب بیٹھی باپ پر جھک گئی۔

''ابو جان! ہم آپ سے ایک التجا کریں؟''

''میں بچوں کا ہمیں نے خدمت کی اجرت ادا کر دی۔''

''اورنگزیب یہاں موجود نہیں لیکن اس کے معافی نامے اب بھی آپ کے سرہانے پڑے ہیں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ آپ اسے معاف فرما دیں۔''

''شہزادی! ہم سے جو چاہو مانگ لو اسے معاف کر دینا ہمارے اختیار میں نہیں۔ اس نے ارجمند بانو کے تین بیٹوں کو قتل کیا ہے۔ اسے تو وہی معاف کرسکتی ہے۔''

''ہم آپ کی زبان سے سننا چاہتے ہیں۔''

''ہماری زبان ہمارے کہنے میں نہیں۔''

''اورنگزیب نے جو کیا وہ اس کی مجبوریاں تھیں۔ بعض اوقات آدمی وہ کر بیٹھتا ہے جو وہ نہیں چاہتا۔ اورنگزیب کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ اسے معاف فرما دیں۔''

''اورنگزیب خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسی بہن ملی ہے۔ ہم تمہاری خاطر اس کے قصوروں کو معاف کرتے ہیں۔ کاش وہ آجاتا۔ ہم اسے دیکھ لیتے لیکن وہ نہیں آئے گا۔ بڑا ضدی ہے وہ۔''

رزق اللہ خان ولد مقرب خان، بندرا بن جراح اور

...آ چلے تھے۔ خواتین نے پردہ کیا اور یہ حضرات ... سانسوں کو گننے میں مشغول ہوگئے۔ ... تشریف لے آئے۔ کمزور آواز میں حکم ... یٰسین پاک کی سورت پڑھو۔''

زبان مبارک سے ادا ہوا۔ ''اے اللہ میرے دنیاوی گناہوں کو معاف فرما دے اور میری آخرت کو سنوار دے۔''

پیر کی رات گزر رہی تھی کہ خواجہ سراؤں کی آہ و بکا نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ جہاں آرا تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اہل ... اپنے اپنے حال کو بے ... کوئی کسی سے نہیں پوچھ رہا تھا کہ ... ہوا ہے، پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جو ہو گیا تھا وہ سب معلوم تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جنازہ شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ اٹھایا جاتا۔ خاص و عام، سب جنازے میں شریک ہوتے۔ ارکان دولت اسے دوش بدوش لے چلتے۔ آگرہ کے تمام مشہور عالم فاضل، پارسا، عابد و زاہد ننگے سر ننگے پاؤں قرأت کرتے۔ کلمہ شہادت کا غلغلہ آسمان تک پہنچتا۔ جنازے کے دائیں بائیں خدام شاہی اشرفیاں بکھیرتے ہوئے چلتے۔ محتاجوں کی جھولیاں بھر جاتیں۔ مفلسوں کو فقر و فاقے سے نجات مل جاتی لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اورنگزیب اس وقت دہلی میں تھا اور قلعہ شاہی پر جہاں آرا کا کچھ اختیار نہ تھا۔ تمام کاموں کا سررشتہ سرکاری ملازموں کے ہاتھ میں تھا۔

جنازہ کسی مفلس کی برات کی طرح اٹھا۔ آہوں اور سسکیوں کے سوا لٹانے کو کچھ نہیں تھا۔ پچھلے پہر شاہ برج کے زینے سے شاہ جہاں کی لاش کو تاج محل میں پہنچا دیا گیا۔ اس کی محبوبہ ارجمند بانو بیگم کی قبر سے ملی تھی۔ اس کی تنہائی دور ہوگئی۔ روضہ تاج محل میں دو قبریں بن گئیں۔

جہاں آرا بیگم کی زبان پر بے اختیار یہ نوحہ جاری ہوگیا۔

''اے آفتاب تاباں تو نظر سے اوجھل ہوگیا۔ اس شب فراق کی سحر کب ہوگی۔

اے بادشاہ زمانہ، اے قبلہ عالم ذرا چشم کرم سے میری طرف نظر کر۔ غم و الم کے سبب میں بانسری کی طرح نالہ و فریاد کرتی ہوں۔ شمع کے مانند جلتی ہوں۔ سر سے دھواں اٹھتا ہے اور حسرت و افسوس کے سوا مجھے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

☆☆☆

اورنگزیب نے علالت کی خبر سنتے ہی شہزادہ محمد معظم کو عیادت و دریافت حال کے لیے اکبر آباد روانہ کر دیا تھا۔ ابھی شہزادہ راستے میں تھا کہ شاہ جہاں کے رحلت کر جانے کی

گرمی اور گرم بازاری

اس بار قیمتوں کی گرم بازاری کا یہ عالم ہے کہ موسم کی گرمی کو بھی پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ موسم کی گرمی سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو لو لگنے سے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد یا چند گھنٹوں کے بعد ہوش میں آجاتا ہے مگر قیمتوں کی گرم بازاری کی لو جس کو لگ جاتی ہے وہ ہوش و حواس ہی سے جاتا رہتا ہے۔ پھر یہ لو ایسی ہوتی ہے جو صرف ایک بار نہیں لگتی بلکہ ہر روز لگتی ہے۔ آپ کچھ نہ کچھ تو خریدیں گے ہی۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر تو زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ نے یہ منطق کر بھی لی تو بیوی بچوں کا کیا کریں گے؟ اتنے پتھر کہاں سے لائیں گے۔ وہ بھی تو آج کل اتنے سستے نہیں ہیں۔

اقتباس: سرخ، سفید، سیاہ از شفیع عقیل

اطلاع ملی۔

یہ خبر جونہی دہلی پہنچی اورنگزیب اکبر آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔

تاج محل کا بھاری دروازہ کھلا۔ غلاموں اور ملازمان شاہی کی قطاریں باہر رکی ہوئی تھیں۔ اورنگزیب تنہا مقبرے میں داخل ہوا۔ پاپوش اتارے، ننگے سر باپ کی قبر کے سامنے کھڑا ہوا تھا پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ عظیم المرتبت کا والی شہنشاہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگزیب عالمگیر بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ پھر اس نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ بڑی دیر تک قبر پر ساکت بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر واپسی کے لیے چل دیا۔

وہ اس عظیم مقبرے کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور اب بھی کیا دیکھ رہا تھا۔ اس نے صرف باپ کی قبر کو دیکھا تھا جو ماں کی قبر پر حاضری دے رہی تھی۔ اسے پتھر کی اس عمارت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

باپ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ جہاں آرا کے پاس تعزیت کے لیے گیا۔ جہاں آرا بیوہ کی حالت میں غم سے نڈھال تھی۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ دارا کی زندگی کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھیک مانگنے اورنگزیب کے پاس گئی تھی تو وہ واپس لوٹی تھی۔ اورنگزیب کا استدلال یہ تھا کہ دارا شکوہ نے اسے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ زندہ رہا تو ملک میں افراتفری برقرار رہے گی۔ وہ خالی ہاتھ واپس آ گئی تھی لیکن اس نے اورنگزیب کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیا۔ آنسوؤں کے موتیوں سے اس کا دامن بھر دیا۔

تمام مقربوں اور درباریوں کو حکم ہوا کہ وہ حرم سرا کے دروازے پر جا کر حضرت بیگم کی خدمت میں تسلیمات بجا لائیں اور پرسہ دیں۔

اورنگزیب نے ضروری سمجھا کہ کچھ دن اکبر آباد میں قیام کرے اور یہاں کا بندوبست اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ مرصع تخت طاؤس جو اب تک اکبر آباد میں تھا، حکم ہوا کہ اسے دہلی بھجوایا جائے۔ خزانۂ شاہی کو شاہجہاں آباد کے قلعے سے اکبر آباد کے قلعے میں منتقل کرانے کے احکام دیے گئے۔

خزانۂ شاہی سفر میں تھا اور اس کے ساتھ پیچھے پوری سلطنت مغلیہ سفر میں تھی۔ شہزادہ معظم سب سے آگے اپنے ہاتھی پر تھا۔ اس کے ساتھ دو دیو ہیکل ہاتھی مزید چل رہے تھے۔ دونوں ہاتھیوں پر شاہی نشان تھا۔ اس کے پیچھے چار مزید ہاتھی تھے جن پر سبز پرچم لہرا رہے تھے۔ گھوڑوں پر سفاک چہروں والے راجپوت چلے آتے تھے۔ درمیان میں بیل والی گاڑیاں تھیں جن کی تعداد چار سو آٹھ تھی۔ یہ بیل سر سے پاؤں تک طلائی چادروں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ صرف ان کے ہلالی سینگ اور سیاہ آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ گاڑیاں اشرفیوں، روپوں، طلائی، نقرئی برتنوں اور مرصع سازوسامان سے لدی ہوئی تھیں۔ گاڑیوں کے پیچھے احدیوں کے گھوڑے جن کی رکابیں اور کاٹھیاں سب سونے کی تھیں۔ پیدل علم بردار گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔

یہ گاڑیاں قلعۂ اکبر آباد میں داخل ہوئیں، خزانہ دیکھ کر در و دیوار کی آنکھیں بھی پتھرا گئی ہوں گی۔ گاڑیوں کے اندر داخل ہوتے ہی قلعے کے دروازے بند ہو گئے تھے لیکن باہر فقیروں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اب خزانے کا صدقہ نچھاور کیا جائے گا۔

صدقے کے روپے اور چاندی کے بنے ہوئے مخصوص پھول پہلے ہی الگ کر لیے گئے تھے۔ قلعے کی فصیلوں سے روپوں اور پھولوں کی ایسی بارش ہوئی کہ آسمان چھپ گیا۔

انہی دنوں یہ خبر پہنچی کہ سیوا راجا جے سنگھ کے ہمراہ عذر تقصیر کے لیے آ رہا ہے اور اکبر آباد کے نزدیک پہنچ چکا ہے۔ بادشاہ نے چھوٹے دو امیروں کو اس کے استقبال کے لیے آگے روانہ کر دیا۔

بادشاہ کی پچاسویں سالگرہ کا جشن منایا جا رہا تھا۔ اپنے بیٹے نو سالہ سنبھا کے ساتھ حاضر بارگاہ ہوا اور ہزار اشرفیاں نذرانے میں پیش کیں۔ بادشاہ کے اشارے سے اسے پانچ ہزاری منصب داری کی صف میں کھڑا کیا گیا۔ وہ کھڑا تو ہو گیا لیکن اس کے چہرے سے ناگواری کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

اس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے اس کے بیٹے کو بھی منصب عطا ہوا تھا۔ وہ سات ہزاری منصب کی توقع باندھ کر آیا تھا۔ اس کا اظہار وہ جے سنگھ سے بھی راستے میں کرتا چلا آیا تھا۔

وہ کچھ دیر تو کھڑا رہا پھر پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے ایک گوشے میں چلا گیا اور فرش پر گر کے تڑپتا رہا۔ بھرے دربار میں جہاں بادشاہ بھی موجود ہو، کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ راجا جے سنگھ کا بیٹا کنور رام سنگھ قریب کھڑا تھا۔ اسی کو بادشاہ نے اس کے استقبال کے لیے بھیجا تھا۔

سیوا نے کچھ دیر لوٹنے پیٹنے کے بعد اس سے شکایت کی۔ "آپ نے دیکھا، مغل دربار میں میری کیسی تذلیل ہوئی ہے۔ مجھے کیسا ذلیل کیا گیا ہے۔ مجھے پنج ہزاری منصب دیا گیا ہے۔ یہی منصب میرے نو سالہ بیٹے کو بھی ملا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں آتا ہی نہیں۔ میں نے اپنے تمام قلعے بادشاہ کو دے دیے اور مجھے یہ انعام ملا۔"

"سیوا جی، مغلوں میں یہ عام دستور ہے۔ اکثر باپ بیٹوں کو ایک ہی منصب عطا ہوا ہے۔"

"میرے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"صبر و انتظار کرو۔ بادشاہ کی طرف سے ابھی اور عنایات ہوں گی۔"

"مجھے اب اس مغل بادشاہ پر بھروسا نہیں رہا۔ میں واپس چلا جاؤں گا۔ مقابلہ نہیں کر سکا تو خودکشی کر لوں گا۔"

"اچھا صبر تو کرو۔ میں بادشاہ سے خود بات کروں گا کہ وہ تمہارے منصب میں اضافہ کر دے۔" رام سنگھ نے اسے تسلی دے کر خاموش کر دیا۔

اس کی یہ شکایات فوراً بادشاہ تک پہنچ گئیں۔ بادشاہ نے بے رخی سے اسے رخصت کر دیا اور رام سنگھ کی تجویز پر شہر کے باہر جے سنگھ کے گھر کے قریب ایک مکان میں اسے ٹھہرایا گیا۔ یہاں پہنچ کر بھی سیوا نے اپنی زبان بند نہیں کی۔ یہاں تک کہہ دیا کہ اس کا استقبال شایان شان نہیں کیا گیا۔

... کے استقبال کے لیے تمہیں بھیجا گیا۔ کیا میں ... [illegible] ... میں آج بھی چاہوں تو شاہی فوجوں کو ناک چنے ... [illegible]

... اس نے اپنے میزبان تک کا خیال نہیں کیا۔ اس پر یہ ... ان کے استقبال کے قابل نہیں تھا۔

... کا دل اس کی طرف سے برا ہو گیا۔ اس نے ... بڑھا چڑھا کر بادشاہ تک پہنچا دی ہے۔ بادشاہ ... اس کے خلاف مزید کوئی کارروائی کرنے تک ضروری ... کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ بادشاہ نے کوتوال ... کے گھر کی اطراف چوکی پہرا لگا دینے کا حکم دیا اور ... دربار میں حاضری اور تسلیمات سے روک دیا۔

اس نے جو یہ پابندیاں دیکھیں تو اپنے افعال کے ... ہو گیا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ کسی طرح یہاں سے نکل بھاگے۔ کچھ دن تو امرائے دربار کو ... کر معافی تلافی کا طالب گار ہوتا رہا اور جب بات نہیں بنی تو مکر و عیاری کا سہارا لیا، جس میں وہ طاق تھا۔ خود کو بیمار ظاہر کرنے لگا۔ اس کے مطابق اس کے جگر میں کوئی خرابی ہو گئی۔ پھر یہ ظاہر کر کے کہ اس کا مرض دق اور سل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ طبیبوں اور معالجوں سے علاج کے لیے رجوع کیا۔

چند دن بعد اس نے صحت پانے کا بہانہ کیا۔ بڑے پیمانے پر خیرات تقسیم کی۔ بڑے بڑے مٹھائی کے ٹوکرے اس کی قیام گاہ سے نکل کر برہمنوں اور طبیبوں کے گھر جانے لگے۔ یہ ٹوکرے ہی دراصل اس کی عیاری کا ذریعہ بننے والے تھے۔ ایک دن وہ مٹھائی کے ایک ٹوکرے میں بیٹھ گیا، دوسرے میں اس نے اپنے لڑکے کو بٹھا دیا۔ یہ ٹوکرے اس کے آدمی یہ کہہ کر اٹھا لے گئے کہ متھرا کے برہمنوں کے لیے مٹھائی جا رہی ہے۔ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ ایک مقررہ مقام پر اس کے آدمیوں نے گھوڑے تیار رکھے تھے۔ وہاں گھوڑوں پر سوار ہوا اور وہ گھڑی بعد متھرا کے قصبے میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے داڑھی مونچھ منڈوا دی اور اپنے بیٹے اور اپنے جسم پر بھبوت مل لی۔ جو جواہرات اور اشرفیاں چھپا کر رکھ لی تھیں اور چند فقیروں کے ہمراہ جنہیں اس نے رشتے راہ بنایا تھا، فقیر معروف بھیس سے جمنا پار کر کے بنارس کے راستے پر روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن پانچ گھڑی گزرنے کے بعد اکبر آباد میں شور مچا کہ سیوا بھاگ گیا۔ بادشاہ اکبر آباد میں تھا۔ تحقیق کرائی تو معلوم ہوا خبر درست ہے۔ اس نے حکم دیا کہ گرز برداروں کی اطراف و اکناف، شرقی و شمالی صوبے داروں اور فوج داروں کے پاس روانہ کیے جائیں کہ جہاں بھی مفرور سیوا کی اطلاع ملے، اسے گرفتار کر کے حضور میں روانہ کریں۔

امکان یہ تھا کہ سیوا احمد آباد اور برار کے راستے سے جائے گا اس لیے گرز بردار اسی طرف بھیجے۔ بنارس کی سمت کسی کی نظر ہی نہیں گئی۔ اس راستے پر چار پانچ دن بعد گرز بردار مقرر ہوئے۔ سیوا کو موقع مل گیا اور وہ تیز رفتاری سے چلتا ہوا الہ آباد پہنچ گیا۔

سیوا خود تو تیز رفتاری کے ساتھ میلوں پیدل چلنے کا عادی تھا لیکن اس وقت اس کا نو سالہ بیٹا بھی ساتھ تھا جس سے اب چلا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کی شناخت کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ گرز برداروں کو بھی بتا دیا گیا تھا کہ سیوا اور اس کا بیٹا ساتھ ہے۔ اس نے سنبھا (سیوا کا بیٹا) کو خود سے الگ کرنے کا سوچا۔ یہاں ایک برہمن اس کا موروثی پروہت تھا۔ سیوا نے اسے ڈھونڈ نکالا اور سنبھا کو اس کے پاس چھوڑ دیا۔

"اگر میں بخیر و سلامت اپنی منزل تک پہنچ گیا تو میں تجھے خط لکھوں گا۔ اس وقت تو سنبھا کو لے کر میرے پاس پہنچ جانا۔ ورنہ جب تک میرا خط نہ آئے تو اپنی جگہ سے ہرگز حرکت نہ کرنا۔"

سیوا نے اسے کچھ جواہر اور اشرفیاں دیں اور خود بنارس کی طرف روانہ ہو گیا۔

بنارس پہنچنے کے بعد وہ اشنان کرنے اور دوسری رسومات ادا کرنے کے لیے دریا پر پہنچا۔ اشنان سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ہر طرف پکڑ دھکڑ کا شور مچ گیا۔ شاہی گرز بردار یہاں پہنچ گئے تھے اور سیوا ہی کی تلاش ہو رہی تھی۔ ابھی دن کا اجالا پوری طرح پھیلا نہیں ہوا تھا۔ سیوا وہاں سے کھسک گیا۔ کسی کی اس پر نظر نہیں پڑی۔ وہ یہاں سے بہار اور پٹنہ کی راہ پر روانہ ہوا۔ گھنے جنگلوں میں زمینداروں کی سرحد سے ہوتا ہوا دشوار گزار راستوں سے سفر کرتا رہا۔ جس علاقے میں بھی پہنچتا تھا، ایک نیا بھیس بدل لیتا تھا۔

کوئی اسے پہچان نہ سکا اور وہ بہ حفاظت عبداللہ قطب شاہ کے پاس حیدر آباد پہنچ گیا۔ دکن کا علاقہ اس وقت شدید خانہ جنگیوں کا شکار تھا۔ خود عبداللہ شاہ کے کئی سرحدی علاقے بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ اس نے عبداللہ قطب شاہ کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے رام کر لیا۔

"اگر آپ مجھے ایک فوج اور قلعہ گیری کا سامان فراہم کر دیں تو میں چند ہی دن میں ان کو فتح کر کے آپ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقبول عام ٹی وی سیریلز اور شاہکار ناولوں کی تخلیق کار

عمیرہ احمد

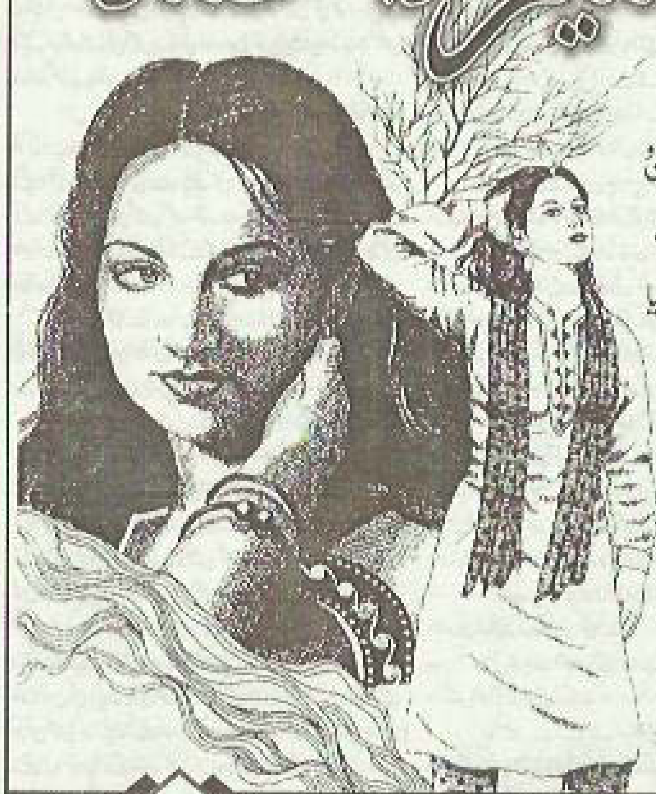

جنہوں نے میدان
میں آتے ہی قارئین و
ناظرین سے اپنے
فن تحریر کا لوہا منوالیا

...جوہری تحریر میں
اپنے ہی بنائے ہوئے
سنگ میل عبور کرتی
جا رہی ہیں

عمیرہ احمد کے قلم سے نکلی ہوئی دلوں
کی گہرائیوں کو چھونے والی،

ایک نئی اور تازہ
سلسلے وار کہانی

ماہنامہ پاکیزہ میں اگست 2011ء سے شروع ہو رہی ہے

حوالے کر دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے وہ قلعے بھی خالی کروں گا جو عالمگیر بادشاہ کے تصرف میں چلے گئے ہیں۔''

عبداللہ قطب نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ مرہٹوں کے قدم دوبارہ جما دیے۔ ایک فوج مہیا کر کے سیوا کے حوالے کر دی۔

قلعہ گیری میں اس کا بڑا شہرہ تھا اور اس وقت تو وہ جیسے سے بھرا ہوا شیر بن گیا تھا۔ آندھی کی طرح اٹھا، طوفان کی طرح چھا گیا۔ ستارہ، پرنالہ اور دوسرے دس بارہ مشہور بیجاپوری قلعے مختصری مدت میں فتح کر لیے۔ یہ ایسے قلعے تھے کہ ان پر برسوں میں بھی قبضہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے ان قلعوں پر بھی دوبارہ قبضہ جمایا جن کی چابیاں اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بے تیغ اور دلیر خان کے سپرد کی تھیں۔

سیوا کو اپنی کارگزاریوں کی طرف سے قدرے اطمینان ہو گیا تھا کہ اورنگ آباد سے اس برہمن کا خط آیا جس کے پاس وہ اپنے بیٹے سنبھا کو چھوڑ کر آیا تھا۔ اس خط میں سنبھا کی موت کی اطلاع تھی۔ سیوا کی بیوی شدت غم سے بے ہوش ہو گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ سیوا بڑا سخت جان تھا کہ ایک ایک کو دلاسا دے رہا تھا اور خود خاموش تھا۔ اس نے نہایت سکون سے سنبھا کی موت کا اعلان کرایا۔ اطراف کے زمینداروں اور راجپوت سرداروں نے اسے تعزیتی خطوط لکھے۔ خبر نویسوں نے اس حادثے کی اطلاع اکبر آباد اور دہلی تک بھی پہنچا دی۔ بادشاہ کو بھی اطلاع کر دی گئی جو ان دنوں کابل میں مصروف تھا اور کابل کے افغان قبیلوں کی شورش کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس حادثے کو پانچ دن گزرے تھے کہ سنبھا اس برہمن کے ساتھ صحیح سلامت واپس آ گیا۔ وہ صحن میں کھڑا تھا اور اس کی ماں کچھ خوف، کچھ خوشی کے جذبات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ پھر دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

''میرے لال، تو زندہ ہے؟''

''کیسی باتیں کر رہی ہو ماں۔ مجھے کیا ہوا تھا؟''

''تیری موت کا خط آیا تھا۔'' سیوا کی بیوی نے کہا پھر برہمن کی طرف دیکھا۔ ''آپ ہی نے تو وہ خط لکھا تھا۔''

''ہاں جی۔ ذرا دھیرج رکھو، سب بتائے دیتا ہوں۔ جل پانی کا تو پوچھو، سب بتائے دیتا ہوں۔''

برہمن سیوا کے بلانے پر ہی آیا تھا اس لیے سیوا بھی اس وقت راج گڑھ ہی میں موجود تھا۔ بلانے پر وہ بھی آ گیا۔ بیوی نے اس سے بھی یہی سوال کیا۔ تب سیوا نے حقیقت بتائی۔

''برہمن نے میرے کہنے سے خط لکھا تھا۔ میں نے ہی اس بری خبر کو مشہور کیا تھا۔ اگر میں اس کی موت کو شہرت دے کر بادشاہ کو غافل نہ کر دیتا تو بادشاہی علاقے میں سنبھا کی تلاش کی سرگرمیاں ختم نہ ہوتیں۔ بادشاہ کو جب معلوم ہوا کہ سنبھا مر چکا ہے تو اس نے اس کی تلاش بھی چھوڑ دی۔ ناکہ بندی ختم کر دی گئی اور سنبھا کا یہاں پہنچنا ممکن ہوا۔''

اب سیوا بالکل بے فکر تھا۔ وہ راج گڑھ کے قلعے میں جم کر بیٹھ گیا۔ اس نے بندرگاہ سورت کو لوٹ لیا۔ وہاں سے وہ نقد رقم، چاندی سونا اور کپڑے لوٹ کر اور کئی ہزار باعزت مسلمانوں کو قید کر کے لے گیا۔ اپنی رہائش کے لیے دشوار گزار پہاڑوں پر قلعے تعمیر کرا کے ناقابل تسخیر ہو گیا۔

یہ سب دیکھ کر اورنگزیب نے مہابت خان کے ساتھ اعظم خان کو دکن کی امدادی فوجوں پر متعین کر کے بھیج دیا۔ کچھ دن بعد بادشاہ نے اسے اپنے پاس طلب کیا لہٰذا اعظم خان دکن سے حسن ابدال بادشاہ کے حضور پہنچ گیا۔ پٹھانوں سے زبردست معرکے ہوئے اور نہایت جدوجہد کے بعد پٹھان ہزیمت کھا کر بھاگے۔

تین سال کے قیام کے بعد اورنگزیب نے حسن ابدال سے دارالخلافہ کی طرف مراجعت کی۔ یہاں پہنچ کر اسے اچانک شہزادہ محمد سلطان کی یاد آئی۔ لشکر کشی کے بکھیڑوں میں اسے محمد سلطان کا خیال ہی نہیں رہا تھا جسے وہ قلعہ گوالیار بھیج چکا تھا۔ حکم ہوا کہ اسے حضور میں پیش کیا جائے۔

بارہ چودہ سال قید میں رہنے اور عزیزوں کے صدمے نے شہزادے کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ حکم شاہی کے مطابق قید میں اسے پوست (افیون) کھلائی جاتی رہی تھی تاکہ وہ کاہل اور سست ہو جائے۔ بغاوت کا حوصلہ نہ رہے۔ اس نے بھی اس کی صحت پر اثر ڈالا تھا۔ باپ نے بیٹے کو دیکھا تو شفقت سے بغل گیر ہو گیا۔

''تمہیں قلعہ گوالیار میں رکھنے کا مقصد سزا دینا نہیں تھا بلکہ تمہیں احساس دلانا تھا کہ بغاوت سے اطاعت کا راستہ بہتر ہے۔''

''ہم نے بغاوت نہیں کی تھی۔ ہم راستہ بھٹک گئے تھے۔''

''بھٹکے ہوئے راہی جب تک منزل پر پہنچتے ہیں، قافلے والے انہیں بھلا چکے ہوتے ہیں۔ ہم نے تمہیں بھلا دیا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ تمہیں ندامت ہے۔ ہم تمہیں صوبہ ... پر مامور کرتے ہیں۔ قید کی سختیوں نے تمہیں بہت کمزور کر دیا ہے۔ تم کفایت خان کو اپنا نائب مقرر کر کے روانہ کر سکتے ہو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ حکم شاہی بجا لایا لیکن شاید قید سے رہائی کا انتظار کر رہا تھا۔ کفایت خاں کی روانگی کے کچھ ہی دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

مرہٹوں کی سرکشی جاری تھی کہ راجا جسونت سنگھ کے مرنے کے بعد راجپوتوں نے بھی سرکشی دکھائی۔ عالمگیر نے شرعی قوانین کے تحت غیر مسلموں کو جزیہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ چتوڑ کے رانا نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور دوسرے تمام راجپوتوں نے رانا کا ساتھ دیا اور جھڑپوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ عالمگیر کی فوجیں کئی محاذوں پر ایک ساتھ لڑ رہی تھیں۔ کوئی اور ہوتا تو پریشان ہو جاتا لیکن وہ اورنگزیب تھا۔

اس نے ابتدا ہی سے امور شرعی کو مدنظر رکھا تھا۔ وقتاً فوقتاً ایسے احکام صادر کرتا رہتا تھا جو اس دیس کے لوگوں کے لیے انوکھے تھے۔ اس سے پہلے کسی مغل بادشاہ نے ان قوانین کے اجرا کو ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اورنگزیب نے یہ خیال کیے بغیر کہ سخت ردعمل سامنے آئے گا، اپنے احکامات پر سختی سے عمل درآمد کرایا۔

شراب خانے بند کرا دیے اور مذہبی میلوں پر پابندی لگا دی حالانکہ ان میلوں میں جو خرید و فروخت ہوتی تھی اس کے محصول میں ایک بڑی رقم ہر صوبے میں جمع ہوتی تھی۔

سرکار میں جو نامی گرامی گویے نوکر تھے ان کو بادشاہ نے گانے بجانے سے توبہ دلا دی اور منصب و خدمات پر ان کو مامور کر دیا۔ ناچ گانے کی ممانعت کی منادی عام کرا دی۔

شاہان سلف کے زمانے سے درشن کا طریقہ چلا آ رہا تھا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں بھی یہ دستور تھا۔ بادشاہ دن میں دو بار ایک بار درشن کے جھروکے میں آتا تھا اور لاکھوں لوگ اس کے دیدار کو جمع ہوتے تھے۔ اورنگزیب نے اس رسم کو خلاف شرع قرار دیا اور جھروکے میں بیٹھنا ترک کر دیا۔ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو جب تک بادشاہ کے درشن نہیں کر لیتے تھے کھانے کی کوئی چیز منہ میں نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ اورنگزیب نے ان کے دھرم میں مداخلت کی ہے۔

بادشاہی محفلوں میں نجومیوں کی بھی بھرمار ہوتی تھی۔ عالمگیر نے نجومیوں کو برخاست کر دیا۔ یہ حکم بھی جاری ہوا کہ تمام مسلمان جب ایک دوسرے سے ملیں تو صرف شرعی سلام یعنی السلام علیکم پر اکتفا کریں۔ کافروں کی طرح سر پر ہاتھ نہ رکھیں۔

راجپوتوں کی بغاوتیں بیشتر انہی احکامات کے ردعمل میں تھیں جن سے نمٹنے کے لیے اورنگزیب کی عمر کا ایک بڑا حصہ خرچ ہو گیا۔

سیوا جی کی غارت گری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ عالمگیر نے اس کی تنبیہ کے لیے بار بار فوجیں بھیجیں جو کبھی فتح پاتی تھیں کبھی شکست۔ یہ سلسلہ یونہی چل رہا تھا کہ سیوا کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا سنبھا گدی نشین ہوا۔

مرنے سے کچھ دیر پہلے کوئی سیوا سے کہہ رہا تھا۔ ”تم نے تمام علاقے تاراج کیے لیکن اورنگ آباد اور برہان پور جیسے علاقے چھوڑ دیے جہاں خزانوں کے ڈھیر لگے ہیں۔“

اس نے جواب دیا۔ ”اگر میں نے ان دو شہروں کو لوٹنے کی کوشش کی تو عالمگیر بادشاہ کی غیرت بھڑک اٹھے گی اور وہ لازماً ادھر کا رخ کرے گا۔ پھر بادشاہوں کی لڑائی نہ معلوم کس نتیجے پر پہنچائے گی۔“

سنبھا تخت پر بیٹھا تو اس نے ایک سال بعد ہی یہ نادانی کر ڈالی۔ اس نے برہان پور پر حملہ کر کے نہایت سفاکی اور بے دردی سے تمام شہر کو لوٹا اور شہر میں آگ لگا دی۔

دکن کے صوبے دار خان جہاں بہادر کو کسی طرح اس لوٹ مار کی اطلاع بروقت مل گئی۔ وہ لشکر کو لے کر نکلا لیکن جان بوجھ کر طویل راستہ اختیار کیا چنانچہ اس کے برہان پور پہنچنے تک سنبھا کو موقع مل گیا وہ لوٹ مار کا سامان لے کر بہ آسانی اپنے قلعوں تک پہنچ گیا۔

مشہور یہی ہوا کہ سنبھا کے وکیل نے خان جہاں کو بھاری رشوت دی تھی۔

برہان پور کے علما، شرفا اور مشائخین نے بادشاہ کے پاس فریاد کی اور ایک محضر بھجوایا۔ اس محضر میں نہایت دل سوزی سے مسلمانوں کے مال و ناموس کی بربادی کا ذکر تھا۔

”اب یہ علاقہ دارالحرب بن گیا ہے اس لیے یہاں جمعہ کی نماز ترک کر دی گئی ہے۔“

اس عرضداشت کے جواب میں بادشاہ کی للکار پہنچی۔

”میں خود آتا ہوں۔“

عالمگیر نے اب تک مرہٹوں کی شرارتوں پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اب اس محضر نے اسے اتنا متاثر کیا کہ اس نے بذات خود دکن جانے کا اعلان کر دیا۔

سفر میں شہزادے بھی ہم رکاب تھے۔ اکبر پور کے گھاٹ سے دریا عبور کیا۔ وہ اور اس کا لشکر برہان پور پہنچ گیا۔ بادشاہ نے قلعہ ”ارک“ کے دولت خانے میں قیام کیا۔ صوبے دار، دیوان، فوج دار، بارگاہ شاہی میں باریاب ہوئے۔ اورنگزیب کئی ماہ کے قیام کے بعد وہ اورنگ آباد روانہ ہو گیا۔

پہنچ کر اپنے بڑے بیٹے معظم شاہ کو مرہٹوں کے

علاقوں کے لیے روانہ کیا۔ یہ شہزادہ دکن کے تمام علاقوں کو پامال کرتا ہوا انتہائی حد تک پہنچ گیا لیکن آب و ہوا کی ناموافقت اور رسد کی نایابی کی وجہ سے جانور مرنے لگے۔ کوئی گھوڑا سواری کے لائق نہیں رہا اور لشکر کے اکثر آدمی بیمار ہو گئے۔ بالآخر عالمگیر نے اسے واپس بلا لیا۔

اس کے بعد تو مہمیں متعین ہوتی رہیں لیکن چونکہ سنبھاجی کو بیجاپور اور حیدر آباد سے مدد ملتی رہتی تھی۔ وہاں کا فرماں روا ابوالحسن تانا شاہ عیش کوشی میں مبتلا تھا۔ پورا ملک کافروں کے سپرد کر دیا تھا۔ سنبھاجی کا مددگار بنا ہوا تھا اس لیے عالمگیر نے مرہٹوں کی طرف سے توجہ ہٹا کر حیدر آباد کا رخ کیا۔

تین سال کی طویل مدت میں بیجاپور اور حیدر آباد کے تمام علاقے بادشاہ کے قبضے میں آ گئے۔ بادشاہ ابھی تک اورنگ آباد میں جم کر بیٹھا ہوا تھا۔

حیدر آباد اور بیجاپور کی فتوحات کے بعد سنبھاجی اکیلا رہ گیا تھا۔ اب اس کا مقابلہ بہ آسانی کیا جا سکتا تھا۔ مقرب خاں کو سنبھا کی گرفتاری کے لیے مقرر کیا گیا۔ مقرب خاں یلغار کرتا ہوا ”کولا پور“ پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے ادھر ادھر جاسوس دوڑا دیے کہ سنبھا کا پتا لگا کر دیں۔

جاسوس لوٹے تو یہ خبر لائے کہ سنبھا گنگا اشنان اور سیر و تفریح کے لیے پرگنہ سنگمیر گیا ہوا ہے۔ اس پرگنہ کی سرحد سے دریائے گنگا کی ایک شاخ بہتی تھی۔ اسی دریا کے قریب ایک دشوار گزار پہاڑی کے درے میں سنبھا کے دیوان نے ایک شاندار عمارت بنوائی تھی۔

مقرب خاں نے اس علاقے کے دشوار گزار ہونے کی پروا نہیں کی اور کولا پور سے روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھی اسے روکتے رہے کہ اس دشوار جنگل اور سر بہ فلک پہاڑوں سے گزر کر سنبھا تک پہنچنا موت کو دعوت دینا ہے لیکن مقرب خاں جذبہ جہاد سے سرشار تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح لشکر کو لے کر عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

سنبھا اس وقت نشے میں غرق تھا۔ خوبصورت عورتیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ مستی کی حالت میں بیہودہ حرکت ہو رہی تھی جس کے لیے سنبھا مشہور تھا کہ اس کے ہرکاروں نے بادشاہی فوج کے آنے کی اطلاع دی۔ اسے یہ اطلاع اس قدر ناگوار ہوئی کہ ان ہرکاروں کی زبان کاٹنے کا حکم دے دیا۔

عمارت کی اطراف باغ تھا۔ باغ کو چاروں طرف سے گھنے جنگل نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مغل یہاں آ سکتے ہیں۔ اس کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا کیونکہ مقرب خاں صرف دو سو سوار یہاں تک لا سکا تھا۔ ان سب نے سنبھا کے سر پر پہنچ کر تلواریں سونت لیں۔ سنبھا کے ساتھ دو تین ہزار مرہٹوں کی جمعیت تھی لیکن سب منتشر اور ہتھیار کھولے ہوئے تھے، بھاگ کھڑے ہوئے۔ سنبھا نے بھی بھاگ کر گھوڑے پر سوار ہونے کی کوشش کی لیکن نشہ ایسا گہرا تھا کہ رکاب میں پاؤں ڈالتے ہی پھسل کر پیچھے گر پڑا۔ اہل خانہ سمیت گرفتار ہوا جن میں اس کا بیٹا ساہو بھی تھا۔

سنبھا کو جب عالمگیر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے عالمگیر کو سخت گالیاں دیں۔ اس کی دریدہ دہنی نے عالمگیر کو ایسا بھڑکا دیا کہ اس نے وہ سزا سنائی جو اس سے پہلے کبھی اس کی زبان سے ادا نہیں ہوئی تھی۔

سنبھا کے ساتھ اس کا بیٹا ساہو اور اس کی ماں بھی گرفتار ہوئی تھی۔ ہندو اور مرہٹے یہاں تک کہ راجپوت بھی عالمگیر کو متعصب کہہ رہے تھے۔ اس وقت ایک فیاضی اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس نے ساہو کو جو سات آٹھ برس کا لڑکا تھا ہفت ہزاری کا منصب اور راجا کا خطاب دیا اور اس کی سرکار قائم کر کے دیوان اور بخشی مقرر کیے اور اس کو خیمہ شاہی کے ساتھ ایستادہ کرنے کا حکم جاری کیا۔ اس کا یہ حکم دور اندیشی سے دور تھا لیکن غلطیاں انسانوں ہی سے ہوتی ہیں۔

بادشاہ نے اسے بادشاہی احاطے میں نظر بند کیا اور اس کی تربیت کے لیے سمجھدار اتالیق مقرر کیے اور اپنی نگرانی میں اسے پال پوس کر جوان کرنے لگا۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سانپ کو دودھ پلانے سے اس کا زہر کم ہو جائے گا۔

سنبھا کا ایک بھائی رام راجا قید میں پڑا ہوا تھا۔ مرہٹوں نے اسے قید سے نکالا اور اسے سنبھا کی گدی پر بٹھا دیا اور ایک بڑا لشکر فراہم کر لیا۔ رام راجا کی فوج کے دو بڑے سردار سنتا اور دھنتا تھے جو دس دس بارہ بارہ ہزار جمعیت کے ساتھ تمام ملک کو لوٹتے پھر رہے تھے۔ ان کا رعب اتنا چھا گیا تھا اور طریقہ جنگ ایسا تھا کہ بادشاہی افسران ان کے مقابلے سے جی چرانے لگے تھے۔ کئی موقعوں پر شاہی فوجوں کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

بادشاہ تک یہ اطلاعات پہنچ رہی تھیں لیکن وہ ان دنوں پرتگیزیوں اور انگریز بحری قزاقوں کا قلع قمع کرنے میں مشغول تھا۔ اپنے افسروں کو سخت سست سناتا رہا اور مرہٹوں کی کارروائیاں جاری رہیں۔ ایک دن پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ ہرکاروں نے اطلاع بہم پہنچائی کہ رام راجا کی فوجیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میدان میں آ گئی ہیں اور جن قلعوں اور علاقوں پر بادشاہی لشکر کا قبضہ ہو گیا ہے انہیں دوبارہ حاصل کرنے کے لیے تاخت و تاراج کرنے لگی ہیں۔ ابھی اس خبر کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ یہ دہشت ناک خبر آ گئی کہ پناپور کا قلعہ پرنالہ ہاتھ سے چلا گیا۔

پرتگیز کوزا ابھی ابھی عاجزی اور معافی کا طلب گار ہو کر آیا تھا اور معافی نے کر رہا تھا کہ یہ خبر عالمگیر کے گوش گزار ہوئی۔

"پرنالہ رفت پناپور رفت" عالمگیر کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "بہرہ مند خان کو حاضر کیا جائے۔"

بہرہ مند خان کو حکم ہوا کہ مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو۔

خبریں تھیں کہ بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ ایک خبر یہ آئی کہ شہزادہ معزالدین نے قلعہ پرنالہ پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا ہے۔

اب یہ تجویز ہوئی کہ خود بادشاہ سلامت بیرم پور تشریف لے جائیں اور وہاں چھاؤنی قائم کر کے ہر طرف فوجیں بھیجی گئیں۔

عالمگیر نے قطعی ارادہ کر لیا تھا کہ مرہٹوں کے قلعے جو ان کی جائے پناہ تھے فتح کر لیے جائیں۔ یہ قلعے ایسے محفوظ، بلند اور مستحکم تھے اور چاروں طرف سے غاروں اور خندقوں سے گھرے ہوئے تھے کہ ان کا فتح کرنا عام آدمی کا کام نہیں تھا۔ راج گڑھ کے قلعے کا دور بارہ میل کا تھا۔ برسوں کی محنت کے بعد یہ قلعے فتح ہوئے تھے اور اب دوبارہ انہیں فتح کرنا پڑ رہا تھا۔

عالمگیر کی عمر اس وقت 88 برس ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود اس مہم کی کمان اس نے اپنے ہاتھ میں لی اور لشکر کو بیرم پوری پہنچنے کا حکم دیا۔ بیرم پور پہنچتے ہی پرنالہ، راج گڑھ، ستارہ اور دوسرے قلعوں کی تسخیر کے لیے جگہ جگہ فوجیں مقرر کر دیں۔ مرہٹوں کے خوف کی وجہ سے ستارہ آ گیا۔

بادشاہی خیمہ بیرم پور سے روانہ ہو کر قلعہ ستارہ کے مقابل ڈیڑھ کوس کی مسافت پر لگا دیا گیا۔ یہ قلعہ اپنے نام کی طرح ستارہ تھا۔ اتنا بلند کہ زمین سے ستارہ ہی نظر آتا تھا۔ شاہی فوجوں کی آمد سنتے ہی اپنے علاقوں سے بھاگ کر برابر کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے اپنے کوہستان میں واپس آنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا کہ راستے میں اس کی موت نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

اس کے ہمراہی سرداروں نے اس کی بیوی تارا بائی کو رام راجا کی جگہ گدی نشین کر دیا۔ رانی بائی نے فوج کے ساتھ دشوار گزار پہاڑوں کی طرف سفر جاری رکھا۔ اس اطلاع پر لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ توقع کی جانے لگی کہ ایک کمزور عورت مرہٹوں کی جمعیت کو برقرار نہیں رکھ سکے گی لیکن اس عورت نے سرداری کا حق ادا کر دیا۔ اس کی سرداری میں مرہٹے پہلے کی طرح تاخت و تاراج کرنے لگے۔ شاہی فوج بھی ان کی سرکوبی کے لیے سرگرداں رہی لیکن مرہٹے حلق کی ہڈی کی طرح پھنسے ہوئے تھے۔ شاہ جہاں کا جمع کیا ہوا خزانہ ان مہموں پر پانی کی طرح خرچ ہو رہا تھا۔ ہزاروں آدمی مارے جا رہے تھے لیکن ستارہ اور پرنالہ جیسے قلعے فتح ہو گئے اور پھر ایک ایک کر کے تمام قلعے فتح کر لیے گئے۔ دو سال کے عرصے میں اس نے تمام قلعے اور مخصوص مقامات فتح کر لیے۔ اس کے جیتے جی سیوا مر گیا، سنبھا مارا گیا، رام راجا صحرا نوردی کی نذر ہوا۔ ستا کا مرگٹ کر دریا میں پہنچا۔ تمام کھوئے ہوئے قلعے قبضے میں آ گئے۔ دکن سے لے کر مدراس تک سناٹا ہو گیا۔

عالمگیر نے دریائے کرشنا کے قریب دیوا پور میں قیام کر کے حسین قلیچ خان کو اس کام پر متعین کیا کہ تمام ملک میں امن و امان کی منادی کرا دے اور رعایا کو ترغیب دی جائے کہ اپنے اپنے گھروں کو آ کر آباد ہو جائیں۔

اب مرہٹے کوئی حکومت یا کوئی قوم نہ تھے بلکہ خانہ بدوش رہزن تھے جو ادھر ادھر آوارہ پھرتے تھے اور موقع پا کر چوری چھپے لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اس منتشر گروہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اب کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ یہ اٹھتے ہوئے ارادے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے لیکن نوے سال اور تجربہ کو موت نے مزید مہلت نہیں دی۔

جلوس کے اکیانویں سال 1118 ہجری کو بادشاہ نے صبح کی نماز ادا کی پھر وظائف میں مشغول ہو گیا۔ دن کا کچھ حصہ گزرا تھا کہ عالمگیر بادشاہ غازی کی روح عالم بقا کی طرف پرواز کر گئی۔

ماخذات: منتخب اللباب (حصہ سوم)، خافی خان۔ اورنگزیب عالمگیر، علامہ شبلی نعمانی۔ شاہجہاں نامہ، محمد صالح کمبوہ۔ اورنگزیب، جادو ناتھ سرکار

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ہر کام میں ناکام کیوں ہو جاتا ہوں۔

مثال کے طور پر ایک بار میرے ایک خالو نے میری پریشانیوں پر ترس کھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "نصیب میاں، تمہاری حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اس لیے میں نے تمہارے لیے ایک راستہ نکالا ہے، چار پیسے مل جائیں گے، کچھ حالات میں تبدیلی آ جائے گی۔"

میرے وہ خالو ڈرائیونگ لائسنس بنانے کے محکمے میں ایک اعلیٰ عہدے پر تھے اور ان ہی کے دستخط سے لائسنس جاری ہوا کرتے تھے۔

"لکھے پڑھے ہوتے اگر تو قوم کو خدا لگتے"...... معاشرے کی بگڑتی صورت حال

کائنات میں ہمہ وقت کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے بس... ایک وہی نہیں ہوتا جیسے ہونا چاہیے... یہی ایک غم اس "قوم" کو کچھ اس طرح لاحق ہوا ہے کہ "لا" اور "حق" کے درمیان حائل ہونے والے فاصلے نے اسے ایک الگ ہی معنی... دیے ہیں... اسی سبب ہر سمت ایک ہی صدا سفر کر رہی ہے "کچھ نہیں ہوگا"... اے قوم جب تک تجھ پر اندھے، بہرے حکمراں مسلط ہیں تیرا نعرہ "کچھ نہیں ہوگا"۔

کچھ نہیں ہوگا

منظر امام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی خالو جان ہیں۔"

"دیکھو ہمارے دفتر کے باہر بے شمار ایجنٹس ہوتے ہیں۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا انہیں تم بھی یہ کام شروع کر دو اور ظاہر ہے کہ تمہارے حوالے سے جو کام میرے پاس آیا کرے گا وہ فوراً ہو جائے گا، اس طرح تمہاری ساکھ بن جائے گی اور لوگ لائسنس بنوانے کے لیے تمہارے ہی پاس آیا کریں گے۔"

"بہترین آئیڈیا ہے خالو۔ بہت بہت شکریہ آپ کا۔ میں کل ہی سے یہ کام شروع کر دیتا ہوں۔"

اس دن میں بہت خوش تھا اسی خوشی کے عالم میں، میں نے اکبر کو پکڑ لیا وہ ہمارے محلے کا ہی بندہ تھا اور خود بھی لائسنس ایجنٹ تھا۔ "اکبر جان کل سے میں بھی تمہارے والا کام شروع کر رہا ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔

"یہ بہت مشکل کام ہے جان نصیب۔" اکبر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ایک لائسنس بنوانے کے لیے نہ جانے کتنوں کی خوشامدیں کرنا پڑتی ہیں، اس کے باوجود مسائل نہیں ہوتے اور کسٹمر ناراض ہوتا رہتا ہے۔"

"لیکن میرے ذریعے جو آئے گا اس کا لائسنس دو دن میں بن جائے گا اکبر صاحب۔" میں نے بتایا۔ "کیونکہ حشمت نظامی صاحب میرے خالو ہیں۔"

"کیا نظامی صاحب تمہارے خالو ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جی جناب وہ خالو ہیں میرے۔"

"پھر تو تمہارا کیس کون روک سکتا ہے بھائی۔ میاں مجھے کوئی ان تو پھر ڈر کاہے کا۔"

چونکہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لائسنس آفس میں کام کس وقت شروع ہوتا ہے اس لیے میں ذرا لیٹ پہنچا تھا اور ابھی وہاں کے ماحول کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل میرے پاس آ گیا۔ "کیا تمہارا نام نصیب ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلو تمہیں نظامی صاحب نے بلایا ہے۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ خالو نے اس لیے بلایا ہوگا کہ وہ دیکھیں کہ میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچا ہوں یا نہیں لیکن وہاں تو صورت حال ہی کچھ اور تھی۔ خالو بہت ناراض تھے۔ "نصیب میاں تم کوئی دوسرا کام ڈھونڈ لو یہ سب تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"کیا ہو گیا خالو؟ ابھی تو میں نے کام بھی شروع نہیں کیا۔"

"اور ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ میں تمہارا خالو ہوں۔ بدنام کرواؤ گے مجھے بہتر ہے کہ تم چلے جاؤ۔"

اور میں ناکام واپس آ گیا..... تو اس طرح کی ناکامیاں میرے مقدر میں لکھی تھیں جن کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میرے پھوپھا ایک بڑی فرم میں ایک اچھے عہدے پر تھے۔ انہوں نے کہا۔ "نصیب کل ہمارے دفتر آ جانا جاب کے لیے انٹرویوز ہو رہے ہیں تم کو بھی انٹرویو دینا ہے۔"

"لیکن پھوپھا میں اس قابل کہاں ہوں کہ انٹرویو میں کامیاب ہو سکوں۔"

"فکر مت کرو انٹرویو میں ہی لوں گا پاس کرنا میرے ہاتھ میں ہے لیکن دفتری کارروائی کے لیے خانہ پری کے طور پر انٹرویو کرنا ہے۔ ٹھیک دس بجے آ جانا۔"

اور میں ٹھیک دس بجے پہنچ گیا۔ میرے علاوہ اور بھی چار نوجوان تھے۔ انٹرویو شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی، اس لیے میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ سب انٹرویو کے لیے آئے ہیں۔"

"جی ہاں۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا آپ لوگ گھر واپس چلے جائیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں..... واپس کیوں چلے جائیں۔"

"اس لیے کہ سلیکشن ہو چکا ہے۔" میں نے بتایا۔ "اور وہ خوش نصیب میں ہوں۔ اتفاق سے میرا نام بھی نصیب ہے اور میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انٹرویو لینے والے میرے پھوپھا ہیں۔"

ان چاروں کے چہرے اتر گئے پھر ان میں سے ایک نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ "یہ نہیں ہو سکتا یہ ناانصافی ہے اگر رشتے داروں ہی کو بھرتی کرنا تھا تو پھر ہمیں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کیسا ڈھونگ رچا رکھا ہے تم لوگوں نے۔"

شور غل سن کر پھوپھا بھی کمرے سے باہر آ گئے۔ انہیں جب یہ پوزیشن معلوم ہوئی تو انہوں نے فوری طور پر مجھے دفتر سے باہر نکلوا دیا۔

تو اس ناپ کی قسمت تھی میری۔ نہ جانے کیوں میرا نام صرف نصیب رکھا گیا تھا بدنصیب رکھ دیتے تو زیادہ اچھا

بہر حال میرے لیے سوائے ناکامیوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

پھر دنوں بعد ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک چالو پرزہ قسم کا انسان تھا۔ میں نے جب اسے اپنے حالات سے آگاہ کیا تو وہ بہت افسوس کرنے لگا پھر اس نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ تمہارے پاس ڈگری کون سی ہے۔ کیا کیا ہے تم نے؟"

"میں نے انٹر تک تعلیم حاصل کی ہے بھائی خوش حال۔" میں نے فخریہ بتایا۔

"اسی لیے تمہارا یہ حال ہو رہا ہے۔ انٹر بھی کوئی تعلیم ہوتی ہے۔ بھائی آج کل پی ایچ ڈی کو کوئی نہیں پوچھتا تو انٹر کون پوچھے گا۔ کب کیا تھا انٹر؟"

"چھ سال پہلے۔" میں نے بتایا۔ "اس کے بعد سے بس جھک مار رہا ہوں۔"

"اس حساب سے تو اب تک تمہارے پاس ایم اے کی ڈگری ہونی چاہیے تھی۔" اس نے کہا۔ "چاہے وہ کوئی بھی سبجیکٹ ہو۔"

"خیر میرا وقت تو گزر گیا۔" میں نے کہا۔ "اب تو تم کہیں بھی میری جاب کی فکر کرو۔"

"خیر..... تمہارا وقت تو اب آیا ہے۔" وہ عجیب انداز میں بولا۔ "اس لیے کہ تمہاری ملاقات مجھ سے ہو گئی ہے تم ایسا کرو۔ ایم اے ہو جاؤ۔"

"خوش حال بھائی ایم اے ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔" میں نے خوفزدہ انداز میں کہا۔ "میں چھ سال کہاں سے لاؤں؟"

"چھ سال نہیں پیارے صرف چھ دنوں کی بات ہے۔ چھ دنوں میں تمہیں ایم اے کی ڈگری مل جائے گی۔" اس نے میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"خوش حال بھائی کہاں سے ملے گی ایم اے کی ڈگری؟"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں دلوا دوں گا لیکن کچھ پیسے خرچ کرنے پڑیں گے۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ جعلی ڈگری؟"

"ظاہر ہے۔"

"نہیں خوش حال بھائی میں جعلی ڈگری نہیں لے سکتا۔ یہ میرے ضمیر کو پسند نہیں آئے گا۔ اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ علامہ اقبال کا یہ شعر صرف تم ہی نے پڑھا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "بھائی میرے اس ملک کے نہ جانے کتنے کامیاب ترین لوگ انہی جعلی ڈگریوں کے ذریعے زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی کامیابی ان ہی جعلی ڈگریوں کی وجہ سے ہے۔ اگر ان میں ایک تم بھی شامل ہو جاؤ گے تو کون سی قیامت آ جائے گی۔" اس نے ہنستے ہوئے میرا مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

"قیامت تو نہیں آئے گی لیکن میرا ضمیر۔"

"ضمیر تو خود اس کے پاس تک نہیں ہوگا جس کا نام ہی ضمیر ہے۔" اس نے کہا۔ "بہر حال میں نے تم کو ایک مخلصانہ مشورہ دے دیا ہے۔ اب اسے ماننا نہ ماننا تمہاری مرضی پر ہے۔"

"ڈگری تو اصل ڈگری جیسی ہوگی نا؟" میں نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھئی بالکل اصل جیسی اور تم نے وہ مشہور مثال نہیں سنی کہ ڈگری تو ڈگری ہوتی ہے چاہے اصلی ہو یا جعلی!"

"پیسے کتنے خرچ ہوں گے؟" میں نے یہ بات سنی ان سنی کرتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔

"فی الحال تو میں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔" اس نے کہا۔

ہر ضرورت منداپنے دلی مقاصد
میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے
خدانخواستہ اگر آپ بھی تنگی ☆ مشکلات اور پریشانیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں ☆ ممکن ہے آپ کی الجھنوں میں کسی دشمن کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہو ☆ باوجہ حسد و بغض آپ کے دنیاوی امور میں رکاوٹ ڈال کر ناکامیوں کو آپ کا مقدر بنانا چاہتا ہو ☆ مثلاً کاروبار میں نقصان/شادی میں رکاوٹ ☆ گھریلو لڑائی جھگڑے، رشتوں میں رکاوٹ ☆ روزی ☆ محبت میں ناکامی ☆ نافرمان اولاد اور ازدواجی زندگی کے کامیاب حل کے لیے ابھی فون کریں contact : faith healer
ماہر عملیات و تعویذات این اے جوہری
0300-2222567

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

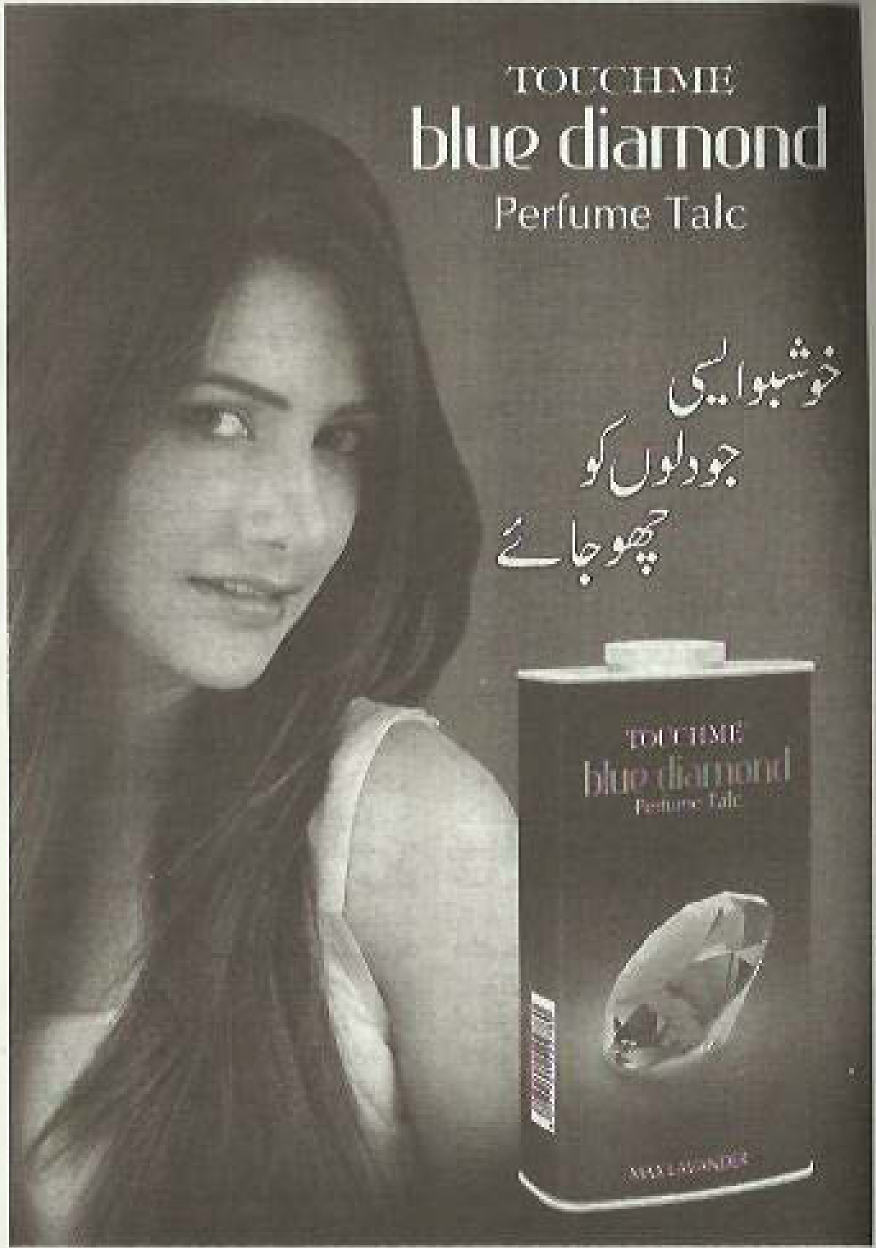

"تم میرے ساتھ چل کر خود ہی دیکھ لینا اور معلوم بھی کر لینا۔"

دوسرے دن وہ مجھے اپنے ساتھ ایک مکان میں لے گیا۔ مکان کا مالک اور میرا دوست خوش حال ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے خوش حال کا استقبال بہت والہانہ انداز میں ہوا تھا۔

دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے رہے پھر خوش حال نے اس آدمی سے میرا تعارف کروایا۔ "سکندر بھائی یہ میرے دوست ہیں نصیب گر آج کل ان کا نصیب خراب چل رہا ہے۔"

"آج کل نہیں شروع سے خراب ہے۔" میں نے درمیان میں ٹوکتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

سکندر بھی مسکرا دیا تھا۔ "کوئی بات نہیں میں سب سمجھ گیا۔ اس گھر میں نصیب بنائے جاتے ہیں۔ آپ یہاں آگئے تو سمجھیں آپ کی پرابلم حل ہو گئی۔ یہ بتائیں کیا چاہیے آپ کو؟"

"آپ بتا دیں آپ کے پاس کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سب کچھ۔ بی اے سے لے کر ایم اے تک۔ ایس سی، ایم کام، پی ایچ ڈی آپ صرف سبجیکٹ بتا دیں آپ کا کام ہو جائے گا۔"

"سکندر بھائی میرے دوست کو ذرا فیکٹری کی سیر تو کرا دو۔" خوش حال نے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔"

ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔ یہاں چار میزیں تھیں اور ان چاروں پر کام ہو رہا تھا۔ "یہ دیکھیں۔" سکندر نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ "اس پر فزکس کی ماسٹر ڈگری تیار ہوتی ہے۔ اس میز پر کیمسٹری کی، اس میز پر بائیولوجی کی اور اس میز پر فارمیسی کی۔ یہ سمجھیں کہ یہ ادارہ سائنس کا سیکشن ہے۔"

"بہت زبردست۔" حیرت سے شاید میری آنکھیں کچھ زیادہ ہی پھیل گئی تھیں۔

"دیکھیں بھائی پہلے مرحلے میں ڈگریوں میں امیدوار کے نام رول نمبرز وغیرہ لکھے جاتے ہیں پھر شعبہ لکھتے ہیں پھر دوسرے قلم کے سائن ہوتے ہیں پھر آخری مرحلے کے طور پر ان کاموں میں انڈر لائن ہوتی ہے تاکہ کسی طرح پکڑے نہ جا سکیں..... یہ سمجھیں کہ بہت محنت اور مہارت کا کام ہوتا ہے محنت میں کوتاہی ویسے بھی جرم ہے۔ آئیں میں آپ کو کامرس کا شعبہ دکھاتا ہوں۔"

کامرس کے شعبے میں بھی چار پانچ آدمی کام کر رہے تھے اس شعبے میں بی کام سے لے کر ایم بی اے اور بی بی اے ایجوکیشن ڈگریاں تیار کی جاتی تھیں۔

"یہ تو بہت زبردست فیکٹری ہے آپ کی۔" میں نے تعریف کی۔

"اب اس طرف آئیں آپ کو ایک خاص شعبہ دکھاتے ہیں۔" اس نے کہا۔

اب ہم جس کمرے میں آئے تھے اس میں بھی چار پانچ آدمی تھے۔ "یہ دیکھیں جناب۔" اس نے اشارہ کیا۔ "یہ صاحب ہومیو پیتھی ڈاکٹرز کی سند تیار کرتے ہیں، یہ حکمت کی اور یہ ایم بی بی ایس کی اور یہ وکالت کی۔"

"یعنی آپ ڈاکٹرز اور وکیل بھی تیار کرتے ہیں۔" اب میری حیرت بہت بڑھ گئی تھی۔

"جی ہاں لیکن ان کی فیس کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹرز کے دو لاکھ وکیل کے ڈیڑھ لاکھ۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"ہمارے اخراجات بھی تو دیکھیں۔" اس نے کہا۔ "اسٹاف کی سیلری، بجلی کا خرچ، اسٹاف کو کھانا اور چائے فیکٹری کی طرف سے پھر ٹرانسپورٹ ان سب پر اچھا خاصا خرچ آجاتا ہے۔"

"نصیب اب تم اپنی بات کرو یار۔" خوش حال نے کہا۔

"مجھے ایم اے اکنامکس کی ڈگری چاہیے۔"

"مل جائے گی۔" اس نے کہا۔ "آپ چونکہ خوش حال کے ساتھ آئے ہیں اس لیے صرف پچیس ہزار لگیں گے۔"

"رہے دو بھائی پچیس ہزار۔" خوش حال جلدی سے بولا۔ "اس ڈگری سے تم نہ جانے کتنے پچیس ہزار کما لوگے۔"

"اوکے میں کل ہی بندوبست کر کے دیتا ہوں۔"

اب میں اپنی آرزوئیں، اپنی خواہشات پوری کر سکتا تھا۔ میں اپنی وہ محبت بھی حاصل کر سکتا تھا جو جاب نہ ہونے کی وجہ سے اب تک حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

اب میں یہ خوش خبری شاہدہ کو سنانے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے اسے فون کیا۔ میری آواز سن کر وہ چونک اٹھی تھی۔ بظاہر ناراض ناراض سے لہجے میں بولی۔ "ابھی تم مرے نہیں تھے اتنے دنوں سے؟"

"مرا نہیں تھا، بلکہ زندہ رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ''ویسے میں فوری طور پر تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ اس خوشی کے موقع پر تمہاری چاند سی صورت میرے لیے نیک شگون ثابت ہوگی۔''

''کہاں آجاؤں؟''

''وہیں کیفے ولدار میں لیکن کچھ کھانے پینے کے پیسے لیتی آنا۔ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ لیکن حالات بدلتے ہی سارے قرض اتار دوں گا۔''

اس نے برا سا منہ بنایا تھا لیکن ولدار کیفے پہنچ گئی تھی۔

''ہاں اب بتاؤ کیا تیر مارا ہے تم نے؟''

''اس طرح نہیں پہلے کچھ آرڈر دو۔''

بہرحال اس نے سموسے اور چائے منگوا لیے تھے۔

''ہاں اب بتاؤ کیا بات ہوئی ہے؟''

''شاہدہ میں تمہاری دعا سے اکنامکس میں ماسٹر ہوگیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کیا بکواس کررہے ہو۔ پچھلے ہفتے تک تو صرف انٹر تھے۔ اب ایم اے کیسے ہوگئے؟''

''اس لیے کہ ایم اے کی ڈگری ہے میرے پاس۔ بالکل اوریجنل۔'' میں نے بتایا۔ پھر اسے ساری کہانی سنادی کہ میں نے کس طرح یہ ڈگری حاصل کی ہے۔

''لعنت ہو تم پر۔'' وہ سننے کے بعد بولی۔ ''اب کیا تم اس جعلی ڈگری کے ذریعے زندگی گزارو گے؟''

''شاہدہ شاید تم نہیں جانتیں..... ایک قول کے مطابق..... کہ ڈگری ڈگری ہوتی ہے، چاہے وہ اصل ہو یا جعلی۔''

''اور علم۔ وہ کہاں سے آئے گا؟''

''چھوڑو علم کو۔ آج کل ڈگری دیکھی جاتی ہے۔ علم کو کون پوچھتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم خود بتاؤ کیا سکندر اعظم کے پاس کوئی ڈگری تھی؟''

''نہیں۔ میرے علم کے مطابق اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔''

''پھر بھی وہ دنیا کا کامیاب ترین انسان تھا۔'' میں نے کہا۔ ''بہرحال اب تم یہ خبر سن لو کہ مجھے بہت اچھی جاب مل گئی ہے کیونکہ میں اکنامکس میں ایم اے ہوں۔''

اس کے بعد میں نے جاب تلاش کرنے کی مہم اور تیز کردی۔ میں نے اپنے کئی دوستوں کو یہ خوش خبری سنادی تھی کہ اب میرے دن بدلنے والے ہیں کیونکہ میرے پاس ڈگری آ گئی ہے اور وہ سب ہی حیران ہونے جارہے تھے۔ بالآخر ایک فرم میں مجھے ایک اچھی جاب مل گئی تھی۔

فرم کا مالک میری ڈگری سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ''نصیب صاحب ہماری اس فرم کو آپ ہی جیسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ سارا کام خوبی کے ساتھ سنبھال لیں گے۔''

دفتر کا پہلا دن بہت خوش گوار گزرا تھا۔ ایک دوسرے سے تعارف ہوتا رہا۔ کھانے پینے کا سلسلہ چلتا رہا لیکن دوسرے ہی دن ایک فائل میرے پاس آ گئی۔ اس میں اعداد و شمار کا ایک گورکھ دھندا پھیلا ہوا تھا اور میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

میں نے پوری دیانت داری سے اس فائل پر لکھ دیا۔ ''سوری۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔''

فرم کے مالک نے فوری طور پر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ ''نصیب صاحب۔ یہ کیا مذاق ہے۔ آپ تو ایم اے اکنامکس ہیں۔ پھر بھی آپ کچھ نہیں سمجھ سکے۔''

''جناب۔ میرے پاس تو بس ڈگری ہے..... '' میں نے بتایا۔ ''میں نے یہ کب کہا کہ میرے پاس علم بھی ہے۔''

''صاف صاف کہو۔''

''صاف صاف یہ کہ ڈگری..... جعلی ہے۔''

''کیا..... جعلی ڈگری؟'' بے چارہ مالک کئی فٹ اوپر اچھل پڑا تھا۔ ''آپ کے پاس جعلی ڈگری ہے؟''

''جی ہاں جناب اور میری خوبی یہ ہے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' میں نے کہا۔

''اور تم یہ جعلی ڈگری لے کر ہماری فرم میں جاب کرنے آئے ہو۔''

''ظاہر ہے۔ میرے پاس ایم اے اکنامکس کی ڈگری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور یہ کوئی معمولی ڈگری نہیں ہوتی۔ لوگ اس کے خواب دیکھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں خواب دکھلاتا ہوں۔'' وہ غصے سے بھنا رہا تھا۔

اس کے کہنے پر دفتر والوں نے مجھے پکڑ لیا۔ حالانکہ میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن میری تو کبھی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ پولیس مجھے اٹھا کر لے گئی۔

مختصر یہ کہ مجھے دو سال کی سزا ہوگئی۔

ایک بار جیل میں خوش حال مجھ سے ملنے کے لیے آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''یار۔ یہ کیا چکر ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ جعلی ڈگریوں کے سہارے باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ وزیر، مشیر اور وکیل لگے ہوئے ہیں۔ انہیں تو کچھ نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''اس لیے کہ تو ایک نمبر کا بے وقوف انسان ہے۔'' خوش حال نے کہا۔ ''تجھے ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ جتنے بھی کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ پہلے کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ان کی ڈگری کے جعلی ہونے کا پتا چلا ہے لیکن جب تک وہ ظاہر ہوتے..... کامیاب زندگی کا لائسنس حاصل کر چکے تھے اور تو نے تو پہلے دن سے ہی اعلان کرنا شروع کر دیا کہ میرے پاس جعلی ڈگری ہے۔''

''خوش حال بھائی۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔ میں نے تو یہ سوچ کر بتانا شروع کر دیا تھا کہ خود ہمارے ایک لیڈر کہہ چکے ہیں کہ ڈگری ڈگری ہوتی ہے۔ چاہے وہ اصلی ہو یا جعلی۔''

''بے وقوف۔ اس قسم کی ڈگریوں کا اعلان صرف بڑے لوگوں کو راس آتا ہے۔ تجھ جیسے لٹ پونجیوں کو نہیں۔ اپنی اوقات دیکھ کر بات کیا کر۔''

''تو کیا ان کے لیے قانون کچھ اور ہوتا ہے؟''

''ہاں۔ بالکل کچھ اور ہوتا ہے۔ تو خود سوچ۔ کیا تو کسی بینک کے پچاس ہزار روپے ہضم کر سکتا ہے؟''

''ہرگز نہیں۔''

''تو پھر انہیں دیکھ۔ وہ پچاس پچاس کروڑ ہضم کر جاتے ہیں اور ان کا کچھ نہیں ہوتا۔ تو تو پاگل آدمی ہے۔ دو کوڑی کی حیثیت اور شوق نوابوں والے۔''

''خوش حال بھائی۔ تمہاری ناراضی اپنی جگہ۔ تم یہ بتاؤ کہ سکندر اور اس کی فیکٹری کا کیا ہوا کیونکہ میں نے پولیس کی مار کے بعد اس کا نام بھی بتا دیا تھا۔''

''اس کا کیا ہوتا ہے۔ پولیس کے جس بڑے آفیسر نے اسے پکڑا تھا اس کے پاس بھی سکندر بھائی کی دی ہوئی ڈگری تھی۔''

''سمجھ گیا۔ پھر اس کا تو کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ مارا میں گیا۔''

''اب دو سال جیل گزار اور باہر نکل کر بھیک مانگ۔'' خوش حال چلا گیا۔ میں نے جیل کے یہ دو سال کس طرح گزارے۔ اس کا اندازہ آپ کو میری داستان کا اگلا حصہ پڑھنے کے بعد ہو جائے گا۔

شاہدہ نے تو مجھ پر تین حرف بھیج ہی دیے تھے۔ گھر والوں نے بھی مجھ سے تعلق ختم ہی کر دیا تھا۔ کسی کو بھی میری پروا نہیں رہی تھی۔ لیکن مجھے سب کی پروا تھی اور سب کو یاد کرتا رہتا تھا۔

دو سال کے بعد جب باہر آیا تو میں ایک مختلف انسان بن چکا تھا۔

میں نے باہر آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ راول کو پکڑا۔ راول کا پتا مجھے جیل سے معلوم ہوا تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ راول میرا یہ کام کر سکتا ہے۔

راول کے پاس استاد پیڈرو نے بھیجا تھا۔ عجب نام تھے ان لوگوں کے۔ میں نے جب راول کو استاد پیڈرو کا حوالہ دیا تو وہ میرے آگے پیچھے ہونے لگا۔ ''بتاؤ بھائی۔ کیا چاہیے میرے سے۔ بولو تو جان بھی حاضر ہے۔''

''نہیں جان نہیں چاہیے۔ بس یہ سمجھ لو کہ میرا نام نصیب ہے لیکن آج سے میں زبیر شاہ ہوں۔''

''سب سمجھ گیا۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''یعنی تم کو ایک جعلی شناختی کارڈ چاہیے۔''

''ہاں۔''

''بس تم پروا ہی مت کرو۔ راول سب کچھ کرا دے گا۔''

''اس لیے تو استاد نے تمہارے پاس بھیجا ہے لیکن میرے پاس پیسے ویسے نہیں ہیں۔''

''ارے بھائی۔ تم سے کون مانگتا ہے بلکہ یہ لو پانچ ہزار۔'' اس نے پانچ ہزار روپے دے دیے۔ ''بس میرے ساتھ شناختی کارڈ کے دفتر چلو۔''

''یار وہاں کوئی گھپلا نہ ہو جائے۔''

''کیا بات کرتا ہے۔ تم راول کے ساتھ جا رہا ہے۔''

میں اس کے ساتھ شناختی کارڈ کے دفتر آ گیا۔ کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ صرف تین دن بعد میں زبیر شاہ بن چکا تھا۔ ایک نیا انسان۔ نیا نام۔ نیا ایڈریس۔ نئی زندگی۔

اس کے بعد میرا جعلی پاسپورٹ بھی بن گیا اور کمال یہ تھا کہ اس پاسپورٹ کے مطابق میں پندرہ سال بعد ساؤتھ افریقا سے پاکستان واپس آیا تھا۔ حالانکہ میں نے کبھی اپنے شہر کا بھی ایئرپورٹ نہیں دیکھا تھا لیکن پندرہ سال ساؤتھ افریقا میں گزار آیا تھا۔ اب اس سے بڑا کمال اور کیا ہو سکتا تھا۔

راول کسی جن کی طرح میرے کام آ رہا تھا۔

''ہاں بھائی۔ اب بتاؤ۔'' راول نے پوچھا۔ ''ابھی میرے لیے کیا حکم ہے۔''

''تم تو یار کوئی جن معلوم ہوتے ہو۔'' میں نے اس کی تعریف کی۔ ''اب تم میرے لیے کیا کرو گے؟''

''پوری پلاننگ معلوم ہے والا۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے ساؤتھ افریقا میں پندرہ برس گزارے ہیں۔ تم کالے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جادو کے وزیر ہو۔ تم سننے والے کی چال اور دلوں کے حال
جانتے ہو۔ تمہاری ایک نگاہ بندے کا بیڑا پار کر دیتی ہے۔ تم
کسی کو بھی اعلیٰ عہدے دلا سکتے ہو۔"

"بس بس اتنا بہت ہے۔" میں اس پر چڑا۔ "تو کل سے
کام شروع کر دیا جائے۔"

اور کام شروع ہو گیا۔

میرے چہرے پر داڑھی آ گئی۔ آنکھوں میں جلال
اور جمال آ گیا۔ شاندار گاڑی آ گئی۔ ایک آستانہ بن گیا۔
پورے ملک میں میری شہرت پھیلتی گئی۔ بچپن کا کام رول
اور اس کے چیلوں نے اتنی ہوشیاری سے سنبھالا تھا کہ خود میں
بھی دنگ رہ گیا تھا۔

کون نہیں آتا تھا میرے پاس۔

بڑے بڑے سرکاری آفیسرز، سیاست دان، فنکار،
دانش ور زندگی کے ہر طبقے اور ہر شعبے کے لوگ۔

پھر میں نے عوام کے بے حد اصرار پر اور ان کی فلاح
و بہبود کے لیے ایک سیاسی پارٹی جوائن کر لی۔ میری صلاحیتیں
کھل کر اب سامنے آ رہی تھیں۔

میں بادشاہ تو نہیں تھا لیکن بادشاہ گر بن چکا تھا۔
میرے اشارے پر لوگوں کو وزارتیں مل جاتی تھیں۔ وہ الیکشن
میں ہار یا جیت جاتے تھے۔

میں نے ثابت کر دیا تھا کہ میں کم صلاحیت کا انسان
نہیں ہوں۔ ملک میں بہت کچھ کر سکتا ہوں اور کرتا چلا جا رہا تھا۔
ایک بار میرا پرانا دوست خوش حال بھی نہ جانے کس چکر میں
میرے پاس آ گیا تھا۔

اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ وہ مجھ سے بے انتہا
مرعوب ہو رہا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس کی زبان
لڑکھڑا رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"بدبخت انسان۔ تو نے کیا اپنے آپ کو تقدیر کا مالک سمجھ رکھا
ہے۔ یا تجھے یہ خیال ہے کہ تو جو کہے گا وہ ہو جائے گا۔"

"نہیں سرکار۔ میری ایسی مجال کہاں ہو سکتی ہے۔" وہ
کانپنے لگا تھا۔

"پھر تو نے یہ کیوں کہا تھا کہ تو جیل سے نکل کر بھیک
مانگے گا۔"

"نہیں تو سرکار۔ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔"
وہ پریشان ہو کر بولا۔

"یاد کر۔ اب سے تین سال پہلے تو نے ایک آدمی
سے یہ کہا تھا۔ جب تو اس سے ملنے جیل گیا تھا۔"

"جی ہاں سرکار یاد آ گیا۔" اب وہ اور زیادہ کانپ رہا
تھا۔ "آپ تو روشن ضمیر ہیں۔ لیکن وہ بندہ ہی ایسا تھا۔"

"بدبخت آنکھیں کھول کر دیکھ۔ میں وہی ہوں۔"

اس بار اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ "ارے تو۔ میرا
مطلب ہے تم۔ یعنی کہ آپ سرکار۔"

"گھبراؤ نہیں خوش حال۔ میں وہی نصیب ہوں۔"
میں نے کہا۔ "اور اب یہ دیکھو کہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا
ہوں۔"

"لیکن یہ کیسے ہوا؟"

"یہ اس طرح ہوا کہ میں نے تمہاری بات اپنے پلے
باندھ لی تھی۔" میں نے کہا۔ "یعنی میں نے اپنا [illegible]
ختم کر دیا اور خاموشی سے کام کرتا رہا اور اب دیکھ لو۔ میں
شاید اس ملک کا سب سے زیادہ اہم انسان ہوں۔ میرے
پاس کوئی چیز بھی اصلی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں اس
معاشرے کا معزز ترین فرد ہوں۔"

"تو ثابت ہو گیا نا کہ بد اچھا اور بدنام برا ہوتا ہے۔"
خوش حال نے کہا۔

"ہاں۔ ثابت ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میں
اس وقت تک معزز رہوں گا جب تک میرا اصلی ہونا ثابت نہ
ہو جائے۔"

"اور جس دن ثابت ہو گیا اس دن تمہارا کیا حشر
ہو گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔
"میرے پاس وہ شاندار کارساز اور ہیں۔ وہ مختلف ناموں
سے لوگ زیر شاہ کو ڈھونڈتے رہ جائیں گے اور میں کسی
اور جگہ کسی اور نام سے اپنی دکان چمکا رہا ہوں گا۔ جہاں میں
اہل ایمان صورت خورشید جیتے تھے۔ ادھر ڈوبے ادھر نکلے
ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔"

تو آج تک میں زیر شاہ ہوں۔ کسی نے اب تک مجھے
جعلی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ میرا بزنس زوروں
پر جا رہا ہے۔ میں دن دونی رات چوگنی ترقی کیے جا رہا
ہوں۔

ہاں۔ یہ اور بات ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے قانون
کے رکھوالوں نے کچھ کام دکھانا شروع کر دیا ہے۔ اسی لیے
کسی حد تک پریشانی ہوئی ہے۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں ملک
خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست۔ جب تک اس ملک
میں سکندر جیسے آدمیوں کی فیکٹری چلتی رہے گی، ہمارا کچھ نہیں
ہونے والا۔

اگر

شمس صغیر ادیب

یہ خواہشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں... انسان کی آنکھوں میں کیسے کیسے خواب بسا دیتی ہیں مگر... جب یہ خواب عذاب میں ڈھلتے ہیں تو دل میں درد کی ایسی لہریں اٹھتی ہیں کہ آنکھیں پیاسی ترسیں، لہو برساتی ہیں اور... جب لہو کے رشتے بھی پانی ثابت ہو جائیں تو آنکھوں میں پیاس بسیرا کر لیتی ہے۔

اپنے گھر کا خواب دیکھتے دیکھتے رشتوں کی پہچان کھو دینے والی آنکھوں کا ماجرا

جب کار روانہ ہوئی تو سہ پہر شروع ہو رہی تھی۔ موسم
خلاف توقع بہت اچھا تھا۔ آسمان صاف تھا اور ہر طرف چمکتی
دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور فضا خاصی گرم تھی۔ رام گاڑی چلا
رہا تھا۔ سیتا اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی جبکہ ممتا دیوی، شیام اور گیتا
پچھلی سیٹ پر براجمان تھیں۔ گیتا تین سال کی تھی جبکہ شیام کا
چھٹا سال شروع ہونے والا تھا۔ وہ دونوں عادت کے مطابق
آپس میں لڑنے جھگڑنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ وجہ وہی
تھی جس پر وہ دونوں اکثر جھگڑتے تھے یعنی پیپرمنٹ اور بیٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں میں سے کون زیادہ طاقتور ہے۔ گیتا بیٹ مین کی فین تھی جبکہ شیام کا ہیرو سپر مین تھا۔

گیتا پرجوش لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "بیٹ مین، سپر مین کو مار سکتا ہے۔"

"نو چانس۔" شیام نے بھی اسی جوش اور یقین سے کہا۔ "سپر مین بہت اسٹرانگ ہے۔ وہ بیٹ مین کو کل (Kill) کر سکتا ہے۔"

ممتا دیوی افسردگی سے مسکرائیں۔ جانے آج کل کے بچے قتل، خون اور ہتھیاروں کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ شیام کے پاس جو کھلونے تھے، ان میں بندوقیں، پستول اور ٹینک وغیرہ شامل تھے۔ یہی حال گیتا کا تھا۔ ویسی کار، رائفل، بیٹ مین اور نہ جانے کیا کیا۔ دونوں بچے بھی ان میں باقاعدہ جنگ کا کھیل کھیلتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھر بناتے تھے، پھر گنوں اور رائفلوں سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے تھے۔ ٹھاہ... ٹھاہ... ٹھاہ... پھر کھیل میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے مرنے کا سوانگ بھی رچاتے تھے۔

"میری گولی تمہیں لگ گئی ہے۔ تم مر جاؤ۔"

"اچھا..." گیتا کہتی۔ "مگر اگلی بار تم مرنا۔"

"ٹھیک ہے۔"

گیتا آنکھیں بند کر کے گھاس پر اوندھی لیٹ کر مر جاتی۔

یہ موت اور ہتھیار اور گھروں پر حملہ... یہ سب کیا ہے؟ کیسے کھلونے اور کھیل ہیں یہ؟... ممتا دیوی کو عجیب ہوتا تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کو بھی لگتا تھا۔ وہ بھی تو بچی تھیں۔ گو اب اس بات کو بہت دیر ہو گئی مگر جب ان کا بچپن تھا تو وہ گڑیوں سے کھیلتی تھیں، ہنڈکلیا پکاتی تھیں اور گڑیوں کا بیاہ رچاتی تھیں اور گھروندے بناتی تھیں مگر آج کل کے بچے گھروندے نہیں بناتے، گھر توڑتے ہیں اور بندوقیں چلاتے ہیں۔ ٹھاہ... ٹھاہ... ٹھاہ۔

دونوں کے لڑنے جھگڑنے کی آواز زیادہ بلند ہوئی تو رام نے انہیں ڈانٹا۔

"شیام! گیتا! شور مت کرو... دادی کو آرام کرنے دو۔"

پھر اس نے ممتا دیوی سے کہا۔ "اماں! تم آرام سے سو جاؤ۔"

"ہاں بیٹا! تم فکر مت کرو۔"

"سیتا! تم نے ان کی دوائیں تو رکھ لی ہیں نا؟" اس نے سیتا سے پوچھا۔

"ہاں... میں نے سب چیزیں رکھ لی ہیں۔ دوائیں، مالا، رام جی کی مورتی اور رامائن۔" سیتا نے جواب دیا۔ "بس ایک چیز رہ گئی ہے۔"

"کیا؟"

"پتا جی کی تصویر۔" سیتا نے جواب میں کہا۔ "شیام نے اس کا شیشہ توڑ دیا تھا نا۔"

"کوئی بات نہیں۔ تصویر بعد میں آ جائے گی۔"

چلتے چلتے بعد ممتا دیوی نے پوچھا۔ "رام! کتنی دیر میں پہنچیں گے وہاں؟"

"اماں! ذرا دور ہے۔ میرا خیال ہے آدھا گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔" رام نے راؤنڈ اباؤٹ پر سرخ بتی دیکھ کر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

ممتا دیوی نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر ارادہ بدل دیا۔ انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس لی اور خالی خالی نظروں سے باہر دیکھا۔ کار اب راؤنڈ اباؤٹ کراس کر کے آگے بڑھ گئی تھی اور کشادہ سڑک پر ہموار رفتار سے رواں تھی۔ سڑک کے ایک جانب چھوٹے چھوٹے درختوں کی طویل قطار تھی۔ درختوں کے عقب میں دور تک سبزے سے ڈھکا میدان تھا جس میں کہیں کہیں اکا دکا پیڑ اور جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ جبکہ دوسری جانب سرخ اینٹوں والے خوبصورت مکانات تھے، قطار اندر قطار اور سنہری دھوپ میں وہ مکان کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

ممتا دیوی ایک حیرت آمیز دلچسپی سے ان مکانوں کو دیکھتی رہیں۔ مکان، گھر، چھوٹے چھوٹے خوبصورت گھر، جن میں چھوٹے چھوٹے لوگ، چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی زندگیاں جیتے ہیں۔ گھر... ممتا دیوی کے لیے گھر ہمیشہ ایک خواب کے مانند رہا تھا اور ان کا سارا جیون اور جوبن کا ایک ایک پل اس خواب کی تعبیر کی جستجو میں گزر گیا تھا۔ جب تک بچپن تھا، تب تک احساس نہیں تھا کہ اپنے گھر اور کرائے کے مکان میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ان کے پتا کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے، کھپریل کی چھت، مختصر سا صحن اور چھوٹا سا آنگن، دروازے پر پھٹا ہوا ٹاٹ کا پردہ جھولتا رہتا۔ مکان کی حالت اور ان کے پتا کی مالی حالت میں برائے نام فرق بھی نہیں تھا کہ دونوں ہی خستہ تھیں۔

☆☆☆

ممتا دیوی کی عمر کوئی گیارہ بارہ سال تھی جب پہلی بار انہیں احساس ہوا کہ جس گھر میں وہ رہتی ہیں وہ ان کا نہیں، پرایا ہے۔ یہ احساس بھی ہوا کہ گھر اپنا نہ ہو تو آدمی کتنا بے وقعت ہوتا ہے اور یہ احساس اس بنا پر ہوا کیونکہ ایک دن

انہوں نے مالک مکان چوبے لال کو اپنے پتا پر ناراض ہوتے دیکھا اور سنا۔ کئی ماہ سے کرایہ ادا نہیں ہوا تھا۔ چوبے لال، لال پیلا ہو رہا تھا اور ان کے پتا جی خوشامد کر رہے تھے۔

"اگر آپ نے کرایہ جلدی ادا نہیں کیا تو سامان اٹھا کر پھنکوا دوں گا۔"

"نہیں چوبے لال جی! ایسا نہ کہیں... میں جلد ہی کوئی بندوبست کروں گا۔ اطمینان رکھیں۔"

ممتا دیوی کے دل میں دراڑ سی پڑ گئی۔ وہ مکان جو ہمیشہ انہیں اپنا سا لگتا تھا، جانا پہچانا، اب غیر محسوس ہونے لگا۔ من میں ایک آرزو ابھری۔ اپنے گھر کی آرزو... ایک ایسا گھر ہونا چاہیے جس کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک پل اپنی ہو اور کبھی ایسا نہ ہو کہ کوئی چوبے لال سامان اٹھا کر باہر پھینکنے کی دھمکی دے۔ ان کے پتا کیا، وہ خود بھی اس قابل نہ ہو سکے کہ "اپنا" گھر بنا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں اپنے گھر کی آرزو دہکتی ہوتی چلی گئی۔

شادی ہوئی، وہ انگلستان پہنچیں۔ اپنے گھر کا خواب پھر بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ ان کے پتی گھنشیام بھی ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ ایک فیکٹری میں لیبر جاب کرتے تھے۔ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی کی کفالت کی ذمے داری بھی ان کے سر تھی۔ آمدنی کا ایک حصہ ہر ماہ نکل جاتا تھا۔ کونسل کے فلیٹ میں رہائش تھی۔ کرائے کی ادائی اور دیگر اخراجات کے بعد اتنا بچتا ہی نہ تھا کہ گھنشیام جی مکان خریدنے کے بارے میں سوچ بھی سکتے۔ ممتا دیوی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ گھنشیام جی انگلستان میں رہتے ہیں، ان کے مالی حالات یقیناً بہتر ہوں گے لہٰذا انہیں مکان مل جائے گا، اپنا مکان، ذاتی۔ جس کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پل ان کی اپنی ہو گی لیکن یہ آرزو تشنہ ہی رہی۔

آدمی پیاسا ہو اور پانی نہ ملے تو پیاس اور بڑھتی ہے۔ منزل نظروں سے اوجھل ہو تو منزل تک پہنچنے کی تڑپ میں اور بھی شدت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ممتا دیوی کا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرا اور اپنے گھر کا خواب پورا ہوتا نظر نہ آیا، ویسے ویسے ان کی خواہش بڑھتی گئی۔ جو بھی ہو، ایک دن وہ اپنا گھر ضرور بنائیں گی۔ گھنشیام جی ایک صابر اور قانع آدمی ہیں۔ ان کی خواہشات محدود ہیں۔ جو کچھ اور جتنا کچھ میسر ہے، اس میں خوش رہتے ہیں لیکن وہ اس صورت حال کو بدل دیں گی۔ وہ ان کا حوصلہ بڑھائیں گی۔ ان کے دل میں امنگ پیدا کریں گی اور ان کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر جدوجہد کریں گی اور ایک دن... ہاں، ایک دن اپنا سپنا

سیاسی پارٹیاں

آپ ذرا تھوڑا سا ماضی میں جھانکیے کیا کیا نام سامنے آتے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی، جناح عوامی لیگ، عوامی لیگ، آزاد پاکستان پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی، عوامی مسلم لیگ، جسٹس پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور نہ جانے کیا کیا پارٹیاں تھیں۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

یہ پارٹیاں اس طرح ٹوٹیں کہ کوئی ان کا نام لیوا تک نہ رہا حالانکہ ان میں سے بعض برسر اقتدار بھی رہیں۔ مگر دیکھیے، مٹے ناموں کے نشان کیسے۔ وہ جو غالب نے کہا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

چنانچہ پارٹیاں بنتی بھی رہیں اور ٹوٹتی بھی رہیں۔ پھر ان میں سے نئی نئی پارٹیاں جنم لیتی رہیں۔ مارشل لا کے دور میں کیا کیا پارٹیاں وجود میں آ گئیں، کیسے کیسے حامی پیدا ہوئے، لیکن وقت کا دھارا سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اب وہی لوگ جمہوریت کے گن گا رہے ہیں، جمہوریت کی خوبیاں گنوا رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مارشل لا والے بھی جمہوریت کے فوائد بیان کر رہے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری قوم کا حافظہ ہمیشہ سے کمزور چلا آ رہا ہے۔ لاکھ روغن بادام ملو، چاہے جتنا خمیرہ گاؤزبان عنبریں کھلاؤ، کتنا ہی شربت انار دو، ان کی یادداشت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا دو روپے۔ جیسے حساب صاف ہو گیا۔

معاف کیجیے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پارٹیاں ٹوٹی ہی نہیں بنی بھی ہیں۔ ایک ایک پارٹی سے کئی کئی بنی ہیں۔ اب مسلم لیگ ہی کو دیکھیے۔ کتنی لیگیں بن گئیں۔

اقتباس: سرخ سفید سیاہ از شفیع عقیل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرور پورا کریں گی۔

اپنا گھر.....!

گھنشیام جی نے ایک بار خود بھی کہا تھا۔

''مکان کی خواہش تو میری بھی ہے۔ سر پر اپنی چھت ہو تو آدمی کو تحفظ کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ میرے حالات نے اب تک اجازت نہ دی مگر اب تم آ گئی ہو تو دونوں مل کر کوشش کریں گے اور بچوں کے لیے ایک گھر بنائیں گے۔''

مگر ابھی رام اور رادھا چھوٹے ہی تھے کہ گھنشیام جی ممتا دیوی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ بیماری بظاہر معمولی سی تھی مگر جان لیوا ثابت ہوئی۔ بستر مرگ پر آنکھیں بند کرنے سے پہلے انہوں نے آبدیدہ ہو کر ممتا دیوی سے کہا تھا۔

''مجھے معاف کر دینا..... میں تمہیں کوئی گھر نہ دے سکا۔''

پتی کا خیال آیا تو ممتا دیوی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی اور وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو کر بیتے دنوں کے جنگل میں گم ہو گئیں۔

☆☆☆

کار اب ایک ایسی سڑک پر چل رہی تھی جس پر دو رویہ گھنے درخت تھے۔ ان کا چھدرا سایہ کسی تجریدی تصویر کی طرح سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔ دائیں جانب قدرے اونچائی پر مکانوں کی قطاریں تھیں جن کے بیرونی باغیچوں میں گلاب، ڈہلیا، گلِ شبو اور دوسرے پودے لگے تھے۔ ممتا دیوی نے ذرا حسرت سے ان چھوٹے چھوٹے باغیچوں کو دیکھا۔ انہیں پھول پھلواری کا بھی بہت شوق تھا۔ کونسل کے فلیٹ میں کوئی باغیچہ نہیں تھا جس میں پھول پودے لگائے جا سکتے۔ صرف ایک چھوٹی سی چند بالکونی تھی۔ ممتا دیوی اس بالکونی میں چند گملے رکھ کر اپنا شوق کسی حد تک پورا کیا کرتی تھیں لیکن سوچتی رہتی تھیں کہ جب بھی مکان میں گی تو اس بات کا خیال رکھیں گی کہ مکان میں کشادہ سا باغ ضرور ہو گا کہ وہ ایک خوبصورت باغیچہ بنائیں اور اس میں ڈھیر سارے زرد گلاب لگائیں۔ انہیں زرد گلاب بہت پسند تھے مگر یہ آرزو بھی تشنۂ تکمیل ہی رہی۔

یکایک ان کی توجہ رام کی طرف مبذول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ماں! تم نے موسی کو چٹھی لکھ دی ہے؟''

''ہاں..... کل ہی تو لکھی تھی۔'' انہوں نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

''انہیں اس بارے میں تو کچھ نہیں لکھا ہے نا؟'' اس نے ''اس'' پر بطور خاص زور دیا۔

''نہیں۔'' ممتا دیوی نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اور لکھنا بھی نہیں۔'' رام نے مزید کہا۔ ''خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے وہ لوگ۔''

ممتا دیوی چپ رہیں۔ بیتا نے اپنے شانوں تک آتے ہوئے بالوں کو ہولے سے جھٹکا دیا۔ ''اب ان لوگوں کو یہاں کے حالات اور مسائل کے بارے میں کچھ معلوم تو ہے نہیں۔ وہ ان سب باتوں کو اپنی نظر سے دیکھیں گے اور بیہودہ باتیں کریں گے۔ انہیں تو سمجھایا بھی نہیں جا سکتا۔''

''ہاں..... یہ تو ہے۔'' رام نے [illegible] ہوئے کہا۔ ''اور ماں! تم نے چاچی کو بھی چٹھی لکھی تھی؟''

''ہاں۔''

''تم نے روپے کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے؟''

''ہاں۔''

''وہ شاید برا تو مانیں گی مگر کیا کیا جائے؟ جتنا روپیہ انہوں نے مانگا تھا، اتنا بھیجنا تو ممکن نہیں تھا۔ اس لیے کم بھیجا ہے۔ تم نے لکھ تو دیا ہے نا کہ ابھی گنجائش نہیں۔''

''ہاں، لکھ دیا ہے۔'' ممتا دیوی نے مدھم آواز میں کہا۔

بیتا نے ایک بار پھر اپنے سیاہ چمکیلے بالوں کو جھٹکا دیا۔

''یہ تو واقعی بڑی مصیبت ہے۔ وہاں والے تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہاں نوٹوں کے پیڑ لگے ہیں۔ جب انہیں ضرورت پڑتی ہے، توڑ لیتے ہیں۔'' اس کا لہجہ کچھ اور خشک اور تیکھا ہو گیا۔ ''اب انہیں کون سمجھائے کہ یہاں ہمارے سر پر بھی کس طرح کے خرچے ہیں۔ اوپر سے بچوں کی ذمے داری۔ اب اتنا کہاں سے لائیں کہ ان کے آئے دن کی مانگیں پوری کریں۔ لیکن انہیں ان باتوں سے کیا غرض۔ کبھی موسی نے مطالبہ کر دیا، کبھی چاچی نے، کبھی ماما نے۔ میں تو بھی تنگ آ جاتی ہوں۔''

ممتا دیوی نے بیتا کے ترشے ہوئے جدید فیشن کے بالوں، گردن میں چمکیلے طلائی ہار اور کانوں میں جھولتے ہیروں کے ٹاپس کو دیکھا اور افسردگی سے مسکرا دیں۔

پھر انہوں نے کھڑکی سے باہر نظریں جما دیں۔ کار ایک موڑ پر گھوم رہی تھی۔ کونے والے مکان کا بیرونی باغیچہ خاصا کشادہ تھا۔ باغیچے کی چہار دیواری کے ساتھ ساتھ گلاب کے کئی پودے تھے جن میں سفید، سرخ اور زرد گلاب کھلے ہوئے تھے..... زرد گلاب..... انہوں نے پژمردگی سے سانس لی۔

☆☆☆

گھنشیام جی تو چلے گئے تھے۔ اب ممتا دیوی تھیں

اور دو چھوٹے چھوٹے بچے، رام اور رادھا اور ایک مسلسل جدوجہد۔ تاہم انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اس پر کٹھن سفر میں، حالات سے ہار نہیں مانیں گی، لڑتی رہیں گی۔ اپنے لیے نہیں، بچوں کے لیے۔ ان کی اپنی زندگی تو محرومی اور انتظار ہی میں گزری تھی۔ محرومی کہ انہیں کچھ نہیں ملا تھا۔ ان کا ہاتھ اس بھکاری کے کشکول کی طرح خالی رہا تھا جسے سارا دن صدا لگانے کے بعد بھی بھیک نہ ملی ہو اور انتظار کہ کبھی تو وہ دن آئے گا جب انہیں اپنے سپنے کی تعبیر ملے گی۔ ایک گھر، جو ان کا اپنا ہو گا۔ ایک ایک اینٹ، ایک ایک کیل ان کی ملکیت ہو گی اور وہ اپنی ذات کے پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ اس گھر میں رہ سکیں گی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے بچوں کو بھی اس محرومی اور انتظار سے دوچار ہونا پڑے۔ چنانچہ ہمت باندھی اور حالات سے لڑنا شروع کیا۔

اب دھیان آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ ان کی جدوجہد کی کہانی بائیس تئیس برسوں پر پھیلی ہوئی تھی اور اب انہیں یقین کرنے میں مشکل ہوتا ہے کہ آخر کس حد تک وہ حالات کے پرخار راستے پر ننگے پاؤں چلی تھیں۔ کیا کچھ ہوا..... مڑ کر دیکھتی ہیں تو حد نظر تک زخمی پیروں کے نشان نظر آتے ہیں اور انہیں یقین آتا ہے کہ واقعی وہ اس راستے پر قدم بہ قدم چلی ہیں مگر یہ سفر آسان بہرحال نہیں تھا۔ بڑے آزار سہے تھے انہوں نے۔ بہت دکھ اٹھائے تھے۔ ہر شام مرتی تھیں اور ہر صبح جیتی تھیں اور ہر چند کہ جینے اور مرنے کا یہ عمل حد درجہ اذیت ناک تھا مگر پھر بھی انہوں نے اپنا حوصلہ نہیں ٹوٹنے دیا۔ صرف ایک مقصد کے لیے، یہ کہ ان کے بچے ہیں اور بچوں کے لیے، رام اور رادھا کے لیے وہ وقت کی ساری پدکھونیاں اپنے سر لے لیں گی لیکن بچوں پر آنچ نہیں آنے دیں گی۔ تعلیم تو تھی نہیں لہٰذا انہوں نے کبھی بچوں کے اسکول کے کچن میں برتن دھوئے، کبھی اسپتال میں فرش صاف کیا، کبھی کپڑے سیے اور کبھی کسی سپر اسٹور میں کام کیا۔ بیچ بیچ میں اکثر بیکاری کا سامنا بھی ہوا۔ تب حکومت کی طرف سے ملنے والے بیکاری الاؤنس پر گزارا کرنا پڑا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور ضرورتیں مار دیں۔ معمولی کپڑے پہنے اور سردیوں میں صرف ایک پھٹا سا کوٹ پہن کر گزارا کیا۔ مگر بچوں کو کبھی کسی محرومی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ انہیں اچھا کھلایا، اچھا پہنایا اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت بھی بروقت پوری کی۔

اپنے گھر کی آرزو ان صبر آزما دنوں میں بھی ہر پل موجود رہی مگر اب انہوں نے اپنی اس تمنا کا مرکز رام کو بنا

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

لیا تھا۔ بڑا ہو گا تو گھر خریدے گا اور میرا سپنا پورا ہو جائے گا۔ وہ رام کو دیکھتیں اور اس کے بڑھتے ہوئے قد کاٹھ پر نظر ڈالتیں تو ان کا حوصلہ اور بڑھتا۔ ہاں، رام ضرور ان کی یہ حسرت پوری کرے گا۔ وہ کام جو ان کے پتی نہیں کر سکے، پتی سے نہ ہو سکا، وہ بیٹا کرے گا اور ان کا یہ خواب جو جان کا روگ بن گیا ہے، انجام کار شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا۔ وہ سوچتیں اور خوش ہوتیں۔

وقت گزرا۔ قسمت نے ساتھ دیا۔ رادھا کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ہوئی اور وہ اپنے پتی کے ساتھ ناروے چلی گئی۔ پھر رام کی شادی ہوئی۔ بیتا گھر آئی۔ کچھ اور برس بیتے، گھر میں شیام اور گیتا کا اضافہ ہوا اور پھر آخر کار وہ دن بھی آیا جب مکان خرید لیا گیا۔ کچھ رقم رام نے جمع کی تھی، کچھ وہ پیسہ ان کے پاس تھا جو انہوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے برسوں میں پس انداز کیا تھا۔ وہ سارا روپیہ انہوں نے رام کو دے دیا۔

''بس اب اور دیر کرنا مناسب نہیں۔ مکان لے ہی لو۔'' انہوں نے کہا تھا۔ ''بچوں کو کرائے کے نہیں، اپنے مکان میں پلنا بڑھنا چاہیے۔''

جس دن مکان کی چابی ملی اور انہوں نے پہلی بار ''اپنے'' گھر میں قدم رکھا، وہ ان کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا۔ سب سے انمول اور مبارک۔ اتنا کہ ہر تہوار سے بڑا۔ گو بڑھاپا تھا اور ناتوانی بھی، پھر بھی وہ سارے گھر میں ماری ماری پھریں، چپے چپے کو پیار سے دیکھا، کھڑکیوں اور دروازوں پر نظر ڈالی اور ان کا من خوشی، آسودگی اور غرور سے بھر گیا۔ آخر کار ان کا خواب پورا ہو گیا تھا۔ یہ مکان ان کے بیٹے کا ہے، گویا ان کا ہے۔ اب کوئی چوہے لال دروازے پر آ کر سامان باہر پھینکنے کی دھمکی نہیں دے سکتا اور نہ کوئی کونسل مکان خالی کروا سکتی ہے۔ ممتا کو پہلی بار..... ہاں، زندگی میں پہلی بار طمانیت، افتخار اور تحفظ کا بھرپور اور بے پایاں احساس ہوا۔

پہلے سات دنوں میں ہر صبح انہوں نے معمول سے زیادہ دیر پوجا میں صرف کیا اور گھر کی خیر و برکت اور اپنے بچوں کے لیے صحت و سلامتی اور ترقی و کامرانی کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرارتھنا کی۔

☆☆☆

یہ کوئی سات ماہ پہلے کی بات ہے۔

یکایک ان کی توجہ شیام اور گیتا کی طرف چلی گئی۔ ایک بار پھر ان کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا تھا اور اس بار وجہ تنازعہ وہ خود تھیں۔ گیتا کہہ رہی تھی کہ دادی میری ہیں، جبکہ شیام کا اصرار تھا کہ دادی اس کی ہیں۔ گیتا یکایک کھڑی ہوئی اور اچک کر مکتا دیوی کی گود میں بیٹھ گئی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"دادی! تم میری دادی ہو نا؟"

"ہاں بیٹا!" انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں، نہیں..... تم میری دادی ہو۔" شیام ان سے لپٹ گیا۔

"نہیں..... دادی میری ہیں۔ تم الگ ہٹو۔" گیتا چلائی۔

"نہیں..... میری ہیں۔" شیام نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"دادی! تم بتاؤ، کس کی دادی ہو تم؟" گیتا نے پوچھا۔

مکتا کے سینے میں کوئی شے چیخ کر ٹوٹی۔ انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔ "بیٹا! میں تم دونوں کی دادی ہوں۔"

"نہیں، نہیں..... تم میری ہو..... تم میری ہو۔" گیتا چلانے لگی۔

"نہیں میری ہیں۔" شیام اور بھی زیادہ زور سے مکتا دیوی سے لپٹ گیا۔

یکایک بیتا نے گردن گھما کر شیام اور گیتا کو ڈانٹا۔ "چپ رہو تم دونوں..... فضول کی باتیں مت کرو اور الگ ہٹ کر بیٹھو۔"

مکتا دیوی نے ہولے سے دونوں بچوں کو خود سے الگ کر دیا۔

☆☆☆

رام نے معاً کار کی رفتار کم کی۔ دائیں جانب ایک سڑک نظر آ رہی تھی۔ رام نے کار اس طرف موڑی، پھر کوئی نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کیا اور کار ایک چھوٹے سے کار پارک میں روک دی۔ سامنے ایک عمارت تھی۔ یک منزلہ، جو دو حصوں پر مشتمل تھی۔ دائیں ہاتھ والا حصہ چوکور تھا جبکہ بائیں جانب ایک دائرہ نما گول کمرا تھا۔ دونوں حصوں کے درمیان فاصلے میں جو کوئی بیس فٹ تھا، ایک کشادہ راہداری بنائی گئی تھی۔ راہداری میں ہی ایک دفتر تھا اور اس سے متصل انتظار گاہ۔ دونوں بچوں کو انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ پھر رام، بیتا اور مکتا دیوی دفتر میں گئے جہاں ایک دبلی پتلی عورت نے انہیں خوش آمدید کہا۔ اس عورت کا نام بینی تھا۔ وہ ایک خوش مزاج عورت تھی مگر اس کے چہرے سے افسردگی اور تھکن کا اظہار ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ وقت اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ کھو بیٹھی ہو۔ اس نے نرم آواز اور دوستانہ لہجے میں ان سے باتیں کیں۔

زیادہ دیر نہیں لگی۔ محض پندرہ منٹ میں ضروری امور طے ہو گئے۔ پھر اس نے رام اور بیتا سے کہا۔

"ٹھیک ہے..... اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

جب وہ دفتر سے باہر آئے تو بینی نے مکتا دیوی سے کہا۔ "آپ میرے ساتھ آئیے۔" مکتا دیوی نے منوں وزنی قدم آگے بڑھایا۔

بینی انہیں گول کمرے میں لے گئی۔ وہ کمرا دراصل سٹنگ روم تھا۔ کمرے میں چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں آرام دہ کرسیاں اور صوفے لگے تھے جو خاصی اچھی حالت میں تھے۔ ایک طرف ٹیلی وژن رکھا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر ڈامینو، تاش کی گڈی اور شطرنج کا ڈبا قرینے سے رکھا تھا۔

مکتا نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنے سینے کے اندر دل کو ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔ کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ ایک بوڑھی انگریز عورت تھی جو صوفے پر نیم دراز تھی اور غالباً سو رہی تھی۔ جبکہ دوسرا ایک انڈین مرد تھا۔ سر پر ایک گول سی ٹوپی، آنکھوں پر پلاسٹک کے سیاہ فریم کا چشمہ، چھوٹی سی داڑھی جس کا ایک ایک بال سفید تھا۔ ہاتھ میں بید کی چھڑی۔ وہ ایک کرسی پر ایک جانب قدرے جھک کر بیٹھے ہوئے تھے اور مکتا دیوی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نظریں ملیں تو وہ ہولے سے مسکرائے۔

مکتا دیوی کے ہونٹوں پر بھی ایک خفیف سی افسردہ مسکراہٹ ابھری۔

بینی نے مکتا دیوی سے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ یہاں بیٹھیے، میں ابھی آتی ہوں۔"

لیکن مکتا دیوی بیٹھیں نہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہیں اور کھڑکی سے باہر کار پارک کی جانب پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہیں، جہاں رام، بیتا اور بچے کار میں بیٹھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کار کو اسٹارٹ ہوتے اور رینگتے ہوئے

دیکھا۔ کار سڑک پر آئی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ تبھی یکایک ان کے کانوں میں آواز آئی۔

"آداب عرض، بہن!"

انہوں نے گھوم کر دیکھا۔ عمر رسیدہ انڈین بزرگ جو کرسی پر بیٹھے تھے اب اٹھ کر چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مکتا دیوی نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"آداب۔"

"میرا نام محمد علی ہے۔" بزرگ نے کہا اور ان کے قریب کھڑے ہو گئے۔

مکتا دیوی نے پژمردگی سے مسکرا کر سر کو جنبش دی۔

"کیا آپ یہیں رہیں گی؟" محمد علی نے پوچھا۔

مکتا دیوی نے ہونٹوں پر زبان پھیری مگر کچھ کہا نہیں۔

قدرے توقف کے بعد محمد علی نے کہا۔ "شاید آپ کی بیٹی ہے وہ۔" انہوں نے کار کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں..... بہو ہے۔"

"اچھا، اچھا....." محمد علی نے ہولے سے کہا۔ "ابھی جب آپ آئی تھیں تو میں نے راہداری میں آپ کو دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید آپ کی بیٹی اور داماد ہیں مگر..... وہ دونوں بچے تو بہت ہی پیارے ہیں۔" انہوں نے رک کر افسردگی سے سانس لی۔ "شاید مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن اگر آپ خیال نہ کریں تو..... آپ کو یہاں آنے کی ضرورت کیوں پڑی؟"

مکتا دیوی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "اصل میں گھر میں جگہ کی کچھ کمی تھی اور پھر میری بہو....." وہ یکلخت جھجک کر چپ ہو گئیں پھر لجھ بھر رک کر بولیں۔ "کچھ اور پریشانیاں بھی تھیں، اس لیے۔"

"اچھا، اچھا..... میں سمجھا۔" محمد علی نے سمجھتے ہوئے انداز میں سر کو جنبش دی۔ "ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ اختیار کی بات نہیں ہے۔ جگہ کم پڑ جاتی ہے اور پھر بیٹا اور بہو....." وہ یکایک رکے، پھر ہنسنے لگے۔ "مگر بہن! آپ پریشان نہ ہوں۔ شروع میں جی گھبرائے گا مگر دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں اسٹاف کے لوگ اچھے ہیں۔ خیال رکھتے ہیں اور ہاں، دو اپنے ہم زبان اور بھی ہیں یہاں۔ میں آپ کو ملواؤں گا ان سے۔ یہ 'اولڈ پیپلز ہوم' برا نہیں۔ سب لوگ مل جل کر رہتے ہیں تاکہ تنہائی کا احساس زیادہ تکلیف نہ پہنچائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ جلدی ہی ہم لوگوں میں گھل مل جائیں گی۔"

مکتا دیوی نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ کار اب موڑ پر پہنچ کر دائیں جانب گھوم رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ شیام اور گیتا عقبی اسکرین سے عمارت کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ ایک نظر اور دادی کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ معاً ان کے کانوں میں دونوں بچوں کی آواز گونجی۔

"دادی میری ہیں..... دادی میری ہیں....."

پھر کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مکتا دیوی نے زور سے سانس لی اور ہاتھ اٹھا کر آنکھوں کی نمی خشک کی۔

پھر انہوں نے محمد علی کی طرف دیکھا۔

"اب جو بھی ہو، سمجھوتا تو کرنا ہی پڑے گا۔" ان کی آواز سے بے بسی چھلک رہی تھی۔ لمحہ بھر چپ رہیں، پھر کہنے لگیں۔ "ویسے میرے بیٹے اور بہو نے وعدہ کیا ہے کہ پابندی سے مجھ سے ملنے کے لیے آیا کریں گے۔"

"ہاں..... وہ ضرور آئیں گے۔ اگر انہیں وقت ملا تو۔" محمد علی نے شکستہ آواز میں کہا۔

"اگر.....؟" مکتا دیوی نے سہم کر ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" محمد علی نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لیا۔ "مکتا دیوی! اس 'ہوم' سے باہر جو دنیا ہے نا، وہ بہت زیادہ مصروف ہے..... کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ ہر شخص بھاگ رہا ہے..... اندھا دھند بھاگ رہا ہے، خواہشوں اور ضرورتوں کے پیچھے۔ لیکن خواہشیں اور ضرورتیں ہیں کہ پوری ہی نہیں ہو پاتیں۔ کیسی کیسی 'مجبوریاں' ہیں بے چاروں کی اور کیسی کیسی مصروفیات۔ دوستوں سے ملنا ملانا، پارٹیاں، چھٹیاں، ہولی ڈے، سیلون اور نہ جانے کیا کیا..... ہر شخص تسخیر اور تلاش کے جنگل میں گم ہے اور لطف یہ ہے کہ اس جنگل سے باہر وہ نکلنا بھی نہیں چاہتا بلکہ اور گم ہوتا چلا جاتا ہے اور ہر چند کہ اس کے پاس سب کچھ ہے، بہت کچھ ہے پھر بھی بے چارہ بے حد کنگال و قلاش ہے کہ اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ میں یہاں سات برس سے ہوں۔ میرے بیٹے نے بھی کہا تھا کہ ہر ہفتے میں وہ اور میری بہو مجھ سے ملنے آیا کریں گے۔ دو ماہ تک اس نے اپنے وعدے کی آبرو رکھی مگر اب مہینے میں ایک بار آتا ہے۔ وہ بھی صرف پندرہ منٹ کے لیے۔ کیا کرے غریب۔ مجبور ہے۔ اسے فرصت ہی نہیں ملتی۔"

محمد علی کی آواز دھیرے دھیرے معدوم ہو گئی۔ مکتا دیوی نے دکھی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور اپنے دل کو بھی دھیرے دھیرے محمد علی کی آواز کی طرح ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔

■■

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

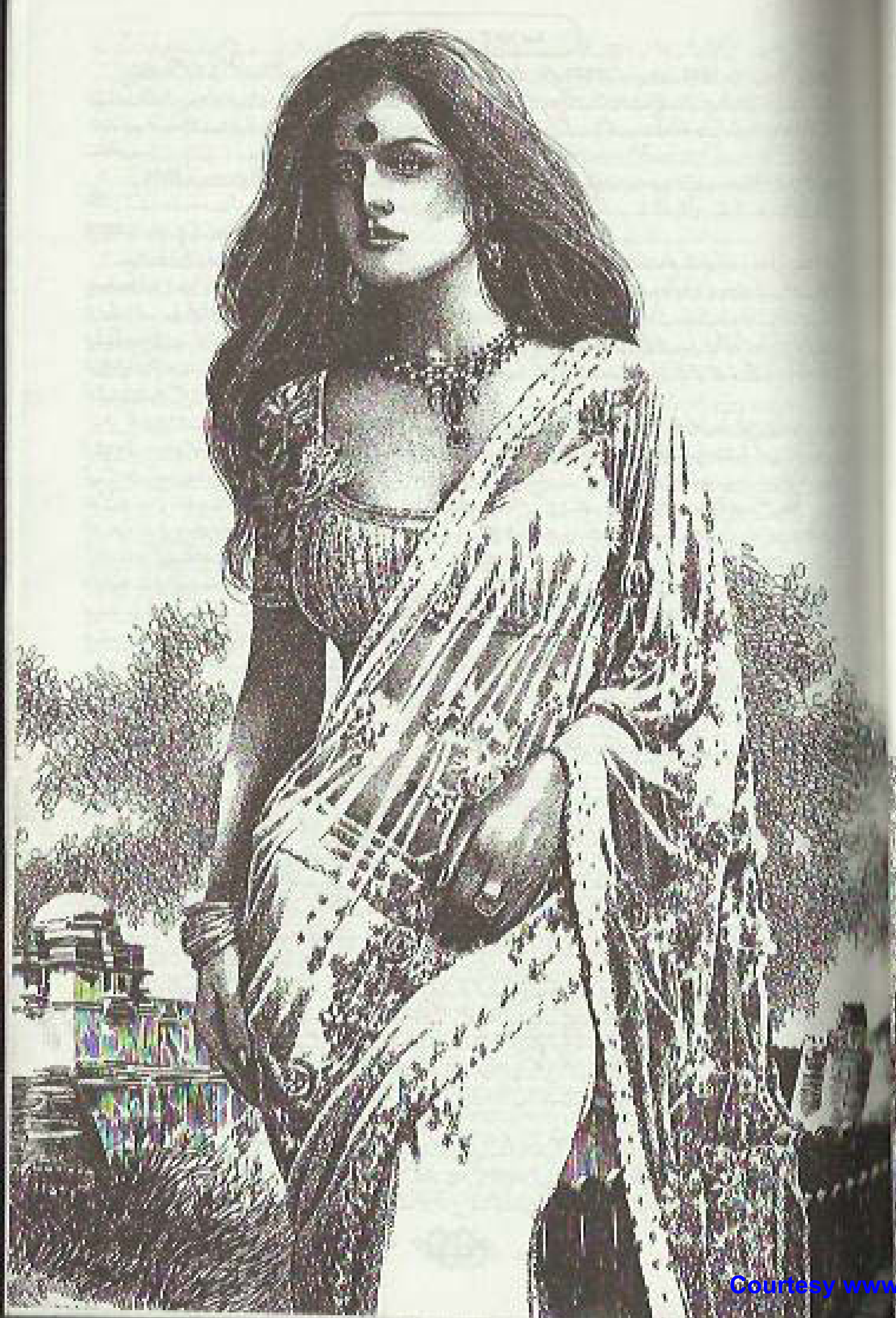

عکس در عکس حیرتوں کا سلسلہ ایک صحرا نورد کی طویل داستان

محی الدین نواب

قسط نمبر 16

کوئی اگر وقت کی صورت دیکھنا چاہے تو انسان کے بدلتے روپ دیکھے...... وقت کا کام بظاہر گزر جانا ہے مگر...... پھر سے کسی نئے روپ نئے پیراہن میں ڈھل کر پلٹ بھی آتا ہے۔ سمندر کا سکوت یہ یقین دلاتا ہے جیسے سب کچھ ٹھیک ہے لیکن...... اس کی گہرائی میں کتنے طوفان مچلتے ہیں کوئی نہیں جانتا...... اس کی زندگی بھی کسی طوفان بلاخیز سے کم نہیں تھی...... جس کا مشغلہ تلاطم و طغیانی اور جس کی شوخی بادوباراں جیسی تھی...... جس کی باغی فطرت اسے بے چین رکھتی...... فہم و فراست آسمان سے باتیں کرتی اور سماعت و بصارت بہت دور کی کوڑی لاتی تھی...... اس کی طلسماتی شخصیت کے آگے کیا تخت و تاج اور کیا سلطنت کی اوقات...... وقت بھی جیسے اس کے آگے باادب کھڑا تھا...... حسن اس کا غلام اور محبت اس کی کنیز تھی مگر...... اسے ایک طویل سفر درپیش تھا...... کیونکہ اسے صفحۂ قرطاس پر ایک طویل داستان رقم کرنے کے لیے جنگلوں سے بستی اور بستی سے صحرا کی سمت دشوار گزار حالات سے برسرِ پیکار رہنا تھا

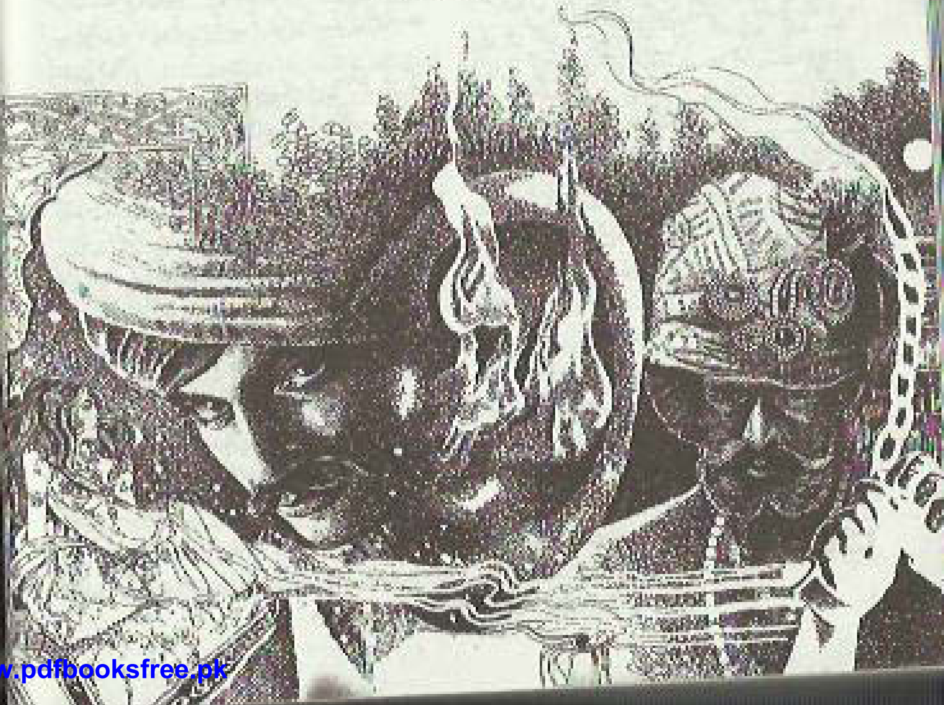

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

[illegible]

[illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لندن جیسے شہر میں جرائم تو ہوتے ہیں لیکن بڑے پیمانے پر دہشت گردی جیسی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ ایک طویل مدت کے بعد میسولی تنظیم کی اس عمارت میں بم دھماکے ہوئے تھے۔

لندن سے واشنگٹن اور جاپان تک یہ خبر چشم زدن میں پہنچ گئی۔ خطرناک تنظیموں کے تمام وہ قرتر(?) میں فون کھڑکھڑا رہے تھے۔ فیکس اور ای میل کے ذریعے معلومات حاصل کی جا رہی تھیں۔

کسی شہر میں باغیانہ سیاسی تحریک نہ چل رہی ہو اور وہاں تخریبی کارروائی ہو تو سب حیران رہ جاتے ہیں۔ اس وسیع و عریض عمارت میں ایسے دھماکے ہوئے تھے جیسے کسی منصوبے کے تحت حکومت کو ہلا دینے کی کارروائی کی گئی ہو۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ کی فورس، سی آئی اے اور انٹرپول کی ٹیمیں وہاں پہنچ گئی تھیں۔ امداد پہنچانے والی جماعتیں ایمبولینس کے ساتھ پہنچ رہی تھیں۔ فائر بریگیڈ والے آگ بجھا رہے تھے۔ زخمیوں اور لاشوں کو وہاں سے نکالا جا رہا تھا۔ میسولی تنظیم کا سربراہ ہوف مین اپنے ہیڈ آفس میں بیٹھا ہوا ٹی وی اسکرین پر وہ منظر دیکھ رہا تھا اور فون کے ذریعے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ڈپٹی ڈائریکٹر سے کہہ رہا تھا۔ "یہ دھماکا کسی دہشت گرد تنظیم نے نہیں کیا ہے۔ پچھلے پچیس برسوں سے تمری(?) اس شہزادہ سلمان سعدی بڑی خطرناک وارداتیں کرتا آ رہا ہے۔ آج پہلی بار اس کے بیٹے یعقوب سلمان غازی نے ایسے دل دہلا دینے والے دھماکے کیے ہیں۔"

ڈپٹی ڈائریکٹر نے کہا۔ "میں ٹی وی اسکرین پر وہاں رپورٹنگ سن رہا ہوں۔ کیا یہ بتا سکتے ہیں، دھماکے سے پہلے آپ کے کتنے لوگ وہاں تھے؟"

"میں یہاں استنبول میں ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ اس وقت وہاں میرے کتنے آدمی تھے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، وہاں سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالا جا رہا ہے۔"

"آپ یہ کیسے جانتے ہیں کہ یہ دھماکے یعقوب سلمان غازی نے ہی کیے ہیں؟"

"تھوڑی دیر پہلے یعقوب نے فون پر مجھے چیلنج کیا تھا۔ اس نے اس دھماکے کی ذمے داری قبول کی ہے۔"

ہوف مین یہ جھوٹا بیان دے رہا تھا۔ یعقوب نے نہ اس سے رابطہ کیا تھا، نہ دھماکوں کی ذمے داری قبول کی تھی۔ ہوف مین اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اعلیٰ افسر سے کہہ رہا تھا۔ "میری دست راست محالا یعقوب کی ماں ہے۔ وہ بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے لندن گئی تھی لیکن بیٹے نے ماں کو کڈنیپ کر لیا۔ اب پتا نہیں، اس عمارت میں دھماکے کرنے کے بعد وہ ماں کو کہاں لے گیا ہے؟"

محالا ایک بنگلے کی بالکونی میں ایک ہتھکڑی کے ذریعے ریلنگ سے بندھی ہوئی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر اس کا موبائل فون فرش پر پڑا تھا۔ یعقوب کے جاتے ہی اس نے اپنے فون تک پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ ریلنگ کے پاس جھک کر اپنی ایک ٹانگ بڑھا کر فون تک پہنچ سکتی تھی۔

اس نے فرش پر گھٹنے ٹیک دیے۔ اپنی ایک ٹانگ فون کی طرف بڑھائی پھر پریشان ہوئی۔ فون اس سے ایک انچ کے فاصلے پر تھا اور اس کی ٹانگ اس سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے ایک پاؤں کا جوتا اتارا۔ جوتے کے تسمے کو پاؤں کے انگوٹھے سے باندھ کر فون کو دیکھا۔ ایک اندازہ لگایا پھر جوتے کو ادھر اچھال دیا۔ وہ جوتا فون کے دوسری طرف جا کر ٹھہر گیا۔

یہ انسان کی فطرت ہے، اس سے کوئی چیز چھین لی جائے تو وہ بڑی چالاکی سے، مکاری سے، کسی بھی تدبیر سے اسے حاصل کر ہی لیتا ہے۔ اس نے انگوٹھے سے بندھے ہوئے تسمے کو اپنی طرف آہستہ آہستہ کھینچا تو جوتا آہستہ آہستہ سرکتا ہوا فون کو اس کے پاس لے آیا۔ اس نے فوراً ہی فون کو اٹھا کر ہوف مین کے نمبر پنچ کیے۔ ہوف مین کا نمبر بزی تھا۔ وہ جھنجلا گئی۔ ایک تو بیٹے نے اس کی کامیابی پر پانی پھیر دیا تھا۔ ماں کو اپنے دام میں لا کر اسے بے دم کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔ فون کا حصول بھی مشکل بنا گیا تھا۔ اب کسی طرح وہ فون حاصل ہوا تو ہوف مین کہیں اور مصروف تھا۔ ادھر سے مدد حاصل نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی تنظیم کے ایک عہدیدار کو فون پر مخاطب کیا۔ "ہوف مین سے کہو فوراً مجھے کال کرے۔ میں مصیبت میں ہوں۔ ہمارے لندن کے ہیڈ آفس کی عمارت تباہ ہو رہی ہے۔ پتا نہیں، تمری اس کے آدمیوں نے وہاں کتنے بم نصب کیے تھے؟ اب تک تین دھماکے ہو چکے ہیں۔"

عہدیدار نے پوچھا۔ "آپ ابھی کہاں ہیں؟"

"میں اس تباہ ہونے والی عمارت سے دو سو میٹر دور ایک بنگلے کی بالکونی میں کھڑی ہوں۔ میرا بیٹا مجھے وہیں کی ریلنگ سے باندھ کر گیا ہے۔ پلیز۔ مجھے یہاں سے فوراً نکالو۔"

عہدیدار نے کہا۔ "میں ابھی ہوف مین کو اطلاع دے رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہمارے آدمی ابھی آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔"

وہ رابطہ ختم کر کے تباہ ہونے والی عمارت کی طرف دیکھنے لگی۔ وہاں لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ فائر بریگیڈ والا ابھی تک آگ بجھانے میں مصروف تھا۔ عمارت کے کچھ حصوں میں آگ بجھ گئی تھی۔ وہاں سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالا جا رہا تھا۔ انھیں اسپتال لے جانے والی کئی ایمبولینسیں چنگھاڑتی آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

اسے اپنے بیٹے پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ تلملا رہی تھی۔ دل ہی دل میں قسمیں کھا رہی تھی کہ پھر اسے کسی نہ کسی طرح ٹریپ کرے گی۔ زنجیروں میں جکڑ کر رکھے گی۔ باپ کے پاس جانے نہیں دے گی۔ دیکھے گی کہ وہ کب تک خود سر اور باغی بن کر رہے گا؟ کب تک باپ کی حمایت کرتا رہے گا؟

وہ تسلیم کرتی تھی کہ بیٹا ماں سے بھی محبت کرتا ہے۔ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ اسی نے باپ کے غصے اور غضب سے اسے بچایا تھا۔ دوسری بار بھی اس نے ماں اور پھر باپ(?) … کی تھی۔ بیٹے کو گن پوائنٹ پر اغوا کرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے طور پر مجبور تھی۔ پیار محبت سے اسے بلایا تو وہ بھی نہ آتا۔ کئی بار کہہ چکا تھا۔ "ماما! میرے پاس آ جائیں۔ آپ کو ہمارے اور پاپا کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ہم تینوں کو ایک ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔"

لیکن اسے پیار و محبت سے بھرپور گھریلو ماحول پسند نہیں تھا۔ اس کی گھٹی میں یہودیت پڑی ہوئی تھی۔ اس بات کی پروا نہیں تھی کہ پہلے میں نے اسے ٹھکرایا تھا اب بیٹا نظر انداز کر رہا تھا۔

ہوف مین نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ "ہیلو محالا! تمہارے بارے میں مختصری رپورٹ ملی ہے۔ ہمارے آدمی اس بنگلے کو تلاش کر رہے ہیں، جہاں تم بندھی ہوئی ہو۔ کیا بالکونی میں ہو تو وہاں آس پاس کی کچھ نشانیاں بتاؤ؟"

ایسے ہی وقت اس نے اپنے چند ماتحتوں کو دیکھا۔ وہ ایک جیپ میں تھے اور سامنے ہی گلی سے گزرتے جا رہے تھے۔ وہ اپنا اسکارف لہرا کر چیختے ہوئے بولی۔ "وہ آ گئے ہیں۔ میں انھیں سگنل دے رہی ہوں۔"

آنے والوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ بنگلے کے اندر آ رہے تھے۔ ہوف مین نے فون پر کہا۔ "تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تمہیں ساتھی سے لے جائیں گے۔ مجھے بتاؤ، یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کیا تم تو یعقوب کو ٹریپ کرنے گئی تھیں؟"

وہ اپنی تمام روداد سنانے لگی۔ اس دوران میں اس کے ماتحت وہاں آ کر ہتھکڑی کھولنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر اس ہتھکڑی کو کاٹ کر اسے وہاں سے ایک رہائش گاہ میں لے آئے۔ وہ استنبول جانے والی تھی۔ اس کے لیے ایک فلائٹ میں سیٹ ریزرو کی گئی تھی۔

اس نے فون پر ہوف مین سے کہا۔ "یعقوب ابھی لندن میں ہوگا۔ اس سے پہلے کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے اسے گرفتار کریں اور اپنی کسٹڈی میں رکھیں، ہمیں کسی بھی طرح یعقوب کو بے بس اور کمزور بنا کر یہاں سے لے جانا ہوگا۔ اگر وہ ہاتھ نہیں آئے گا تو پھر پتا نہیں، اس کا باپ اسے کہاں لے جا کر چھپا دے گا؟"

یعقوب تو ماں کو ہتھکڑی لگا کر سیدھا ایئر پورٹ پہنچ گیا تھا۔ وہاں جہاں شہزادہ(?) … نے سوئٹزرلینڈ جانے والی فلائٹ میں دو سیٹیں بک کرائی تھیں۔ وہ صفر(?) کے ساتھ ہو چکا تھا۔

ماں نے کہا۔ "بیٹے! ماں نے تمہیں گن پوائنٹ پر اغوا کرایا۔ کیا تمہیں برا نہیں لگا؟"

"بے شک۔ انہوں نے ماں ہو کر دشمنوں کا سا انداز اختیار کیا۔ مجھے برا بھی لگا اور دل کو بے حد تکلیف بھی پہنچی۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔ انہیں اپنے اور آپ کے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ میری یہ محبت، یہ دستور انہیں پسند نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں، میں آپ کو چھوڑ کر ان کے پاس رہنے نہیں جاؤں گا۔ اس لیے انہوں نے مجبور ہو کر دشمنوں جیسا انداز اختیار کیا تھا۔"

"وہ تمہیں جبراً حاصل کرنا چاہتی ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اپنی ممتا سے مجبور ہے۔ تم اچھی طرح سمجھتے ہو، وہ تمہیں کمزور بنانے کے لیے تمہیں اپنی گرفت میں رکھنا چاہتی ہے۔"

"میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں پاپا!"

"تو پھر تمہیں چاہیے تھا کہ ماں کو ہمارے پاس لے آتے۔ جس طرح وہ تمہیں جبراً اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے، اسی طرح ہم اسے اپنے پاس رکھتے اور یہودی لابی سے بہت دور کر دیتے۔"

"آئندہ کبھی ایسا ہوگا۔ میں انہیں جبراً محبت کا قیدی بنا کر رکھوں گا۔ آپ نے ایک بار انہیں میری خاطر معاف کیا۔ میں نے بھی ممتا کے صدقے انہیں جانے دیا ہے۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں، وہ آپ کی سلامتی نہیں چاہتیں۔ دیکھیں آئندہ کیا ہوتا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جو ایک بچی کو نہیں سمجھی میری اور تمہاری محبت کو حرام سمجھتی ہے۔ اس کا انجام بہت برا ہوگا اور اس کے برے انجام کو ایک بیٹے کی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے ذاتی طور پر تیار رہو۔"

"تو پاپا! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے میری ماما کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ میری خاطر معاف کرتے رہیں گے۔"

"بیٹے۔ میں نے وعدہ کیا ہے لیکن یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ وہ اندھیرے میں چھپنے والی گولی کی طرح ہمیں آ کر لگے۔"

"ایسا نہیں ہوگا پاپا! آپ میری ماما کو مجھ پر چھوڑ دیں۔ آئندہ وہ ہم باپ بیٹے کو نقصان پہنچانا چاہیں گی تو میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

"تم پر تو چھوڑ دیا ہے۔ اسی لیے تو وہ ابھی تک زندہ ہے۔ ماں کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہو۔ اپنی فطری محبت سے مجبور ہو لیکن باپ کی یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ وہ ناگن ہے۔ بیٹے کی آستین میں رہ کر باپ کو ڈس لے گی۔ میں اسے ہلاک کرنے کو نہیں کہتا لیکن اپنی آنکھوں کے سامنے دل کے قریب رکھنے کے لیے اسے راز داں کی طرح بے دست و پا بنا دو۔ جس طرح ایک من پسند پرندے کو پنجرے میں رکھ کر اسے چاہا جاتا ہے۔ اسی طرح ماں کو بستر پر اپاہج بنا کر ڈال دو اور اس سے محبت کرتے رہو۔"

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ یعقوب نے یہ طے کر لیا کہ اب ماں کے پیچھے پڑا رہے گا۔ اسے یہودی تنظیم میں سکون سے نہیں رہنے دے گا۔

ہمارے چند جاں نثار یہودی بن کر یہودی تنظیم میں رہا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ عام کارندوں کی طرح کام کرتے تھے اور کچھ نے ہوف مین اور محالا کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ ان کے خاص اور قابل اعتماد ماتحت بن کر گھر کے بھیدی کی طرح رہا کرتے تھے۔

یعقوب ان جاں نثاروں سے رابطے میں رہنے لگا۔ وہ اسے بتانے لگے کہ محالا استنبول میں کہاں رہتی ہے اور کیسے کیسے معاملات میں مصروف رہا کرتی ہے؟ وہ لندن سے استنبول پہنچنے کے بعد بھی آئی تھی کہ میں پہنچ گئی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ میں بیٹے کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کا انتقام لینے کے لیے اسے نقصان پہنچاؤں گا۔

وہ پہلے سے زیادہ سخت سکیورٹی میں رہنے لگی تھی۔ ایک ٹی وی چینل کے ذریعے میرے خلاف بیان دے رہی تھی۔ یہ جھوٹ کہہ رہی تھی کہ میں نے اسے گن پوائنٹ پر اغوا کیا تھا اور جبراً یہودی تنظیم کے ہیڈ کوارٹر والی عمارت میں لے گیا تھا۔

وہ دلی صدمات کا اظہار کرتے ہوئے رونے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ "اس ظالم شوہر نے میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کر دیا ہے۔ بیٹا میرے لیے تڑپتا ہے۔ میرے پاس آ کر رہنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ظالم اسے دھمکیاں دیتا رہتا ہے کہ ماں کے پاس جائے گا تو اس کے جاں نثار اسے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ اس کی ماں کو راز داں کی طرح اپاہج بنا دیں گے۔"

راز داں کو اس چینل کے ذریعے دکھایا جا رہا تھا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ قطری ایلچی شہزادہ سلمان سعدی نے اس پر کس قدر ظلم کیا ہے؟ درندگی کی انتہا کر دی ہے۔ اس کی ایک آنکھ نکال دی ہے۔ ایک گردہ نکال لیا ہے اور دونوں ہاتھ کاٹ دیے ہیں۔

ٹی وی کے ناظرین اسے دیکھ رہے تھے اور مجھے ظالم درندہ سمجھ رہے تھے۔ یہ حقیقت نہیں جانتے تھے کہ راز داں نے مجھے تہ خانے میں قیدی بنا کر کیسے کیسے مظالم ڈھائے تھے؟ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ویڈیو فلم کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں کسی شک و شبہے کے بغیر ظالم درندہ کہلایا جا رہا تھا۔

یعقوب نے ایک جاں نثار سے رابطہ کیا۔ وہ سکیورٹی گارڈ کے طور پر محالا کے قریب رہا کرتا تھا۔ اس نے جاں نثار سے کہا۔ "میں اپنا یہ فون آن رکھوں گا۔ تم مجھے ماما کے متعلق رپورٹ دیتے رہو کہ وہ ٹی وی اسٹوڈیو سے نکل کر کہاں جا رہی ہیں اور کیا کرتی رہتی ہیں؟"

یعقوب نے اس فون کو ایک کان سے لگا رکھا تھا۔ پھر اس نے دوسرے فون کے ذریعے اپنی ماما سے رابطہ کیا۔ وہ ٹی وی پروگرام میں ہوف مین اور تنظیم کے دوسرے عہدیداروں کے ساتھ بیٹھی میرے خلاف بیان دے رہی تھی۔ ایسے وقت ناظرین کی فون کالز آ رہی تھیں۔ لوگ سوال کر رہے تھے اور وہ ان کے جوابات دے رہی تھی۔

اسے بیٹے کی کال موصول ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو آپ کون ہیں؟"

اس نے کہا۔ "میں آپ کا بیٹا یعقوب سلمان غازی بول رہا ہوں۔ کیا دنیا والوں کے سامنے میرے سوالوں کے جواب دیں گی؟ میری کال جاری رہنے دیں ٹی وی والے اسے بند نہ کر دیں گی؟"

محالا نے پریشان ہو کر ہوف مین کی طرف دیکھا۔ ہوف مین نے کہا۔ "بیٹے یعقوب! اپنے باپ کا جادو بول رہا ہے۔ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ تم ماں کو غلط اور باپ کو درست سمجھتے ہو۔"

محالا نے کہا۔ "میں اچھی طرح جانتی ہوں اس وقت تم اپنے باپ کے پاس کہیں بیٹھے ہو۔ وہ تمہیں جو سکھا رہا ہے وہی الزام سے کہو گے۔ ہیلو دادا سے کیا کہنا چاہتے ہو بولو؟"

اس نے کہا۔ "میں بائیس برس کا جوان ہوں۔ تعلیم یافتہ ہوں۔ دنیا دیکھ رہا ہوں۔ اچھے اور برے کی تمیز رکھتا ہوں۔ ابھی ہوف مین نے کہا ہے کہ باپ کا جادو میرے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ میں نادان بچہ نہیں ہوں۔ جو سچ ہے وہی بول رہا ہوں۔ میرے پاپا کو تم لوگوں نے تہ خانے میں قیدی بنا کر رکھا تھا۔ ان پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ اس کی کوئی ویڈیو فلم نہیں ہے ورنہ راز داں کی طرح پاپا پر ڈھائے جانے والے مظالم کے مناظر بھی میں ضرور دکھاتا۔"

اس کی فون کال فوراً ہی کاٹ دی گئی۔ محالا نے ہیلو ہیلو کہتے ہوئے یعقوب کو مخاطب کیا۔ "میرے بیٹے! تم چپ کیوں ہو گئے؟ بولتے کیوں نہیں؟ ہیلو! باپ کی حمایت میں جتنا جھوٹ بول سکتے ہو بولو۔ ہم سن رہے ہیں۔ ہیلو یعقوب ہیلو۔۔۔"

پھر ہوف مین نے کہا۔ "نیٹ ورک کی خرابی کے باعث کال ڈراپ ہو گئی ہے۔ جیسے ہی اس سے رابطہ ہوگا ہم ناظرین کو پھر اس کی باتیں سنائیں گے۔"

انہوں نے بڑی مکاری سے سچائی کا منہ بند کر دیا تھا۔ ٹی وی کے ناظرین تک حقائق کو پہنچنے نہیں دیا تھا۔ یعقوب نے پھر کال کی لیکن اس کال کو آن ایئر آنے نہیں دیا گیا۔

جاں نثار نے فون کے ذریعے یعقوب کو بتایا کہ اس ٹی وی اسٹوڈیو کے اندر اور باہر اچھی خاصی بھیڑ ہے۔ سکیورٹی کے سخت انتظامات ہیں۔ یہاں ہمارے جاں نثار بھی موجود ہیں۔

یعقوب نے کہا۔ "کسی جاں نثار سے رابطہ کراؤ۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔"

اس نے فون کو بند کیا۔ تھوڑی دیر میں ہی کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "ہیلو کون؟"

جاں نثار نے کوڈ ورڈز ادا کیے۔ یعقوب نے کہا۔ "تم ٹی وی سیکشن کے باہر ہو۔ کیا یہ جانتے ہو کہ میری ماما کس گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے جانے والی ہیں؟"

اس نے کہا۔ "جی ہاں۔ جانتا ہوں۔ وہ بلیک ہنڈا اکارڈ میں آئی ہیں۔ اسی میں بیٹھ کر واپس جانے والی ہیں۔ اس گاڑی کے پیچھے کئی سیکیورٹی گارڈز کی گاڑیاں ہوں گی۔"

یعقوب نے کہا۔ "کسی طرح اس گاڑی کو اور کسی ایک اعلیٰ عہدیدار کو نشانہ بناؤ۔ میں اپنی ماما کے دل و دماغ پر دہشت طاری کرنا چاہتا ہوں۔"

"یس سر! ابھی کوشش کرتا ہوں۔"

محالا ہوف مین اور دوسرے عہدیداران ٹی وی پروگرام کے بعد اسٹوڈیو سے باہر آئے۔ ایک ہنڈا اکارڈ کی طرف جانے لگے۔ پرنٹ میڈیا کے رپورٹرز ان سے سوالات کر رہے تھے۔ وہ جوابات دیتے ہوئے اپنی گاڑی کے پاس پہنچے۔

ایسے وقت ایک عہدیدار اچانک ہی اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ سب نے دیکھا۔ اس کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا تھا۔ وہاں سے لہو بہہ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

ایک دم سے بھگدڑ مچ گئی۔ محالا اور ہوف مین فوراً ہی کار کا دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سائلنسر لگے اسلحے سے گولی چلائی گئی تھی۔ اس لیے سمت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے؟ پھر بھی سیکیورٹی گارڈز ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے ہوئے قاتل کو تلاش کر رہے تھے۔

وہ دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی طرف اب کوئی گولی نہیں آ سکتی تھی۔ ایسے وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ محالا نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ بیٹے کی آواز سنائی دی۔ "ماما! آپ میری فون کال کاٹ سکتی ہیں۔ لیکن گولی کا رخ بدل نہیں سکتیں۔ جس گولی نے ایک کا کام تمام کیا ہے۔ وہ آپ کی طرف بھی آ سکتی تھی۔"

وہ بولی۔ "مجھے دھمکیاں مت دو۔ میں جانتی ہوں تم ماں کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے لیکن یہ کیسی حرکتیں کر رہے ہو؟"

"اب ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ آپ اس کار سے باہر نکلیں۔ کتنے ہی اخباری رپورٹرز ادھر ادھر جا کر چھپ گئے ہیں۔ انہیں بلائیں اور بیان دیں کہ آپ نے میرے پاپا کے خلاف جھوٹی باتیں کی ہیں۔ میرے پاپا مظلوم تھے۔ آپ لوگوں نے ان پر مظالم ڈھائے تھے۔ یہ حقائق بیان کریں گی تو یہاں سے جا سکیں گی ورنہ یہ کار آگے نہیں بڑھ سکے گی۔"

وہ بولی۔ "ہمارے سیکیورٹی کے انتظامات اتنے بھی ناقص نہیں ہیں کہ تم مجھے جانے سے روک سکو۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی چلاؤ۔ یہاں سے نکل چلو۔"

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ کار اسٹارٹ کی۔ پھر گیئر بدلے۔ اسی وقت ایک دھماکا سا ہوا۔ کار کا پہیہ برسٹ ہو گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ سائیلنسر لگے ہوئے اسلحہ سے گولی چلائی گئی تھی۔

اب وہ کار آگے کہیں نہیں بڑھ سکتی تھی۔ دوبارہ کالنگ ٹون سنائی دی۔ محالا نے اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم بچکانہ حرکتیں کر رہے ہو۔''

''آپ کا بچہ ہوں۔ اگرچہ ایک بچے کی طرح ضد کر رہا ہوں مگر اس میں آپ کی بہتری ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، اپنی باتیں منوا لو گے؟ میں مجبور ہو گئی ہوں۔ ابھی دیکھو، یہاں سے پیچھے جا رہی ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ ہوٹل مین کے ساتھ کار کے اندر قیدی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ باہر نکل سکتی تھی۔ یہ یقین تھا کہ بیٹا اسے نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن اس کے ساتھ ہوٹل مین تھا، اس کی جان کو خطرہ تھا۔

کار کے باہر سختی سے چیکنگ ہو رہی تھی۔ غیر ضروری لوگوں کو وہاں سے ہٹایا جا رہا تھا اور جو ضروری تھے ان کی جامہ تلاشی ہو رہی تھی۔ یہ شبہ تھا کہ سیکورٹی گارڈز میں کوئی دشمن چھپا ہوا ہے۔ ان کے اسلحہ کو چیک کیا جا رہا تھا۔ اس طرح یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ ابھی وہ فائرنگ کس نے کی ہے؟

تھوڑی دیر بعد لان کے ایک پودے کے پاس سائیلنسر لگا ہوا ریوالور پایا گیا۔ ہمارے جس جاں نثار نے اسے استعمال کیا تھا، اب وہ گرفت میں نہیں آ سکتا تھا۔ ایک سیکورٹی گارڈ کے طور پر اپنے اسلحہ کے ساتھ ان کے درمیان موجود تھا۔

محالا بہت ضدی تھی۔ پرنٹ میڈیا کے رپورٹرز کو پتا کر رہے تھے مگر کوئی بیان نہیں دے رہی تھی۔ سیکورٹی بڑھا دی گئی تھی۔ تقریباً پچیس مسلح افراد دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سب اسٹالروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ یہ یقین تھا کہ ان کے درمیان سے ہی کسی نے گولیاں چلائی تھیں۔ ایک گاڑی ایک ہٹلا گارڈ کے پاس آ کر رک گئی۔ ایک دوسرے گارڈز نے دونوں گاڑیوں کو گھیر لیا۔ اس طرح محالا اور ہوٹل مین ایک گاڑی سے نکل کر دوسری گاڑی میں پہنچ گئے۔ اس کے دروازے بند ہو گئے۔ آگے پیچھے کئی مسلح گارڈز گاڑیوں میں موجود تھے۔ اس طرح وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

ان حالات میں پھر چھپ کر گولیاں نہیں چلائی جا سکتی تھیں۔ ہمارا بیٹا بہت اپنی رہائش گاہ کی طرف چلی گئی۔ میں نے ایک گھنٹے بعد فون پر بیٹے سے رابطہ کیا۔ پھر ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا میرے بیٹے! اماں سے منت کیا کیا؟''

''کیا دونوں پاپا! وہ بہت ہی ضدی ہیں۔''

''بیٹا! عورت کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ کوئی اسے سیدھا نہیں کر پایا۔ پچھلے تمہیں تجربہ ہو رہا ہے۔ ماں کو سیدھا کرنے کے تو آئندہ کسی عورت پر بھروسا نہیں کرو گے۔ ماں ہو یا بہن ہو یا بیٹی ہو یا بیوی ہو، آخر عورت ہی ہوتی ہے۔ اسے سمجھنے کا تو ہوا کھلا دو گے، تو پھر کی نظر سے دیکھو تو وہ کبھی کبھی کی رہتی ہے۔''

میں نے اسے سمجھایا کہ عورت کو خوب سمجھتی دو۔ مگر سر پر نہ چڑھاؤ۔ ابھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر بیٹا کی چیلی سیدھی ہو جائے گی۔ یہ گمان کر کے ہی کہ وہ سیدھی رہتی ہے۔

میں نے اپنے طور پر بیٹے کو سمجھا کر رابطہ ختم کر دیا۔

☆☆☆

میرے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ میں انگوٹھی اور عصا کے بغیر ادھورا ہوں۔ یہ چیزیں ایسی ہیں، میرے لیے ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں۔ ان کے بغیر کر کھڑا نہیں رہ سکوں گا۔

میں نے بارہا آزمایا تھا۔ جب تین بیٹیوں کی عداوت نے مجھے چاروں اطراف اور ہڈیوں کو ڈھانچا بنانا چاہا تھا تو میں نے بارہا جیسے بدمعاش قاتل سے مقابلہ کیا تھا۔ وہ ایسا شہ زور تھا کہ اپنے کسی سولی سلاخوں کو دو ہاتھوں سے موڑ دیتا تھا۔ میں نے کمزور اور ہڈیوں کا ڈھانچا ہونے کے باوجود اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

راز ہ میں کی قید میں یقین ہو چکا تھا کہ اس تہ خانے سے میری لاش ہی باہر نکلے گی۔ میں اس قدر نحیف تھا کہ بستر پر کروٹ نہیں لے سکتا تھا۔ ایسے وقت میں نے لادو انگوٹھی اور عصا کو مجھ تک پہنچ کر کمال کر دیا تھا۔ اس انگوٹھی نے میرے اندر بلا کی توانائی بھر دی تھی اور میں عصا کے ذریعے دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہوا اس تہ خانے کی قبر سے نکل آیا تھا۔

وہ دونوں چیزیں مجھے دیکھ رہا ہوں سے نجات دلاتی تھیں۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے غیر معمولی توانائی یا صلاحیتیں حاصل ہو جائیں۔ میری غیر معمولی قوتیں شاید گم ہو کے نہ خانے کے بچے سے تھیں۔ میں یہاں سائیں کے غار سے گزر کر انہیں حاصل کر سکتا تھا۔ مگر ابھی دوں نہ گول مصروفیات کے باعث انہیں نظر انداز کرتا ہوا ان سے دور ہوتا گیا تھا۔

اب خیال آ رہا تھا کہ میں ان کے بغیر ادھورا ہوں۔ دشمنوں کی عداوتیں شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ دل نے زور دے کر کہا، ''حالات نے سمجھایا تو خانے خدا کی۔ وہ چیزیں آپ کے ساتھ نہیں رہیں گی تو کسی دن کسی وقت دشمن آپ پر غالب آ جائیں گے۔''

میں بھی تسلیم کر رہا تھا کہ جوانی کی طرف واپسی کی

انہیں اپنی حالت تک پہنچنے کے لیے انگوٹھی اور عصا ضروری ہیں۔ یہ اگر اپنا ساتھ نہ رہیں تو شاید میں جوانی کی دہلیز تک پہنچ نہیں پاؤں گا۔

میں بڑوں کے ساتھ ہوں کشمکش میں تھا۔ یہ ہمارا معمول بن گیا تھا کہ ہم اسم اعظم پڑھتے رہتے تھے۔ کھانے پینے اور سونے کے علاوہ دیگر ضروری کاموں سے جب بھی فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے ناموں کی ادائیگی کی مشق کرتے رہتے تھے۔

اگرچہ انگوٹھی اور عصا دوبارہ حاصل نہیں کر پاتا تھا لیکن وہ ہماری کمی میں میرے نقش قدم پر چلتی تھی۔ وہ دو چیزیں حاصل ہو جاتیں، میں ناقابل شکست ہو جاتا۔ دکھ یہ ہے کہ پاس بھی لگے بچھو پاتیں تو میری بہتری میں ہی اس کی بھی بہتری تھی۔

انتہا میں اس نے میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے اسم اعظم پڑھنا شروع کیا تھا۔ کیونکہ میں بے انتہا مصروفیات کے باعث پوری لگن اور دلجمعی سے پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ جب دوپہر کر اللہ کا نام ادا کرتا تھا تو کتنے ہی دشمن مسائل مجھ پر دھاوا بولنے لگتے تھے۔

کوئی ایک مسئلہ ہوتا تو اسے نظر انداز کیا جائے۔ میری زندگی میں تو مسائل یکے بعد دیگرے چلے آتے تھے۔

تین دشمن بیٹیوں کی عداوتوں کے بعد ایک محبت کرنے والا سعادت مند بیٹا یعقوب ہی تھا۔ اسے بیویوں کی سازشوں سے محفوظ رکھنے کا مسئلہ تھا۔

سی آئی اے، انٹرپول، ایف بی آئی، 'را'، موساد اور دیگر کئی خطرناک تنظیموں کے جاسوس دن رات مجھے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ ان سے خود کو مسلسل چھپائے رکھنے کا مسئلہ تھا۔

میرے پاپا پا ہو گئے تھے۔ اگر کہیں ہوں گے تو بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں جاں نثاروں کے ذریعے اپنی گمشدہ اور سے ہونے والے بیٹے صلاح الدین ثانی کو تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ یہ مسئلہ تھا کہ وہ دونوں اپنی سلامتی کے لیے کب تک میرے اور جاں نثاروں کے محتاج رہیں گے؟

ہماری دنیا کے سپر پاورز، دشمن تنظیمیں اور انتہائی خطرناک شاطر سراغ رساں میرے دشمن محض اس لیے تھے کہ میں نے ریڈ مرکری کو کہیں چھپا رکھا تھا۔

یہ اندیشہ نہیں تھا کہ دنیا کی بڑی طاقتیں اور چالباز شاطر بھی ریڈ مرکری تک پہنچ پائیں گے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ مسئلہ تھا کہ اس جوہری مادے کو اپنے پاک وطن کے حکمرانوں کے حوالے کروں گا تو نتیجہ کیا ہوگا؟

میں جس دن ریڈ مرکری اپنے ملکی حکمران کے حوالے کروں گا، اس دن میری شامت آ جائے گی۔ سپر پاور کی نظروں میں وہ سب سے بڑا مجرم ہے جو پاک وطن کو مضبوط اور ناقابل شکست بنانا چاہتا ہے۔ میں پچھلے چوبیس برسوں سے انتظار کرتا رہا کہ کوئی سچا محب وطن برسر اقتدار آئے گا تو ریڈ مرکری اس کے حوالے کروں گا۔

میں نہیں جانتا کب میرے وطن کی قسمت جاگے گی اور کب ایماندار اور محب وطن برسر اقتدار اس ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے؟ ہو سکتا ہے میں نہ رہوں، میرا وقت پورا ہو جائے تو پھر ریڈ مرکری کا کیا ہوگا؟

دیکھا جائے تو میں نے وہ جوہری مادہ حاصل کر کے مصیبت مول لی تھی۔ اس دنیا کو تباہ کرنے والے تمام دشمنوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ چوبیس برسوں سے دن رات کا سکون برباد کرتا آ رہا تھا۔ مجھے اس جوہری مادے سے ایک پیسے کا بھی فائدہ نہیں تھا۔ اب اندیشہ یہ تھا کہ میری غفلت یا کسی کمزوری سے یا میری موت کے بعد ریڈ مرکری ان دشمنوں کے ہاتھ لگ جائے گی جو اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو میری برسوں کی بھاگ دوڑ کا فائدہ کیا ہوگا؟

جب میں نے فیصلہ کیا کہ اسے زمین کی تہ میں زیادہ سے زیادہ دفن کر دیا جائے۔ کوئی چیز فائدہ نہ پہنچائے اس کے برعکس جینا دوبھر کر دے تو کہتے ہیں خاک ڈالو اس پر۔۔۔

لہٰذا میں خاک ڈال چکا ہوں۔ ہٹر اسکس سے کئی کلو میٹر دور جہاں میرا انقلاب آیا ہے۔ وہاں تیس فٹ کی گہرائی میں اس جوہری مادے کو دفن کر چکا ہوں۔ یہ راز صرف چھ جاں نثار جانتے ہیں۔ ہم نے قسم کھائی ہے یہ راز ہمارے سینوں میں رہے گا اور ہماری میت کے ساتھ دفن ہو جائے گا۔ خدا کا شکر ہے میں ریڈ مرکری کی طرف سے مطمئن تھا۔ آئندہ جب تک خدا کو منظور نہیں ہوگا کوئی وہاں تک بھی نہیں پہنچ پائے گا اور میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین میں چھپے ہوئے خزانوں کو اپنے بندوں سے ہمیشہ نہیں چھپاتا۔ کسان کو زمین کی تہ سے اگی ہوئی فصل دیتا ہے۔ کان کنوں کو کوئلے اور ہیرے کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ غوطہ خوروں کو سیپ میں موتی دیتا ہے۔

الغرض معدنیات ہوں یا پاتال میں چھپے ہوئے انجانے راز ہوں، وہ رب العالمین وہاں تک انہیں پہنچاتا ہے جو اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی ریڈ مرکری تک بھی اس کے مستحقین پہنچیں گے۔

☆☆☆

اب میرا سارا دھیان لادو انگوٹھی اور عصا کی طرف تھا۔ دشمن یہ نہیں جانتے تھے کہ میں ان کی مطلوبہ ریڈ مرکری کو منوں مٹی تلے دبا چکا ہوں۔ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے کبھی سکون سے نہیں رہنے دیں گے۔

ان سے محفوظ رہنے کے لیے انگوٹھی اور عصا کو میرے پاس رہنا چاہیے تھا۔ جبکہ میرے وہ دونوں محافظ اس زمین کی تہ میں چھپے ہوئے تھے اور میں اسمِ اعظم کی برکت حاصل کیے بغیر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر یہ کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے انڈیا میں رہنا ضروری تھا اور انڈیا میں رہنے کے لیے مجھے امیر خیری بن کر رہنا تھا۔ میرے جاں نثار مجھے امیر خیری کے متعلق مکمل معلومات فراہم کر رہے تھے۔ میں اس عیاش امیر کبیر شخص کی آڈیو کیسٹ سن کر اس کی آواز اور لب و لہجے کی ادائیگی کو سمجھ رہا تھا۔ ویڈیو کیسٹ دیکھ کر اس کے چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کی نقل کرتا رہتا تھا۔

اس کی نقالی میرے لیے مشکل نہیں تھی۔ مشکل یہ تھی کہ اس کے ماضی اور حال کے خفیہ معاملات معلوم نہیں تھے۔ میرے جاں نثار کھوج لگا رہے تھے۔ مگر کسی چار دیواری میں اور بند کی کال کوٹھری میں چھپے ہوئے بھید ایک دو دن میں معلوم نہیں ہوتے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے مہینوں اور برسوں لگ جاتے ہیں اور یہی ہو رہا تھا۔ ایک برس گزرنے کے بعد بھی رہ رہ کر اس کم بخت کا کوئی یار دار یا اس سے تعلق رکھنے والی کوئی نئی بات معلوم ہوتی رہتی تھی۔ اگر میں اس کی تمام باتیں تمام راز معلوم کیے بغیر امیر خیری بن کر انڈیا جاتا تو کسی دن بھی میرے بہروپ ہونے کا بھید کھل جاتا۔ یوں دو برس گزر گئے۔ ایک تو اس کے متعلق مکمل معلومات حاصل نہیں ہو رہی تھیں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ میں پنج وقتہ مصروفیات کے باعث پوری توجہ اور لگن سے اسمِ اعظم پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ میرے برعکس خدا اسمِ اعظم میں جذب ہونے لگی تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت ملتا تھا۔ وہ میرے سائے میں اس قدر محفوظ اور مطمئن تھی کہ کوئی مسئلہ اسے الجھاتا نہیں تھا۔ وہ بڑی آسودگی اور اطمینان سے پڑھتے پڑھتے اللہ کہتے کہتے اپنے نام کو اپنے وجود کو بھول جاتی تھی۔

میں ایک صبح نماز سے فارغ ہو کر اس کے کمرے کی طرف آیا تو اللہ کا نام سن کر دروازے پر ہی رک گیا۔ وہ نماز پڑھنے کے بعد قبلہ رو بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے جب اللہ کا نام نکلا تو میری عجیب سی کیفیت ہوئی۔ قدم رک گئے۔ یوں دم بخود ہوا کہ چند لمحوں تک سانس لینا بھول گیا۔ آج بھی ٹھیک طور پر بیان نہیں کر سکوں گا کہ خدا نے اسمِ اعظم کی ادائیگی کیسے کی تھی۔

اس نام کی پاکیزگی اس کا تقدس خدا کی زبان سے اور حلق سے نہیں ابھرا تھا۔ وہ نام کسی عالمِ نامعلوم سے تڑپ کر نکلا تھا اور خدا کے سینے میں بھر گیا تھا۔ میں یقین سے کہتا ہوں وہ اسمِ اعظم نہ اس کی زبان سے نکلا تھا نہ میرے کانوں نے سنا تھا۔ وہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی روحانی لہر تھی۔ جو دل کی نامعلوم گہرائیوں سے نکلی تھی اور میرے دل تک پہنچی تھی۔ ان لمحات میں یہ انکشاف ہوا کہ اسمِ رب عظیم کو کوئی سنا نہیں سکتا ہے۔ وہ دل کی طرح دل سے نکلتا ہے اور دل میں اترتا ہے۔ یہ سودا زبان و بیان کا نہیں ہے۔ صرف اور صرف روح کی گہرائی اور وسعت کا ہے۔

میں پہلی بار فرطِ عقیدت سے خدا کو تکنے لگا۔ وہ اسمِ اعظم پڑھ رہی تھی۔ لیکن اب وہ ادائیگی نہیں تھی جس نے میرے قدموں کو زنجیر کیا تھا اور ایک پل کے لیے روحانی کیفیات میں گم کر دیا تھا۔

ظاہر ہے ابھی اس میں روحانی پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ پڑھتے پڑھتے دنیا میں واپس آ جاتی تھی۔ ابھی مشق جاری تھی۔ ابھی اللہ سے لو لگی تھی مگر دنیا داری کی لو بھی لگی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ نے اس کی عبادت اور محویت میں مداخلت کی تھی۔

وہ اب بھی پڑھ رہی تھی۔ مگر دل کی طرح دل کو نہیں چھو رہی تھی۔ عبادت کے وقت صرف عبادت میں نہیں ڈوب رہی تھی۔ پھر بھی میرے مقابلے میں بڑی کامیابی سے رفتہ رفتہ اسمِ اعظم کو روح کی انگلی سے چھو رہی تھی۔

میں نے پہلی بار خدا کو توجہ سے دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ مجھے پتا نہیں چل رہا ہے اور وہ تبدیل ہو رہی ہے۔ اس میں سنجیدگی اور بردباری آ گئی ہے۔ شخصیت میں ایسا نامعلوم تقدس پیدا ہو رہا ہے جو غیر شعوری طور پر متاثر کرتا ہے۔

ان لمحات میں وہ جائے نماز پر ایک مقدس ہستی لگ رہی تھی۔ ایسی ہستی جس سے پاکیزہ ماحول میں صرف عبادت کی توقعات ہی کی جا سکتی ہیں۔

یہ کیا بات ہوئی...؟ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی...

میں جوانی کی طرف واپس آ رہا تھا اور وہ عین جوانی کے آغاز میں ایک مقدس بزرگ ہستی کے روپ میں ڈھل رہی تھی اور یہی مجبوری تھی کہ میں اس کی تبدیلی پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ میں مسلمان ہوں۔ دل میں خدا کا خوف ہے۔ میں تذبذب میں پڑ گیا کیا ہونا چاہیے؟ میں کیا کروں؟

میں ذرا اور قریب آ کر اس سے فاصلہ رکھ کر دو زانو ہو گیا۔ وہ زیرِ لب پڑھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ چپ ہو گئے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا پھر دھیمی سی مترنم آواز میں پوچھا۔ "آپ نے نماز پڑھ لی؟"

"خدا کا شکر ہے۔ اذان سے پہلے خود بخود آنکھ کھل جاتی ہے۔ پھر کسی طرح کی کاہلی اور سستی کو غالب آنے نہیں دیتا۔ کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ابھی نماز پڑھ کے ہی آ رہا ہوں۔"

خدا نے سر گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "اگر آپ نے ابھی نماز پڑھی ہے تو آپ پر سستی غالب آ گئی تھی۔ دیکھیں کتنا دن نکل آیا ہے؟"

میں نے جلدی سے بات بنائی۔ "میں وقت پر اٹھ گیا تھا۔ دراصل واش روم میں دیر ہو گئی تھی۔"

اس نے مجھے تعجب کے انداز میں دیکھا۔ میں نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "آنکھ کھل گئی تھی۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ذرا دیر ہو گئی۔ پھر بھی نماز پڑھ لی ہے۔"

"آپ کو یہ سمجھنا چاہیے جب تک نماز صحیح وقت پر صحیح جذبے سے نہیں پڑھیں گے تب تک اسمِ اعظم صحیح ادا نہیں کر سکیں گے۔"

"تم تو دیکھ رہی ہو حالات مجھے کس طرح الجھاتے رہتے ہیں؟ اسی لیے میں..."

اس نے ہاتھ اٹھا کر آگے کچھ کہنے سے روکنے کا اشارہ کیا۔ میں چپ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "دنیاوی معاملات تو الجھاتے ہی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود جو دیندار ہوتے ہیں وہ مکمل خشوع و خضوع سے عبادت کرتے ہیں۔ آپ انگوٹھی اور عصا حاصل کرنے کے لیے نمازیں پڑھتے ہیں۔ بےشک ہم اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہیں لیکن کیسے مانگتے ہیں؟ قبلہ رو کھڑے ہوتے ہیں جھکتے ہیں بیٹھتے ہیں سجدے کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ نماز ہے اور ہم عبادت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ پھر مدد حاصل ہو جاتی ہے۔ ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو اٹھنا بیٹھنا اور جھکنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ عبادت تھی ہی نہیں وہ تو ایک نمائش ہوتی ہے جو ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم یہ باتیں مجھے کیوں سنا رہی ہو؟"

"آپ نے اپنی پچھلی زندگی کا کچھ حال مجھے سنایا تھا۔ آپ نے نصف سے زیادہ جوانی عیش و عشرت میں گزاری۔ پھر ایک بہت ہی نیک عمل کے باعث خدا آپ پر مہربان ہوا۔ آپ دینی احکامات پر عمل کرنے لگے۔ آپ کو وہ انگوٹھی اور عصا کے ذریعے تحفظ اور توانائی حاصل ہونے لگی۔ اس کے بعد ہی آپ نے نمازیں چھوڑ دیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔ ان دنوں دشمنوں کی ایسی یلغار تھی کہ میں جگہ جگہ بھاگتا پھرتا تھا۔"

"کہیں ایک جگہ نہ ٹکنے کے باوجود آپ دنیا کے تمام کام کرتے تھے۔ تمام ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ صرف نماز آپ کے لیے غیر ضروری ہو گئی تھی۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"یہی بات ہے۔ اسی لیے انگوٹھی اور عصا آپ کے ہاتھ سے نکل گئے۔"

یہ بات اتنی سچ اتنی کڑوی تھی کہ میں جواب نہ دے سکا۔ واقعی میں پھر گیا تھا۔ صرف جمعے کی نماز پڑھ کر مسلمان ہونے کی ایک رسم ادا کرتا تھا۔ یہ گمان تھا کہ خدا مجھ سے راضی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ راضی ہے تو عصا اور انگوٹھی عطا کرنے والے معبود نے مجھے ان عنایات سے محروم کیوں کر دیا ہے؟

اس نے کہا۔ "کئی دنوں سے سوچ رہی تھی۔ آپ کو غلطیوں کا احساس دلاؤں۔ مگر ڈرتی تھی کہ آپ ناراض ہو جائیں گے۔"

"میں ناراض نہیں ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ اب میں نے عہد کر لیا ہے کبھی ایک وقت کی بھی نماز نہیں چھوڑوں گا۔"

"ایک اور سچ کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں۔ کہو..."

"آپ خدا کے خوف سے نہیں دشمنوں کے خوف سے نماز قائم کر رہے ہیں۔ انگوٹھی اور عصا حاصل کرنے کے لیے نمازیں اور وظیفے کے لیے اسمِ اعظم پڑھ رہے ہیں۔ ذرا اپنا محاسبہ کریں۔ کیوں نہیں پڑھ پا رہے ہیں؟"

"تم بولو۔ کیوں پڑھنے میں ناکامی ہو رہی ہے؟"

"خدا بندوں کی نیت کو دیکھتا ہے۔ پھر نمازیں قبول کرتا ہے۔ آپ کی معبودیت میں نماز نہیں ہے لالچ اور انگوٹھی ہے۔ وہ چیزیں ہیں جنہیں پانے کے بعد آپ نماز سے پھر گئے تھے۔ ہمارا معبود غفور الرحیم ہے۔ بار بار معاف کرتا ہے اور سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔ سنبھلنے کے لیے لازمی ہے کہ دشمنوں کو نظر انداز کریں۔ دل میں صرف خوفِ خدا رکھیں۔ کہیں گوشہ نشین رہ کر عبادت کریں گے تو کوئی دشمن آپ کے سائے تک بھی نہیں پہنچ پائے گا۔ آپ ان سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے نیاز مند رہیں گے۔ میری طرح دل کی اور روح کی گہرائیوں سے اسمِ اعظم پڑھ سکیں گے اور اسمِ اعظم کی روحانی ادائیگی کے لیے نماز صحیح وقت پر صحیح جذبے سے قائم رکھنا لازمی ہے۔"

وہ کوئی معصوم یا پہنچی ہوئی بزرگ ہستی نہیں تھی۔ میرے سامنے کی بچی تھی۔ دین سے تعلق رکھنے والی کوئی ذہین دیہات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں کر رہی تھی۔ مجھ سے جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئی تھیں انہیں دین کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”یہ میرے لیے مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن ہے کہ میں دشمنوں کو نظر انداز کر کے گوشہ نشین ہو کر عبادت کروں۔“

پھر میں نے ٹھہر کر کہا۔ ”اب سنو کہ مسائل کتنے شدید ہیں؟ پاپا کی گمشدگی نے الجھا دیا ہے۔ اگر وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، ہماری دنیا میں نہیں رہے تو انہوں نے اپنے نواسے صلاح الدین ثانی کو کون پرائے ہاتھوں سونپا ہے؟ صلاح الدین ثانی نے یعقوب کے گلے لگ کر پاپا کی آواز اور لہجے میں پیش آنے والے خطرے سے کیسے آگاہ کیا؟ کیا یہ اشارے نہیں ملتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور بعد میں آنے والی وجوہات کی بنا پر خود کو ظاہر نہیں کر رہے ہیں؟ کسی مجبوری کے باعث نہ سامنے آ رہے ہیں، نہ براہ راست کچھ بول رہے ہیں۔ یہ ایسا معما، ایسی الجھن ہے کہ نماز کے وقت اور اسم اعظم پڑھنے کے دوران میں اچانک توجہ کو منتشر کر دیتی ہے۔ میں...... اور صلاح الدین ثانی تمام دشمنوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اگر میں اپنے جاں نثاروں کے ساتھ دیوار بن کر نہ رہوں تو سی آئی اے، موساد اور دوسری خطرناک تنظیمیں انہیں بھی سکون سے رہنے نہیں دیں گی۔ میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار نہیں کر سکوں گا۔“

میں نے اس پر ایک نظر ڈالی، پھر کہا۔ ”میں تمہارے پاس بیٹھا زندہ سلامت سانسیں لے رہا ہوں۔ یہ نیکی کی بدولت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے وسیلہ بنا کر مجھے نئی زندگی دی ہے۔ اگر وہ انڈیا سے ہزاروں میل دور استنبول تک آتی اور الجھی کو مجھ تک نہ پہنچاتی تو راز دین کی قید سے نجات ناممکن ہو جاتی۔ اس تہ خانے سے میری لاش ہی باہر نکلتی۔ آج نیکی دنیا میں تنہا ہے۔ اس کے چاچا پنڈت دینا ناتھ کا دیہانت ہو چکا ہے۔ شوہر دغا باز تھا، وہ مر گیا ہے۔ میں اسے منکوحہ بنا کر اس کا سہارا بن کر اس کے احسانات کا قرض چکا سکتا تھا لیکن ان دنوں وہ حاملہ تھی۔ اس سے نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ پنڈت جی کی پیشگوئی تھی کہ میں اگلے آٹھ برس تک کسی کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم نہیں کر سکوں گا اور وہ پیشگوئی اب تک درست ثابت ہو رہی ہے۔“

خدا نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا آٹھ برسوں کے بعد کیا ہوگا؟ لیکن میرا یہ فرض ہے کہ نیکی اور اس کی بیٹی کا محافظ اور سرپرست بن کر رہوں۔ میں یہ فرض ادا کر رہا ہوں۔ میرے جاں نثار جس طرح میری اور صلاح الدین کی نگرانی کر رہے ہیں، اسی طرح نیکی اور اس کی بچی کی ہر ضرورت پوری کر رہے ہیں۔ پچھلے چار برسوں میں سی آئی اے اور اداروں کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ نیکی کا تعلق پہلے بھی خفیہ ایجنسی سے تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن اس حقیقت کا ٹھوس ثبوت انہیں نہیں مل رہا ہے۔“

میں ذرا چپ رہا، پھر بولا۔ ”بہرحال میں تمہارے سامنے مسائل بیان کر رہا ہوں۔ ان مسائل کی بھرمار مجھے توجہ سے اسم اعظم پڑھنے نہیں دیتی۔ نماز کے دوران میں بھی جیسی محویت ہونی چاہیے وہ نہیں ہوتی۔“

خدا نے پوچھا۔ ”اسم اعظم نہیں پڑھ پائیں گے تو پھر سائیں کے غار میں انگوٹھی اور عصا تک کیسے پہنچیں گے؟“

”یہ میرا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ ہم دونوں پچھلے دو برسوں سے اسم اعظم پڑھتے آ رہے ہیں۔ میں پچھڑ رہا ہوں۔ تم مجھ سے بہت آگے نکل گئی ہو۔“

میں نے اس پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم رب عظیم کے اسم اعظم میں اس قدر جذب ہو جاؤ گی۔ یا خدا! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اسم اعظم کی ادائیگی جانے کیسی محویت سے کی تھی؟ میں نے سنا تو دل ایک دم سے لرز گیا۔ میں جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ یہ یقین سے کہوں گا کہ تم جلد ہی اسم اعظم کی ادائیگی میں کمال حاصل کرنے والی ہو۔“

میری بات سن کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر کہا۔ ”اللہ رب العالمین ہے۔ مجھ پر مہربان ہے۔ میں پچھلے دو برسوں سے دن رات پڑھتی آ رہی ہوں۔ وہ معبود میری لگن، میرا جذبہ، میری نیت اور میری محویت کو قبول فرما رہا ہے۔“

میں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ابھی کوئی آنکھ بند کرے اور دل کی گہرائیوں سے اللہ کے ساتھ اللہ کہے اور کہتا رہے تو اس کے آس پاس کی دنیا گم ہو جائے گی۔ بند آنکھوں کے خلا میں اللہ کی موجودگی ضرور محسوس ہوگی۔“

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”میں نے کئی بار ایسی ادائیگی کی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”صحیح ادائیگی کے باوجود کمی رہ جاتی ہے۔ دین کے، دنیا کے اور دنیاداری کے سلسلے میں کوئی بھی کمی ہو وہ صرف نماز سے پوری ہوتی ہے۔ یہ کوتاہی آپ کو دشمنوں کے آگے کوتاہ قد بنا دے گی۔“

اس کی سچی اور ناقابل تردید باتیں مجھے پریشان

کر رہی تھیں۔ میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو یوں لگا جیسے میرے سامنے دعا مجسم ہو کر کھڑی ہوئی ہے۔ وہ دعا دشمنوں کے تمام حملوں کو روکنے والی ہے۔

میں نے کہا۔ ”اللہ تم پر مہربان ہے۔ تمہاری عبادت قبول ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے تم جلدی اسم اعظم کی تکمیل میں روحانی پختگی حاصل کر لو گی۔ ایسا ہوگا تو تم پاپا سائیں کے غار میں میرے ساتھ چلو گی۔ اسم اعظم کی برکت سے اس وسیع و عریض چٹان کو ہٹا کر راستہ بناؤ گی۔ جسے دنیا کی کوئی کرین اپنی جگہ سے ہلا نہ سکی۔“

”میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتی رہوں گی کہ وہ معبود مجھے آپ کی توقع کے مطابق کامیابی عطا فرمائے اور میں انگوٹھی اور عصا کو وہاں سے نکال لاؤں لیکن......“

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”ہاں بولو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”آپ یہ ذمہ داری مجھے سونپ کر تمام فکر و پریشانی سے نجات حاصل کر لیں گے۔ پھر کوئی حاجت نہیں رہے گی۔ تو آپ پہلے کی طرح عبادت سے اور خاص طور پر نماز سے کترائیں گے اور اپنی مصروفیات کا دکھڑا سناتے رہیں گے۔“

میں تسلیم کرتا ہوں، یہ بات بھی ٹھیک تھی۔ اب اسے میری کمزوری سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ ٹھیک بول رہی تھی تاکہ میں آئندہ ہر نماز سے دور نہ ہو جاؤں۔ میں نے کہا۔ ”یہ انسانی فطرت ہے۔ جب دشمنوں کا خوف نہ ہو، کوئی بیماری حملہ نہ کرتی ہو، کوئی ناگہانی مصیبت، دولت اور طاقت کی کمی جاتے ہی ٹل جاتی ہو تو پھر خدا یاد نہیں رہتا۔ مانتا ہوں ماضی میں ایسی غلطیاں کر چکا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ پانچ وقت کی نمازیں ٹھیک وقت پر ٹھیک جذبے سے پڑھوں گا۔“

”یہ یاد رکھیں کہ ماضی میں محض نماز سے کترانے کے باعث آپ غیر معمولی صلاحیتوں سے اور غیر معمولی قوتوں سے محروم ہوتے رہے ہیں۔“

”تم بہت اچھی ہو۔ میں یاد رکھوں گا اور تم یاد دلاتی رہو گی۔ مجھے ایک وقت کی نماز میں بھی سستی نہیں کرنے دو گی۔“

”اللہ مجھے توفیق دے۔ میں اپنا فرض ادا کرتی رہوں گی۔ اب ہمیں کچن میں چلنا چاہیے۔ یہ بتائیں کیا کھانا پسند کریں گے؟“

”جو کھلاؤ گی کھاؤں گا۔ ابھی جو کہنے آیا تھا وہ بات رہ گئی ہے۔“

”چلیں۔ کچن میں باتیں ہوں گی۔“

”یہیں جو کہنا ہے کہہ جاؤں تو اچھا ہے۔“

”تو پھر بولیں؟“

ہم ایک دوسرے سے نظریں ملا کر باتیں کر رہے تھے۔ اچانک میری نظروں کا مفہوم بدل گیا۔ میں نے بڑے پیار سے دیکھا تو فوراً اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ میں موضوع بدل رہا ہوں۔ دین سے ہٹ کر دنیاوی ضرورت کی طرف آ رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں؟

میں نے بڑی خاموشی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ جو بات زبان سے ادا نہ ہو وہ خاموشی سے کہہ دی جاتی ہے۔ اس کا ہاتھ ایک سہمی سی چڑیا کی طرح ہولے ہولے کانپنے لگا۔ موضوع بدل گیا، موسم بدل گیا، مزاج بھی بدل گیا۔ میں نے دھیمی سرگوشی میں پوچھا۔ ”میری دلہن بنو گی؟“

میں نے دیکھا اس کے سینے میں اتھل پتھل سی ہوئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ میں اس کی اندرونی کیفیت کو بھانپ رہا تھا۔ میرا اندیشہ تھا وہ شرما رہی ہے، منہ سے کچھ نہیں بولے گی۔ اس کی خاموشی رضامندی کی دلیل ہوگی اور رضامندی یوں ظاہر کی کہ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے نیچے سے ہٹا دیا تھا۔

پھر میری خوش فہمی ختم ہو گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑی آہستگی سے کھینچ لیا۔ اپنے ہاتھوں کو دوپٹے میں یوں چھپا لیا جیسے میں پھر پکڑنے آ جاؤں گا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ دھیمی سی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ ایسی باتیں نہ کریں۔“

میں نے شدید حیرانی سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں پچھلے پانچ برسوں سے انتظار کر رہا ہوں۔ پنڈت جی کی بتائی ہوئی مدت پوری ہو چکی ہے اور تم شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔“

میں بول رہا تھا، وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔ اس کا یوں جواب نہ دینا، کترا کر جانا، بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں سوچتا رہ گیا۔ وہ کمرے سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کیا پچھلے دو برسوں میں عبادت اور ریاضت اس پر غالب آ گئی ہے؟ وہ دنیاوی خواہشات سے دور ہو چکی ہے؟ یا خدا! کیا وہ اللہ والی بن کر رہنا چاہتی ہے؟ میں تیزی سے چلتا ہوا کچن میں آیا۔ وہ کچن کے کام میں لگ گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم خاموش کیوں ہو؟ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

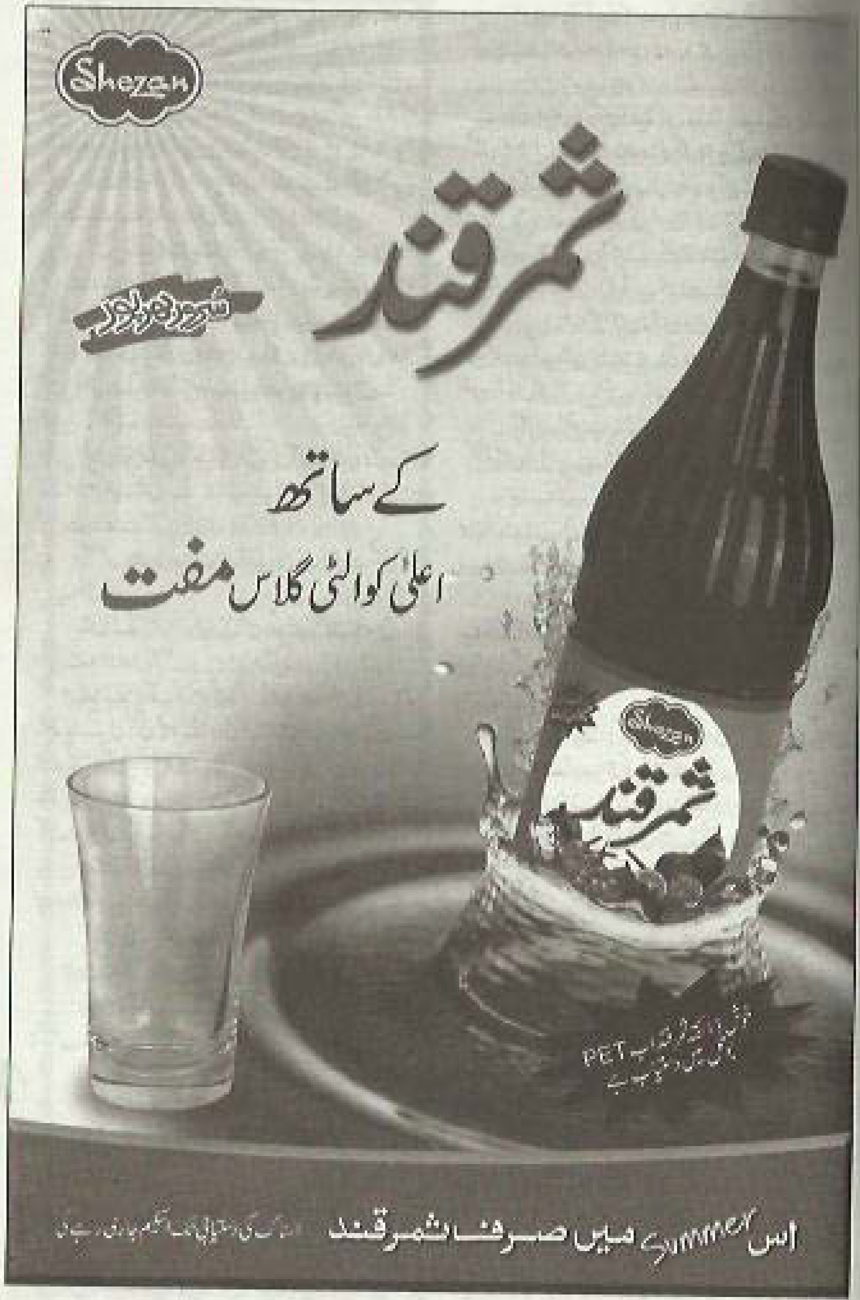

ری ہے؟''

وہ چپ تھی۔ چولہے پر چائے کا پانی چڑھا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میں تم کو تنگ نہیں کروں گا۔''

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''تم چپ رہنے کا روزہ رکھو۔ میں کھانے پینے کا روزہ رکھوں گا۔''

وہ پھر اپنے کام سے لگتے ہوئے بولی۔ ''پلیز آپ کچھ خیال نہ کریں۔ میں چاہتی ہوں ابھی شادی کی بات نہ کی جائے تو اچھا ہے۔''

میں نے قریب آ کر پوچھا۔ ''کیوں نہ کروں؟ کیا ایک لڑکی سے شادی کی بات کرنا گناہ ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر یہ بات ہے کہ میں بوڑھا ہوں۔''

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر پوچھا۔ ''کیوں مجھ سے کترا رہی ہو؟''

''کبھی آپ سے کترانے کا خیال بھی دل میں نہیں آ سکتا۔ آپ ہاتھ چھوڑیں۔ میں بولتی ہوں۔''

''میری گرفت میں رہ کر بولو۔''

''میں دین کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گی۔ ہم ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں۔ مجھ سے فاصلہ رکھیں۔ پھر بولوں گی۔''

میں نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ناشتا تیار کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ مجھے دن رات عبادت کرتے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے انسانی فطرت سے حق رکھنے والی تمام خواہشات کو کچل دیا ہے۔ اپنے جسم اور روح کی پاکیزگی کے ساتھ نماز ادا کرتی ہوں۔ تب ہی صرف اسم اعظم پڑھنے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔''

وہ اپنے کام سے لگی ہوئی بول رہی تھی۔ ''میں مکمل کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس مرحلے تک پہنچنا ہے کہ بابا صاحب کے غار میں اس چٹان پر ہاتھ رکھ کر کہوں... بسم اللہ... اور وہ چٹان سرک جائے اور انگوٹھی اور عصا تک پہنچنے کا راستہ کھل جائے۔''

میں نے کہا۔ ''انشاء اللہ تمہیں کامیابی حاصل ہوگی۔ عبادت لازمی ہے۔ تم اسے دل و جان سے جاری رکھو لیکن دنیاوی معاملات میں بھی رہو۔ لیکن ہمارے دین میں رہبانیت کی اجازت نہیں ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ شادی کی عمر کو پہنچتے ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاؤ۔ نسل انسانی کو آگے بڑھاؤ۔ دین کے احکامات کے مطابق عبادت کے تمام مدارج طے کرو اور دنیا کی اہم ذمے داریاں بھی نبھاتے رہو۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور عبادت کے سوا کوئی اور کام نہ کرنے کے لیے فرشتے کافی ہیں۔ انسان کو دنیا کے تمام اہم کام انجام دیتے ہوئے عبادت کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کیا تم راہبہ بن کر رہنا چاہتی ہو؟''

وہ منہ پھیر کر سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ راہبہ بننا چاہتی ہوں۔''

''پھر کیا کہا ہے؟ میں تمہارے کترانے کے انداز کو کیا سمجھوں؟''

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''میں مہلت چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ بتاؤ کب تک میری شریک حیات بننا چاہتی ہو؟''

وہ چپ رہی۔ کچھ سوچتی رہی۔ میں نے کہا۔ ''تم کسی الجھن میں ہو۔''

''الجھن آپ کے لیے ہے۔ یہ بتائیں دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو آپ کسے اپنائیں گے؟ کسے چھوڑیں گے؟ مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں یا انگوٹھی اور عصا آپ کے لیے لازمی ہیں؟''

''دونوں ہی لازمی ہیں۔''

''آپ سب ہی کچھ بیک وقت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ میں نے نیت کی ہے جب تک اسم اعظم پڑھنے کی روحانی صلاحیت اور پختگی حاصل نہیں ہوگی اور انگوٹھی اور عصا تک آپ کو نہیں پہنچاؤں گی تب تک ازدواجی خواہش سے دور رہوں گی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''میری ہر خواہش سے افضل آپ کی سلامتی ہے اور آپ کی سلامتی انگوٹھی اور عصا کے حصول سے ہے۔''

وہ ناشتے کی ڈشیں میز پر لا کر رکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ ''میں اماں کے پیٹ سے جیسی پیدا ہوئی تھی۔ ویسی ہی اب تک ہوں۔ آپ مجھے اسم اعظم کی روحانی قوت حاصل کرنے تک ہر پہلو سے پاک رہنے دیں۔''

میں چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک اپنی ماں [illegible] کی ڈپلیکیٹ تھی۔ وہی رنگ روپ وہی ناک نقشہ۔ قد اور جسامت بھی وہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے شباب واپس آ گئی ہے۔

وہ اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ میں نے اسے جان سے زیادہ چاہا تھا۔ اس نے بھی پیار کی انتہا کی تھی لیکن مجھ سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شادی نہیں کی تھی کیونکہ وہ ایڈز کی مریضہ تھی۔ اپنا روگ مجھے لگانا نہیں چاہتی تھی۔

آج وہی گلاب جیسے عذاب کے روپ میں پھر شادی سے انکار کر رہی تھی۔ میری خاطر حق اور پرہیزگار رہ کر مکمل طہارت کے ساتھ نماز پڑھنا اور اسم اعظم پڑھنا چاہتی تھی۔ میری ہی بہتری اور سلامتی کے لیے نئی اولاد شریک حیات بننے سے انکار کر رہی تھی۔

میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ شریک حیات بن کر بھی عبادت و ریاضت جاری رکھ سکتی ہے لیکن میں کچھ کہہ نہ سکا۔ کال لنک فون نے مجھے متوجہ کر لیا۔ ایک جاں نثار کال کر رہا تھا۔ میں نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہاں کہو۔"

اس نے کہا۔ "یعقوب بابا بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ بات کراؤ۔"

فون خاموش ہو گیا۔ پھر بیٹے کی آواز سنائی دی۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے جواب دے کر پوچھا۔ "میری بہو خیریت سے ہے؟"

"خیریت سے ہے اور آپ کو ایک نہایت قیمتی تحفہ دینے والی ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔ کیا دادا بننے والا ہوں؟"

ثنا نے چونک کر سر گھما کر مجھے دیکھا۔ اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹنے والی تھی۔ اس نے سنبھال لی۔ وہ بہت کم سن تھی۔ یہ چونکا دینے والی بات تھی کہ جس کی دلہن بننے والی ہے وہ دادا بننے والا ہے۔ میں ذرا جھینپ گیا۔ دوسری طرف منہ پھیر کر یعقوب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں پاپا! میں آپ کی خوشی کا اندازہ کر رہا ہوں۔ آپ ہماری خوشی کا اندازہ کریں۔"

"ہاں بیٹے! میں تمہاری اور صنم کی خوشیوں کا اندازہ کر رہا ہوں۔"

وہ بولا۔ "اس خوشی کے موقع پر آپ کی بہو آپ سے ناراض ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "بہو مجھ سے ناراض کیوں ہے؟"

"خود ہی سوچیں! ہماری شادی کو ڈھائی برس گزر چکے ہیں۔ اب تک آپ نے بہو کو دیکھ کر سر پر ہاتھ رکھا اور نہ اپنی صورت دکھائی۔"

"ہاں۔ میں ہمیشہ اپنی مصروفیات و مجبوریاں بیان کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اب اپنے پوتے یا پوتی کی خاطر ضرور ملنے آؤں گا۔"

وہ بولا۔ "آنے کا وعدہ کر رہے ہیں تو میں ابھی آپ کی بہو سے بات کرواتا ہوں۔ وعدہ کریں۔"

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ایسے وقت ثنا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "آپ مجھے یہاں تنہا نہیں چھوڑیں گے اور اپنے ساتھ بھی ان کے سامنے نہیں لے جا سکیں گے۔ میں عمر میں آپ کی بہو سے بھی چھوٹی ہوں۔"

یہ بات مجھے پتھر کی طرح لگی۔ میں اس وقت جواب دینے کے قابل نہ رہا۔ فون پر صنم نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے سلام کیا پھر پوچھا۔ "کیا واقعی آپ ہم سے ملنے آ رہے ہیں؟"

"ہاں۔ مگر ابھی نہیں۔ جس دن مجھے ننھا سا خوبصورت ساتھی دو گی۔ میں اسے چومنے اور تمہیں دعائیں دینے ضرور آؤں گا۔"

صنم اور یعقوب جانتے تھے کہ مجھ سے فون پر زیادہ دیر گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ لہٰذا جلد ہی ان سے رابطہ ختم ہو گیا۔

ثنا نے کہا۔ "آپ نہیں جا سکیں گے۔ بہو سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ ذرا سوچیں کتنے طویل عرصے سے انہیں ٹال رہے ہیں۔"

وہ سچ بول رہی تھی لیکن مجھے بیٹے اور بہو کی خوشیوں کے پیش نظر دل رکھنا تھا جو ابھی ان سے کہا تھا۔ ہم رشتے کی بحث پر آ گئے۔ ثنا نے کہا۔ "ویسے مبارک ہو۔ آپ دادا بننے والے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اگرچہ یہ خوشی کی بات ہے۔ لیکن تمہارے سامنے عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"کیوں عجیب سا لگ رہا ہے؟"

"عمروں کا فرق بھی کچھ ستانے لگتا ہے۔"

"یہ آپ سو برس کے بوڑھے نہیں ہیں، پھر بھی جوان ہو رہے ہیں۔"

"میرے خاندانی معاملات میں یہ جوانی مہنگی پڑ رہی ہے۔ تم میری ہونے والی دلہن ہو۔ کبھی میرے بیٹے کی دلہن ہوتی تو آج یعقوب سے ہونے والا جو پوتا ہے وہ تمہارے بیٹے سے عمر میں بڑا ہوگا۔ یہ عجیب سلسلہ چلتا رہے گا کہ بہو بڑی ساس چھوٹی، پوتا بڑا اور بیٹا عمر میں چھوٹا رہے گا۔"

"آج میں آپ کے مقابلے میں کم سن ہوں۔ ذرا حساب کریں۔ آج سے تیس برس بعد پچاس برس کی ہو جاؤں گی اور آپ واپسی کا سفر کرتے ہوئے مجھ سے عمر میں پچیس برس چھوٹے ہو جائیں گے۔ میں بوڑھی ہو جاؤں گی اور آپ تیس برس کے جوان دکھائی دیں گے۔"

"ہاں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کیا ہونے والا ہے تو

ہول سا آتا ہے کہ اگلے تیس برسوں میں اپنے بیٹے یعقوب سے اور اپنے چھوٹے صلاح الدین ثانی سے عمر میں چھوٹا ہو جاؤں گا۔ ان دونوں سے ہونے والی بیٹیاں میرے برابر ہوں گی ان کی تو دنیا کو دیکھے گی؟ کیا کہے گی؟ تو کون کو کہ وہ سب میری کزن ہیں یا دوست ہیں۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھو کر کہا۔ "توبہ توبہ۔ میں تمام رشتوں سے دور چلا جاؤں گا۔ کبھی کسی کا سامنا نہیں کروں گا تو معاملات الجھ جائیں گے۔ اگر اپنے پوتے پوتیوں سے اور نواسے نواسیوں سے برسوں کی جوانی کے بعد کبھی ملاقات کا سامنا ہوگا تو ہم رشتوں کے حوالے سے ایک دوسرے کو پہچان نہیں پائیں گے۔ ایسے میں لاعلمی کے باعث درمیان میں غلط رشتے قائم ہو جائیں گے۔"

ثنا نے کہا۔ "واقعی بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔"

"پہلے تو میں خوش ہو رہا تھا کہ بڑھاپے کے بعد موت نہیں مل رہی ہے۔ دوبارہ جوانی مل رہی ہے لیکن اب سوچ رہا ہوں، جوانی کی طرف واپس جانا خوش بختی نہیں کم بختی ہے۔ آئندہ پچاس برسوں میں میرے سیکڑوں پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہوں گے۔ اگر میں ان میں سے ہر رشتے کا نام اور روز و تاریخ ریکارڈ کے طور پر نہیں رکھوں گا تو خدا نہ کرے ان رشتوں سے لاعلمی کے باعث غلط رشتے قائم ہو جائیں گے۔"

میں نے سر تھام کر کہا۔ "یا خدا میں کیا کروں؟ مجھے شرم و حیا عزیز ہے۔ جائز رشتے داری اور انسانی تہذیب عزیز ہے۔ کیا میں جوانی کی سمت واپس جانے سے انکار کروں تو واپسی کا سفر رک جائے گا؟"

"ایسا نہ سوچیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔ اس سے انکار نہ کریں بلکہ یہ زحمت کریں کہ اپنے تمام رشتوں کا تحریری حساب رکھتے رہیں۔ آپ کا خاندانی شجرہ دور تک پھیلتا جائے گا۔ آپ اس شجرے کی ہر شاخ، ہر پھول اور ہر پتی کا باتصویر اور باقاعدہ ریکارڈ رکھتے اور ان کی ہسٹری اپنے پاس رکھیں گے تو کبھی کوئی غلطی نہیں ہوگی۔"

میں نے سوچا پھر کہا۔ "ایسے ہی طریقہ کار کے مطابق زندگی گزارنی ہوگی۔ اپنے خاندان کے سیکڑوں افراد کا حساب رکھنا ہوگا۔ تب ہی بات بنی رہے گی۔"

ہم ناشتے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میں نے کہا۔ "ہم اپنی باتیں کرتے کرتے پورے خاندان کا ذکر لے بیٹھے۔ دیکھو ثنا! تمہیں مناسب نہیں کہ مجھ سے دور رہ کر عبادت نہیں کر رہی ہے۔ یہ نہ سوچو کہ شادی کے بعد انگوٹھی اور

بین الاقوامی تنظیمیں

س: "ایکو" سے کیا مراد ہے؟
ج: تنظیم برائے اقتصادی تعاون۔
س: یہ بتایئے کہ تنظیم برائے اقتصادی تعاون کا قیام کب عمل میں آیا تھا؟
ج: 1985ء
س: یہ بتایئے کہ اقتصادی تعاون کی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟
ج: تہران (ایران)
س: "سارک" سے کیا مراد ہے؟
ج: ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کوآپریشن۔
س: "سارک" تنظیم کا قیام کب اور کہاں پر عمل میں آیا تھا؟
ج: دسمبر 1985ء کو ڈھاکا میں۔
س: سارک کا ہیڈ کوارٹر کہاں پر ہے؟
ج: کھٹمنڈو (نیپال)
س: "کولمبو پلان" کیا ہے؟
ج: ایک عالمی تنظیم کا نام ہے۔
س: "کولمبو پلان" تنظیم کا قیام کب عمل میں آیا تھا؟
ج: 1950ء
س: "کولمبو پلان" تنظیم کے مستقل ممبران کی تعداد بتائیں؟
ج: 25۔
س: کیا آپ جانتے ہیں کہ "سینٹرل امریکن کامن مارکیٹ" تنظیم کے ممبر ممالک کی تعداد کتنی ہے؟
ج: چھ۔
س: "CACM" سے کون سی عالمی تنظیم مراد ہے؟
ج: سینٹرل امریکن کامن مارکیٹ۔
س: "سینٹرل امریکن کامن مارکیٹ" کا صدر دفتر کہاں ہے؟
ج: گوئٹے مالا۔
س: "سینٹرل امریکن کامن مارکیٹ" تنظیم کا قیام کب عمل میں آیا تھا؟
ج: دسمبر 1960ء

حنا عروج کی معلومات کراچی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عصا حاصل نہیں کرسکوگی۔"
"میں آپ کی بہتری کے لیے سوچ رہی ہوں۔"
"پلیز میرے لیے ایسا نہ سوچو۔ یہ سوچو کہ پچھلے دو برسوں سے اسم اعظم پڑھتی آرہی ہو۔ کیا تم جانتی ہو کہ بابا سائیں کی طرح اسم رب کریم پڑھنے کی پختگی اور صلاحیت اور کتنے برسوں میں پیدا ہوگی؟"
"یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ وہی ہماری عبادتوں کو قبول کرنے اور انعام دینے والا ہے۔"
"میں تو پوچھ رہا ہوں انعام کتنے عرصے میں ملے گا؟ دو چار ماہ میں یا برسوں میں؟ صاف کہہ دیتا ہوں میں انتظار نہیں کروں گا۔ تم آج کل میں فیصلہ سناؤ۔"
اس نے چور نظروں سے مجھے دیکھا۔ شرم و حیا کا تقاضا تھا۔ وہ اپنی شادی اور ازدواجی معاملات میں کھل کر بات نہیں کرسکتی تھی۔
میں نے کہا۔"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ تم شادی کی مسرتوں سے پہلے میری سلامتی چاہتی ہو۔ ان شاء اللہ ہمیں انگوٹھی اور عصا دونوں ہی ملیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عبادت بھی کرو اور ازدواجی زندگی بھی گزارو۔" میں وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔"اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"
اس نے پوچھا۔"کہاں جارہے ہیں؟ ناراض ہوگئے ہیں؟"
"ایک ناراض کرتا ہے تب ہی دوسرا ناراض ہوتا ہے۔ تنہائی میں بیٹھ کر سوچو پھر مجھ سے بات کرو۔"
میں وہاں سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کوئی میرے حالات کو سمجھے۔ میں پچھلے دس برسوں سے تنہا تھا۔ اس دوران بیوی یاد نہیں آئی۔ چاہتا رہا لیکن میرے اور ان کے درمیان کوئی چھوٹا سا تعلق قائم نہ ہوسکا۔ میں محروم ہی رہا۔
اور یہ محرومی ایسے وقت تھی جبکہ میں جوانی کی طرف سفر کررہا تھا۔ جوانی کے جو تقاضے ہوتے ہیں وہ مجھے بیکار سے لگے۔ میری دولت اور شخصیت سے متاثر ہوکر حسینوں کا میلہ لگ سکتا تھا۔ کون سمجھے گا کہ میں دینی احکامات کے خلاف رنگ رلیاں منانا چاہتا ہوں اور بظاہر پارسائی کررہا ہوں۔
سنا ہے قیامت کے دن گناہوں کی سزا ملے گی اور قیامت کس نے دیکھی ہے؟ جوانی بار بار پلٹ کر نہیں آتی۔ یہ ایک بار پلٹ کر آرہی ہے تو اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔
گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہو تو ایسے ہی خیالات بھڑکاتے رہتے ہیں۔ بہکنے کے مواقع پیدا ہوتے

تھے۔ گھر میں سمجھا رہا تھا۔ یہ بات ذہن میں تھی کہ یہ تو میرے صبر کا امتحان لے رہی ہے۔ قدرت کی مہربانی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ عیش و عشرت میں ڈوب جاؤں۔
میں بڑے صبر و استقلال سے یہ سوچتا چلا آرہا تھا کہ حجاب، نیکی اور سوئی سے محروم رہنے کا مطلب یہ ہے کہ قدرت فی الحال مجھے ازدواجی مسرتوں سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔ ایسی محرومیت کے پیچھے کوئی مصلحت ہوگی۔
لیکن اب صبر دل کی حد ہوگئی تھی۔ تنہا بھی اچھل اچھل حسیناؤں کی طرح نگاہیں پکار رہی تھی۔ ایسا کیوں ہورہا تھا؟ کیا اب بھی میں بوڑھا ہوں؟ کیا خود کو جوان سمجھ کر جوان لڑکی کی تمنا نہیں کرنا چاہیے؟
پچھلے دس برسوں سے جوانی کی سمت سفر جاری تھا۔ گرچہ میں پھر سے جوان نہیں ہوا تھا تو پہلے کی طرح بوڑھا بھی نہیں رہا تھا اور غزالہ مجھے بوڑھا سمجھ کر شادی سے انکار نہیں کررہی تھی۔ وہ دشمنوں کے حوالے سے مجھے اور تواتر اور ناقابل شکست بنانے کے لیے میری اس خواہش کو ٹال رہی تھی۔
اور وہ غلط سوچ رہی تھی۔
اور اللہ سے لو لگانے والی کے متعلق میں بھی غلط سوچ رہا تھا۔ یہ ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ عبادت کرنا اور بات ہے اور عبادت میں محو ہوکر روحانیت کے مراحل طے کرنا اور معاملہ ہے۔
میں نے یہ دیکھا ہے کہ روحانیت کے مراحل سے گزرنے والے رفتہ رفتہ دنیاداری سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دور ہوجائے۔ میرے پاس رہے۔ میری دھڑکنوں سے لگ کر رہے۔
اس سے اپنی بات منوانے کا بس یہی ایک طریقہ تھا کہ میں ناراضی ظاہر کرتا رہوں۔ میں نے دوپہر کو کھانے سے انکار کردیا۔ اس نے فون پر کہا۔"کچھ تو کھالیں۔ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ ٹھیک ہے لیکن رزق سے تو ناراض نہ ہوں۔"
"جب یہ جانتی ہو کہ تم سے ناراض ہوں تو یہ بھی جانتی ہو کہ مجھے کس طرح کھانا کھلاسکتی ہو؟"
"ہاں، جانتی ہوں۔ میں بھوکی رہوں گی تو آپ سے برداشت نہیں ہوگا۔ آپ خود بھی کھائیں گے اور مجھے بھی کھلائیں گے۔"
وہ بڑے اعتماد سے بول کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بے شک میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ وہ بھوکی پیاسی رہے۔ میں لباس تبدیل کرکے گھر سے نکل گیا۔ کار کی

گ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا تو وہ دوڑتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اس وقت تک میں کار آگے بڑھا چکا تھا۔ اس کی رفتار تیز کرتا ہوا مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔ وہ مجھے آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔
اس کے ساتھ یہی رویہ مناسب تھا۔ نہ میں اسے فاقہ کرتے ہوئے غور سے دیکھتا، نہ اس سے متاثر ہوتا اور نہ اسے منوانا تھا اور میرے پاس آکر مجھے منانا تھا۔
دن گزر گیا۔ شام ہوگئی پھر اندھیرا پھیلنے لگا۔ تب اس نے فون پر مخاطب کیا۔"آپ کہاں ہیں؟"
میں نے جواب نہیں دیا۔ وہ بولی۔"کیا مجھ سے نہیں بولیں گے؟ میں ابھی تک بھوکی ہوں۔"
میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ چپ رہا۔ اس نے کہا۔"آپ کو مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جانا چاہیے تھا۔"
میں نے پوچھا۔"کس رشتے سے تمہیں ساتھ لے جاؤں؟ ہم کس رشتے سے ایک چھت کے نیچے ایک چار دیواری میں رہتے ہیں؟"
وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔"اتنی بڑی دنیا میں خدا کے بعد صرف آپ ہی ہیں۔ خدا کے لیے آجائیں۔"
میں نے پھر وہی سوال کیا۔"کس رشتے سے...؟"
وہ رونے لگی۔ اس کی سسکیاں سنائی دیں۔ میں نے فون بند کردیا۔ اسے بند کرنے کے باوجود سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ میرے احساسات کو چھو رہی تھیں۔ میرا دل محبت سے بھر گیا۔ لیکن میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔
حجاب کے بعد میں نے اسے کبھی تنہا نہیں رہنے دیا تھا۔ آج پہلی بار اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے بعد میرے سہارے کی عادی ہوگئی ہے۔ رات تنہا نہیں گزار سکے گی۔
جو سوچا تھا، وہی ہوا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد فون پر روتے ہوئے کہا۔"آپ جیتے میں ہاری۔ گھر آجائیں۔ جو کہیں گے وہ مانوں گی۔"
"میں عشا کی نماز پڑھ کر مولوی صاحب کو لے کر آؤں گا۔ وہ آج ہی ہمارا نکاح پڑھائیں گے۔"
"پلیز جلدی نہ کریں۔ میں آپ کی بات مان تو رہی ہوں۔"
"جو کام آج ہوسکتا ہے میں اسے کل پر بھی نہیں ٹالتا۔"
"میری بات مان لیں۔ کل نکاح پڑھائیں۔"
"آج کیوں انکار کررہی ہو؟ کل تک کیا فرق پڑ جائے گا؟"
"میں آج کی تمام رات عبادت کرنا چاہتی ہوں۔"
میں نے ایک گہری سانس لے کر شکست خوردہ انداز میں کہا۔"ابھی وقت ہے۔ میں آرہا ہوں۔"
"خدا کا شکر ہے۔ کھانا تیار ہے۔ آجائیں۔"
میں نے فون بند کردیا۔ موڑ شکل میں ایک خوبصورت مسجد ہے۔ میں نے وہاں عشا کی نماز ادا کی۔ پھر گھر کے دروازے پر آکر کال بیل کا بٹن دبایا۔ میرا خیال تھا، وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کررہی ہوگی۔ کال بیل کی آواز سنتے ہی دوڑتی ہوئی آئے گی اور بڑے پیار سے دروازہ کھولے گی۔ لیکن فوراً ہی دروازہ نہیں کھلا۔ وہ میرا کیا انتظار کرتی؟ میں بھی اس کا انتظار کرنے لگا۔
تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ وہ دروازہ کھولنے نہیں آئی۔ میرے دل میں جو رومانی جذبات مچل رہے تھے، وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ یہ سمجھ میں آگیا کہ وہ عشا کی نماز میں مصروف ہے۔
پھر یکبارگی سر سے پاؤں تک میں ہولے سے لرز گیا۔ اسم اعظم کی آواز ابھری تھی۔ یا اللہ... وارب عظیم کے اسم کی ادائیگی میں ایسی شدت ایسی تڑپ تھی کہ میں ہل گیا تھا۔ شاید گر پڑتا لیکن فوراً ہی دروازے سے لگ گیا۔
پہلی بار معلوم ہوا کہ اسم اعظم روح کی گہرائی سے ادا کیا جائے تو اس اسم کی آواز اور لہجے کی گونج سے دل پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔
میں بہت سخت جان ہوں۔ ساری زندگی موت سے بچ کر آتا رہا ہوں۔ بار بار دشمنوں کی لائی ہوئی موت کا منہ پھیرتا رہا ہوں۔ کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ عام مسلمانوں کی طرح رسمی طور پر کہتا ہوں کہ میرے دل میں خدا کا خوف ہے۔ حقیقتاً ہم صرف زبان سے کہتے ہیں۔ مگر خدا سے ڈرتے نہیں ہیں۔ آج پتا چلا کہ خوف کیا ہوتا ہے؟ موت سے نہ ڈرتے ہوئے بھی اسم اعظم سنتے ہی پسینا چھوٹ جاتا ہے بشرطیکہ کوئی بابا سائیں کی طرح اسم اعظم پڑھے۔
غزالہ کے سینے سے نکلی ہوئی اسم اعظم کی گونج اب تک میرے سینے میں لرز رہی تھی۔ یہ یقین ہورہا تھا کہ اسے اسم اعظم کی ادائیگی میں روحانی کمال حاصل ہونے لگا ہے۔
اب وہ پڑھنے کے دوران ہی اپنے باطن میں پہنچنے لگی تھی۔ اپنے اندر پہنچنے کی لگن سے پہنچو تو روح سے شناسائی حاصل ہونے لگتی ہے۔ ایک وجدانی کیفیت ہوتی ہے جیسے کچھ دریافت ہونے والا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ دریافت کرنے کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔

میں دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ پھر ایک دم میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ پھر اسم اعظم کی گونج سنائی دی۔ اس بار آواز بہت قریب سے آئی تھی۔ جیسے وہ دروازے پر آ گئی ہو۔

تب میں نے محسوس کیا کہ دروازہ بند نہیں ہے کھل چکا ہے۔ میں دروازے سے لگا ہوا تھا۔ ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر ہینڈل کو تھام کر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

میں نے اندر آ کر دیکھا۔ وہ نہیں تھی۔ اس کے پڑھے ہوئے اسم اعظم اور دعا کی آواز فضا میں لہراتی ہوئی گونجتی ہوئی آئی تھی اور دروازہ کھل گیا تھا۔

بے شک۔ اللہ جسے چاہتا ہے' عزت دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے' ذلت دیتا ہے۔

اور ندا کو عزت مل رہی تھی۔ میں حیرانی سے دروازے کو تک رہا تھا۔ کیا سوچ کر آیا تھا کہ ندا اپنی عمر کے بانکپن کے ساتھ لہراتی بل کھاتی ہوئی آئے گی دروازہ کھولے گی۔ میں اس سے روٹھ کر گیا تھا۔ مجھے منانے کے لیے گلے کا ہار بن جائے گی۔

میں ساری عمر عشق و ہوس کے گرداب میں گھومتا رہا تھا۔ آج آنکھ کھلی تو دل اور دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ کسی شاعر کی رومانی غزل' جھیل کا کنول اور تاج محل نہیں ہے۔ ایک پاکیزہ ہستی ہے۔

وہ ہستی جو تیرے دل میں بستی تھی' وہ بدل چکی ہے۔ اس نے پچھلے دو برسوں کے ایک ایک لمحے میں عبادت کی طرح عبادت کی ہے اور طہارت کے صحیح مفہوم کے مطابق اپنے بدن کے روئیں روئیں کو پاک رکھ کر خدا کو پکارا اور خدا اسے سن رہا ہے۔ اسے قبول کر رہا ہے۔ اسے تبدیل کر رہا ہے۔ اب وہ ندا نہیں رہی ہے۔ ایک پاکیزہ ہستی ہے۔ خبردار اسے ہاتھ نہ لگانا۔

میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی خواب گاہ میں پہنچا۔ اسی وقت وہ جائے نماز سے اٹھ گئی تھی۔ پہلے توجہ کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی آسودگی اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔

میں نے کہا۔ "تم میرے بغیر تنہا نہ رہ سکیں۔"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "اب میں تنہا نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ میرے اندر رہتا ہے۔ صرف وہی میرے لیے ضروری ہے اور جب وہ میرے پاس ہے تو کوئی میرے لیے ضروری نہیں ہے۔"

میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ مجھے غیر ضروری کہہ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا میں بھی ضروری نہیں ہوں؟"

"آپ میرے اور میری روح کے محسن ہیں۔ اس معبود نے آپ کو وسیلہ بنا کر آج بھی مجھے آپ کی سرپرستی میں رکھا ہے۔ آئیے کچن میں چلیں۔"

ہم دونوں کچن میں آ گئے۔ میں نے کہا۔ "میں نے کال بیل کا بٹن دبانے سے پہلے دیکھا تھا' دروازہ بند تھا۔ تم دروازے پر نہیں آئیں۔ اسم اعظم پڑھ رہی تھیں۔"

وہ سالن گرم کر رہی تھی اور روٹیاں پکا رہی تھی۔ اس نے جواباً کہا۔ "الحمدللہ..."

"جب تم نے دوسری بار اسم اعظم پڑھا تو دروازہ کھل گیا اور میں اندر آ گیا۔"

اس نے چونک کر سر گھما کر مجھے دیکھا۔ پھر بڑے جذبے سے کہا۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تم حیران نہیں ہو؟"

"حیران نہیں ہوں۔ آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔ جب بھی چپ ہو جاتی ہوں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہتی ہوں۔ میرا معبود میرا پروردگار مجھ سے راضی ہے۔ آپ سے بھی التجا کرتی ہوں' مجھ سے راضی ہو جائیں۔ ابھی شادی نہ کریں۔ مجھے صرف اور صرف اپنے پاک پروردگار سے لو لگانے دیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "تم پھر وہی بحث کر رہی ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ کبھی رہبانیت کی طرف نہ جاؤ۔ عبادت بھی کرو اور دنیاداری بھی نبھاؤ۔"

"بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور میں اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ لیکن آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ تھوڑی سی مہلت چاہیے۔ میں نے نیت کی ہے کہ جب تک انگوٹھی اور عصا حاصل نہیں کروں گی' ان کے ذریعے آپ کو تحفظ فراہم نہیں کروں گی' تب تک خواہشات کی آلودگیوں سے دور رہوں گی۔"

"اور تب تک میں انتظار کرتا رہوں گا۔ پتا نہیں کتنے مہینے کتنے برس لگ جائیں گے؟"

"آپ دیکھ رہے ہیں' اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہے۔ مجھے کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ ذرا صبر کریں۔"

"تم ضد کرو گی۔ اپنی بات منواؤ گی تو میں ابھی چپ جاؤں گا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں جیسے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ کام کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "آخری فیصلہ سناؤ۔ ہاں یا ناں۔ پھر تمہاری خوشامد نہیں کروں گا۔ یہاں سے جاؤں گا اور کسی سے نکاح پڑھا لوں گا۔"

اس نے سر جھکا کر کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی تحویل میں دیا ہے۔ میں آپ کی رضا میں راضی ہوں۔"

وہ راضی تھی مگر دل سے نہیں۔ مجبوری سے ہاں کہہ رہی تھی۔ جب میں ڈائننگ ٹیبل پر اس کے ساتھ کھانے بیٹھا تو رہ رہ کر چور نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ غضب کا حسن تھا۔ ایسی کشش تھی کہ کھنچا چلا جاتا تھا۔ شاید کشش اس لیے بھی بڑھ گئی تھی کہ وہ انکار کر رہی تھی۔ کوئی نہیں چاہتا کہ جو چیزیں نہیں ملنے والی ہیں وہ ہاتھ سے نکل جائیں۔ مجھے ہر حال میں اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھنی تھی۔

میں نے سوچا' ابھی یہ نخرا کر رہی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ کل جب دلہن بنے گی اور نئی مسرتوں سے مالا مال ہوگی تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ دین کے ساتھ دنیاداری بھی لازمی ہے۔ میں مسلمان ہوں' ایسا دیندار ہوں کہ اسے زیادہ سے زیادہ عبادت میں مصروف دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا۔

میں نے کھانے کے دوران میں اسے سمجھایا۔ وہ چپ رہی۔ کسی گہری سوچ میں گم رہی۔ میں نے پھر اسے مخاطب کیا تو اس نے چونک کر ہوں ہاں کہہ کر مختصر سا جواب دے کر مجھے ٹال دیا۔

میں کھانے کے بعد اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ یہ بات واضح تھی کہ میرے اور اس کے درمیان ذہنی مطابقت نہیں تھی۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اپنی ضد پوری نہ ہونے کے باعث مایوس ہو گئی ہے اور ناراضی ظاہر کر رہی ہے۔ کل تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میں اپنی خواب گاہ میں تنہا تھا۔ رات کا ایک بجا تھا۔ میں نے بیڈ سے اتر کر سوچا' ذرا دیکھوں تو سہی' وہ کیا کر رہی ہے؟

وہ اپنی خواب گاہ میں تھی۔ میں نے کھڑکی کے پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ وہ بستر پر نظر نہیں آئی۔ کمرے کا دوسرا حصہ وہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے دروازے کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ وہ جائے نماز پر تھی۔

اس نے کہا تھا' آج تمام رات عبادت میں مصروف رہے گی اور ایک رات کی کیا بات ہے؟ اس نے اپنی ساری زندگی عبادت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے ایسی لو لگائی تھی کہ شادی کے نام پر میری مداخلت بھی گوارا نہیں تھی۔ میں نے دیکھا' وہ سجدے میں تھی۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ تب مجھ میں آیا کہ وہ سسک رہی ہے' رو رہی ہے۔

مجھے شرمندہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن غصہ آ رہا تھا کہ کیا میں اس پر ظلم کر رہا ہوں؟

وہ بے سہارا ہے' نامحرم ہے۔ اس کے ساتھ ہمیشہ ایک چھت کے نیچے رہنے کے لیے منکوحہ بنا رہا ہوں۔ ساری زندگی کے لیے اس کا محافظ بن رہا ہوں۔ کیا اس پر ظلم کر رہا ہوں؟

میں جھنجلا کر وہاں سے چلا آیا۔ اپنے بیڈ پر آ کر تھوڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر گہری نیند میں ڈوب گیا۔ دوسری صبح ناشتے کی میز پر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ تمام رات روتی رہی ہے' جاگتی رہی ہے اور عبادت کرتی رہی ہے۔ اس نے ناشتا نہیں کیا۔ صرف چائے پیتی رہی۔

میں نے کہا۔ "تمہاری صورت سے پتا چل رہا ہے کہ میں تمہیں اپنی شریک حیات نہیں بنا رہا ہوں۔ تمہیں عزت آبرو سے تحفظ فراہم نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ سزائے موت دے رہا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "ایسا نہ بولیں۔ مجھے آپ سے شکایت نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے شکایت ہے۔ تم ناشتا نہیں کر رہی ہو۔"

"طبیعت بوجھل سی ہے۔ سر بھاری سا لگ رہا ہے۔ ابھی جا کر نیند پوری کروں گی۔ پھر ناشتا کروں گی۔"

"بہتر ہے' جا کر نیند پوری کرو۔ ہم لنچ باہر کریں گے۔ پھر شادی کے لیے جتنی ہو شاپنگ کر لینا۔ بعد نماز مغرب ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔"

"میری ایک بات مانیں گے؟"

"ہزار باتیں مانوں گا۔ بولو۔"

"ہم باہر لنچ نہیں کریں گے اور میں شاپنگ بھی نہیں کروں گی۔ میرے پاس پہننے کے لیے نئے جوڑے ہیں۔"

"کل سے گھر کی چار دیواری میں ہو۔ تم کو تو تنگ ہونی چاہیے۔"

"میں نکاح سے پہلے زیادہ سے زیادہ عبادت میں وقت گزارنا چاہتی ہوں۔"

"نہ میں نے عبادت سے پہلے بھی روکا ہے' نہ اب روکوں گا لیکن شادی کے بعد تمہارا فرض ہوگا کہ اپنے شوہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں۔"

وہ چپ رہی۔ مگر بے چینی سے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"ایک بات کہنا چاہتی ہوں مگر کہہ نہیں پاتی۔ سوچتی ہوں آپ پھر سے ناراض ہو جائیں گے۔"

"ناراض کرنے والی بات ہوئی تو میں نہیں سنوں گا۔"

"آپ کی بہتری کے لیے کہنا چاہتی ہوں۔"

"میری بہتری رہنے دو۔ میں جانتا ہوں تم کیا کہو گی؟"

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہا۔ "کل آپ نے کہا تھا کہ بیرونی دروازہ بند تھا پھر کھل گیا تھا۔ جبکہ میں کھولنے نہیں آئی تھی؟"

"ہاں۔ میرے ذہن میں یہی بات آئی کہ یا تو تمہارے اسم اعظم پڑھنے کی وجہ سے وہ دروازہ کھلا تھا یا تم پہلے ہی بند کرنا بھول گئی تھیں اور میں اسے کھول کر اندر آ گیا تھا۔"

"آپ کے جانے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"تو پھر وہ آپ ہی آپ کیسے کھل گیا؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا۔ "میں اسم اعظم پڑھ رہی تھی۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا؟"

میں نے چونک کر کہا۔ وہ بھی کچھ نہیں بول رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پڑھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ ایسا کرشمہ ہوا تھا۔ یہ تسلیم کرنے والی بات تھی کہ اسم اعظم پڑھنے کی روحانی قوت حاصل ہو گئی ہے۔

اس نے کہا۔ "اگر میں بابا سائیں کے غار میں جاؤں اور اس چٹان پر ہاتھ رکھ کر اسم اعظم پڑھوں تو اللہ کی مرضی سے مجھے غار کے اندر جانے کا راستہ مل جائے گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ آپ میری بات مانیں۔ نکاح پڑھا لیں۔ پہلے یہاں سے انڈیا جانے کی تیاری کریں۔ کسی بھی پہلی فلائٹ میں ہمارے لیے سیٹ ریزرو کرائیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ چپ ہو گئی۔ فوراً ہی اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ "پلیز فاصلہ رکھیں۔"

میں نے کہا۔ "پہلے ہم یہ فیصلہ سنائیں گے کہ نکاح پڑھا لیں گے۔ پھر میاں بیوی بن کر یہاں سے بابا سائیں کے غار کی طرف جائیں گے۔"

انگوٹھی اور عصا کا تعلق روحانی قوتوں سے ہے۔ یہ چیزیں میری روحانی صلاحیتوں سے حاصل ہونے والی ہیں۔ پھر آپ دل کی زبانی اور بدن کی پاکیزگی کے ساتھ انہیں کیوں نہیں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ انہیں حاصل کرنے کے بعد مجھ سے نکاح پڑھوا سکتے ہیں۔"

میں جھنجھلا گیا۔ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "تم اپنی ضد منوانا چاہتی ہو؟ یہ ضروری ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے تمہیں روحانی صلاحیتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ ہم آج نہیں تو کل نکلیں تو پھر وہاں جا کر انہیں حاصل کریں گے۔ وہ چیزیں وہاں سے بھاگ نہیں جا رہی ہیں۔"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں نے یہ نیت کی ہے کہ اپنے بدن کی اور روح کی تمام تر پاکیزگیوں کے ساتھ اسم اعظم پڑھنے کی صلاحیت حاصل کروں گی۔ اس پاک اسم کی برکت سے انگوٹھی اور عصا حاصل کروں گی۔ اس کے بعد دنیاوی خواہشات کے متعلق سوچوں گی۔ میں نے عبادت کے دوران جائے نماز پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے جو نیت کی ہے۔ پلیز۔ اس کا لحاظ کریں۔"

میں نے غصے سے پیچتے ہوئے ایک ہاتھ کھانے کی ڈشوں پر مارا۔ وہ ڈشیں شور مچاتی ہوئی کچھ میز پر بکھر گئیں کچھ نیچے جا گریں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا تو میری کرسی پیچھے کی طرف الٹ گئی۔ وہ سہم کر کھڑی ہو گئی تھی۔

میں نے کہا۔ "جاؤ۔ تم آزاد ہو۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہاں عیش و آرام سے رہو۔ تمہاری تمام ضرورتیں اور تمام اخراجات پورے ہوتے رہیں گے۔ مجھے کبھی کال کرنے کی زحمت نہ کرنا۔ تمہیں جواب نہیں ملے گا۔"

میں ڈائننگ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا۔ وہاں ایک اٹیچی میں ضروری سامان رکھنے لگا۔ وہ دوڑتی ہوئی آ کر میرے قدموں سے لپٹ گئی۔ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "مجھے معاف کر دیں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گی چپ رہوں گی۔ آپ جو کہیں گے وہی کرتی رہوں گی۔"

"تم کل سے یہی تماشے کر رہی ہو۔ ابھی مجھے روکنے کے لیے میری بات مان رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد پھر اپنی بات اپنی ضد منوانے کی کوشش کرو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔ اب کچھ نہیں بولوں گی کچھ نہیں کروں گی۔ نہ آپ کو غصہ آئے گا۔"

میں نے اسے اپنے قدموں سے الگ کیا۔ پھر کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ شام کو مولوی صاحب اور چار جوان شاہدوں کے ساتھ آؤں گا۔ ان سب کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجودگی میں ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔"
میں وہاں سے چلا آیا۔ اس سے دور ہو گیا۔ یہ طے کر لیا کہ نکاح کے وقت ہی وہاں جاؤں گا۔ اس سے پہلے جاؤں گا تو وہ پھر وہی بات منوانے کی کوشش کرے گی۔

بہر حال بعد نماز مغرب میری مراد پوری ہو گئی۔ ہمارا نکاح پڑھا دیا گیا۔ ندا نے مجھے قبول کر لیا۔ میرے چار جاں نثاروں کے ساتھ ان کی مائیں بہنیں اور بیویاں آئی تھیں۔ انہوں نے کھانے پینے کے انتظامات کیے تھے۔

نکاح کے بعد عورتوں نے اسے میری خواب گاہ میں پہنچا دیا تھا۔ میں مہمانوں کی موجودگی میں اس وقت وہاں نہیں گیا۔ ان کی خاطر مدارات کرتا رہا۔ عشا کے بعد وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ تب میں اپنی خواب گاہ میں آیا۔

ہماری مشرقی روایات کے مطابق جب دولہا حجلۂ عروسی میں آتا ہے تو دلہن گھونگھٹ میں چھپی سمٹی سمٹی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ گھونگھٹ میں نہیں تھی۔ سہاگ کی سیج پر بھی نہیں تھی۔

میں پوری طرح دروازہ کھول کر اندر آیا۔ وہ مصلے پر تھی۔ میں اندر سے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ مناسب نہیں تھا۔ اسے وہاں نہیں میرے ارمانوں کی سیج پر ہونا چاہیے تھا۔

عجیب معاملہ تھا۔ مجھے عبادت کو نامناسب نہیں کہنا چاہیے۔ عبادت تو کسی وقت بھی جاری رہ سکتی ہے۔ اس پر شیطان ہی اعتراض کر سکتا ہے۔ میری ساری رومانیت سارے جذبات غارت ہو گئے۔ کیسی مجبوری تھی؟ میں اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ چپ چاپ بے بسی سے دیکھنے لگا۔

میں نے دیکھا وہ نماز نہیں پڑھ رہی تھی۔ بڑی دیر سے سجدے کی حالت میں تھی۔ میں جب سے آیا تھا' اسی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت ہی دھیمی آواز میں اسم اعظم پڑھ رہی تھی۔

اس کی دھیمی سی گنگناتی ہوئی آواز میں بہت ہی درد و کرب تھا۔ وہ سہاگن بن کر خوش نہیں تھی۔ اسم اعظم کی ادائیگی کہہ رہی تھی وہ دور رہ کر اپنے معبود کو پکار رہی ہے۔

ان لمحات میں ہم دونوں عبودیت اور شیطانیت کے سنگم پر تھے۔ وہ اللہ کو پکار رہی تھی اور میں ہوس کی سیج بچھائے انکار کر رہا تھا۔

نکاح ہو چکا تھا۔ وہ میری منکوحہ تھی۔ میرے پاس آنے والی تھی۔ لیکن سجدے کی حالت میں یوں منہ چھپا ہوا تھا جیسے قسمت سے بچنے کے لیے سجدے کی چادر میں خدا کے پاس چھپ رہی ہو۔

وہ نیت کر چکی تھی کہ اسم اعظم پڑھنے کی روحانی صلاحیت حاصل کرنے اور کوٹھی اور مصاحبت پہنچنے سے پہلے نفسانی خواہشات کا خیال بھی دل میں نہیں آنے دے گی۔

میں نے قریب آ کر آواز دی۔ "ندا! تم بڑی دیر سے سجدے میں ہو۔ اٹھو...."

سجدہ اٹل رہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے قریب بیٹھتے ہوئے آواز دی۔ "ندا! اٹھ جاؤ۔ ہم رات گزاریں گے۔ پھر فجر کی نماز پڑھیں گے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو یوں لگا' جیسے برف کی سل پر ہاتھ رکھا ہو۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ باحیرت! وہ ایسی ٹھنڈی ہو گئی تھی جیسے ابھی فریزر سے نکالا گیا ہو۔

جوانی گرم ہوتی ہے جذبے آگ ہوتے ہیں' تب ہی ہوس کو گرماتے ہیں۔ اس کے بدن میں آگ تو کیا' کوئی سی چنگاری بھی نہیں تھی۔

اب وہ سجدہ کا نہیں رہی تھی۔ ابھار رہی تھی۔ کیا یہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی ہو گئی ہے؟

میں نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے اس کے شانوں کو تھام لیا۔ ہولے سے جھنجوڑتے ہوئے آواز دی۔ "ندا! اٹھو...."

وہ اسم اعظم پڑھتی ہوئی اٹھی تو ایسا لگا' جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ میں بیٹھے بیٹھے اچھل کر پیچھے چلا گیا۔ یہ ایک احساس تھا کہ جھٹکا لگا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بات اسم اعظم کی ادائیگی میں تھی۔ اس ادائیگی نے مجھے ندا سے دور کر دیا تھا۔ تاکہ میں اسے چھو بھی نہ سکوں۔

اس نے خواہشات کی آلودگیوں سے دور رہنے اور پاک رہنے کی جو نیت کی تھی اس نیت پر اسم اعظم کی مہر لگ چکی تھی۔

میں پیچھے ہٹ گیا۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ وہ ایک پاکیزہ ہستی بن چکی ہے۔ میں نکاح کے بعد بھی اسے ہاتھ نہیں لگا سکوں گا۔ جب روحانی معاملات اسے اجازت دیں گے' تب ہی وہ آئے گی اور میں اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار سکوں گا۔

میں وہاں سے اٹھ گیا۔ دور ہو کر اسے حسرت سے دیکھنے لگا۔ اب وہ دو زانو بیٹھی سر جھکائے اسم اعظم پڑھ رہی تھی۔ پتا نہیں اس کی ادائیگی میں کیا بات تھی' مجھے پتھر لگ رہے تھے۔ میں سر جھکا کر اس کمرے سے باہر آ گیا۔

اپنی دلہن کو چھوڑ کر یوں لگا جیسے ذلت کی مار پڑی ہے۔

نکاح پڑھ جانے کے باوجود میرے حق سے مجھے محروم کر گیا تھا۔ مجھے محروم کرنے والی پارسا تھی۔ پاکیزہ عبادت گزار تھی۔ میں احتجاج بھی نہ کر سکا۔

کمرے سے باہر آ کر بری طرح جھنجلا گیا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ عجائب کی بیٹی کی سلوی گئی اور اب ندا کی گئی۔ پچھلی بار سلوی سے نکاح پڑھایا تھا۔ مگر اس سے بھی ازدواجی تعلق قائم نہ ہو سکا تھا۔

پنڈت دینا ناتھ نے کہا تھا کہ میں آٹھ برسوں کے بعد ازدواجی مسرتیں حاصل کر سکوں گا۔ وہ آٹھ برس گزر چکے تھے۔ ندا سے نکاح ہو چکا تھا۔ پھر مسرتوں سے محروم کیوں ہو رہا تھا؟ میں تندرست اور توانا تھا۔ ایسی حالت میں فطری خواہش کی تسکین کے بغیر کیسے رہ سکتا تھا؟

مجھ جیسے دولتمند اور صحت مند بھی بھرم جاری ہی کر نہیں رہتے۔ ایک نیکی سے شریفانہ زندگی گزارنے کے لیے ایک عورت لازمی ہوتی ہے اور وہ ایک عورت میری زندگی میں نہیں آ رہی تھی۔ آ کر آ رہی تھی تو جھٹکا دکھا کر جا رہی تھی۔ تقدیر مجھے چڑا رہی تھی اور شیطانی ارادے کہہ رہے تھے۔ "بہت ہو چکا۔ کوئی عورت دلہن بن کر نہیں آئے گی۔ ہاں۔ آئے گی۔۔۔ ابھی آئے گی مگر تہذیب کے چور دروازے سے آئے گی۔"

میں نے قد آدم آئینے میں خود کو دیکھا' سر سے پاؤں تک بڑی حد تک جوان دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ واپسی کے سفر میں ابھی صرف دس برس گزرے تھے۔

کیا واپسی کا سفر یونہی رائیگاں جائے گا؟

کیا یہ جو جوانی مل رہی ہے' یا صرف دکھاوے کے لیے ہے؟ اب تک تو میرے ساتھ یہی ہو رہا تھا اور اب میں تنگ آ رہا تھا۔ برداشت کی حد ہو چکی تھی۔ تقدیر نے مجھے دلہن کے کمرے سے نکال دیا تھا۔ میرے دماغ میں جیسے دھواں بھر گیا تھا۔ میں گھر سے باہر آ گیا۔ شاید کھلی فضا میں اندر کے حبس سے نجات مل سکتی تھی۔ رات کا ایک بجا تھا۔ میں کار ڈرائیو کرتا ہوا سڑک پر نکل آیا۔

☆☆☆

تمام مخالفین کو یقین ہو گیا تھا کہ پاپا اس دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن تھری ایس ہندوستان میں موجود ہے۔ یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ میں نے ریڈ مرکری کو اسی ملک میں کہیں چھپا کر رکھا ہے۔

ایسی ہی قیاس آرائی نے را والوں کی اور بھارتی حکمرانوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ ان کے ذہین اور بہترین تربیت یافتہ جاسوس مجھے پورے ہندوستان میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

مجھے ڈھونڈ نکالنے کا سب سے اہم ذریعہ ممی ثنا تھیں۔ وہ بے چاری میرے پاپا سے دل لگا کر پھر ان کی منکوحہ بن کر مسلسل مصائب برداشت کرتی آ رہی تھیں۔ سی آئی اے کے اور موساد کے جاسوس دن رات ان پر نظر رکھتے تھے۔ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ زندہ سلامت رہیں گی تو ان کے ذریعے کبھی نہ کبھی مجھ تک ضرور پہنچ سکیں گے۔

وقت کا کام ہے گزرتے رہنا۔ یوں گزرتے گزرتے پانچ برس ہو گئے تو ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مسز ثنا غازی کو پریشان کیا جائے گا تو تھری ایس تڑپ کر اپنی ماں کی مدد کے لیے ضرور آئے گا۔ ان سے رابطہ کرے گا اور اپنی ممی کی خاطر کوئی سمجھوتا کرے گا۔

پانچ برس پہلے میں نے ایک افسر کو جہنم رسید کیا تھا۔ مخالفین کو دھمکیاں دی تھیں کہ پاپا کی شریک حیات کو اور بیٹے کو کوئی نقصان پہنچے گا تو تمام خفیہ ایجنسیوں اور تنظیموں کے اہم افراد باری باری مرتے رہیں گے۔

ایسی دھمکیوں کے باعث وہ اب تک خاموش رہ کر مجھے تلاش کرتے رہے تھے۔ اب مرنے مارنے پر تل گئے تھے۔ انہوں نے اچانک ہی ممی کی رہائش گاہ پر چھاپا مارا۔ پورے گھر کی تلاشی لینے لگے۔

ماہرین نے اس گھر کے فرش کو جگہ جگہ سے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ خیال تھا کہ وہاں کہیں تہ خانے میں ریڈ مرکری چھپا کر رکھی گئی ہے۔ لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔

را کے ڈائریکٹر نے ممی سے پوچھا۔ "تمہارے ساتھ یہ بوڑھے میاں بیوی کون ہیں؟ تمہاری آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟ تم اتنے عیش و آرام سے کیسے رہتی ہو؟"

سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے کہا۔ "ہمارا بدترین دشمن تھری ایس تمہاری سرپرستی کرتا ہے۔ تم در پردہ اس کے لیے کام کر رہی ہو۔"

موساد کے چیف نے کہا۔ "تم غازی صلاح الدین کی وائف ہو۔ تھری ایس نے ریڈ مرکری کو پہلے غازی کی تحویل میں دیا تھا۔ وہ مر چکا ہے۔ اب وہ ریڈ مرکری کہاں ہے' یہ صرف تم ہی بتا سکتی ہو۔ نہیں بتاؤ گی تو ہم تمہارے اس بیٹے کو قیدی بنا کر لے جائیں گے۔ آج کے بعد تم اس کی شکل بھی نہیں دیکھ پاؤ گی۔"

صلاح الدین ثانی سات برس کا ہو گیا تھا۔ اس وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماں کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ گھر میں گھس آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ بڑی معصومیت سے چپ چاپ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ڈرا کے ڈائریکٹر کو گھور کر دیکھا تو اس کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔

وہ فون کا بٹن دبا کر کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''ہیلو کون؟''

دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ''میں یہاں موجود ہوں۔ سب دیکھ رہا ہوں۔ سب سن رہا ہوں۔ فوراً اپنے گھر کی خبر لو۔''

وہ بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی افسران سے بولا۔ ''وہ یہاں موجود ہے۔ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ہماری باتیں سن رہا ہے۔''

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ پورے گھر میں غازی صلاح الدین کو تلاش کیا جائے۔

ایک افسر نے پوچھا۔ ''کیا وہ فون پر بول رہا ہے؟''

''ہاں۔ جسٹ آ منٹ۔۔۔''

یہ کہہ کر اس نے فون کو پھر کان سے لگا کر کہا۔ ''میں تمہاری آواز پہچان رہا ہوں۔ تم کہاں ہو؟ سامنے آؤ۔''

اسے جواب نہیں ملا۔ فون بند ہو چکا تھا۔

موساد کے چیف نے پوچھا۔ ''کیا تم نے واقعی غازی کی آواز سنی ہے؟ اگر وہ یہاں موجود ہے تو پھر فون پر کیوں بول رہا ہے؟ سامنے کیوں نہیں آ رہا ہے؟ اس سے بولو یہاں آئے ہم سے سمجھوتا کرے۔''

اس نے بٹن دبا کر کال کرنے والے کے نمبر دیکھنا چاہے تو وہاں کوئی نمبر نہیں تھا۔ وہ حیرانی اور پریشانی سے فون دیکھنے لگا۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم پریشان کیوں ہو؟''

وہ بڑے تعجب سے بولا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فون کرنے والے کا نمبر نہیں ہے۔ یہ آپ ہی آپ کیسے مٹ گیا؟''

ممی کے دل کی دھڑکنیں یکبارگی تیز ہو گئیں۔ ایسا تو ان کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ جب صلاح الدین پیدا ہوا تھا تو اس وقت بھی جسمانی طور پر پاپا کا وجود نہیں تھا۔ انہوں نے فون کے ذریعے نومولود بچے کے کان میں اذان سنائی تھی۔ جبکہ انہوں نے جس فون سے اذان سنائی ہوگی اس کا نمبر آپ ہی آپ مٹ گیا تھا۔

سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے پوچھا۔ ''غازی کیا کہہ رہا تھا؟''

''یہی کہہ رہا تھا کہ یہاں موجود ہے۔ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ہماری باتیں سن رہا ہے اور مجھے فوراً اپنے گھر کی خبر لینی چاہیے۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی پھر کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ اس کی وائف چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ''ہائے! ہم تو لٹ گئے۔ گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ میں بچوں کے ساتھ جان بچا کر باہر آئی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟''

''میں ابھی آ رہا ہوں۔ یہ بتاؤ اچانک آگ کیسے لگ گئی ہے؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ایسی غضب کی آگ ہے کہ پڑوسی بھی گھر چھوڑ کر دور چلے گئے ہیں۔''

''حوصلہ کرو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔''

وہ فون بند کر کے وہاں سے جانے لگا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے گھر میں آگ لگ گئی ہے؟''

وہ جاتے جاتے بولا۔ ''ہاں۔ ابھی غازی نے فون پر کہا تھا کہ فوراً اپنے گھر کی خبر لو۔''

وہ بولتا ہوا چلا گیا۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے اپنے فون کو دیکھا۔ رنگ ٹون ابھر رہی تھی لیکن فون کرنے والے کا نمبر اسکرین پر نہیں تھا۔ وہ بڑبڑایا۔ ''امیزنگ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ''تم نے پرائے گھر میں گھسنے سے پہلے اپنے گھر کی گیس لائن چیک نہیں کی۔ تمہارے اہم دستاویزات جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔''

سی آئی اے کے ڈائریکٹر نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''غازی! یہ تم ہو۔ اپنی قبر سے بھی بولو گے تو میں تمہیں پہچان لوں گا۔ اگر یہاں چھپے ہو تو فوراً سامنے آؤ۔''

ممی سہمی ہوئی تھیں۔ اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ اس فون کی طرف کھنچی چلی آئیں جہاں سے پاپا کی آواز ابھر رہی تھی۔ ڈپٹی ڈائریکٹر نے جھنجلا کر ان سے کہا۔ ''اس نے فون بند کر دیا ہے۔ تم شروع سے جانتی ہو وہ زندہ ہے۔ تم سے چھپ کر ملتا ہوگا اور ہم سب اسے مردہ سمجھ کر دھوکا کھا رہے ہیں۔''

موساد کے چیف نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے فون پر بھی غازی بول رہا تھا؟''

''ہاں۔ اس نے اے کے ڈائریکٹر کا ہی نہیں میرا گھر بھی جلا دیا ہے۔ مگر ہم اس کے خلاف قانونی کارروائی کرتے رہیں گے۔''

اس کے فون نے پھر اسے متوجہ کیا۔ اس نے نمبر پڑھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہاں جیک، ابولو تم کہاں ہو؟"

جیک نے کہا۔ "میں بھاگتا ہوا آپ کے بنگلے کے پاس آیا ہوں۔ یہاں اندر اور باہر آگ ہی آگ ہے۔ فائر بریگیڈ والے اپنا کام کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کا سب کچھ تباہ ہو گیا ہے۔"

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ "میں اس کی بیوی اور بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ایسے وقت سپاہیوں نے آکر کہا۔ "ہم نے گھر کے اندر اور باہر ڈھونڈا ہے۔ وہ کہیں نہیں ہے۔"

ڈپٹی ڈائریکٹر نے گھور کر ممی کو اور میرے بھائی کو دیکھا۔ سات برس کا صلاح الدین ثانی اسے گھور رہا تھا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر غصے میں اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ پھر ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ باہر ایک دل دہلا دینے والا بم دھماکا ہوا تھا۔ سب ہی لرز گئے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی ایک اور دھماکا سنائی دیا۔

دو جاسوس دوڑتے ہوئے وہاں آئے۔ ان میں سے ایک نے سی آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر کو اور موساد کے چیف کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں کی گاڑیوں میں بم رکھے ہوئے تھے۔ ان کے پرزے دور تک بکھر گئے ہیں۔"

ڈپٹی ڈائریکٹر نے حیرت سے کہا۔ "ہماری سیکیورٹی ہائی الرٹ رہتی ہے۔ پھر ہماری گاڑیوں میں بم کہاں سے آ گئے؟"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے صلاح الدین ثانی کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "یہ بالکل اپنے باپ جیسا ہے۔ ایسا لگتا ہے غازی اس کی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔"

ممی فوراً ہی اسے خود سے لگا کر بولیں۔ "میرے بیٹے کو نظر نہ لگاؤ۔ تم لوگوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے اس سے عبرت حاصل کرو۔ جب تک میرے گھر میں گھسے رہو گے تم سب پر ایسی ہی مصیبتیں نازل ہوتی رہیں گی۔"

"ہم اس ہاتھ بھر کے چھوکرے کو کال کوٹھری میں لے جا کر ڈالیں گے۔ اتنا ستائیں گے کہ پھر ہم نہیں اس کا باپ عبرت حاصل کرے گا۔"

صلاح الدین ثانی تڑپ کر اپنی ماں سے خود کو چھڑا کر دوسرے کمرے کی طرف بھاگتے ہوئے بولا۔ "آؤ مجھے لے جاؤ۔"

دو جاسوس اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے دوسرے کمرے میں گئے۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر دیکھا۔ وہ نظر نہیں آیا۔ پلنگ کے نیچے الماری کے پیچھے دیکھ لیا۔ تو اٹیچ سے آواز آئی۔ "میں کسی کے ساتھ ایسی ہی آنکھ مچولی کھیلتا ہوں۔"

وہ دونوں دوڑتے ہوئے تو اٹیچ میں آئے۔ وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ اس باتھ روم کا دروازہ دوسرے کمرے کی طرف بھی کھلتا تھا۔ وہ دونوں ادھر گئے تو اسی کمرے میں پہنچ گئے جہاں سی آئی اے کا ڈپٹی ڈائریکٹر اور موساد کا چیف کھڑا ہوا تھا۔

چیف نے پوچھا۔ "کہاں بھاگ گئے؟ کہاں ہے وہ؟"

ایک نے کہا۔ "وہ اس کمرے سے نکل کر ابھی یہاں آیا ہے۔"

"کیا بکواس کرتے ہو؟ کیا وہ تمہیں یہاں دکھائی دے رہا ہے؟ جاؤ۔ اسے پکڑ کر لاؤ۔"

اس بار تین سپاہیوں کا اضافہ ہو گیا۔ وہ سب اسے بنگلے کے ہر حصے میں ڈھونڈنے لگے۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ پتا نہیں کیا کہ باہر نکل گیا ہے۔ وہ باہر آئے۔ سرونٹ کوارٹر کے باہر کھڑے ہوئے دو سپاہیوں نے کہا۔ "وہ لڑکا یہاں نہیں آیا ہے۔"

وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ وہ گھر کے اندر بھی نہیں تھا باہر بھی نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح تلاش کیا گیا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر نے جھنجلا کر کہا۔ "اسے جہنم میں جانے دو۔ اس کی ماں کو لے چلو۔"

دو سپاہی آگے بڑھے ممی نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "رک جاؤ۔ میرے غازی کے سوا کوئی مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

سپاہی رک گئے۔ موساد کے چیف نے کہا۔ "بڑی پارسا بنتی ہے۔ میں تجھے ہاتھ لگاتا ہوں۔ یہاں سے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔"

وہ آگے بڑھا ممی کو پکڑنے کے لیے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے میں ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی۔ چیف کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ اچھل کر فرش پر گرا پھر تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

سب سہم کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ خلاف توقع اب ہو رہا تھا۔ بنگلے کے باہر دور تک سپاہی تھے۔ اتنی سخت سیکیورٹی تو ڈر کر کون آ سکتا تھا؟ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے ہی سپاہیوں کے درمیان قاتل چھپا ہوا ہے اور اس نے کھڑکی یا روشندان سے گولی چلائی ہے۔

تمام سپاہی دوڑتے ہوئے کمرے کے باہر گئے۔ باہر کوریڈور میں کھڑے ہوئے سپاہیوں نے کہا۔ "ادھر سے کسی نے گولی نہیں چلائی ہے اور یہاں کسی کی گن میں سائلنسر لگا ہوا نہیں ہے۔"

سی آئی اے کا ڈپٹی ڈائریکٹر ممی کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بولیں۔ "یہ مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی جہنم میں

"پاپا! کیا تم بھی نادانی کرو گے؟"

"طاقت اور اختیار کے زعم میں نادانی کرنے کے سوا نہیں ہوتا۔ دیکھ رہا تھا کہ دونوں بظاہر معصوم سی باتیں ہو رہی تھیں۔ دونوں گھر میں گھس آئے۔ وہ ان کے گھروں میں گئی۔ بچے پر جبر کرنا چاہا تو وہ اسی چار دیواری میں گم ہو گیا۔ غازی کی زوجہ کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی موساد کا چیف مارا گیا۔"

وہ فوراً ہی پلٹ کر سپاہیوں سے بولا۔ "چلو یہاں سے۔ ہم بعد میں ان سے نمٹ لیں گے۔"

وہ میدان چھوڑتے ہوئے یہ جتا رہا تھا کہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے۔ سپاہی چیف کی لاش اٹھا کر لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بنگلے کے اندر اور باہر کوئی نظر نہ آیا۔ آنے والے تعداد میں چالیس تھے۔ باقی دو موساد اور سی آئی اے کے افسران تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا تھا۔

ان سب کے جاتے ہی ثانی ایک سرونٹ کوارٹر سے باہر آ گیا۔ ادھر میرے دو جاں نثار سپاہیوں کی وردی میں تھے۔ ان کے علاوہ دو تین جاں نثار گھر کے اندر فرمانبردار سپاہی بن کر تھے۔ ان میں سے ایک نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور سے موساد کے چیف کا خاتمہ کیا تھا۔

صلاح الدین ثانی چھپا ہوا بنگلے سے باہر آیا تھا۔ جاں نثاروں نے اسے سرونٹ کوارٹر میں چھپا دیا تھا۔ کہہ دیا تھا کہ بچہ ادھر نہیں آیا ہے۔ یہ ہیرا پھیری ڈپٹی ڈائریکٹر کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس نے یہی سمجھا کہ خلاف عقل غیر معمولی باتیں ہو رہی ہیں۔

اس نے فون پر میرے پاپا کی آواز سنی تھی۔ اسے کوئی جادوئی تماشا لگ رہا تھا۔ فی الحال اس نے میدان چھوڑ دیا تھا۔

ثانی دوڑتا ہوا ماں کے پاس آیا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا۔ پھر اپنا فون اٹھا کر پیشانی سے لگا کر کہا۔ "میرے سرتاج! خدا جانے آپ نے کیسے میرے بچے کو دشمنوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا؟ پتا نہیں کہاں سے گولی چلائی گئی تھی؟ وہ کم بخت آپ کی پھول وتی کو ہاتھ لگانے والا تھا۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔ کتنا عرصہ گزر چکا ہے میں نے آپ کی صورت نہیں دیکھی۔ بس ایک بار آواز سنی ہے۔ اس طویل عرصے میں سوچتی رہی کہ فون کے ذریعے مجھ سے بولتے کیوں نہیں ہیں؟ اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ میں آپ کی منکوحہ نہیں ہوں۔ چونکہ حاملہ تھی اس لیے ہمارا نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔ میں آپ کے لیے نامحرم ہوں۔ اس کے باوجود میں نے آپ کے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ یہ بیٹا میرا نہیں ہے آپ کی منکوحہ پھول وتی کا ہے۔ برسوں پہلے کی اس امانت کو میں نے پیدا کیا ہے۔ پورے دو برس تک دودھ پلایا ہے۔ کیا بیٹے سے صرف دودھ کا رشتہ رہے گا؟ آپ کب تک نامحرم رہیں گے۔ ہمارا نکاح ہوگا۔ اب تو سات برس گزر چکے ہیں۔ آپ اللہ والے ہیں۔ اپنا وعدہ پورا کریں۔ آ جائیں اور مجھے شرعی طور پر اپنی شریک حیات بنالیں۔ اگر مجبور ہیں۔ یہاں آنے میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں یا اور کوئی ایسی بات ہے جسے میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں تو کوئی بات نہیں۔ آپ نہ آئیں۔ فون پر نکاح پڑھوا لیں۔ میں آپ کی سلامتی کے لیے جدائی برداشت کرتی رہوں گی۔ مگر آپ کے لیے نامحرم نہیں رہوں گی۔ آپ فون پر مجھ سے باتیں کرتے رہیں گے۔ خدا کے لیے ابھی جواب دے کر میری تسلی کریں۔ میری باتوں کا جواب دیں۔"

وہ انتظار کرنے لگیں۔ فون کو تکنے لگیں۔ انہوں نے پاپا سے جائز مطالبات کیے تھے۔ وہ ان کی منکوحہ بننے کی مستحق تھیں۔

جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ فون خاموش تھا۔ وہ رونے لگیں۔ سسکنے لگیں۔ "میں آپ کے اور پھول وتی کے لیے وسیلہ بن گئی۔ کنواری تھی تین ماہ کی حاملہ ہو گئی۔ مجھے کم از کم اس محبت کا صلہ دیں کہ میں نے آپ کی امانت کو جنم دیا ہے اور آخری سانس تک اسے سینے سے لگائے رکھوں گی۔ اگر میں آپ کی محبت کے قابل نہیں ہوں تو آپ کی اولاد پیدا کرنے والی ایک مزدور عورت سمجھ کر میری مزدوری ادا کریں۔ مجھے منکوحہ بنا کر نیک نامی دیں۔"

پاپا کے ساتھ یقیناً کوئی مجبوری ہوگی اسی لیے وہ بولنے سے کترا رہے تھے۔ ممی نے رونے گڑگڑانے اور التجا کرنے کی حد کر دی تھی۔ اس کے باوجود وہ نہیں بول رہے تھے۔ یہ ایسی ہی بات تھی کہ مردے کے سامنے آہ و زاری کرتے رہو وہ نہیں بولتا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ پاپا کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آوازوں سے تمام رشتوں سے کٹ گئے ہیں۔ اگر وہ چادر وفون کے ذریعے ان کی آواز سنی گئی تھی تو وہ فریب سماعت ہے یا ایسا قدرتی معاملہ ہے جو فی الحال سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور جو بات سمجھ میں نہیں آتی اسے وقت بھی نہیں سمجھا پاتا ہے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رو رہی تھیں۔ انہیں محسوس ہوا جیسے پاپا آگئے ہیں ان کے سامنے ہیں۔ وہ بھی دائیں بائیں بھی محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے آگے پیچھے رہے تھے۔

انہوں نے فوراً ہی منہ پر سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غازی صلاح الدین ثانی ان کے سامنے کھل رہا تھا۔ وہ کبھی سے بھاگی اور ہاں کبھی سے وہ کبھی جا رہا تھا۔ پھر وہ سامنے آ کر رک گیا۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''آنسو پونچھ لو۔ میں ہوں نا۔۔۔''

ممی نے ایکدم سے چونک کر شدید حیرانی سے بیٹے کو دیکھا۔ یہ بات بیٹے نے نہیں باپ نے کہی تھی۔ ایسی بھاری بھرکم آواز اور ٹھوس لہجہ کسی بچے کا نہیں ہوتا۔

وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بولیں۔ ''ابھی تم بول رہے تھے؟ ہاں۔ میں نے دیکھا ہے تم ہی بول رہے تھے۔ پھر بولو میں تمہاری آواز سننا چاہتی ہوں۔۔۔ میرے بیٹے پھر بولو۔''

وہ ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''آپ رو رہی کیوں ہیں؟''

وہ بچہ تھا۔ اس نے بچگانہ انداز میں پوچھا۔ پھر گلے لگ گیا۔ اس کی صورت ممی کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ گلے لگنے والوں کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے وقت بابا کی آواز اور لہجہ سنائی دیا۔ ''میں مجبور ہوں نہیں آسکتا۔ تم میرے پاس آجاؤ۔''

ان کے دیدے حیرانی سے پھیل گئے۔ انہوں نے بیٹے سے الگ ہو کر اسے دیکھا۔ وہ پہلے کی طرح معصوم تھا۔ بیٹا ہی تھا۔ بابا باپ نہیں تھا۔ آواز ہی بابا کی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی ہوا تھا۔ وہ پھر اسے گلے سے لگا کر بولیں۔ ''میں آؤں گی۔ ابھی آپ کے پاس آؤں گی۔ آپ کے بیٹے کو لے کر آؤں گی۔''

پھر آواز سنائی دی۔ ''ابھی آؤ گی؟''

''ٹھیک ہے۔ بیٹے کو سلانے کے بعد آؤں گی۔ مجھے بتا دیں آپ کہاں ملیں گے؟''

''فجر کی اذان سے پہلے معلوم ہو جائے گا۔''

وہ بچہ ماں سے الگ ہو گیا۔ ممی نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی بچپنا تھا، سنجیدگی اور معصومیت تھی۔ وہ بیٹے کو دیکھ کر سوچ رہی تھیں۔ ''کیسی عجیب سی بات ہے۔ باپ چپ رہتا ہے اور بیٹا باپ بن کر بولتا ہے؟'' ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آج انہیں بابا سے ملنے کے بعد معلوم ہونے والا تھا۔

انہوں نے بیٹے کو رات کا کھانا کھلایا۔ خود نہیں کھایا۔ ملن کی رت آ رہی تھی۔ خوشی کے مارے بھوک اڑ گئی تھی۔ وہ جلدی بیٹے کے ساتھ لیٹ گئیں۔ خوشی اتنی تھی کہ نیند بھی نہیں آ سکتی تھی۔

وہ بیٹے کو تھپک تھپک کر سلانے لگیں۔ سوچنے لگیں۔ ''کیا فجر کی اذان سے پہلے وہ آئیں گے؟''

''نہیں۔ ان کی کوئی مجبوری ہے۔ مجھے ہی وہاں سے جانا ہو گا۔''

وہ بے چینی سے سوچ رہی تھیں۔ ''پتا نہیں مجھے کہاں بلائیں گے؟ پھر میں کب تک واپس آؤں گی؟''

انہوں نے بیٹے کو دیکھ کر سوچا۔ ''بڑے میاں اور بڑی بی سے کہہ کر جاؤں گی۔ وہ اس کا خیال رکھیں گے۔ میں پھر کسی دن بیٹے کو باپ کے پاس لے جاؤں گی۔''

وہ ڈھیر ساری باتیں سوچ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ بیٹا سو گیا تھا۔ وہ سونے والی نہیں تھیں لیکن نیند غالب آ گئی۔

بابا کو خواب میں دیکھنے کے لیے سونا ضروری تھا۔ رات کے پچھلے پہر انہوں نے اپنے محبوب کو دیکھا۔ وہ غار کے اندر اس چٹان پر بیٹھے اسم اعظم پڑھ رہے تھے جہاں وہ برسوں عبادت کیا کرتے تھے۔

انہوں نے کہا۔ ''آؤ شاہ! یہاں میرے پاس بیٹھو۔''

وہ ان کے پاس چٹان پر آ کر دوزانو ہو گئیں۔ بابا نے کہا۔ ''مجھ سے بڑی غلطیاں ہوئیں۔ بھاری گناہ ہوا۔ ایک بار پھول وتی کے ساتھ ہوس میں اندھا ہو گیا۔ یہ نہیں سوچا کہ اس کی قربت مجھے فجر کی نماز سے محروم کرے گی کیونکہ اس برفانی علاقے میں غسل کرنے کا اہتمام نہیں تھا۔ اس لیے سزا ملی۔ میں اسم اعظم پڑھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔ ستر برس تک موت کی نیند سوتا رہا۔ دوسری بار تم میری تنہائی میں آ گئیں۔ میں نے نکاح کے بغیر تمہاری قربت حاصل کی پھر غفلت کی نیند میں ڈوب کر فجر کی نماز چھوڑ دی۔ دوسری بار بھی ہوس نے نماز چھڑا دی۔ اس کی سزا تو ملنی ہی تھی۔ میں اس چٹان کے نیچے تہ خانے میں قید ہو گیا۔ خدا بہتر جانتا ہے اور بہتر کرتا ہے۔ اس نے میرے لیے بہتری کی۔ ساری دنیا سے میرا رشتہ توڑ دیا۔ میں نے صرف اپنے معبود حقیقی سے رشتہ جوڑا اور دن رات عبادت میں مصروف رہنے لگا۔''

وہ ذرا چپ ہوئے پھر بولے۔ ''فجر کی اذان ہو چکی ہے۔ آؤ ہم نماز پڑھیں۔''

غار میں ایک طرف پانی رکھا تھا۔ ممی نے وہاں جا کر وضو کیا۔ پھر ان کے ساتھ آ کر نماز پڑھنے لگیں۔ جب وہ دونوں پہلی بار ملے تھے تو ہوس میں ابھرے ہوئے تھے۔ اب شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مل گئی تھی۔ بابا نے دن رات عبادت کرتے ہوئے شاید اللہ تعالیٰ کو راضی

کر لیا تھا۔

ممی نے نماز کے بعد پوچھا۔ ''کیا ہمارا معبود ہم سے راضی ہے؟''

بابا نے کہا۔ ''ہاں۔ وہ غفورالرحیم ہے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ ہمیں بخش دیتا ہے۔ چلو اٹھو۔''

وہ ان کے ساتھ اٹھ کر چٹان کے ایک سرے پر آ گئیں۔ وہاں سے تہ خانے میں جانے کا راستہ ملتا تھا۔ بابا نے چٹان پر ہاتھ رکھ کر اپنے اندر ڈوب کر اسم اعظم پڑھا۔ ''اللہ۔۔۔''

اس ایک اسم کی ادائیگی میں ایسا جذبہ تھا اور جذب ہو جانے کی ایسی محویت تھی کہ شاہ نے پہلی بار اسم اعظم کو اپنے دل میں اترتے ہوئے محسوس کیا۔

بابا نے پھر جذب کے عالم میں کہا۔ ''اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔!''

اس غار میں گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔ شاہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ بھاری بھرکم وسیع و عریض چٹان ایک ذرا سی سرک گئی تھی۔ نیچے تہ خانے میں جانے کا زینہ دکھائی دیا۔ وہ دونوں وہاں آ گئے۔ زینے پر پہنچ کر نیچے اتر گئے۔ ان کے سر سے اوپر چٹان سرک کر اپنی جگہ واپس آ گئی۔

جب قصہ ختم ہو جائے تو کتاب بند ہو جاتی ہے۔ مکان اپنے مکین سے خالی ہو جائے تو سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور جب حیات تمام ہو جائے تو قبر کا منہ بند ہو جاتا ہے۔

وہ تہ خانہ بھی بند ہو گیا۔

صلاح الدین ثانی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بے اختیار اسم اعظم پڑھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کسی نے اسے پڑھنا نہیں سکھایا تھا۔ وہ اسم اعظم اسے ورثے میں ملا تھا۔

اس نے سر گھما کر ماں کو دیکھا۔ وہ چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرے سے ابدی سکون جھلک رہا تھا۔

وہ بیڈ سے اتر کر کمرے سے باہر آ گیا۔ دوسرے کمرے میں بڑی بی اور بڑے میاں سو رہے تھے۔ صلاح الدین ثانی نے بڑی بی کا بازو جھنجھوڑ کر آواز دی۔ ''نانی اماں! نانی اماں!۔۔۔ اٹھیں۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ''کیا ہوا بیٹے! کیا صبح ہو گئی ہے؟''

بڑے میاں بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ ''نانی اماں! ممی بول نہیں رہی ہیں۔ میں جگا رہا ہوں تو جاگ نہیں رہی ہیں۔''

وہ دونوں بیڈ سے اتر کر تیزی سے چلتے ہوئے ممی کے پاس آئے۔ پہلے انہیں آواز دی پھر نبض ٹٹولی۔ سینے سے کان لگایا تو یقین ہو گیا کہ زندگی سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

بیشک۔ جب قصہ ختم ہو جائے تو کتاب بند ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

ہماری دنیا رنگ و روپ کی شراب و شباب کی مستیوں سے اور رنگینیوں سے بھری پڑی ہے۔ نائٹ کلب کی رنگینیوں میں آ کر پتا چلا کہ میں احمق تھا۔ وہاں ملنے والی جوانی کو اب تک حجاب 'ممی' سلویٰ اور عما کے پیچھے احمق دوڑا رہا تھا اور ہلکان ہو رہا تھا۔

آج بڑی دنیا میں یہ صرف چار نہیں ہیں۔ چاروں طرف حسن کا میلا لگا رہتا ہے۔ میں ہی اس رنگین میلے سے دور بھٹک رہا تھا۔

میں ایک کلب میں آ گیا تھا۔ اس مہنگے کلب میں صرف کروڑ پتی اور ارب پتی سرمایہ دار آتے تھے۔ میں نے ایک جاں نثار سے فون پر کہا۔ ''مجھے پچاس لاکھ ڈالرز چاہئیں۔ میں اس کلب میں رات گزارنا چاہتا ہوں۔ ابھی رقم یہاں پہنچاؤ۔''

اس نے کہا۔ ''آل رائٹ سر! میں ابھی آ رہا ہوں۔''

میں جہاں بھی جاتا تھا' وہاں میرے جاں نثار کروڑوں ڈالرز لے کر تیار رہتے تھے۔ میں ایک طویل مدت کے بعد نائٹ کلب کے رنگین ماحول میں آیا تھا۔ ایک سوئمنگ پول کے رنگ بدلتے شفاف پانی میں چند حسینائیں جل پریوں کی طرح تیر رہی تھیں۔

کیبرے ڈانس کے اسٹیج پر بھی حسینائیں رقص کے دوران ایک ایک لباس اتار اتار کر پھینکتی تھیں۔ پھر تاریکی میں کہیں گم ہو جاتی تھیں اور دیکھنے والے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انتظار کرتے رہ جاتے تھے۔ دل مچل مچل کر کہتا تھا ایک بار دیکھا ہے بار بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ بے انتہا امیر کبیر لوگوں کو حسین سوغات پیش کرنے سے پہلے اسی طرح للچایا جاتا تھا۔ وہ جس میں جتنا ہو کر ان کی زیادہ سے زیادہ بولیاں لگاتے تھے۔

قمار خانے میں جوا کھیلنے کے لیے طرح طرح کے گیمز تھے اور کم عمر نوخیز لڑکیاں کھلاتی تھیں۔ سگریٹ اور شراب کے جام بھی وہی پیش کرتی تھیں۔

میں ریفرشمنٹ روم میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ میرے ایک جاں نثار نے مجھے آ کر سلام کیا۔ پھر ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو اور بولو؟''

وہ میز کے ایک طرف کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ آپ نے شراب اور شباب سے توبہ کی تھی۔ کئی برس تک لاہور میں رہا ہے۔ اپنے دکھی دنوں سے نمٹتے رہے۔ پھر لاہور سے نکل کر لندن اور استنبول گئے۔''

وہ مجھے یاد دلا رہا تھا کہ میں جیل سے نمٹنے کے بعد دس برس کی قید میں صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔ پھر وہاں سے نجات پاکر اب تک جو زندگی گزری ہے۔ اس میں بازاری عورت کی ایک بھی جھلک اور شراب کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ''تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ آج میں نے توبہ کیوں توڑی ہے؟ ایسے عشرت کدے میں کیوں آیا ہوں؟''

''میں سر! صرف مجھے ہی نہیں آپ کے تمام جاں نثاروں کو دکھ پہنچ رہا ہے۔''

''یعنی یہاں آتے ہی میرے تمام جاں نثاروں تک خبر پہنچ گئی ہے کہ میں پھر بدل گیا ہوں، پھر عیش و عشرت میں مست رہنے والا ہوں؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''آج ہی آپ نے میڈم عذرا سے نکاح پڑھوایا اور نئی دلہن کو تنہا چھوڑ کر یہاں آگئے۔ آپ نے ہم سے کہا تھا کہ میڈم کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔''

''ہم کوئی فیصلہ کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اچانک حالات کی ایک ٹھوکر سے فیصلے بدل جایا کرتے ہیں۔ مجھے عذرا سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں اس کے پاس واپس جاؤں گا۔ اسے تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب جاؤ یہاں سے......''

اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ مجھ سے بحث نہیں کرسکتا تھا۔ چپ چاپ چلا گیا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ جو بحث کرتا وہ درست ہوتی۔ مجھے عذرا اپنی جگہ درست تھی۔ ایک میں ہی برسوں کی محرومیوں کے باعث بھٹکا ہوا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی غلطی مجھ سے یہ ضروری ہوئی تھی۔ محرومیت کی گرمی میرے دماغ کو گرم کر رہی تھی۔ اسے ٹھنڈا نہ کرتا تو پاگل ہو جاتا۔

میں وہاں سے اٹھ کر پھر سے اسٹیج کی طرف جانا چاہتا تھا۔ مگر دروازے کے پاس آ کر رک گیا۔ دروازہ شیشے کا تھا اور اس پار ایک حسین لڑکی آتے آتے مجھے دیکھ کر رک گئی تھی۔ اس میں بلا کی کشش تھی۔ نہ بھی ہوتی تو میں بھٹکنے کے لیے ہی آیا تھا۔

مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ مسکرانے لگی۔ ہمارے درمیان کانچ کی دیوار تھی۔

وہ ایک ادا سے مسکراتے ہوئے ذرا دور ہوئی پھر ایک ستون کے پیچھے گھوم کر ہر زاویے سے خود کو دکھانے لگی۔ مجھے دیکھنے کی نہیں اسے پالینے کی بے چینی تھی۔

میں نے کہا۔ ''کم آن۔ ہم تنہائی میں وقت گزاریں گے۔''

وہ پاس آ کر بولی۔ ''کاؤنٹر پر چلو اور پے منٹ کرو۔''

میں اسے ایک بازو کے حصار میں لے کر کاؤنٹر کی طرف جانے لگا۔ یہ ادائیگی ذرا ہے۔ اگر ہم دولت مند ہیں تو جو چاہیں جب چاہیں حاصل کرسکتے ہیں۔

پچھلے دس برسوں سے واپسی کا سفر کہہ رہا تھا کہ جوانی لٹی کی ہر کارروائی کرنے کے لیے کوئی نہیں ہے گی۔ چاہے جتنی کوششیں کرلو۔ حسینائیں آتی رہیں گی اور گرفت سے پھسلتی اور دور ہوتی رہیں گی۔ اگر مقدر میں یہی تھا تو میں اپنی دانست میں دولت سے تقدیر کا لکھا بدل رہا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر آکر مطلوبہ رقم پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''خواہ وہ اسے ویٹ پر نقد دو......''

کاؤنٹر گرل رقم لے کر گننے لگی۔ میں نے بائیں طرف گھما کر دیکھا۔ ایک دروازے پر لکھا تھا "Gayheaven"۔ (نوخیز چھوکروں کی جنت)

اس کلب میں ایک پورشن ایسا تھا جو کم سن حسین لڑکوں کے لیے وقف تھا۔ وہ لڑکے پلاسٹک سرجری کے ذریعے ایسی بھارت سے تبدیل ہو جاتے تھے کہ بالکل حسین نوخیز لڑکیاں دکھائی دیتے تھے۔ میں نے چونک کر اپنے بازو سے لگی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا تم گے (Gay) ہو؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''او۔ نو۔ پہلے روم تو حاصل کرو پھر مجھے دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔''

میں غلطی سے کلب کے اس حصے میں آ گیا تھا جہاں بد ذوق عیاش دولت مند آ کر راتیں گزارتے ہیں۔

مجھ پر یکدم سے جھنجھلا گیا۔ پھر ایک حسینہ آ کر ہاتھوں سے پھسل گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سوچ رہا تھا کہ اپنی دولت سے مقدر کا لکھا بدل رہا ہوں اور ابھی میرے منہ پر تقدیر کا جوتا پڑ گیا تھا۔ محرومی میرے اندر دھوئیں کی طرح کر رہی تھی۔ میرے اندر یہ چبھتا ہوا سوال پیدا کر رہی تھی کہ کیا مجھے ملنے والی جوانی یا حسن کی دانت ہے؟ صرف دکھانے کے لیے ہے۔ مجھے لگ رہا تھا، تقدیر منہ چڑا رہی ہے۔ میں وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا سوئمنگ پول کے پاس آیا۔ اس

اب نامرادی اور ناکامی کی انتہا ہو چکی تھی۔

میرے اندر ضد پیدا ہوگئی کہ میری مراد کیسے پوری نہیں ہوگی......؟ اس چار منزلہ نائٹ کلب میں سیکڑوں حسینائیں تھیں اور سب ہی سکۂ رائج الوقت کی ایک جھلک سے حاصل ہو جاتی تھیں۔ کیا ان میں سے کوئی ایک، صرف ایک مجھے حاصل نہیں ہو سکتی تھی؟ میرے پیاس کے صحرا میں اک پھول نہیں کھل سکتا تھا؟ تقدیر کہاں تک مجھے روک سکتی تھی؟

سوئمنگ پول میں جل پریاں تیر رہی تھیں، تھرک رہی تھیں۔ بعض دوسرے تولیے لگا رہی تھیں اور مجھ جیسے نامراد کو ڈوب مرنے کو کہہ رہی تھیں۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی؟ نہ کوئی کنکی مل رہی تھی نہ پانی میں......؟ وہاں ایک کاؤنٹر کے پیچھے بڑی سی اسکرین پر وہ جل پریاں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے رقم دے کر اسکرین پر دیکھا۔ ان میں سے ایک کو پسند کیا۔ پھر وہاں رکھے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین پر روشنی کا ننھا سا دائرہ ابھرا۔ میں نے ماؤس کے ذریعے اس دائرے کو اپنی مطلوبہ حسینہ پر پہنچایا تو ایک گھنٹی بجی۔ ادھر اس حسینہ نے مسکراتے ہوئے ویڈیو کیمرے کو دیکھا پھر ہاتھ ہلایا۔ اب وہ پانی سے نکل کر آنے والی تھی۔

☆☆☆☆

یہ کہنے کی باتیں ہیں کہ انسان تقدیر سے ہار جاتا ہے۔ میں جیتنے کے ہزار راستے جانتا تھا۔ اب تو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آسکتی تھی۔ وہ پول سے نکل کر بدن اور بال خشک کرنے اور لباس پہننے گئی تھی۔

میں وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایسے وقت کال کی ٹون سنائی دی۔ میں نے گھڑی سی اسکرین کو دیکھا۔ عذرا کا نام ابھرا تھا۔ وہ تو ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ شاید اب برف پگھل رہی تھی۔ میں اسے جس بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر آیا تھا۔ شاید وہ عبادت سے فارغ ہوگئی تھی۔ شاید اب شریک حیات کے فرائض ادا کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے یاد کر رہی تھی۔

میں نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ پھر خشک لہجے میں کہا۔ ''ہاں بولو۔''

وہ بڑے پیار سے بولی۔ ''آپ نے وعدہ کیا تھا مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔''

''میں دنیا چھوڑ کر نہیں گیا ہوں۔ واپس آجاؤں گا۔''

''ابھی آجائیں۔ باہر گہری اور تنہائی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''گھر میں کیا ہے؟ جس لڑکی سے نکاح پڑھایا، وہ کہاں ہے؟ اگر وہ تم ہو تو شادی اور ازدواجی مسرتوں سے محروم کیوں ہوں؟ جب مراد گھر سے کچھ نہیں ملتا تو وہ باہر صحراؤں میں دور دور کرتا ہے۔''

''میں پھر التجا کرتی ہوں، کچھ عرصہ صبر کریں۔ آپ کو بہت کچھ حاصل ہونے والا ہے۔ یقین کریں اللہ تعالیٰ آپ کو آزما رہا ہے۔ اگر آزمائش میں ناکام رہیں گے تو آپ پر اللہ نہ کرے برا وقت آئے گا۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''آپ کے تین بیٹوں نے ایسی دشمنی کی تھی کہ آپ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئے تھے۔ رازی میں آپ کو تہ خانے میں مارڈالنا چاہتا تھا۔ نئی بلا آئی تو آپ انگوٹھی اور عصا سے محروم رہتے اور آج بھی محروم ہیں۔''

وہ مجھے سمجھا رہی تھی۔ ''آپ ان دو چیزوں سے وہ قابل شکست بن جاتے ہیں۔ پلیز مجھے بابا سائیں کے غار تک پہنچنے دیں۔ پھر آپ کی ازدواجی مسرتوں سے انکار نہیں کروں گی۔''

میں فون کو کان سے لگائے اس کی باتیں سن رہا تھا اور نگاہوں کے سامنے میری مطلوبہ حسینہ کیٹ واک کرتی آرہی تھی۔ کیا غضب کی چال تھی! میں صبر و تحمل کی چال بھول گیا۔ میں نے عذرا سے کہا۔ ''سوری! پھر کسی وقت کال کروں گا۔ صبح تک واپس آجاؤں گا۔''

میں فون بند کر کے آنے والی کے استقبال کے لیے اٹھ گیا۔ مجھے عذرا کی آواز سنائی دی۔ ''آ جائیں۔ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

میں نے چونک کر فون کو دیکھا۔ ابھی اسے بٹن دبا کر بند کیا تھا اور وہ بند تھا۔ پھر اس کی آواز کیسے سنائی دی تھی؟ میں نے اسے کان سے لگایا تو حیرانی سے میرا منہ کھل گیا۔ عذرا کی آواز اور لہجے میں اسم اعظم سنائی دیا۔ ''اللہ...... یا اللہ......!''

پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ حسینہ میرے سامنے آ کر بڑے فخر سے مسکرانے لگی۔ اس کا خیال تھا میں اس کے حسن و شباب کی فتنہ سامانیوں کو دیکھتے ہی حیران ہو رہا ہوں۔ کوئی کیا سمجھے کہ ہماری عقل و فہم سے ماورا کیسی صدائیں ہوتی ہیں جو آتی ہیں۔ دروازے تو ڈراپ کیے ہوئے فون سے یوں آتی ہیں جیسے آسمان سے ندا آیا کرتی ہے۔

ہماری زندگی میں ایسا ہوتا ہے ہماری ایک طرف نیکی ہوتی ہے، دوسری طرف بدی ہوتی ہے اور ہم بیچ میں پھنسے ہوتے ہیں۔ ادھر سے عذرا نے پکارا تھا۔ یا اللہ...... ادھر شکار سے دل ربا گناہوں کی سوغات آئی تھی۔

کاؤنٹر گرل نے آنے والی کا تعارف کرایا۔ ''یہ مس مریم ہیں۔ یہاں کی اے ون کیٹگری کی سب سے حسین لڑکی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرینہ قریب آ کر ایک ذرا بل کھا کر مجھ سے الگ ہو گئی۔

مجھ جیسے پیاسے کے صحرا میں برسنے والے بادل چھا گئے۔ پلک جھپکتے ہی ساری محرومیاں ہوا ہو گئیں۔ کیسا جادوئی بدن تھا؟ حسن سے تراشی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں برسوں کا بھوکا تھا۔ میری سوچ بڑی ہواؤں میں اڑنے لگی۔

میں سحر زدہ سا ہو کر ایک لگژری بیڈ روم میں آ گیا۔ ان لمحات میں یہ یاد نہ رہا کہ ابھی ابھی خدا نے اسم اعظم سنایا تھا۔ گناہ گار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب اپنے اندر عورت اچھلتی ہے تو اسم اعظم کی ہیبت بھی طاری نہیں ہوتی۔ دین ایمان اللہ رسول سب خیالی باتیں لگتی ہیں۔

میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ بیڈ کے سامنے ایک بڑی سی ٹی وی اسکرین تھی۔ مرینہ نے اسے آن کیا۔ وہاں سے ایک حسینہ جلوے دکھانے لگی۔ وہ سر تال کے مطابق تھرک رہی تھی۔

ایسا منظر مجھ جیسے گناہوں کا بھڑکانے کے لیے تھا۔ مرینہ بھی ایسا ہی سحر طاری کرنے لگی۔ ہماری دنیا عورت سے جوان ہے۔ حسن و شباب کی رنگینیاں اور مدہوشیاں نہ ہوں تو مرد جوان ہوتے ہی بوڑھا ہو جائے گا۔

اور میں تو اب بوڑھا ہونے والا نہیں تھا۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بڑھاپا رخصت ہو چکا ہے۔ واپسی کے سفر میں جوانی آ رہی ہے۔ بڑھاپا کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔

سامنے ٹی وی اسکرین پر جو کچھ ہو رہا تھا وہی مرینہ میرے سامنے کر رہی تھی۔ میں نے جذبات سے بے قابو ہو کر اسے اپنی طرف کھینچا پھر دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اس کا لباس ادھر ادھر فرش پر بکھرا پڑا تھا اور میں تھا کہ اندر سے بکھر رہا تھا۔

اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ ہم بیڈ پر آ گئے۔

آہ... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

مجھے اس کی ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ میں اسے سمیٹ رہا تھا۔ وہ فوراً ہی میری گرفت سے نکل کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ پھر اس کے حلق سے "اوں اوں" کی آوازیں نکلیں۔ وہ ایسے کھکار رہی تھی جیسے قے کرنا چاہتی ہو۔ مگر اس کے اندر سے الٹ کر باہر کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ بیڈ سے اتر کر تیزی سے چلتے ہوئے واش روم کا دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئی۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے ایسے دیکھا جیسے مقدر دکھائی دے رہا ہو۔ میں ان لمحات میں حلق پھاڑ کر پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

غصے اور جھنجلاہٹ کے مارے دیوار سے سر پھوڑنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک گلدان اٹھا کر اسکرین پر دے مارا۔ شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر دور تک بکھر گیا۔ مرینہ نے واش روم کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اسے ابکائیاں سی آ رہی تھیں مگر پیٹ سے کچھ باہر نہیں آ رہا تھا۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے ہانپ رہی تھی۔ میں نے غصے سے کہا۔ "جب تم ماں بننے والی ہو تو پھر دھندا کرنے کیوں آئی ہو؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "پاپا کا ڈیک۔ یہ بات کلب کی انتظامیہ سے نہ کہنا میرا لائسنس کینسل ہو جائے گا۔"

وہ کمرے میں آ کر بیڈ کے سرہانے بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ پہلا مہینہ ہے۔ پیٹ نکلنے تک دو تین ماہ میں اچھی کمائی ہو جائے گی۔ پھر میں خود ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

میں نے چیخ کر پوچھا۔ "لعنت ہے تم پر... کیا میں ایک ماں بننے والی کے ساتھ منہ کالا کروں گا؟ ہر گز نہیں..."

"کسی نے منہ کالا کیا تھا جب ہی ماں بننے والی ہوں۔ ایک عورت کو ماں بنانے سے پہلے یا بعد میں کالک ہی لگتی ہے۔"

میں تھوڑی دیر کے لیے جھنجلا گیا تھا۔ یوں لگا کہ محرومی پھر میرا منہ چڑا رہی ہے۔ مرینہ بھی ہاتھ سے نکل جانے کی لیکن وہ درست کہہ رہی تھی۔ ہم جس کے ساتھ بھی رات گزارتے ہیں تو وہ کسی کی بہن بیٹی یا ماں ہوتی ہے۔ وہ جو بھی ہو جیسی بھی ہو ہم اس کی چمک دمک سے بہل کر گزر جاتے ہیں۔

کیونکہ ہم یہ طوفان لیتے ہیں کہ گناہ ہی کرتے ہیں۔

کیونکہ گناہ کی سزا ابھی نہیں ملے گی۔ آگے کبھی یوم حساب آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا۔

میں بھول گیا کہ خدا کے پاکیزہ ماحول سے آیا ہوں۔ اور تو اور یہ بھی بھول گیا کہ اسی کلب میں خدا کی آواز میں اسم اعظم سنا ہے۔

وہ فون جو بند ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے آخری وارننگ دی تھی۔ اس کے بعد قدرتی حالات نے مجھے گناہ گار بننے

ہوتی ہو گی۔ انسان اپنے ایمان افروز عمل سے مقدر بناتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

جب بندہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتے وقت عقل کہاں گم ہو جاتی ہے؟ شجر ممنوعہ کے سامنے میں بھی عقل ضرور اندھی ہے۔

میری مثال سامنے تھی۔ میں اس لگژری بیڈ روم کی چار دیواری میں عقل کا اندھا ہو گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جن آزمائشوں سے گزرتا آ رہا تھا ان میں ناکام ہو چکا ہوں۔

☆☆☆

میرے مخالفین کو میری ممی شاہ کی وفات کی خبر ملی تو وہ پریشان ہو گئے۔ سی آئی اے، را اور دیگر خطرناک تنظیمیں ممی کی نگرانی کرتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے ذریعے وہ کسی دن روپوش ہونے والے غازی صلاح الدین تک پہنچیں گے اور تھری ایس کا بھی سراغ لگا سکیں گے۔

ان کی یہ امید بر نہیں آئی۔ ممی کی وفات نے انہیں مایوس کر دیا تھا۔ مجھ تک پہنچنے کا ایک مضبوط ذریعہ فنا ہو گیا تھا۔

وہ اپنے طور پر سوچنے لگے کہنے لگے۔ "تھری ایس کو یہ اندیشہ تھا کہ ہم مسز شاہ کے ذریعے اسے ڈھونڈ نکالیں گے اس لیے اس نے شاہ کو ہلاک کرا دیا ہے۔"

آرمی اور انٹیلی جنس والوں نے ممی کے مکان کا محاصرہ کیا تھا۔ یہ تحقیق کرنا چاہتے تھے کہ ایک صحت مند خاتون اچانک کیسے وفات پا گئی؟

انہوں نے ممی کی آخری رسومات کی ادائیگی کو روک دیا۔ اپنے اطمینان کے لیے ان کا پوسٹ مارٹم کرایا۔ میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا کہ ان کی طبعی موت نہایت سکون سے واقع ہوئی ہے۔ ان کی وفات کے پیچھے کوئی سازش نہیں ہے۔ گھر سے قبرستان تک جاسوسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ خیال تھا کہ غازی صلاح الدین اپنی شریک حیات کے آخری دیدار کے لیے بھیس بدل کر آئے گا اور تھری ایس بھی اپنی ممی کو کاندھا دینے آ سکتا ہے۔

تقریباً دو ماہ تک جاسوس ہونے کے بعد بھی ان بوڑھے میاں بیوی کی نگرانی ہوتی رہی جن کی سرپرستی میں ممی اور صلاح الدین ثانی زندگی گزارتے رہے تھے۔ اب ممی نہیں تھیں۔ اچانک ہی انکشاف ہوا کہ صلاح الدین ثانی بھی نہیں ہے۔ وہ اس گھر سے اچانک کہیں چلا گیا تھا۔

تمام مخالفین کے ذہنوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ کہنے لگے کہ میرے جاں نثاروں نے اسے کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دیا ہے یا اس کا باپ غازی صلاح الدین بڑی رازداری سے اسے لے گیا ہے۔

ممی اور صلاح الدین ثانی کی تصاویر انٹیلی جنس والوں کے پاس تھیں۔ انہوں نے اخبارات میں ثانی کی تصویریں شائع کرائیں۔ ٹی وی چینلز کے ذریعے ساری دنیا کو اس بچے کی تصویر دکھائی۔ اسے ڈھونڈ کر لانے والے کے لیے پچاس لاکھ کا انعام رکھا اور خود بھی اس کی تلاش میں سرگرداں رہے لیکن وہ نہ ملا۔

تھک ہار کر سی آئی اے، را، موساد اور دوسری تنظیموں کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں کہا گیا کہ پچھلے چوبیس برسوں سے تھری ایس انہیں اپنے پیچھے دوڑا رہا ہے۔ تھری ایس کا باپ چھ برس پہلے پاسا ساگر کے غار میں غائب ہو گیا تھا۔ آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ زندہ ہے بھی یا نہیں؟ اب اس کا سات برس کا بیٹا صلاح الدین ثانی گم ہو گیا ہے۔

ایک خفیہ تنظیم کے سربراہ نے کہا۔ "وہ بچہ بھی باپ کی طرح ڈرامائی انداز میں گم ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو وہ تینوں باپ بیٹے برسوں سے ڈرامائی انداز اختیار کرتے آ رہے ہیں اور ہم ان کے پیچھے ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔"

ایک نے کہا۔ "ہم نے اس ریڈ مرکری کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی ہے جسے تھری ایس چرا کر لے گیا تھا۔ چوبیس برسوں میں کچھ تو اس کا سراغ ملنا چاہیے کہ وہ کہاں ہے؟ ہے بھی یا نہیں؟"

سی آئی اے کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "میرا دل میرا دماغ کہتا ہے ریڈ مرکری تھری ایس کے پاس نہیں ہے۔ تھری ایس نے اپنا ایک منظم گروپ بنا کر ریڈ مرکری کا شوشا چھوڑ کر دنیا کی تمام خطرناک تنظیموں سے زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔"

دوسرے افسر نے کہا۔ "مرغی انڈوں پر بیٹھ کر بچے نکالتی ہے۔ کچھ روز انڈوں پر بیٹھنے کا مقصد تو اسے پتا ہے۔ تھری ایس چوبیس برسوں سے ریڈ مرکری پر آسن جمائے بیٹھا ہے اور ایک ٹکا بھی حاصل نہیں کر رہا ہے۔ وہ جوہری مادہ اس کے پاس ہوگا تو کچھ حاصل کرے گا۔"

"اسے ریڈ مرکری سے کروڑوں ڈالرز کی آمدنی ہو سکتی ہے تو پھر وہ بڑی سے بڑی رقم کیوں نہیں کما رہا ہے؟"

وہ سب ہی ریڈ مرکری کے معاملے میں تھک گئے تھے۔ چوبیس برس کم نہیں ہوتے۔ اب تمام مخالفین اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ میں ایک مصنوعی حربے سے انہیں الو بناتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آرہا ہوں۔

آخر میں اجلاس کے صدر نے کہا۔ ”ہم کیوں ریڈ مرکری کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ جب وہ کسی ملک سے اس کا سودا کرے گا تو بات چھپی نہیں رہے گی۔ تب ہم تھری ایس کے خلاف جو کر سکتے ہیں وہ کریں گے۔“

”ویسے یہ یقین ہو چکا ہے کہ تھری ایس کے پاس نہ ریڈ مرکری ہے نہ کبھی اس کا سودا ہوگا۔“

”پھر یہ کہ پچھلے کئی برسوں سے تھری ایس کی کوئی مصروفیت ہمارے علم میں نہیں آئی ہے۔ وہ گوشہ نشین ہوگیا ہے یا مر کھپ گیا ہے۔ اگر مر چکا ہے تو ہمیں بھی معلوم نہیں ہو سکے گا اور ہم اسے زندہ سمجھ کر خواہ مخواہ اپنی راتوں کی نیندیں حرام کرتے رہیں گے۔“

اس اجلاس میں یہ طے ہوگیا کہ تھری ایس شہزادہ سلمان سعدی پر فی الحال مٹی ڈالی جائے۔ جب اس کی کوئی مصروفیت سامنے آئے گی وہ کوئی واردات کرے گا اور اس کے جاں نثار حرکت میں آئیں گے تو ان سے نمٹ لیا جائے گا۔

اس فیصلے کے بعد میری فائل بند کر دی گئی۔ ریکارڈ روم میں میرے نام کے لاکر کو غیر معینہ مدت کے لیے لاک کر دیا گیا۔ میری داستان سے ریڈ مرکری کا باب ختم ہو چکا ہے۔ نہ میں اسے زمین کی تہ سے نکالوں گا نہ کسی ملک سے سودا کروں گا اور نہ ہی میرے ملک کے سیاست داں اس قابل ہیں کہ میں اس جوہری مادے کو ان کے حوالے کروں۔ میں اسے خدا کے حوالے کر چکا ہوں۔

میری داستان کا دوسرا تعلق میرے پاپا غازی صلاح الدین سے ہے۔ وہ برسوں پہلے بابا سائیں کے غار میں جا کر گم ہوگئے تھے۔ ان کی زوجہ ثنا نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ اسی غار میں چلی گئی ہیں۔ وہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ اس لیے وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔

وہ ہستیاں اب واپس آنے والی نہیں تھیں۔ ان کا پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟ کیوں چلا گیا ہے؟ وہ بھی واپس آئے گا یا نہیں؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

اب میری زندگی میں دو اہم چیزیں رہ گئی تھیں۔ انگوٹھی اور عصا اور الٹے قدموں جوانی کی طرف واپسی کا سفر۔۔۔ یہ میری بدبختی تھی کہ اس سفر میں میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

میرا خیال تھا اس سفر میں بھی چپ چاپ چلوں گا تو چلتا ہی رہوں گا۔ دین ایمان، تہذیب و اخلاق آڑے نہیں آئیں گے۔ کسی کو اس کی اوقات سے زیادہ عروج اور کامیابیاں حاصل ہوں تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھی دیکھ نہیں پاتا۔

میں کلب کے اس بیڈ روم میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ انعام میں ملنے والی جوانی کو کس بازار میں لے آیا ہوں؟

اللہ تعالیٰ انعام دیتا ہے تو بندوں کو آزماتا بھی ہے کہ وہ اس انعام کے قابل اور مستحق بن کر رہ پاتے ہیں یا نہیں؟

میری آنکھ کھلی تو ذرا دیر سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہوں؟ پھر یاد آیا کہ ایک رات کے لیے خریدے ہوئے بستر پر ہوں۔ میں نے دائیں بائیں کروٹ لے کر دیکھا۔ وہ نہیں تھی۔ تاریکی صرف رات تک رہتی ہے۔ صبح ہوتے ہی رخصت ہو جاتی ہے۔

وہاں ہر کام فری کی وارننگ کے مطابق ہوتا تھا۔ اس کی جتنی قیمت ادا کی گئی تھی۔ اسی حساب سے وہ وقت گزار کر جا چکی تھی۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ پتا نہیں چل رہا تھا کتنا وقت گزر چکا ہے؟ میں نے موبائل فون کو آن کرکے وقت دیکھا۔ صبح کے دس بج چکے تھے۔ میں اب تک گہری نیند سو رہا تھا۔

مجھے اس بات کا ذرا بھی افسوس نہیں تھا کہ میں نے دنا کو دلہن بنانے کے بعد اس کے ساتھ رات نہیں گزاری۔ میں تو گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے ٹرخا دیا تھا۔ پھر یہ کہ مرینہ نے اس کی کمی پوری کر دی تھی۔

میں نے ہوٹل کے کھانے سے بھوک مٹائی تھی۔ اس لیے گھر کی روٹی اس وقت یاد نہیں آرہی تھی۔ میں بیڈ سے اتر کر واش روم میں آیا۔ وہاں غسل کرتے وقت بھی یاد نہیں آیا کہ دنا مجھے پاکیزہ ماحول میں رکھنا چاہتی تھی۔

عیش و عشرت میں رات سے صبح کرتے وقت یہ بھی بھول گیا کہ ہر رات کے بعد فجر کی اذان سنتا تھا اور نماز پڑھتا تھا۔ جب سے انگوٹھی اور عصا حاصل ہوا تھا اور جب سے جوانی کی سمت واپسی کا سفر شروع ہوا تھا تب سے میں نے ایک وقت کی بھی نماز نہیں چھوڑی تھی۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار اس روز پہلی بار میں نے فجر کی نماز کو نظر انداز کر دیا۔۔۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

ہاں۔ ایک وقت کی نماز نہیں پڑھی تو کیا ہوا؟ کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی۔۔۔؟

غلطی ہو جاتی ہے تو ہم یہی سوچتے ہیں کہ کوئی بات نہیں آئندہ ہم سے غلطی نہیں ہوگی۔ آئندہ کی نمازیں اپنی جگہ ہیں لیکن جو نماز جان بوجھ کر چھوڑ دی گئی ہے اس کی معافی نہیں ہے۔ سزا تو ضرور ملتی ہے۔

میرے پاپا کو اس کی سزا مل چکی تھی۔ جب وہ [illegible]

جاتے ہیں اپنی محبوبہ کے ساتھ تھے یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ صبح غسل کرنے کے لیے پانی نہیں ملے گا اور پاپا کی نماز چھوٹ جائے گی۔ اس کے باوجود ہوس ان پر غالب آگئی تھی۔ انہیں سزا دی گئی۔ وہ مختصر برس تک موت کے اندھیرے میں رہے تھے۔ پھر انہیں نئی زندگی دی تو انہوں نے توبہ کی۔ ایک طویل عرصے تک نماز سے غافل نہیں رہے۔ عبادت کو جاری رکھنے کا جو وعدہ خدا سے کیا۔ اس کے مطابق آخری سانسوں تک نماز نہ چھوڑنے۔ یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ غلطیوں کو معاف کرتا ہے۔ لیکن جان بوجھ کر کی گئی غلطیاں معاف نہیں کی جاتیں۔ میرے پاپا نے پھر ایک بار وہی غلطی دہرائی۔

جب ثنا ان کی زندگی میں آئی تو انہوں نے پیچھے پھر سے بھولی وفا کو پالیا۔ وہ اس کے دیوانے ہوگئے۔ ایسے گم ہوگئے کہ پھر ایک بار ہوس ان پر غالب آگئی۔ پھر ایک بار انہوں نے فجر کی نماز کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد انہیں جو سزا ملی اسے میں نے آنکھوں سے دیکھا۔ وہ جیتے جی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ پھر کبھی ان کی زندگی کا نہ سراغ ملا نہ موت کی تصدیق ہوئی۔

اس حد تک معلوم ہوا کہ وہ بابا سائیں کے غار میں جا کر زندہ در گور ہوگئے ہیں۔

ہم اپنے سامنے اپنوں کو اور غیروں کو غلطیاں کرتے اور سزائیں پاتے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی سبق حاصل نہیں کرتے۔ میرے پاپا کے ساتھ ایسا دو بار ہوا اور میں نے اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ اس رات کلب میں جا کر وہی غلطی کی جو پاپا کر چکے تھے۔ ایک رات میں دو بار کر چکے تھے۔

اس کلب کے بیڈ روم میں مجھے یہ باتیں یاد نہیں آرہی تھیں۔ اس وقت تو میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ ساری گمراہیوں دور کر کے اپنے حال میں مست تھا۔ اس لیے بھی مستی چھائی تھی کہ میں نے وہ رات ایک بھرپور جوان کی طرح گزاری تھی۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ جوانی واپس آگئی ہے۔

میں کلب سے باہر آ کر اپنی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا مجھے اپنا میڈیکل چیک اپ کرانا چاہیے۔ واپسی کے سفر سے پہلے مجھے جو بیماریاں تھیں وہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہی تھیں۔ اب وہ ختم ہو چکی ہیں یا نہیں؟ اس بات کی بھی تصدیق ہو جاتی تو اس سلسلے میں کسی شبے کی گنجائش نہیں رہتی کہ آئندہ بھی واپسی کا سفر جاری رہے گا اور کسی طرح کی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔

ماموں چوہا

انور (امی جان سے) ”امی جان کیا ہمارے ماموں چوہا ہیں؟“

امی۔ ”نہیں بیٹے لیکن یہ تم نے کیوں کہا؟“

انور۔ ”جب بھی میں ان سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو کہتے ہیں۔ خاموش رہو، میں بل بنا رہا ہوں۔“

گدھے کی سواری

بیوی (شوہر سے) ”تم اتنی دیر سے بچے کو چپ نہیں کروا سکے۔“

شوہر۔ ”کہتا ہے، گدھے پر سواری کروں گا۔ اب یہ ضد کہاں سے پوری کروں۔“

بیوی۔ ”تھوڑی دیر کے لیے آپ بن جائیے ناں۔“

بے ڈش

ایک سکھ چین گیا۔ وہ چینی زبان سے ناواقف تھا۔ اس نے ہوٹل کے مینو کی آخری سطر پر انگلی رکھتے ہوئے بیرے سے کہا۔ ”یہ ڈش لے آؤ۔“

بیرے نے انگریزی میں کہا۔ ”معاف کیجیے گا۔ جناب آپ کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکے گی، کیونکہ یہ ہوٹل کے مالک کا نام ہے۔“

میں نے فون کے ذریعے ایک جاں نثار سے کہا۔ ”میری میڈیکل رپورٹ کی فائل ابھی لے آؤ۔ میں ڈاکٹر کریمر کے کلینک میں جا رہا ہوں۔“

میں کار ڈرائیو کرتا ہوا ایک اوپن ریسٹورنٹ میں آیا۔ وہاں ناشتہ کیا۔ ایسے وقت دنا یاد آئی۔ حجاب کی وفات کے بعد میں نے بھی اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اب تنہائی نے اسے سمجھایا ہوگا کہ آئندہ وہ میری باتیں مان کر ہی مسرتوں بھری ازدواجی زندگی گزار سکے گی۔ ورنہ بیوی کی اکڑ تنہا رہے گی اور میں اسی طرح اسے چھوڑ کر جاتا رہوں گا۔

میں نے دنا کے نمبر پنچ کیے۔ پھر فون کو کان سے لگا کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کا موجودہ نمبر اس وقت بند ہے۔ میں نے آرام سے ناشتا کیا چائے پی۔ پھر کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھنے کے بعد دوبارہ دنا کو کال کی۔ دوسری بار بھی وہی ریکارڈنگ سنائی دی۔ میں نے فون بند کرتے وقت سوچا۔ ”کیا بات ہے اس کا فون کیوں آف ہے؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ اس نے ناراضی ظاہر کرنے کے لیے اسے آف رکھا ہوگا۔ ایک چاہنے والی کے دل میں یہ ارمان ہوتا ہے کہ وہ روٹھ جائے تو محبوب اسے منائے۔ میں نے دل میں سوچا۔ ''ٹھیک ہے۔ گھر جا کر اسے منالوں گا۔''

میرا جاں نثار ڈاکٹر کریمر سے ملاقات کا وقت مقرر کرچکا تھا۔ میں نے مقررہ وقت پر وہاں پہنچ کر اپنی میڈیکل رپورٹس دکھائیں۔ ڈاکٹر نے ان کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد میرا مکمل چیک اپ کرایا۔ پھر کہا۔ ''آپ کو دوسرے دن رپورٹس مل جائیں گی۔''

ان تمام مصروفیات میں اچھا خاصا وقت گزر گیا۔ میں ایک رات کے لیے ندا سے دور ہوا تھا۔ لیکن دوسرا آدھا دن بھی گزر گیا۔ جب گھر پہنچا تو دن کے دو بج رہے تھے۔

میں نے دروازے پر پہنچ کر کال بیل کے بٹن کو دبانا چاہا تو رک گیا۔ وہ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں کسی وقت بھی واپس آسکتا ہوں اس لیے دروازے کو کھلا رکھا تھا۔ خود آ کر میرے لیے دروازہ کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اس طرح ناراضی کا اظہار کرنے والی تھی۔

میں نے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے اسے وہاں بلانے کے لیے کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ پھر دروازے کو پوری طرح کھول دیا۔ بیل کی آواز گھر کے اندر دور تک گئی تھی مگر وہ نہیں آئی۔ میں نے پھر بیل دبایا۔ پھر گھنٹی کی گنگناتی ہوئی آواز دور تک جا کر معدوم ہوگئی۔

میں نے ڈرائنگ روم میں آ کر وہاں کی ویرانی دیکھی۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے بیڈروم کے قریب پہنچ کر آواز دی۔ ''ندا۔۔۔!''

اس کی خواب گاہ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر پھر سے آواز دی۔ جب جواب نہ ملا تو دروازے کے ہینڈل کو تھام کر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ میں نے اندر آ کر دیکھا۔ وہ خواب گاہ اس کے وجود سے خالی تھی۔

میں نے اپنے بیڈروم میں آ کر اور کچن میں آ کر دیکھا پھر اسے آوازیں دیں۔ نہ وہ دکھائی دی، نہ اس کی آواز سنائی دی۔ پھر میں نے اس کے فون نمبر پنچ کیے۔ اندازہ تھا کہ اس کا فون آن ہوگا اور وہ کہیں چھپی ہوگی تو اس کا فون بے ساختہ پکارے گا۔

اور یہی ہوا کہ رنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے بیڈروم میں آیا پھر ایک طرف دیکھا اس کا فون میز پر رکھا ہوا تھا اور وہاں سے ٹون سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اسے اٹینڈ کرنے والی نہیں تھی۔

میں نے الماری کھول کر دیکھی۔ وہ جب بھی شاپنگ کے لیے یا آؤٹنگ کے لیے میرے ساتھ جاتی تھی تو ایک چھوٹا سا بیگ اپنے شانے سے لٹکائے رکھتی تھی۔ اس میں اس کا ضروری سامان رہا کرتا تھا۔

میں نے پوری الماری کو کھنگال کر دیکھا۔ پھر سیف کو کھول کر دیکھا۔ وہاں اس کا پاسپورٹ اور اس سے متعلق رکھنے والے ضروری کاغذات نہیں تھے۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے فوراً ہی فون کے ذریعے ایک جاں نثار کو مخاطب کیا پھر پوچھا۔ ''ندا کہاں ہے؟''

اس نے کہا۔ ''وہ ابھی گیارہ بجے کی فلائٹ سے پاکستان گئی ہیں۔''

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم نے میری اجازت کے بغیر اسے جانے کیوں دیا؟''

''میں نے آپ سے فون پر رابطہ کیا تھا۔ لیکن وہ کل رات سے بند پڑا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی اس نائٹ کلب میں گیا تھا۔ اس نے وہاں کے انچارج سے کہا کہ آپ سے ملاقات کرائی جائے، ضروری باتیں کرنی ہیں لیکن انچارج نے کہا کہ جب انہوں نے اپنا فون بند رکھا ہے۔ کسی سے ملاقات نہیں کرنا چاہتے تو یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے کہ ہم اپنے کسٹمرز کو ڈسٹرب کریں۔ وہ یہاں عیاشی کے لیے آتے ہیں۔ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔''

یہ سچ تھا کہ رات بھر میرا فون آف رہا تھا۔ مجھے اس بات پر غصہ آیا کہ انہوں نے میرے بیدار ہونے کا انتظار کیوں نہیں کیا؟

میرے جاں نثار نے کہا۔ ''آپ نے یہ حکم دیا ہے کہ ہم میڈم ندا کے ہر حکم کی تعمیل کیا کریں۔ جب آپ موجود نہ ہوں تو انہیں کسی طرح کی شکایت کا موقع نہ دیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نے ایسا حکم دیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میری غیر موجودگی میں اسے ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچا دیا جائے۔''

''سر! وہ آپ کی شریک حیات ہیں۔ آپ کے لیے اور ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ وہ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر رہی ہیں۔''

ندا اس انداز سے اچانک ہی مجھے چھوڑ کر گئی تھی۔ اس سے میری توہین ہو رہی تھی۔ میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''اس نے جانے کے سلسلے میں کوئی تو بات کی ہوگی کہ اچانک کیوں جا رہی ہے؟''

اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ میں نے گرجتے

ہوئے کہا۔ ''جواب دو۔''

''سوری سر! یہ آپ کی شریک حیات کے الفاظ ہیں کہ عبادات اور ریاضت ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتیں۔''

''وہ بے وقوف ہے۔ اتنی سی بات پر گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ اگر مجھ سے فون پر کہہ دیتی تو میں اس گھر میں قدم نہ رکھتا۔ دور ہی دور سے اسے دیکھتا، اپنی نگرانی میں رکھتا۔''

''سر! یہ ہم تمام جاں نثار دیکھ رہے ہیں کہ وہ کس قدر دیندار اور عبادت گزار ہیں۔ وہ ہم سب کو پاکیزہ ہستی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ہمارا خیال ہے۔ بلکہ ایمان ہے کہ وہ عبادت اور ریاضت کے ان مراحل سے گزر رہی ہیں جہاں انہیں آپ کے یا کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ انہیں صرف ایک خدا پر بھروسا ہے اور اسی بھروسے پر وہ یہاں سے چلی گئی ہیں۔''

میں نے مٹھی بھینچ کر دہاڑتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اسے جانے کیوں دیا؟''

''سوری سر! اب آپ ہمیں بھی جانے دیں۔ صرف میں ہی نہیں اور بھی کئی جاں نثار یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ آپ سے دور رہیں۔ آپ سے بے وفائی نہ کریں۔ لیکن دور ہی دور رہ کر صرف ان احکامات کی تعمیل کریں جن کا تعلق ہمارے دینی احکامات سے ہوگا۔''

میں نے خلا میں تکتے ہوئے سوچا۔ ''یہ میرے برسوں کے وفادار کھل کر غداری نہیں کر رہے ہیں۔ وفاداری کا دعویٰ کرنے کے باوجود مجھ سے دور ہو کر مجھ سے بدظن ہو چکے ہیں۔''

میں نے بیزاری سے کہا۔ ''میں تمہاری دوغلی وفاداری کا محتاج نہیں ہوں۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔ میرے لیے تم مر چکے ہو۔''

اس نے کہا۔ ''فون بند کرنے سے پہلے ایک بات سن لیں۔ صرف میں نہیں ہوں اور بھی کئی جاں نثار ہیں جو آپ کے حکم سے دفع ہو جائیں گے لیکن آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ اس واپسی کا نہیں جو زوال کی سمت ہو رہی ہے۔ ہمیں اس واپسی کا انتظار ہے جو ایمان کی طرف ہوگی۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ میں بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے جاں نثار مجھ سے بدظن ہو جائیں گے اور میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ میں جاں نثاری کے عوض انہیں مالا مال کرتا رہتا تھا۔ وہ عیش و عشرت کی زندگیاں گزار رہے تھے۔

میں نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور وہ میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ انہیں چربی چڑھ گئی ہے۔ میں ان کے متعلق ایسا سوچ رہا تھا جبکہ میرے دماغ پر چربی چڑھ گئی تھی۔ مجھے اپنی غلطیاں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

اور یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ بڑے ہی نامعلوم طریقے سے قدرت مجھے سزا دے رہی ہے۔ میرے جاں نثاروں کو مجھ سے دور کر رہی ہے اور آگے چل کر یہ بھی سمجھ میں آنے والا تھا کہ یہ سزا کا پہلا مرحلہ ہے۔ پہلے مرحلے میں جاں نثاروں نے ساتھ چھوڑا ہے۔ اگلے مراحل میں اور نہ جانے کیا ہونے والا ہے؟

میں نے لاہور کے جاں نثار آرم ثانی سے رابطہ کیا۔ پھر اس سے کہا۔ ''میری شریک حیات ندا لاہور پہنچنے والی ہے۔ کیا اس سلسلے میں تمہیں اطلاع دی گئی ہے؟''

''جی ہاں۔ وہ شام پانچ بجے کی فلائٹ سے یہاں پہنچنے والی ہیں۔ میں نے کوٹھی کی صفائی کرائی ہے۔ ان کی خدمت کے لیے پہلے جو ملازمہ تھی اسے بھی بلا لیا ہے۔''

میں نے کچھ سوچا پھر اس سے کہا۔ ''جیسے ہی وہاں پہنچے اس سے میری بات کراؤ۔''

''یس سر!''

میں نے رابطہ ختم کرتے ہوئے دور میز پر رکھے ہوئے فون کو دیکھا پھر سوچا۔ ''وہ اپنا فون یہاں کیوں چھوڑ کر گئی ہے؟''

بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگر فون اس کے پاس رہتا تو میں بار بار کال کرتا رہتا۔ اسی لیے اس نے رابطے کا ذریعہ ختم کر دیا تھا۔ اپنا فون میرے پاس پھینک کر چلی گئی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سوچتا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ پھر بستر پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ پچھلی رات وہ مجھ سے کترا رہی تھی۔ فاصلہ رکھنا چاہتی تھی۔ اب تو ہزاروں میل کا فاصلہ قائم کر دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی اور یہ میری توہین تھی۔

میں نے سوچا۔ ''اگر وہ مجھ سے اس قدر کترا رہی ہے تو پھر یہی سہی۔ میں اس کے قریب نہیں جاؤں گا، دور رہوں گا۔ البتہ اسے پالنے کی ہوس رہے گی۔''

وہ میری منکوحہ بن گئی تھی۔ میرے قریب آتے آتے بہت دور چلی گئی تھی۔ جو چیز ملتے ملتے ہاتھ نہ آئے، دور نکل جائے تو اس کے لیے ضد، تڑپ اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔

میں چپ چاپ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے لیے بے حد کشش بڑھ رہی ہے۔ میں اسے پالینا چاہتا ہوں۔ لیکن اب میرے اندر بھی ضد پیدا ہو گئی تھی۔ میں اسے ٹھکرا دوں گا۔ کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو جو ایک لڑکی مجھے حاصل نہیں ہو گی۔ دنیا میں اس سے بھی زیادہ حسین ترین اور پُرکشش لڑکیاں ہیں۔ ایسی حسیناؤں کو حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں لازمی ہوتی ہیں۔ ایک دولت دوسری جوانی اور یہ دونوں چیزیں میرے پاس وافر مقدار میں موجود تھیں۔

کال فون نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً ہی اٹھ کر بیٹھتے ہوئے نمبر پڑھے۔ میرا ایک جاں نثار انڈیا سے کال کر رہا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بولو؟“

”ایک تشویش کی اطلاع دے رہا ہوں۔ صلاح الدین غائب ہو گیا ہے۔ ہم اس کی گھر کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ ہمیں پتا ہی نہ چلا کہ وہ وہاں سے کب چلا گیا؟“

”کیا بکواس ہے؟ وہ سات برس کا بچہ کہاں جائے گا؟ ضرور دشمنوں نے اغوا کیا ہو گا۔ اب وہ میرے اس بھائی کو میری کمزوری بنائیں گے۔“

”سر! ہم یقین سے کہتے ہیں دشمنوں نے اسے اغوا نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ آپ کو ضرور چیلنج کرتے۔ ہم نے دیکھا ہے وہ خود اس بچے کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

”اسے کسی طرح تلاش کرو۔ وہ بچہ ہے۔ کہاں جا سکتا ہے اور کتنی دور جا سکتا ہے؟ اسی شہر میں کہیں ہو گا۔“

”صرف ہم ہی نہیں دشمن بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ اخبارات میں اس کی تصویر شائع کرائی گئی ہے۔ ٹی وی چینلز کے ذریعے اسے دکھایا جا رہا ہے اور ڈھونڈ کر لانے کے لیے پچاس لاکھ روپے کا انعام رکھا گیا ہے۔“

میں نے تھوڑی دیر تک اس سے باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ میں وہاں سے ہزاروں میل دور تھا۔ اپنے بھائی کی گمشدگی کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے یہ اطمینان تھا کہ صرف میرے جاں نثار ہی نہیں دشمن بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ آج نہیں تو کل وہ کسی کی نظروں میں آ سکتا تھا۔

میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ سوچنے لگا۔ ”یہاں مورشش میں کیا کر رہا ہوں؟ یہاں امیر تیمری نامی ایک امیر کبیر شخص کا بھیس بدلنے آیا تھا۔ اسے قریب سے دیکھ کر انڈیا جا کر اس کا رول ادا کرنے والا تھا۔“

پلاننگ یہ تھی کہ وہاں ندا کے ساتھ رہ کر بڑی رازداری سے بابا سائیں کے غار میں جاؤں گا۔ اگر دل کی اور روح کی گہرائیوں سے اسم اعظم پڑھوں گا تو تہ خانے میں جانے کا راستہ ملے گا۔ پھر میں انگوٹھی اور عصا حاصل کروں

گا۔ مجھے پھر سے غیر معمولی قوتیں حاصل ہو جائیں گی۔

جتنی آسانی سے سوچا تھا، اتنا ہی اسم اعظم پڑھنا میرے لیے دشوار ہو گیا تھا۔ واپس ملنے والی جوانی اور حسن کے تقاضے مجھ پر حاوی ہو گئے تھے۔ میں ندا تک پہنچنے کی ہوس میں مبتلا ہو گیا اور ندا خدا تک پہنچنے کی وجدانی کیفیات میں مبتلا رہی۔ وہ جس طرح اسم اعظم پڑھتے وقت اپنی ذات کو گم کر دیتی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ انگوٹھی اور عصا تک ضرور پہنچے گی اور وہ دونوں چیزیں میرے لیے ضرور لے آئے گی۔

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے...

میں نے اس پر تکیہ کیا اور وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور یہ کہہ کر گئی کہ طہارت اور غلاظت ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتیں۔ قدرتی طور پر حاصل ہونے والی انگوٹھی اور عصا کو پاکیزہ ہاتھ ہی حاصل کر سکتے ہیں اور میں ندا کی نظروں میں پاکیزہ نہیں رہا تھا۔ پھر کیا وہ میرے لیے ان دو چیزوں کو حاصل کرے گی؟

نہیں... وہ یہی کہے گی کہ انگوٹھی اور عصا میرے ہاتھوں میں آئیں گے تو اپنی قدرتی تاثیر کھو دیں گے۔ وہ تو دو اور دوسری تمام متبرک چیزیں مجھ سے دور رکھے گی اور جب وہ غیر معمولی قوتیں مجھے حاصل نہیں ہوں گی تو پھر میں امیر تیمری کا بھیس بدل کر انڈیا جا کر کیا کروں گا؟

پہلے تو مجھے ندا کے ارادے معلوم کرنے ہوں گے۔ اگر وہ میرے ساتھ انڈیا میں رہ کر وہ چیزیں حاصل کرے گی تو پھر میں اپنا موجودہ حلیہ تبدیل کروں گا۔ امیر تیمری بن کر ندا کے ساتھ وہاں جاؤں گا۔

یہ سوچ کر بڑی کوفت محسوس ہو رہی تھی کہ میں ندا کا محتاج ہو گیا تھا۔ وہ میرے سامنے کی ہٹی تھی۔ مجھے بچانا ہو گا ہی تھی۔

میں سوچتے سوچتے چونک گیا۔ فون سے میسج ٹون سنائی دی۔ میں نے بٹن دبا کر پڑھا۔ تحریر ہی اسکرین پر لکھی تھی۔

انسان اپنی عمر سے زیادہ جی نہیں سکتا۔

کوئی بڑھاپے سے جوانی اور بچپن کی طرف واپس جا نہیں سکتا۔

سو برس کا سامان نہ کرو، پل کی خبر رکھو۔

اس سے پہلے کہ اگلے پل کچھ ہو جائے۔ اٹھو... توبہ کرو۔

تجسس و تحیر سے لبریز
واقعات کیلئے شمارہ ...

بوڑھا شیر

تنویر ریاض

آدمی بوڑھا ہو کر کمزور ہو جاتا ہے مگر شیر جتنا پرانا ہوتا ہے، اتنا ہی طاقتور ہوتا ہے... وہ جانے کس گمان میں تھے کہ سطحِ سمندر کے مانند پُرسکون رہنے والوں کی زندگی کو درہم برہم کرنے چلے آئے مگر... انہیں کیا معلوم تھا کہ اس سمندر کی تہ میں کتنے طوفان پوشیدہ تھے۔

کسی کی چاہت میں اپنا عکس دیکھنے والے ایک عاشق کا کارنامہ

لیوک فاک اپنے کام میں مصروف تھا کہ رکھوالی والے کتے کی غراہٹ نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور دوبارہ کام میں لگ گیا۔ اس کا دادا جھیل کے کنارے ان چیزوں پر بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ اس نے بھی کتے کی غراہٹ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کتے کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ ایک بار پھر سر اٹھا کر بھونکا۔ اس کی پریشانی بجا تھی کیونکہ اس نے دو گاڑیوں کو بوٹ ہاؤس کی جانب آتے دیکھ لیا تھا۔ دونوں ایک جیسی گاڑیاں تھیں اور پچھلی گاڑی میں سے اترنے والے چار افراد بھی ایک جیسے ہی لگ رہے تھے۔ وہ سیاہ فام تھے اور انہوں نے سیاہ سوٹ اور دھوپ کے چشمے لگا رکھے تھے۔ انہوں نے تیزی سے دوسری گاڑی کے گرد حصار قائم کیا اور ہر ایک نے بوٹ یارڈ کا جائزہ لینے لگے۔ ان کے سرغنہ کا قد سات فٹ اور سر منڈا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ، سفید قمیص اور سرخ ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس نے نظریں گھما کر اطراف کا جائزہ لیا اور شاپ کے کھلے ہوئے دروازے پر آ کر بولا۔

”ایکسکیوزمی! میں اس شاپ کے مالک سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”میں ہی لیوک فاک ہوں، اس شاپ کا مالک۔“ لیوک سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ اس وقت اس نے کام والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ بغیر آستینوں والی ٹی شرٹ اور جینز۔ اس کے لمبے بال گردن سے بھی پیچھے آ رہے تھے۔

”میرا نام ڈیکن ہے اور میں مسٹر اپولا مار کوک کا سیکیورٹی چیف ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا اگر میرے آدمی اس جگہ کا جائزہ لینا چاہیں؟“

لیوک نے رضامندی ظاہر کر دی۔ ڈیکن کے آدمی پہلے ہی صحن میں جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے تلاشی لینے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ وہاں صرف دو کھلے ہوئے شیڈز، ایک کیبن اور ایک کشتی تھی جس پر کام ہو رہا تھا۔ تلاشی کے دوران ڈیکن ٹہلتا ہوا ورکشاپ کے باہر بنے ہوئے ڈیک پر چلا گیا جہاں جھیل کی طرف ایک بوڑھا شخص لان چیئر پر بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ اس کے برابر ہی وہ کتا بھی آرام کر رہا تھا جو کچھ دیر پہلے گاڑیوں کی آواز سن کر بھونکا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں ڈیکن پر جم گئیں۔

"آرام سے جیکو۔" بوڑھے نے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا پھر وہ ڈیکن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا نام جیسن ہے اور میں لیوک کا دادا ہوں۔ اگر تم مجھے بتانا چاہو مسٹر....."

"ڈیکن۔" سیاہ فام نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "نہیں شکریہ۔ میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" بوڑھے نے کہا۔ "اس علاقے میں ہمارے علاوہ کوئی نہیں رہتا اور یہ کتا پانچ میل دور سے آنے والی آواز بھی سن سکتا ہے۔ اس نے تمہاری گاڑیوں کی آواز بھی پندرہ منٹ پہلے سن لی تھی۔"

ڈیکن نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہاں سے چل دیا۔ پھر ڈیکن اس شیڈ کی طرف آیا جہاں لیوک ایک کشتی پر کام کر رہا تھا۔ ڈیکن نے وہاں پڑے ہوئے سامان اور اوزاروں کو دیکھنا شروع کر دیا پھر اس نے ایک الماری کھولی۔ اس میں تین بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے لیوک سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"شکار میں استعمال ہونے والی بندوقیں۔" لیوک نے اس جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

ڈیکن نے ایک رائفل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس طرح کی رائفل سے کیا شکار کرتے ہو؟"

"میں شکار نہیں کرتا۔ یہ شوق میرے دادا کا ہے۔ میں تو کشتیاں بناتا ہوں۔ کیا تم کوئی کشتی دیکھنا پسند کرو گے۔ اگر نہیں تو اپنی فوج کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔"

ڈیکن نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور ایک بٹن دباتے ہوئے بولا۔ "سب ٹھیک ہے۔"

چند لمحوں بعد ایک عورت اندر داخل ہوئی جو دوسری گاڑی سے اتری تھی۔ اس نے سیاہ اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا اور اس کے سیاہ بال بھی اسکارف سے ڈھکے ہوئے تھے اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔ اس نے غور سے لیوک کو کام کرتے دیکھا پھر ڈیکن کی طرف دیکھ کر گردن ہلا دی۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ کر باہر ڈیک پر چلا گیا۔

"کیا تم کوئی مشہور ہستی ہو؟" لیوک نے کام پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"میں بھی نہیں۔"

"تم اپنے مصاحبین کے ساتھ سفر کر رہی ہو۔ ایسا تو بڑے لوگ ہی کرتے ہیں۔"

"نہیں میں تو ایک عام سی خریدار ہوں۔ میں نے ایک کیٹلاگ میں تمہاری بنائی ہوئی کشتیوں کے بارے میں پڑھا تھا مجھے وہ بہت منفرد اور خوبصورت لگیں۔ اس میں جو قیمتیں درج تھیں۔ ان سے مجھے لگا کہ تمہاری کوئی بہت بڑی کمپنی ہوگی۔"

"کمپنی۔ یہ ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے اور میں ساری کشتیاں اپنے ہاتھ سے بناتا ہوں۔ کسی بڑے کارخانے میں صورت حال مختلف ہوگی۔"

"شاید۔" وہ بولی اور بھرپور نظروں سے لیوک کا جائزہ لینے لگی۔ وہ گڑبڑا گیا اور اس کی توجہ ہٹانے کے لیے بولا۔

"تم کشتیوں کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

"میں ڈبروونک میں پلی بڑھی ہوں اور میں نے دس سال کی عمر میں ہی کشتی چلانا سیکھ لی تھی۔ ہم وینس میں بھی رہے ہیں جہاں کشتیاں ٹیکسی کی طرح چلتی ہیں۔"

"بہت عمدہ۔" لیوک نے کہا۔ "چلو میں تمہیں ایک کشتی دکھاتا ہوں۔"

عقبی ڈیک سے ایک چالیس فٹ طویل بند جیٹی تک جا رہا تھا اور اس کے آخری سرے پر وہ کشتی کھڑی تھی۔ ایلینا حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور بولی۔ "واقعی بہت منفرد کشتی ہے۔"

لیوک اس کشتی کی خوبیاں گنواتے ہوئے بولا۔ "اس کی لمبائی تیس فٹ اور وزن صرف چھ سو پاؤنڈ ہے۔ اس میں چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے لیکن ایک یا دو لوگوں کے ساتھ اس کی رفتار زیادہ ہوگی۔"

"کیا میں اس پر جا سکتی ہوں؟"

"ضرور لیکن اگر تم مائنڈ نہ کرو تو اونچی ہیل کے سینڈل اتار کر ایک شوز پہن لو۔"

"میں نے اپنی زندگی میں کشتی پر سوار ہونے کے لیے کبھی جوتے نہیں بدلے۔"

یہ کہہ کر وہ کشتی میں سوار ہوگئی۔ اس نے اسٹیئرنگ کو

ہلا کر دیکھا تاکہ سمت کا تعین کر سکے۔ لیوک پیچھے بیٹھا رہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے پتوار سنبھالے اور آہستہ آہستہ کشتی کو گہرائی میں لے آئی۔ لیوک قریب میں بیٹھا اسے ہدایات دے رہا تھا۔ اسے یہ کشتی چلانے میں بہت لطف آ رہا تھا۔ اس نے اپنا اسکارف اتار دیا اور اس کے ہوا سے کٹے بال بکھر گئے لیکن جب لیوک نے رفتار بڑھانا چاہی تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے۔ میں ساحل کے قریب ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

لیوک نے ساحل کی طرف دیکھا۔ وہاں ڈیکن ہاتھ باندھے کرسی کے ساتھ کھڑا کشتی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"کنارے سے قریب رہ کر اس کشتی کے چلانے کا صحیح مظاہرہ نہیں کیا جا سکتا۔" لیوک نے کہا۔

"اگر میں اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ پریشان ہو جائے گا اور میں ایسا نہیں چاہتی۔"

"تم یہاں مکمل طور پر محفوظ ہو۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بہت خوب صورت کشتیاں بناتے ہو لیکن ڈیکن میری حفاظت پر مامور ہے اور وہ اپنا کام بہت سنجیدگی سے کرتا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اتنے باڈی گارڈز رکھنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ اس علاقے میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔"

"امریکا میں قتل ہونے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اس حوالے سے مشی گن بہت آگے ہے۔"

"تم بڑے شہروں کی بات کر رہی ہو۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔"

"شاید ہم کسی مختلف ملک میں رہتے ہیں مسٹر فاک! بہرحال اس مظاہرے کے لیے تمہارا شکریہ۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ پتوار تم سنبھال لو۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" لیوک شانے اچکاتے ہوئے بولا۔ اس نے اپنی ناراضی چھپانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن جب وہ کنارے کے قریب پہنچے تو وہ اپنے آپ کو نہ روک سکا اور اس کی نظریں بے اختیار ایلینا کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ ایلینا نے اس کی چوری پکڑ لی اور اس نے فوراً ہی اپنی نظریں ہٹا لیں۔ ساحل پر پہنچ کر ایلینا نے اپنا اسکارف دوبارہ سر پر باندھ لیا اور لیوک کے پیچھے چلتے ہوئے بوٹ ہاؤس میں آ گئی۔ لیوک دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ ایلینا بولی۔

دو بجے رات کو سیل فون کمپنی کا مینیجر اپنے فون کی گھنٹی سن کر سوتے سے اٹھا اور فون اٹھا کر روایتی انداز میں بولا۔ "ہیلو"
دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کیا مجھے سیل فون کمپنی کے مینیجر سے بات کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟"
"جی ہاں" مینیجر نے اس کی خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر کہا۔ "فرمایئے؟"
"ذرا یہ تو بتایئے، دو بجے رات کو رانگ نمبر کال وصول ہو تو دل پر کیا قیامت گزرتی ہے؟"

"تمہارا کہنا ہے کہ تم اچھے سیلز مین نہیں ہو لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہارا کام خود بولتا ہے۔ مجھے یہ کشتی بہت پسند آئی ہے۔ میں اسے لینا چاہتی ہوں۔"

"کیا واقعی تم یہ کشتی لینا چاہتی ہو؟" لیوک حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔"

"تم نے اسے پوری طرح نہیں چلایا اور نہ ہی اس کی قیمت پوچھی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ کیا لو گے؟"

"ساٹھ ہزار ڈالرز۔"

"اس خوب صورت کشتی کے لحاظ سے یہ قیمت کم ہے۔" اچانک اس کی نظر اس کے ہاتھ پر گئی اور وہ بولی۔ "تمہارے ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے۔ کیا تمہارے پاس فرسٹ ایڈ باکس ہے؟"

"ہاں۔ کاؤنٹر کے سرے پر رکھا ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے دیکھنے دو۔" یہ کہہ کر اس نے کاؤنٹر پر سے فرسٹ ایڈ باکس اٹھایا اور بولی۔ "اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔"

لیوک نے جھجکتے ہوئے اپنی زخمی ہتھیلی آگے بڑھا دی۔ اس نے اپنا چشمہ اتار کر زخم کا معائنہ کیا اور اسے صاف کر کے پٹی باندھ دی۔ جتنی دیر وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ لیوک اس کی آنکھیں دیکھتا رہا۔ ایلینا نے اس کی نظروں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور یوں لگا جیسے وقت تھم گیا ہو۔

"میں تمہاری کشتی ضرور لوں گی۔" وہ سنبھلتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولی۔ ''لیکن میری نظر میں اس کی قیمت ستر ہزار ڈالرز ہے لہٰذا تمہیں یہ قبول کرنا ہوگی۔''

''میں کوئی کشتی ران نہیں ہوں جو تم مجھے ٹپ دے رہی ہو۔'' یوک سرد لہجے میں بولا۔

''میرا مقصد تمہاری بے عزتی کرنا نہیں تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ اس کشتی کی قیمت ساٹھ ہزار ڈالرز سے زیادہ ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ اس کے بنانے میں تم نے کتنا وقت لگایا ہوگا۔''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''مسٹر فاک، میں بہت زیادہ ذہین تو نہیں ہوں اور نہ ہی تمہاری طرح خوب صورت چیزیں تخلیق کر سکتی ہوں لیکن مجھے چیزوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے اور میں تمہارے کام کی کم قیمت نہیں لگا سکتی۔''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ مجھے مدد کی ضرورت ہے؟''

''یہ میں نے کب کہا۔'' الینا بولی۔ ''تم یہ کشتی بیچنا چاہتے ہو یا نہیں؟''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں لیکن.....''

''ٹھیک ہے۔ ہم درمیان کا راستہ نکال لیتے ہیں۔ پینسٹھ ہزار ڈالرز میں معاملہ طے کر لو۔''

یوک خاموش رہا تو وہ بولی۔ ''سودا طے ہو گیا۔ میں اس کشتی کو نیویارک.....''

''ایک منٹ!'' یوک اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری کشتی ابھی ڈیلیوری کے لیے تیار نہیں ہے۔ ابھی مجھے اس میں بہت سا کام کرنا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے تمہیں ایک مرتبہ پھر آنا ہوگا۔''

''میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔''

''میں مخصوص گاہکوں کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق کام کرتا ہوں مس مارکووک۔'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ کوئی کھلونا یا ڈیکوریشن پیس نہیں ہے بلکہ اسے استعمال بھی کیا جائے گا۔ اگر تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں اسے مناسب طریقے سے مکمل کر سکوں تو میں کشتی تمہیں نہیں بیچوں گا۔''

''او خدایا۔ اتنا جارحانہ انداز اختیار کرو۔ میں نے بہت سے لوگوں سے ڈیلنگ کی ہے لیکن تم جیسا سیلز مین نہیں دیکھا۔''

''میں سیلز مین نہیں بلکہ بوٹ مین ہوں اور تم کیا کرتی ہو؟''

''میں فاضل چیزیں خریدتی ہوں۔''

''تم اس کی وضاحت کر سکو گی۔''

''چھوڑو۔ تمہیں میرے بزنس سے کیا لینا دینا لیکن مجھے تمہاری یہ کشتی ہر حال میں چاہیے۔ اس میں کیا کام باقی ہے؟''

''چھوٹے موٹے کئی کام ہیں۔ شاید تم پوری طرح نہ سمجھ سکو۔ اس کے علاوہ نام بھی لکھنا ہے۔ تمہارے ذہن میں کوئی نام ہے۔''

''میں نے اس بارے میں ابھی نہیں سوچا۔''

''الینا کیسا رہے گا۔ اس کا مطلب ہے صبح کا ستارہ۔''

''تم یہ کیسے جانتے ہو؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہے۔ ویسے تم جو چاہو نام رکھ سکتی ہو۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ الینا ایک خوب صورت نام ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کا اپنا نام ہونا چاہیے۔ بچی کیسا رہے گا؟ ویسے بھی کچھ دیر پہلے ہم بچوں پر ہی بحث کر رہے تھے۔''

☆☆☆

شاید وہ ملاقاتیوں کے آنے کا دن تھا۔ الینا کو گئے ہوئے مشکل آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا کہ بوٹ یارڈ میں ایک شیورلیٹ بلیزر آ کر رکی۔ اس میں سے دو افراد برآمد ہوئے اور عقابی نظروں سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے یوک کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک چالیس کے پیٹے میں تھا جبکہ دوسرا قدرے کم عمر لگ رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے یوک کے سامنے اپنا کارڈ لہرایا اور بولا۔ ''فیڈرل ایجنٹس۔ میرا نام گورڈن لارکن ہے اور یہ ریڈلے ہے۔ کیا تم ہی لوکس فاک ہو؟''

''ہاں لیکن میرا نام لوکس نہیں بلکہ یوک ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا تعلق کس ایجنسی سے ہے؟''

''اے۔ ٹی۔ ایف یعنی بیورو آف الکحل، ٹوبیکو اور فائر آرمز۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مس مارکووک یہاں کیوں آئی تھی؟''

''وہ ایک کشتی خریدنے آئی تھی لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تم صرف ہمارے سوالوں کے جواب دو۔ اس کے ساتھ کتنے آدمی تھے؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے ان کی گنتی نہیں کی تھی۔''

''کمال ہے۔ ایک عورت پورے لشکر کے ساتھ تم سے ملنے چلی آئی اور تم نے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔''

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ مسٹن بھی وہاں آ گیا اور بولا۔

''میں نے ان سے اچھی طرح سے بات کی تھی۔ اس کا کام ہو گیا تھا۔''

''بڑے میاں، تم بیچ میں مت بولو۔ میں مسٹر فاک سے بات کر رہا ہوں۔''

''ہم دونوں ہی مسٹر فاک ہیں، میں اس کا دادا ہوں اور میں نے ہی اسے سارے گر سکھائے ہیں۔ زیادہ تر لوگ مجھے مسٹر فاک کے بجائے مسٹن کہتے ہیں لیکن آج تک کسی نے بڑے میاں نہیں کہا۔''

''میرا مقصد تمہیں ناراض کرنا نہیں تھا۔'' عمر رسیدہ ایجنٹ بولا۔ ''لیکن ہم ایک ایسے معاملے کی تحقیقات کر رہے ہیں جس کا تعلق قومی سلامتی سے ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم لوگ باتیں کرو۔ میں مچھلیاں پکڑنے جا رہا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد یوک نے کہا۔ ''اب بتاؤ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

''تم ایک فیڈرل ایجنٹ سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتے۔'' لارکن نے نخوت سے کہا۔

''کیا ہم لوگ کچھ دیر کے لیے پرسکون نہیں ہو سکتے؟'' ریڈلے نے اپنے ساتھی کو گھورتے ہوئے کہا پھر یوک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم سب امریکن ہیں مسٹر فاک! ہمیں ایک معاملے میں مس مارکووک کی گواہی مطلوب ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟''

''میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ ایک کشتی خریدنے آئی تھی۔''

''تم اس کی ڈیلیوری کب دو گے؟''

''چند ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔ مجھے اس میں کچھ تبدیلیاں کرنی ہیں۔ اس کے بعد وہ اسے آزمائشی طور پر چلا کر دیکھے گی۔''

''بہت خوب۔'' لارکن اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس دوران میں تم اس کشتی میں ہمارے لیے ایک آلہ نصب کر سکتے ہو؟''

''کس قسم کا آلہ؟'' یوک نے پوچھا۔ ''اس سے تمہاری مراد کوئی جاسوسی کا آلہ ہے؟''

''ہاں ایک خاص قسم کا آلہ ہوگا۔''

''احمقانہ خیال ہے۔'' یوک نے کہا۔ ''تمہارے اس الو کے آلے کو کاک پٹ میں نصب کرنا ہوگا جو فوراً ہی اس عورت کی نظروں میں آ جائے گا۔ وہ کشتیوں کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے اور اس کے لیے کیا تمہیں کسی وارنٹ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

''پھر تم ہم پر چھوڑ دو۔'' ریڈلے نے کہا۔ ''ہم یہ آلہ خود نصب کر لیں گے بس تم ہمیں اتنا بتا دو کہ وہ ڈیلیوری لینے کب آئے گی!''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

''یہ کوئی عام سی درخواست نہیں ہے۔'' ریڈلے سخت لہجے میں بولا۔ ''تم کسی زمانے میں سپاہی رہ چکے ہو۔ اب ملک کو تمہاری مدد کی دوبارہ ضرورت ہے۔''

''اس طرح کی جذباتی باتیں مجھ پر اثر نہیں کرتیں۔'' یوک سپاٹ لہجے میں بولا۔

''تمہیں اپنے ملک کی پروا نہیں ہے۔'' لارکن غرایا۔ ''تم کس طرح کے امریکن ہو؟''

''میں تو دو مرتبہ عراق جا چکا ہوں۔'' یوک نے کہا۔ ''اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ تم نے بھی وردی پہنی ہے؟''

''میں اب اپنے ملک کی خدمت کر رہا ہوں۔'' لارکن نے کہا۔

''اچھی بات ہے۔'' یوک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن عراق میں میرا وقت اچھا نہیں گزرا۔ میری تعیناتی ایرانی سرحد کے قریب تھی۔ خودکش حملہ آوروں کو بھگانے کے لیے ہم پندرہ سو گز سے فائر کیا کرتے تھے۔ میں نے پندرہ مہینوں میں آٹھ حملہ آوروں کو مار گرایا۔ ان میں ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا بھی تھا جو سائیکل پر آتش گیر مادہ لے کر آ رہا تھا۔ اس سے ہمارا آدھا کیمپ تباہ ہو جاتا۔ مجھے اس کے مرنے کا افسوس ہے۔ مجھے وہاں کے لوگوں کی حالت پر بہت ترس آتا تھا۔ وہ بے چارے پانی کی ایک ایک بوند کے لیے ترستے تھے لیکن ان کے لیے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ اس پریشانی میں میری نیند اڑ چکی تھی۔ چنانچہ میں نے ڈسچارج لیا اور یہاں چلا آیا لیکن اب میں سرکار کا کوئی کام نہیں کرتا اور نہ ہی کروں گا لہٰذا اب تم بھی چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

یہ کہہ کر یوک اپنے کام میں مصروف ہونے ہی والا تھا کہ لارکن نے اس کا بازو پکڑا اور بولا۔ ''ہم نے تم سے بہت نرمی سے بات کی ہے لیکن تم کچھ زیادہ ہی ہوشیار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ سے کوئی بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ میری زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ تمہاری بربادی کے لیے کافی ہے۔ نہ صرف اس ورکشاپ میں تالا لگ جائے گا بلکہ تم بھی دس سال کے لیے جیل چلے جاؤ گے۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے وہی کرو۔ ورنہ تم ناقابل بیان مشکلات میں گھر جاؤ گے۔''

''تم کیا جانو کہ مشکل کیا ہوتی ہے۔'' یوک نے نرمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہا اور ہاتھ میں پکڑی چھتری کو فضا میں اچھال کر دوبارہ پکڑ لیا پھر لارکن کی گردن پر اس کی نوک بھے سے چھوتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ تم نے بھی کوئی مشکل دیکھی ہی نہیں۔"

اس کے ردعمل کے طور پر لارکن کا ہاتھ اپنی گن کی جانب بڑھا۔

"میں بھی ایسا نہ کرتا۔" گھسن عمارت کے ایک کونے سے برآمد ہوتے ہوئے بولا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی ونچسٹر کاربائن تھی۔ "اپنے دماغ پر قابو رکھو۔"

"سب لوگ پرسکون ہو جائیں۔" ایجنٹ ریڈلے نے پرانا جملہ دہرایا۔ "ہم یہاں تمہارا تعاون حاصل کرنے آئے ہیں فاک! کوئی مشکل کھڑی کرنے نہیں۔ اگر تم اپنے ملک کی خدمت نہیں کرو گے......"

"میں اپنے حصے کا کام کر چکا ہوں مسٹر۔ اب یہ چالیس ایکڑ زمین اور ورکشاپ ہی میرا ملک ہے اور میں صرف کشتیوں کے آرڈر وصول کرتا ہوں۔ اب تم جاؤ اور ہمیں تنہا چھوڑ دو۔"

ریڈلے نے فاک کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ برف کی طرح سرد ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم اس انداز میں سوچ رہے ہو مسٹر فاک۔ بہرحال اگر تمہارا ذہن تبدیل ہو جائے تو تم ہم سے اس نمبر پر رابطہ کر سکتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک کارڈ فاک کی طرف بڑھا دیا اور لارکن سے بولا۔ "چلو۔"

☆☆☆

"تمہیں میرا ساتھ دینا چاہیے تھا۔" واپس جاتے ہوئے راستے میں لارکن نے شکایت کی۔ "ہم انہیں حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار کر سکتے تھے۔"

"وہ مشتبہ افراد نہیں بلکہ عام شہری ہیں اور ہمارے پاس انہیں گرفتار کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔"

"فیڈرل ایجنٹ سے جھوٹ بولنا بھی جرم ہے۔ فاک نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ اس کے فوجی ریکارڈ سے مطابقت نہیں رکھتا۔"

"ایک کے علاوہ باقی سب باتیں درست ہیں۔ اس لیے اس بنیاد پر بھی کارروائی نہیں ہو سکتی۔"

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ ہم اس کے حسابات چیک کر سکتے ہیں۔ اس کا کریڈٹ کارڈ منجمد ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"ان کارروائیوں کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہیڈ کوارٹر والوں کا کہنا ہے کہ مس مارلوک ایک خاص گواہ ہے اور وہ اسے جلد از جلد کٹہرے میں لانا چاہتے ہیں۔ اس لیے فی الحال فاک کے معاملے میں پڑنا حماقت ہوگی۔"

"پھر ہم دوسرا طریقہ اختیار کریں گے۔"

"وہ کیا؟"

"اس نے کہا تھا کہ مس مارلوک کشتی کی آزمائش کرنے آئے گی۔ اگر وہ پانی میں اکیلی گئی اور ہم اس کی کشتی سے ڈرگز برآمد کر سکیں تو وہ بڑی آسانی سے قابو میں آ جائے گی اور اگر فاک اس کے ساتھ ہوا تو ہم اسے بھی پکڑ لیں گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کشتی پر کوئی نشہ آور شے رکھ دی جائے جبکہ ہمیں جاسوسی کا آلہ رکھنے کی ہدایت ملی ہے۔"

"میں نے تو کہا تھا کہ ہیڈکوارٹر کو یہ معاملہ نمٹانے کی جلدی ہے۔"

"اوہ میرے خدایا۔ تم تو میری سوچ سے بھی زیادہ پاگل ہو۔ کیا تم ڈیٹرائٹ والا واقعہ بھول گئے جب تم نے دو مجرموں کو سگریٹ اسمگل کرنے کی کوشش کے دوران ہی گولی مار کر زخمی کر دیا تھا۔ اگر تمہارے چچا اس وقت واشنگٹن کے ڈپٹی کمانڈر نہ ہوتے تو تمہیں جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔"

"دیکھو۔ بیورو کو نتائج سے غرض ہے اور تم جانتے ہو کہ دہشت گردی، مافیا سے بھی بڑا خطرہ ہے۔ اگر مارلوک پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے تمام دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیں محتاط ہو کر کام کرنا چاہیے۔" ریڈلے بولا۔ "کوئی بھی غلطی ہوئی تو ہم بے روزگار ہو جائیں گے۔ اس بار شاید انکل بھی تمہاری کوئی مدد نہ کر سکیں۔"

"پھر تم میری مدد کرو۔ میں فاک کے ورکشاپ میں جاؤں گا اور موقع ملتے ہی وہاں ڈرگز رکھ دوں گا۔ جب مارلوک کشتی ٹیسٹ کرنے جائے گی تو ہم اسے پکڑ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" ریڈلے نے سر ہلایا۔ "میں تمہیں کور دوں گا۔ تم فاک کی ورکشاپ کے سامنے والی پہاڑیوں پر اپنی پوسٹ بنا سکتے ہو۔ کیا تمہارے پاس کوئی طاقتور دوربین ہے۔"

"ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" لارکن نے کہا۔

"اس لیے کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی پندرہ سو گز سے کم کا فاصلہ رکھنے کی حماقت نہ کرتا۔"

☆☆☆

اگلے پانچ دن تک لیوک اس کشتی پر کام کرتا رہا۔ عراق سے واپس آنے کے بعد وہ بہت خوش تھا اور اس نے

سوچا تھا کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا لیکن اب وہ جانے کیوں بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایلینا کا چہرہ بس گیا تھا۔ وہ ورکشاپ کے باہر کھڑا ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے ابھرتے ہوئے سورج کا نظارہ کر رہا تھا۔ ایسے میں اسے ایلینا کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

ایلینا کی واپسی ایک ہفتے بعد ہوئی۔ اس بار بھی محافظ دستہ اس کے ہمراہ تھا۔ باقی سب لوگ تو باہر رک گئے۔ البتہ ڈیکن، ایلینا کے ساتھ ہی اندر چلا آیا۔ ایلینا کو دیکھ کر لیوک کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے نگاہیں پھیر لیں۔ ایلینا اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولی۔ "خیریت تو ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔"

"ہاں۔" لیوک نے مختصر جواب دیتے ہوئے اسے لارکن اور ریڈلے کی آمد کے بارے میں بتا دیا۔

"وہ کیا معلوم کرنا چاہ رہے تھے؟" ڈیکن نے پوچھا۔

"انہیں مس مارلوک کے بارے میں معلومات درکار تھیں۔"

"پھر تم نے کیا بتایا؟" ایلینا بولی۔

"وہی جو سچ تھا۔" لیوک کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "یعنی یہ کہ تم ایک خریدار ہو اور مجھ سے کشتی خریدنے آئی ہو۔" ایلینا نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ "میں اس کشتی کو اسی حالت میں لے جاؤں گی۔ ان حالات میں اس کی آزمائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"میرے پاس ڈنگی کے علاوہ ایک موٹر لانچ بھی ہے۔ تمہارے ساتھی اس کے ذریعے تمہاری نگرانی کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ ابراہیم اور راشی لانچ... میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ ڈنگی میں سوار ہو گئی اور پتوار سنبھال لیے جبکہ اس کے دونوں محافظ لانچ میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ڈیکن کنارے پر ہی گھسن کی ان چیزوں کے ساتھ کھڑا دونوں کشتیوں کو پانی میں جاتے دیکھتا رہا۔

"کشتی رانی کے لیے بہترین دن ہے۔" گھسن بولا۔ "کچھ پیو گے مسٹر ڈیکن؟"

"نہیں۔"

"اس لیے کہ تم اپنے آپ کو ڈیوٹی پر سمجھ رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں شرارت کرنے میں مزہ آتا ہے۔" ڈیکن طنزیہ انداز میں بولا۔

"مجھے حیرت ہے کہ تم نے میرا نوٹس لے لیا۔"

"کیوں؟" ڈیکن نے پوچھا۔

"کیونکہ جب آدمی بوڑھا ہو جائے تو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ سب اسے نظرانداز کر کے گزر جاتے ہیں۔" گھسن نے افسردگی سے کہا۔

"میرا تعلق جس ملک سے ہے وہاں بوڑھے شیر کو زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے کیونکہ انہیں مرنے کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ آدم خور بن جاتے ہیں۔"

"لیکن میں آدم خور نہیں ہوں اور تم جیسے لوگوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

ڈیکن مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ خوف نہیں بلکہ عقل مندی ہے۔"

☆☆☆

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ جھیل اتنی چوڑی ہو سکتی ہے۔" ایلینا نے جھیل کی وسعت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو یہ کسی سمندر کی طرح معلوم ہو رہی ہے۔"

لیوک نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا شمار دنیا کی چند بڑی جھیلوں میں ہوتا ہے۔"

"تمہیں یہاں رہتے ہوئے تنہائی محسوس نہیں ہوتی؟"

"یہاں بہت سکون ہے اور ویسے بھی یہاں ہمیشہ سناٹا نہیں ہوتا۔ اگلے ہفتے میکیناک ریگاٹا ہونے والی ہے اس دوران میں ڈھائی سو کشتیاں یہاں سے گزریں گی اور ان کا رخ اسٹریٹ اور پھر شکاگو کی جانب ہوگا۔"

"اندازاً یہ کتنا فاصلہ ہے؟"

"ویسے تو یہ تین سو میل کی ہے لیکن کسی کشتی راں کے لیے اس سفر کی کوئی منزل نہیں۔ وہ اگر چاہے تو ہزار میل کا سفر طے کر کے کسی بھی دوسرے ملک میں جا سکتا ہے جہاں اسے کوئی خطرہ نہ ہو۔"

"ہو سکتا ہے کسی زمانے میں ایسا ہوتا ہو لیکن آج کے دور میں یہ ممکن نہیں۔ سیٹلائٹ کے ذریعے سب پتا چل جاتا ہے۔"

"لیکن وہ تمہارا پیچھا کیوں کر رہے ہیں۔ تم ان کے لیے اتنی اہم کیوں ہو گئی ہو؟"

"یہی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی اہم شخصیت نہیں ہوں مسٹر فاک لیکن ..." اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا باپ اسلحہ کا بین الاقوامی تاجر ہے اور شہزادوں کی طرح دمشق کے ایک محل میں رہتا ہے جو کبھی سلطان آف اومان کی ملکیت تھا لیکن کسی عرب ملک میں مجھ جیسی ماڈرن عورت کے لیے کوئی گنجائش نہیں اس لیے میں مغرب میں رہنے کو ترجیح دیتی ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر اسے باڈی گارڈز ساتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس کاروبار میں خطرات بہت ہیں۔ میں اپنے والد کے بزنس میں بچپن سے کام کر رہی ہوں اور امریکن ہمارے بہترین گاہک ہیں۔"

"میرا سوال اب بھی اپنی جگہ پر ہے کہ یہ لوگ تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟"

"تمہاری حکومت میرے باپ کو ڈبل ایجنٹ بنانا چاہتی ہے لیکن اس حوالے سے ان کا ریکارڈ بہت تکلیف دہ ہے۔ وہ اس بہانے اسے مار دینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے میرا باپ دمشق میں رہتا ہے اور کیونکہ میں اس کے دشمنوں کے لیے ایک قیمتی یرغمالی ہو سکتی ہوں اس لیے مجھے اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو قیدی بنا رکھا ہے۔"

"کبھی کبھی مجھے خود بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔" وہ ایک دلکش مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولی۔ "لیکن آج میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہی ہوں اور اگر یہ دونوں فرشتے میرے ساتھ نہ ہوتے تو اور زیادہ آزادی محسوس کرتی۔"

"تم چاہو تو اس لانچ کو بہت پیچھے چھوڑ سکتی ہو۔ ایک بار اس کے بازو کھول دیے جائیں تو یہ مرغابی کی طرح ان لہروں پر تیر سکتی ہے اور اس طرح تم کسی بھی ساحلی جزیرے پر اتر کر غائب ہو سکتی ہو۔"

ایلیا نے مرکزی مستول کی رسی کھولی اور اس کے ساتھ ہی کشتی منہ زور گھوڑے کی طرح اچھلی اور پانی کی لہروں پر تیزی سے تیرنے لگی۔ ایلیا اس کی رفتار دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔ "یہ تو اڑ رہی ہے۔"

دوسری موٹر بوٹ بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ کھاڑی کے اختتام پر ایلیا نے بڑی مہارت سے کشتی کا رخ جنگل نما جزیروں کے جھنڈ کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ کشتی مکمل طور پر جنگل کے پردے میں چھپ گئی تھی۔ لیوک سوچے سمجھے بغیر آگے بڑھا اور اس نے ایلیا کا اسکارف اتار دیا۔ وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا تم اس تنہائی کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو؟"

"ہم تنہا نہیں ہیں۔ ایک فیڈرل ایجنٹ سامنے والے جنگل سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔"

"اچھا ہے وہ بھی یہ نظارہ دیکھ لے۔" یہ کہہ کر وہ اس کی جانب جھکی اور اس کا بوسہ لے لیا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" لیوک بولا۔ "میں اس پر نازاں بھی ہو سکتا ہوں۔"

"مسٹر! میں لاکھوں ڈالر کے سودے کرتی ہوں اور چہرے پڑھنا خوب جانتی ہوں۔"

موٹر بوٹ کی آواز قریب آ رہی تھی۔ وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔ "اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔"

اس نے اپنے محافظوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس کی کشتی تیزی سے ان کی لانچ کے پاس سے گزر گئی۔ ساحل پر پہنچ کر لیوک نے اس سے کہا۔ "تمہیں ایک مرتبہ پھر آنا ہوگا۔"

"کیوں؟ کشتی تو بہت اچھی چل رہی ہے۔"

"نہیں۔ ابھی اس میں کچھ کام باقی ہے۔"

"یہ ایک غلطی ہوگی۔" ایلیا نے کہا۔ "جانتی ہوں کہ بہت زیادہ خوب صورت نہیں ہوں لیکن ایسی بھی نہیں ہوں کہ کچھ دیر کے لیے کسی کے ساتھ وقت نہ گزار سکوں۔ میں ایک دولت مند عورت ہوں اور تم پرکشش ہونے کے باوجود پیسوں سے محروم ہو۔"

"تعریف کا شکریہ۔" لیوک نے کہا۔ "ہمارے یہاں اس شخص کو امیر سمجھا جاتا ہے جس کے پاس گزارے کے لیے کافی پیسے ہوں جبکہ میں تو کافی سے زیادہ کماتا ہوں اور اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی آدھی آمدنی فلاحی مقاصد کے لیے عطیہ کر دیتا ہوں۔"

"تم اپنی آدھی آمدنی عطیہ کر دیتے ہو؟" ایلیا حیرت سے بولی۔

"ہاں، کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے کبھی تمہاری دولت کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں صرف تم سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں۔ تمہیں دیکھنا اور سننا چاہتا ہوں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ زندگی کوئی شاعری نہیں۔ خاص طور پر میرے لیے..... تم مسکرا کیوں رہے ہو؟"

"کیونکہ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں ہے۔ تمہارا چہرہ گواہی دے رہا ہے کہ تم واپس آنا چاہتی ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے۔ کیا تم اپنی زندگی سے خوش ہو۔ مسلح محافظوں کے ساتھ سفر کرنا اور قیدیوں کی طرح رہنا، کیا تم ایسا ہی چاہتی ہو؟"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ کوئی شخص ہمیشہ خوش رہ سکتا ہے؟"

"اسی لیے لوگ تبدیلی کی خواہش کرتے ہیں۔" لیوک نے کہا۔

"میں نے اپنے لیے اس زندگی کا انتخاب نہیں کیا۔" وہ افسردگی سے بولی۔ "لیکن اب مجھے اسی طرح رہنا ہے۔ گھر پر بہت ذمے داریاں ہیں۔"

"یقیناً فیملی کی ذمے داریاں ہو سکتی ہیں لیکن اپنے باپ کے کاروبار کے لیے تم ناگزیر نہیں ہو۔ اگر تم کوئی دوسرا کام شروع کر دو تو اس کا سلسلہ کاروبار رک نہیں جائے گا۔"

"تم نہیں سمجھو گے۔"

"میں تم سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ مجھے بھی تمہاری طرح ایک موقع ملا تھا اور میں نے اپنے ملک اور حکومت کے لیے کام کرنے کا انتخاب کیا تھا۔ دوسرے ملک میں جا کر لوگوں کو مارا اور تجربات نے مجھے آپ کو تباہ کر لیا، میری غلطیوں سے سبق سیکھو تم کوئی دوسرا انتخاب بھی کر سکتی ہو۔"

"وہ انتخاب کیا ہو سکتا ہے؟"

"دو ہی راستے ہیں یا تو تم اسی طرح ہتھیار پہنتی رہو یا پھر سب چھوڑ کر میرے پاس آ جاؤ۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"یہ پاگل پن ہے۔" وہ خلا میں نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "تم پاگل ہو گئے ہو۔"

"اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ تم صرف اتنا بتا دو کہ واپس آنا چاہتی ہو یا نہیں؟"

☆☆☆

"ہمیں ابھی جانا ہوگا۔" ڈیکن قریب آتے ہوئے بولا۔ "پہاڑی پر سے تمہاری نگرانی ہو رہی ہے۔ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔"

"تم کس سے موازنہ کر رہے ہو۔" ایلیا برہم ہوتے ہوئے بولی۔ "دمشق کو سوچو کون سی جگہ محفوظ ہے؟"

"میں نہیں جانتا مس لیکن یہ جگہ یقیناً محفوظ نہیں ہے۔" ڈیکن اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا کوئی پریشانی ہے؟"

"یہ کشتی ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوئی۔ مسٹر فاک اس پر مزید کچھ کام کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ اس کام میں چند دن اور لگیں گے۔" لیوک بولا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ڈیکن بولا۔ "یہاں ہم بالکل الگ تھلگ اور غیر محفوظ ہیں۔ ہم دوبارہ نہیں آ سکتے۔"

"ڈیکن! تم میرے سرپرست ہو جیلر نہیں۔" ایلیا برہمی سے بولی۔ "میں اس کشتی کو مکمل حالت میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر تم جنگل میں چھپے ہوئے ایک ایجنٹ سے ڈر رہے ہو تو مجھے اپنے باپ سے سی آئی اے کے سیکیورٹی چیف کے لیے کہنا پڑے گا۔"

"شاید تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ ہم دونوں کل کی فلائٹ سے چلتے ہیں تاکہ اس سے براہ راست گفتگو ہو سکے اور دیکھتے ہیں کہ تمہارا باپ کس کی بات کا یقین کرتا ہے۔"

ایلیا خوفزدہ ہو گئی لیکن اس نے ڈیکن پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں تمہیں اپنا افسر سمجھتی ہوں لیکن اگر تم مجھے دمشق لے گئے تو قسم کھاتی ہوں کہ تم صحرا میں بھوکے پیاسے مر جاؤ گے۔"

ڈیکن بھی جانتا تھا کہ ایلیا کا باپ اپنی بیٹی کی بات کو ہی اہمیت دے گا۔ ایلیا پرسکون ہوتے ہوئے بولی۔ "اگر تم اصرار کر رہے ہو تو ہم ایک بار پھر یہاں آ سکتے ہیں۔"

☆☆☆

لارکن اور ریڈ نے کشتی میں ہونے والے واقعے کی رپورٹ مل چکی تھی۔ لارکن اس حوالے سے خاصا پرجوش نظر آ رہا تھا لیکن ریڈ نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور بولا۔ "ہمیں کسی کی ذاتی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔"

"یہ ایک اچھا موقع ہے۔ اگر ہم اس کے باپ کو اس کی مکمل کرکے وارننگ دے دیں تو اس طرح وہ دباؤ میں آ جائے گا۔"

سپر بار بر سیلون

☆ یار شیر بہادر کا انتقال کیسے ہوا؟

○ وہ ایک ماڈرن قسم کے باربر شاپ میں شیو کرانے گئے تھے، جہاں لڑکیاں گاہکوں کی شیو کرتی ہیں۔ لڑکی شیو بنا رہی تھی کہ ایک چوہا لڑکی کے پاؤں پر سے گزر گیا، چاچا جی دنیا سے گزر گئے۔

☆ تمہاری کبھی سرجری ہوئی؟

○ بہت مرتبہ..... کیونکہ میں نائی سے شیو بنواتا ہوں۔

☆ تم بہت اچھے حجام ہو تمہاری باتیں سنتے ہوئے پتا ہی نہیں چلتا کہ کب حجامت ہو گئی۔

○ یہ فن مجھے ورثے میں ملا ہے۔

☆ سر آپ کس طرح حجامت بنوانا پسند کریں گے؟

○ تمہاری آواز سنے بغیر۔

☆ سر! میں شیو بنانے لگا ہوں، پلیز اپنا منہ بند کر لیجیے۔

○ ہر گز نہیں اپنا تم بند کرو۔

☆ سر آپ تیزی سے گنجے ہو رہے ہیں، کیا اس سلسلے میں کوئی احتیاطی تدابیر کر رہے ہیں؟

○ ہاں میں اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہوں۔

بابا ایمان..... حافظ آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جانتا ہوں کہ اس لڑکے نے تمہاری بات نہیں مانی لیکن تمہیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ہمیں اس عورت سے غرض ہے۔ کیا تم نے اس کی کشتی میں کوئی چیز چھپائی ہے؟"

"ابھی تک موقع نہیں مل سکا۔ فاک سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی بیدار ہو جاتا ہے اور اندھیرا ہونے تک ورکشاپ میں ہی رہتا ہے۔ اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی وہ وہاں سے نہیں ہٹتا اور اس کے علاوہ وہ کتا چوبیس گھنٹے پہرا دیتا رہتا ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ تم جلد از جلد یہ کام کرلو۔ میں زیادہ دیر تک تمہارے دوسرے کاموں کی ذمے داری نہیں لے سکتا۔"

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔"

"کیسا آئیڈیا؟" ریڈلے نے پوچھا لیکن جب لارکن نے اس سوال کو نظرانداز کر دیا تو اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔

☆☆☆

وہ جوڑا ایک مرسڈیز کار میں وہاں آیا تھا۔ عورت لمبی، دبلی اور سنہرے بالوں والی تھی جبکہ مرد اس کے مقابلے میں پستہ قد تھا۔ دونوں نے عمدہ لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور دیکھنے میں خاصے دولت مند لگ رہے تھے۔ ان کا انداز ایسے خریداروں کا سا تھا جو اپنی پسندیدہ چیزوں کی تلاش میں وہاں آتے ہوں۔ وہ گھوم پھر کر ورکشاپ کا جائزہ لیتے رہے اور خاص طور پر بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن انہوں نے اسے خریدنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ لیوک جانتا تھا کہ اس طرح کے گاہک آتے رہتے ہیں لہٰذا جب وہ کوئی آرڈر دیے بغیر چلے گئے تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

"یہ کون لوگ تھے؟" گبسن نے ورک شاپ میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ اس کا پالتو کتا ریزی ساتھ تھا۔

"گاہک جو کچھ خریدنے کے بجائے ہمارا وقت ضائع کرتے ہیں۔" لیوک نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو کچھ شک ہو رہا ہے۔" گبسن نے کہا۔ "جب وہ مرد بیٹی کو دیکھ رہا تھا تو عورت ایک لمحے کے لیے ورکشاپ میں آئی اور فوراً ہی واپس چلی گئی۔ جیسے وہ یہاں کوئی چیز بھول گئی تھی۔ پھر اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور اس کے فوراً بعد وہ دونوں یہاں سے چلے گئے۔"

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ریزی نے غرانا شروع کر دیا۔ وہ بار بار اس جانب دیکھ رہا تھا جہاں مرسڈیز کھڑی تھی۔

"لگتا ہے کہ ریزی کو ان لوگوں کا آنا اچھا نہیں لگا۔" لیوک نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ ریزی صرف اجنبیوں کو دیکھ کر غراتا ہے۔ کسی کے جانے پر اس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔"

اس کی بات سن کر لیوک سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ورکشاپ کا اچھی طرح جائزہ لیا تو اسے گرائنڈر مشین کے پیچھے ایک چھوٹا سا کاغذ کا تھیلا نظر آیا۔ اس نے کھول کر دیکھا تو اس میں سے ایک آٹومیٹک پستول اور دو پلاسٹک کی تھیلیاں برآمد ہوئیں جن میں سفید پاؤڈر تھا۔ انہیں دیکھتے ہی گبسن چلایا۔ "یہ کیا ہے؟"

"دس سال قید بامشقت۔" لیوک بولا پھر اس نے پستول سے میگزین نکال کر ایک طرف اچھال دیا اور بقیہ چیزوں کو سرامک کی بنی ہوئی ایک پلیٹ پر رکھ دیا پھر اس نے ویلڈنگ ٹارچ روشن کی اور چند لمحوں میں وہ سب چیزیں جل کر خاک ہو گئیں۔ لیوک بولا۔ "یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

"گزشتہ ہفتے جو دو ایجنٹ آئے تھے۔ یہ انہی کے بھیجے ہوئے لگتے ہیں۔"

ابھی اس کی بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ باہر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد ایک پولیس آفیسر اندر داخل ہوا۔ "ہمارے پاس سرچ وارنٹ ہے۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔"

"کیسی تلاشی؟ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے آفیسر!" گبسن بولا۔

"ابھی پتا چل جائے گا۔" اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ "کتے کو اندر لے آؤ۔"

لیوک اسے منع کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی لیڈی پولیس آفیسر ایک السیشن شیفرڈ کے ساتھ اندر چلی آئی۔ وہ کتا سونگھتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا کہ اچانک ہی ریزی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ دونوں کتے ایک دوسرے کو دیکھ کر زور زور سے بھونک رہے تھے۔ لیڈی پولیس آفیسر نے اپنے کتے کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے قابو نہ آیا۔ گبسن نے بھی ریزی کو پکڑنا چاہا جس کے نتیجے میں اس کی کلائی زخمی ہو گئی پھر لارکن اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ گبسن پر چلایا۔ "اپنے کتے کو روکو۔"

پھر اس نے انتظار کیے بغیر ریزی پر گولی چلا دی جو اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ کتا پشت کے بل اچھلا اور درد سے چلانے لگا۔ لیوک سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس

نے لارکن پر چھلانگ لگا دی اور اسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس نے غصے میں آ کر لارکن کے منہ پر ایک گھونسا بھی جڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی مزید پٹائی کرتا۔ دو پولیس والے آئے اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ لارکن بہ مشکل اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور پستول کی نال لیوک کے ماتھے پر رکھ دی۔

"رک جاؤ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" شیرف جیری گیرسن کی آواز گونجی۔ اسے اندر آنے میں دیر ہو گئی تھی لیکن اس آپریشن کا انچارج وہی تھا۔

"آفیسر۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔" وہ خاتون پولیس آفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا پھر اس نے لارکن سے کہا۔ "اگر تم نے دوبارہ اس پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا ہوگا۔"

"فاک نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔" لارکن نے احتجاج کیا۔

"خاموش رہو۔" شیرف غصے سے بولا۔ "یہ میرا علاقہ ہے اور ابھی تک میں نے یہاں کوئی جرم سرزد ہوتے نہیں دیکھا۔ گبسن تم ٹھیک تو ہو؟"

"ٹھیک۔ ان دونوں کتوں میں سے کسی ایک نے مجھے زخمی کر دیا ہے لیکن یہ سب کیا ہو رہا ہے جیری؟"

"ہم ایک سرچ وارنٹ کی تعمیل کر رہے ہیں گبسن۔" جیری نے جواب دیا۔ "اس ایجنٹ کو اطلاع ملی ہے کہ یہاں منشیات اور غیر قانونی اسلحہ موجود ہے۔"

لیڈی پولیس آفیسر اندر آئی تو جیری نے اس سے پوچھا۔ "کچھ ملا؟"

"نہیں البتہ ایک الماری میں کچھ شکاری بندوقیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک آٹومیٹک پستول کا میگزین ہے۔"

"اس کے بارے میں کیا کہو گے فاک۔" گیرسن نے پوچھا۔ "اس کا پستول کہاں ہے؟"

"لارکن سے پوچھو۔" لیوک غرایا۔ "اسی نے یہاں کسی کو بھیجا تھا۔"

"ایک بار پھر تلاشی لو۔" لارکن نے حکم دیا۔ "پستول کو یہیں ہونا چاہیے۔"

"مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔" لیڈی پولیس آفیسر نے کہا۔ "میں نے یہاں جلی ہوئی دھات کا ٹکڑا دیکھا ہے جو ابھی تک گرم ہے۔ لگتا ہے کہ ویلڈنگ ٹارچ کے ذریعے کوئی چیز پگھلائی گئی ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے فاک؟" گیرسن نے پوچھا۔

"میں ہر روز ویلڈنگ ٹارچ استعمال کرتا ہوں اور جب تم لوگ آئے ہو تو اس وقت بھی میں اس سے کام کر رہا تھا۔"

"اس نے یقیناً وہ ہتھیار تباہ کر دیا ہے۔" لارکن جلدی سے بولا۔ "اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ناجائز اسلحہ تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو جب تک کہ تم نے خود اسے یہاں نہ رکھوایا ہو۔" لیوک نے کہا۔

"اب اس پستول کی اہمیت نہیں رہی۔ میں تمہیں ایک آفیسر پر حملہ کرنے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔"

"میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا ایجنٹ لارکن!" شیرف گیرسن نے کہا۔

"اس نے میری ناک توڑ دی ہے۔" لارکن نے شکایتی انداز اختیار کیا۔

"اور تم نے بھی اس کے کتے پر گولی چلائی ہے۔ عدالت تمہیں بھی قصوروار سمجھ سکتی ہے۔ تمہیں غلط اطلاع ملی تھی۔ یہاں کوئی منشیات اور ناجائز اسلحہ نہیں ملا۔ اب میں چلنا چاہتا ہوں۔ گبسن، کیا تم چاہو گے کہ ہم تمہارے کتے کو علاج کے لیے لے جائیں۔"

"نہیں۔ میں خود ہی دیکھ لوں گا۔ یہ کیسا ایجنٹ ہے جس کا نشانہ اتنا خراب ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ تم اپنی زبان بند رکھو بڑے میاں۔" لارکن جھنجلاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

ان کے جانے کے بعد لیوک اس جگہ کی صفائی میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ریزی نے ایک بار پھر غرانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن گبسن نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لیوک نے اپنے دادا کی ونچسٹر رائفل اٹھائی اور دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ دو کاریں صحن میں آ کر رکیں اور ایک کار میں سے تین محافظ باہر آئے جنہوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں لیکن اس بار ڈیکن نے اندر آنے کے بجائے دوسری گاڑی کا دروازہ کھولا اور ایلا شاہانہ انداز میں چلتے ہوئے اندر آ گئی۔ ڈیکن باہر ہی کھڑا رہا۔

ان لوگوں کے چہروں پر نظر پڑتے ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ یہاں تلاشی لینے آئے تھے۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ ہمارے پاس اسلحہ اور منشیات ہے۔"

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔" الینا بولی۔ "مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"تمہارا کام ابھی مکمل نہیں ہوا۔ پھر تم کیوں بھی آگئیں۔ میں نے تو تمہیں نہیں بلایا تھا۔"

"نہیں۔ صورت حال اب تبدیل ہو چکی ہے۔ میرے باپ کو ایک ای میل ملی ہے۔ شاید یہ ایجنٹوں نے بھیجی ہوگی۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ تم فوج سے کس بنیاد پر ڈسچارج ہوئے تھے اور یہ کہ میرے لیے خطرہ بن سکتے ہو۔ اسی لیے انہوں نے میری حفاظت کی پیشکش بھی کی ہے۔"

"وہ میری جنگ تھی الینا اور اب میں اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں۔ میں تم سے اچھے مستقبل کا وعدہ نہیں کرتا لیکن......"

"جو وقت ہم نے ساتھ گزارا وہ ایک سہانا خواب تھا لیکن اب صبح ہو چکی ہے۔ میرے والد کو ڈر ہے کہ انہیں بلیک میل کرنے کے لیے مجھے گرفتار کرلیا جائے گا لہٰذا وہ امریکا میں اپنا کاروبار بند کر رہا ہے اور مجھے دمشق واپس آنے کی ہدایت کی گئی ہے۔"

"ان کی پریشانی بجا ہے۔ یہ دونوں ایجنٹ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

"فی الحال میں شام کے سفارت خانے میں پناہ لوں گی۔ وہ میری روانگی کا بندوبست کر دیں گے۔ دمشق میں ہمارا بہت پیارا گھر ہے۔ بچپن میں وہ گھر مجھے بہت اچھا لگتا تھا لیکن اب......" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ...... کیا تم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گے اور وہاں بھی تم یہی کام کرنا۔ صحرا میں کشتیاں بنانا۔"

"میں صحرا میں اچھا خاصا وقت گزار چکا ہوں الینا اور وہاں سے میری کچھ خوشگوار یادیں وابستہ نہیں ہیں۔ میں دوبارہ وہاں نہیں جاسکتا۔"

"مجھے بھی افسوس ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ اس لیے بہتر ہے میرے ساتھ کشتی کا سودا کر دو اور اگر چاہو تو اس میں سے آدھی رقم عطیہ میں دے دو۔"

"جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تو لیوک کی دادی اس وقت دوسری جماعت کو پڑھایا کرتی تھی۔" ٹیسن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "میں کینیڈا سے آیا تھا۔ اس زمانے میں ہم لڑکے بڑے لاابالی ہوا کرتے تھے۔ لمبے بال، جسم سے چپکی ہوئی قمیص، کمر میں اڑسے ہوئے شکاری چاقو۔ مقامی لوگ ہمیں امریکن نہیں سمجھتے تھے اور ہم سے دور رہتے تھے۔ کیتھرین بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ وہ کئی ہفتوں بعد میرے ساتھ باہر جانے پر تیار ہوئی۔"

الینا کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بے زار ہوتے ہوئے بولی۔ "اب مجھے چلنا چاہیے۔"

"ایک منٹ ٹھہرو۔" لیوک نے کہا اور دادا سے بولا۔ "کہتے رہو ٹیسن۔"

"کیتھرین کے گھر والوں کو ہمارے ملنے پر اعتراض تھا۔ اس زمانے میں غیروں کے ساتھ شادی کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہمیں کوئی بھی ایک کمرا کرایہ پر دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا میں نے یہ زمین خریدی اور اپنے لیے کیبن بنایا۔ بوٹ ہاؤس بعد میں تعمیر ہوا اور سیاحوں کے لیے چھوٹی کشتیاں بنانا شروع کر دیں۔ ہم شمالی امریکا کے قدیم باشندے ہیں لیکن میں بھی تمہاری دادی کو لے کر وہاں نہیں گیا کیونکہ وہاں کے رہنے والے زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں اور آج بھی کم و بیش ان کا یہی حال ہے لیکن میرا پوتا ہونے کی وجہ سے تمہیں وہاں کی شہریت مل جائے گی اور تمہارے پاس کشتیاں بنانے کے کئی بھی آرڈرز ہوں گے۔"

"میں کچھ بھی نہیں۔" الینا بولی۔

"اس جھیل کے اس پار یہ لوگ ایک قوم کی طرح آباد ہیں۔ وہاں امریکی قانون نہیں چلتا اور کینیڈا کی حکومت بھی ان قبیلوں کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ وہ جگہ بہت خوب صورت ہے، یہاں سے زیادہ۔"

"تم اس کاروبار کے لیے مناسب ہو سکتی ہو۔" لیوک نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ بہت چھوٹی ہے۔ میں نیا پلانٹ لگانا چاہتا ہوں لیکن مجھے کاروبار کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ایک ایسے پارٹنر کی ضرورت ہے جو مارکیٹنگ کا تجربہ رکھتا ہو اور جسے کشتیوں کی پہچان ہو۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو؟"

"اگر میں چاہوں بھی تو کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے لیے اس ملک سے باہر جانا اتنا آسان نہیں۔"

"سرحد کی لکیر کا وجود صرف نقشے پر ہے جو جھیل کے وسط سے گزرتی ہے۔"

"لیکن سیٹلائٹ سے تو لوگوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔"

"مکیناک ریگاٹا کی ریس کل سے شروع ہونے والی ہے جس میں سیکڑوں کشتیاں حصہ لیتی ہیں اور کئی کشتیوں میں

اس ریس کو دیکھنے والے اور جج بھی موجود ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پچاس میل کی بلندی پر آسمان سے ساری کشتیاں ایک جیسی نظر آتی ہوں گی۔"

"میں پہلے ہی تم لوگوں کے لیے کافی مشکلات کھڑی کر چکی ہوں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"یہ محض تمہارا خیال ہے۔ اس سے زیادہ آسان اور محفوظ راستہ کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"میں کہنے والی تھی کہ یہ ممکن نہیں ہے لیکن شاید تمہارے اور کیتھرین کے لیے اس سے بھی زیادہ مشکل حالات رہے ہوں گے لہٰذا محض کیبن کی خاطر تم کشتیوں کی دوڑ کے بارے میں مزید کچھ بتانا پسند کرو گے۔"

☆☆☆

ریڈلے بار میں بیٹھا ہوا تھا کہ لارکن سامنے کے دروازے سے اندر داخل ہوا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ریڈلے کے برابر والے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس کی ناک پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ریڈلے کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ کئی راتوں سے نہیں سویا۔ لارکن نے اپنے لیے ایک ڈبل اسکاچ کا آرڈر دیا اور آہستہ سے بولا۔ "شیرف کیرمن نے کچھ معلومات فراہم کیں؟"

"اس نے ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ بھیج دی ہے اور اب ہمیں سوموار کی صبح پیش ہو کر اس کارروائی کی وضاحت کرنی ہے جو تم نے گزشتہ روز کی تھی۔ تم پر جعلی ثبوت ظاہر کرنے اور بلا جواز گولی چلانے کا الزام ہے۔ ہم بہت مشکل میں پھنس گئے ہیں کوڈی!"

"گھبرانے کی کیوں ہو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ ایک شیرف کے مقابلے میں فیڈرل ایجنٹ کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔"

"مسئلہ یہ نہیں ہے۔ کیرمن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس نے تمہارے اس دعوے کی بنیاد پر چھاپہ مارا تھا کیونکہ تمہیں اپنی اطلاع کے مصدقہ ہونے کا یقین تھا۔"

"میں اب بھی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ منشیات وہاں رکھی گئی تھیں لیکن اس لیوک کے بچے کو اس کی بھنک پڑ گئی اور اس نے انہیں ضائع کر دیا۔"

"تم سے یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ یہ اطلاع کہاں سے ملی تھی۔"

"یہ خفیہ معاملہ ہے اور قومی سلامتی کے تحت اسے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔"

"افسرانِ بالا سے کوئی بات نہیں چھپائی جاسکتی۔ تمہیں

رہنمائی

ریفری کتنا ہی ایماندار اور دیانتدار کیوں نہ ہو مگر عموماً تماشائی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ جانبداری سے کام لے رہا ہے۔ ہاکی کے ایک میچ کے وقفے کے دوران ملک کے مشہور ریفری "تاج محمد" سے ایک تماشائی نے پوچھا کہ "جناب! آپ نے ابھی تک کتے کا انتظام نہیں کیا۔؟"

"کتے کا انتظام؟"

"جی ہاں! سنتا ہے، اب تو پاکستان کے اندھے بھی اپنی رہنمائی کے لیے کتوں کا انتظام کرنے لگے ہیں۔" تماشائی نے جواب دیا۔

ان لوگوں کے نام بتانا ہوں گے اور مجھے شبہ ہے کہ تمہارے دوست اور اس کی گرل فرینڈ کو بھی پوچھ گچھ کے لیے بلایا جائے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم لوگوں کو بھی جیل کا منہ دیکھنا نہ پڑ جائے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" لارکن نے آہستہ سے کہا۔ "میرے انکل......"

"اس معاملے میں وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔" ریڈلے نے اپنا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ فاک کی وجہ سے ہوا ہے۔" لارکن بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ ملک کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔"

"تم یہی جملہ اوپر والوں کے سامنے کہہ سکتے ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔"

"اگر ہم کسی طرح مس مارکوک تک پہنچ جائیں تو ہیڈ کوارٹر سب کچھ بھول جائے گا۔" لارکن نے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہوگا۔" ریڈلے نے کہا۔ "ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ فاک اس کے بارے میں جانتا ہے۔" لارکن اپنی ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر ہم اس کے ساتھ سختی کریں تو وہ سب کچھ بتا دے گا۔''
''او میرے خدا!'' ریڈلے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو۔ ہم اس پر کسی معقول وجہ کے بغیر ہاتھ نہیں ڈال سکتے اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی وارنٹ ہے۔''
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' لارکن اپنا گلاس ختم کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے، چلو۔''
وہ دونوں لیوک کی ورکشاپ پہنچے تو ان کا سامنا بوڑھے گسن سے ہوا۔ لارکن نے اسے دیکھ کر فوراً سے پوچھا۔
''فاک کہاں ہے؟''
''مجھے نہیں معلوم۔'' گسن نے جواب دیا۔
دور بیٹھے ہوئے ریڈی نے انہیں دیکھ کر غرانا شروع کر دیا۔ لارکن نے اپنا آٹومیٹک پستول نکالا اور بولا۔
''فاک کا پتا دو ورنہ میں اس کتے کو شوٹ کر دوں گا۔''
''لیوک کینیڈا میں ہے اور وہ عورت بھی اس کے ساتھ ہی ہے۔''
''کینیڈا میں کس جگہ؟''
''جہاں تم نہیں پہنچ سکتے۔ اونٹاریو میں کری قبیلے کے ساتھ۔ وہ وہاں بالکل محفوظ ہیں۔''
''میرا خیال ہے کہ اس کے لیے ہمیں حکومتی سطح پر مدد لینا پڑے گی۔'' لارکن نے اسے ڈرانا چاہا۔
''کوشش کر کے دیکھ لو۔'' گسن بولا اور اپنی جیب سے سیل فون نکال کر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔
''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' ریڈلے نے پوچھا۔
''مائن ایلین کو فون کر رہا ہوں کہ دو چور بندوقوں سمیت یہاں چلے آئے ہیں۔''
''بھاڑ میں جاؤ تم۔'' لارکن نے اس کے ہاتھ سے فون چھین کر زمین پر پھینک دیا۔
''ٹھیک ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔'' ریڈلے بولا۔ ''زحمت کے لیے معذرت چاہوں گا۔''
''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' لارکن بولا۔
''ہمیں آنے میں دیر ہو گئی۔ وہ جا چکے ہیں، ہمیں بھی چلنا چاہیے۔ اسے تم میرا حکم سمجھو۔''

☆☆☆

''تم تلاشی لیے بغیر کیوں چلے آئے؟'' لارکن نے واپسی کے سفر کے دوران پوچھا۔ ''فاک وہیں کہیں چھپا ہوگا۔ وہ کہیں نہیں جا سکتا۔''
''وہ چھپنے والا شخص نہیں ہے۔'' ریڈلے نے جواب دیا۔ ''اسی لیے میں نے بوڑھے کی بات پر یقین کر لیا ہے۔''
''ممکن ہے کہ وہ جا چکے ہوں۔'' لارکن جھلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ابھی انہوں نے سرحد پار نہیں کی ہوگی۔ ہم بارڈر پولیس سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان دونوں کو گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دے۔''
''ہمیں اس کا اختیار نہیں ہے۔ ہم پہلے ہی بہت دور تک جا چکے ہیں۔''
لارکن نے گاڑی چلاتے ہوئے جھیل کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''
تقریباً پچاس کے قریب کشتیاں ساحل کے قریب جمع ہو رہی تھیں۔ ریڈلے نے کہا۔ ''مسکیا تک ریگاٹا کی تیاری ہو رہی ہے۔ یہ کشتیوں کی سب سے بڑی دوڑ کہلاتی ہے۔''
لارکن نے بریک پر پاؤں رکھے اور گاڑی سڑک کے کنارے پر روک لی۔ ''اس عورت کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ اس لیے وہ عام راستے سے سرحد پار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ یقیناً وہ بھی اپنی کشتی سمیت اس ریس میں شامل ہوگی اور کینیڈا کی حدود میں پہنچ کر غائب ہو جائے گی۔ ہم اب بھی انہیں پکڑ سکتے ہیں۔''
''تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ ہم دوسرے ملک میں جا کر کچھ نہیں کر سکتے۔''
''سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لیے کوئی بھی اختیار استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' لارکن نے اپنے پستول پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بوٹ ہاؤس میں ایک موٹر لانچ دیکھی تھی۔ ہم اسی کے ذریعے ان کا تعاقب کریں گے اور انہیں پکڑ لیں گے۔''
''کس الزام میں؟'' ریڈلے نے پوچھا۔
''انہوں نے سرکاری افسر پر حملہ کیا تھا۔'' لارکن نے گاڑی اسٹارٹ کی اور یوٹرن لیتے ہوئے بولا۔ ''وہ پہلے بھی دوسرے لوگوں کی موجودگی پر حملہ کر چکا ہے اور مس مارووک کو بچانے کے لیے ایسی ہی کوشش دوبارہ کرے گا اور یہی اس کی آخری غلطی ہوگی۔''
ریڈلے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لارکن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس عورت کو پکڑنے کا یہ آخری موقع ہے۔ ویسے بھی ان کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں تھا۔
لارکن کو بوڑھے گسن کی طرف سے مزاحمت کی توقع تھی لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ کتے نے انہیں دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ زخمی ہونے کی وجہ سے چلنے کے قابل نہ تھا۔ اس لیے وہ دونوں اس کے پاس سے گزرتے ہوئے موٹر لانچ تک پہنچ گئے۔ لارکن نے اسٹیرنگ سنبھالا اور دوربین ریڈلے کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ''ان پر نظر رکھو۔ وہ انہی کشتیوں کے درمیان کہیں ہوں گے۔''
ریڈلے کو وہ سب کشتیاں ایک جیسی نظر آئیں۔ لارکن نے لانچ کی رفتار بڑھائی اور کشتیوں کا گھیرا توڑتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کی یہ حرکت دوسرے لوگوں کو پسند نہیں آئی اور وہ مکے لہرا لہرا کر چلانے لگے۔ بالآخر وہ کشتی انہیں نظر آ ہی گئی۔ ریڈلے اسے دیکھتے ہی چلایا۔ ''وہ رہی۔''
لارکن اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر چلایا۔ ''رک جاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔''
لیوک نے تیزی سے پتوار چلانا شروع کر دیے لیکن لارکن کے نشانے کی زد سے باہر نہ نکل سکا۔ لارکن نے موقع سے فائدہ اٹھا کر فائر کھول دیا۔ لہروں کے مدوجزر کی وجہ سے اسے اپنا توازن قائم رکھنے میں دشواری ہو رہی تھی اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی گولی نشانے پر لگ جائے۔ دوڑ میں حصہ لینے والے دوسرے لوگ اس منظر سے گھبرا گئے اور انہوں نے مارے خوف کے چلانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی کشتیوں کو فائرنگ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔
لارکن نے دونوں ہاتھوں سے پستول تھام لیا اور فاک پر نظریں جما دیں۔ اس کی انگلیاں ٹریگر پر تھیں کہ اچانک ہی اس کے دائیں کان کے اوپر سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ لارکن بری طرح لڑکھڑایا۔ اس کا توازن برقرار نہ رہ سکا اور وہ پانی میں جا گرا۔ ریڈلے نے فوراً ہی لیوک اور ایلنا کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں خیر سے تھے۔ پھر اس نے دوسری کشتیوں پر نگاہ دوڑائی لیکن وہ سب کافی فاصلے پر تھیں اور ان کی لانچ سے بتدریج دور ہوتی جا رہی تھیں۔ ریڈلے کے لیے فوری طور پر اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ لارکن کس کی گولی کا نشانہ بنا۔ اس نے بے بسی کے عالم میں اپنے ساتھی کو دیکھا جو آہستہ آہستہ جھیل کے گہرے پانی میں ڈوب رہا تھا۔ پتھر کی طرح بے جان اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں تھے۔
ریڈلے نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور لانچ کو گھما کر اس جگہ لے آیا جہاں لارکن ڈوبا تھا۔ تقریباً ایک درجن کشتی راں اس کے قریب آ گئے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ کوئی شخص نشے کی حالت میں جھیل میں گر گیا ہے۔
وہ انتظار کرتے رہے کہ شاید ڈوبنے والا سطح آب پر آ جائے لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ لارکن تیزی سے نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ ایک کشتی راں نے مائن ایلین کو فون کر دیا لیکن پولیس بوٹ اور غوطہ خوروں کو آنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ اس دوران کسی کی نظر اس کشتی پر نہ گئی جو بڑے سکون سے مشرقی ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی۔
''میں سمجھی نہیں کہ فائرنگ کیوں رک گئی اور اس لانچ کے گرد کشتیاں کیوں جمع ہو رہی تھیں؟'' ایلنا نے کہا۔
''کسی نے ہماری جان بچائی ہے۔'' لیوک بولا۔ ''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ فائر کم از کم اٹھارہ سو گز کے فاصلے سے کیا گیا ہوگا۔''
''لیکن وہ کون ہو سکتا ہے۔ ڈیکن کو تو میں نے واپس بھیج دیا تھا۔''
''پھر وہ کوئی اور ہوگا۔ دادا نے مجھے سب کچھ سکھایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ گولی کس طرح چلائی جاتی ہے۔ اسے چھپ کر فائر کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ اس نے کوریا میں سلور اسٹار حاصل کیا تھا۔''
''ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ کہیں وہ اسے گرفتار نہ کر لیں۔''
''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' لیوک نے کہا۔ ''کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ لارکن کو اتنے طویل فاصلے سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ دادا نے ہمارے لیے دروازہ کھول دیا ہے۔ ہمیں اس سے گزر جانا چاہیے۔''

☆☆☆

بوٹ ہاؤس میں آنے کے بعد گسن نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی قدیم اسپرنگ فیلڈ رائفل کو لیوک کی ویلڈنگ ٹارچ کی مدد سے راکھ میں تبدیل کر دیا گو کہ ایسی نایاب رائفل کو ضائع کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔ آج کل پولیس کے پاس تفتیش کے جدید ذرائع موجود ہیں اور وہ کسی بھی طرح اس ہتھیار تک پہنچ سکتی تھی۔ ویسے تو کسی کے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اس نے اٹھارہ سو گز کے فاصلے سے لارکن کو نشانہ بنایا ہوگا لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی مہارت بھی دھوکا نہیں دے گی۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ لیوک اور ایلنا محفوظ مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ اب اگر قانون کے ہاتھ اس تک پہنچ بھی گئے تو پروا نہیں۔ تکلیف کا یہ وقفہ بہت عارضی ہوگا اور وہ بہت جلد اس دنیا میں پہنچ جائے گا جہاں کیتھرین اور اس کا دوست اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لمحے اسے لارکن سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ کاش وہ جان سکتا کہ بوڑھے شیر کو چھیڑنا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک معصوم صورت حسینہ کا خباثت بھرا احوال

مرزا امجد بیگ

سینہ زوری

ہر چور اپنی سمجھ کے مطابق "چوری اور... سینہ زوری" ساتھ لے کر چلتا ہے اور اس خوش فہمی میں زندہ رہتا ہے کہ اپنی حکمت عملی کے بل پر ہر بار وہ بازی مات کر دے گا مگر... جب کوا ہنس کی چال چلتا ہے تو لاشعوری طور پر لنگڑاتا ضرور ہے... ایسے ہی ایک مقام پر جب مرزا امجد بیگ نے بھی اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ محسوس کر کے چور کو اس کے گھر تک پہنچایا... تو بہت سی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

وہ ماہ اگست کے ابتدائی ایام تھے۔ موسم برسات... شدید گرمی اور حبس کا تھا، بار بار رُت جاری تھی۔ کراچی میں جولائی اور اگست کے مہینے بھی اسی طور گزرا کرتے تھے۔ کراچی کے باسی ان تکالیف کے عادی ہو چکے ہیں۔

ایسی ہی ایک شام میں اپنے دفتر میں بیٹھا کاروبار حیات کو چلا رہا تھا۔ انسان کا پیشہ کوئی بھی ہو، وہ کسی بھی ذریعے سے روزگار کرتا ہو...... یہ سب کوشش وہ زندہ رہنے کے لیے کرتا ہے۔ "جان ہے تو جہان ہے" کے مصداق وہ خود کو زندہ سلامت رکھنے کے لیے پیسا کماتا ہے کیونکہ انسان کا کوئی بھی کام پیسے کے بغیر ہوتا نہیں، سو میں بھی اس وقت اپنی روزی روٹی سے لگا ہوا تھا...... حالانکہ برسات نے اس میں اچھا خاصا خلل ڈال دیا تھا۔

آخر کام کا بوجھ ہوا تو میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔ اس لائن پر عموماً میری سیکریٹری لیڈی ہی مجھ سے بات کیا کرتی تھی۔ اگلے ہی لمحے فہمیدہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"بیگ صاحب! کوئی مشتاق صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مشتاق صاحب کون؟" میں نے پوچھا۔

"ایک کلائنٹ ہیں۔" سیکریٹری نے بتایا۔ "اپنے کسی کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

میں پچھلے ایک گھنٹے سے اپنے چیمبر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے فارغ بیٹھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کلائنٹس میرے آفس کا راستہ بھول گئے ہوں۔ اللہ کا شکر ہے، اس سلسلے میں بھی مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں رہی، ورنہ اللہ معاف کرے اور جھوٹ نہ بلوائے کہ بعض ایسے وکیلوں کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں جو فاقوں کی بغل میں دبائے، عدالت کی راہداریوں اور احاطے میں جوتے چٹخاتے پھرتے ہیں۔

"ٹھیک ہے......" میں نے اپنی سیکریٹری سے کہا۔ "مشتاق صاحب کو میرے پاس بھیج دیں۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد مشتاق نامی وہ شخص میرے سامنے موجود تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

"ر...... آپ......؟"

"اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔ "لیکن میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ ان کا تو کوئی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا......"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے مشتاق کو دیکھ کر جس شخصیت کا تصور کیا تھا، چند سال پہلے وہ اس دارفانی سے کوچ کر گیا تھا۔ میرا اشارہ پاکستان کے ایک سابق فوجی صدر کی طرف ہے۔ مشتاق ہو بہو وہی دکھائی دیتا تھا۔ بس قد میں وہ مذکورہ صدر سے دو تین انچ کم تھا لیکن صورت شکل میں ایسی گہری مشابہت تھی کہ میری نظر دھوکا کھا گئی تھی۔

بہر حال، حقیقت حال واضح ہونے کے بعد میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔ مشتاق کو دیکھتے ہی میں بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مشتاق صاحب! اتنی زیادہ مشابہت ..... خدا کی قدرت ہے ..... !''

''ہاں جناب! یہ خدا کی قدرت ہی ہے کہ وہ .....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کہ وہ دو انسانوں کو ایک جیسی شکلیں دے کر پیدا کرتا ہے لیکن نصیب اپنے مختلف بناتا ہے کہ ایک تو آرمی چیف کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد ملک کا سربراہ بھی بن جاتا ہے اور دوسرا .....'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر دل شکستہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اور دوسرا اللہ کی قدرت سے ٹیلر ماسٹر بن جاتا ہے ..... !''

''مشتاق صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ کوئی ٹیلرنگ شاپ چلاتے ہیں؟''

''جی ہاں، اپنے مقدر میں یہی لکھا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ادھر گارڈن ویسٹ میں میری ٹیلرنگ شاپ ہے۔''

''انسان کو اپنے مقدر پر صابر و شاکر رہنا چاہیے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ جس کو جو بنا دے، وہی اس کا نصیب ہے .....''

''ہاں .....'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''شاید اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں!''

میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔ ''جی مشتاق صاحب! فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں ایک معاملے میں آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کس معاملے میں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''بیگ صاحب!'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''میرے ایک کاریگر کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں آپ کی خدمات حاصل کر کے امین کو اس مصیبت سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔''

''امین غالباً آپ کے اس کاریگر کا نام ہے جسے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے؟''

''جی ہاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میری شاپ میں دو کاریگر کام کرتے ہیں۔ امین اور حسین۔ میں صرف کٹنگ اور فٹنگ کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے رائٹنگ پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''مشتاق صاحب! آپ کے کاریگر امین کو پولیس نے کس چکر میں گرفتار کیا ہے، میرا مطلب کیا الزام عائد کیا ہے؟''

''پولیس نے امین کو حدود آرڈی نینس کے تحت گرفتار کیا ہے ..... !''

''کیا ..... !'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور مشتاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفساری انداز میں کہا۔ ''تفصیلات کیا ہیں؟''

مشتاق نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بتانے لگا۔ ''امین کی رہائش گارڈن ویسٹ ہی کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ ''خدیجہ پرائڈ'' میں ہے۔ اس کے ماں باپ کا ایک حادثے میں چند سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور اس وقت وہ اپنی دادی زہرہ کے ساتھ ایک کمرے کے ڈربہ نما فلیٹ میں رہائش پذیر ہے۔ زہرہ ایک کرخت، عمر رسیدہ عورت ہے جو لگ بھگ اپنی زندگی کی اسی بہاریں دیکھ چکی ہے۔ اس کی زندگی کا پہلا اور آخری سہارا اس کا یہی پوتا امین ہی ہے۔ امین کا بھی زہرہ کے سوا اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔ یہ ڈربہ نما فلیٹ ان کی ذاتی ملکیت ہے۔ امین اتنا کما لیتا ہے کہ ان دادی پوتے کا با آسانی گزارہ ہو جاتا تھا۔ میں نے .....''

''ایک منٹ مشتاق صاحب!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ''آپ مجھے حدود آرڈی نینس کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے .....؟''

''جی، میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن یہ تفصیل بھی ضروری تھی۔''

''ٹھیک ہے .....'' میں ایک مرتبہ پھر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

وہ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''امین ''خدیجہ پرائڈ'' کے فلیٹ نمبر چار سو دو میں اپنی دادی

کے ساتھ رہتا ہے جبکہ وہ عورت فلیٹ نمبر چار سو ایک میں رہائش پذیر ہے جس نے امین پر یہ گھناؤنا الزام لگایا ہے۔ وہ کرائے دار ہے۔ اس عورت کا نام نوری ہے .....''

''کیا نوری نامی یہ عورت شادی شدہ ہے؟'' میں نے معلومات کی غرض سے سوال کیا۔

''جی ہاں ..... ابھی چند ماہ پہلے ہی اس نے ایک بندے سے شادی کی ہے۔'' مشتاق نے جواب دیا۔ ''مجھے اس عورت کا چال چلن ٹھیک نہیں لگتا جناب!''

''اور امین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''آپ اس کے کردار کے بارے میں پوچھ رہے ہیں .....؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بتانے لگا۔

''اگر مجھے امین کے چال چلن پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں اس کی حمایت میں ایک قدم بھی نہ اٹھاتا۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں اگر چل کر آپ کے پاس آیا ہوں تو اس کا کوئی تو سبب ہو گا .....؟''

''آپ کی اس مخلصانہ اور ہمدردانہ آمد کا یہی سبب ہو سکتا ہے کہ .....'' میں نے کہا۔ ''آپ کو اپنے کاریگر کے کردار اور چال چلن پر بڑا اعتماد ہے۔''

''بالکل یہی بات ہے جناب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''امین میرے پاس لگ بھگ دس سال سے کام کر رہا ہے۔ کسی بھی شخص کو پرکھنے اور آزمانے کے لیے یہ ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ میں امین کی زندگی کے ایک ایک گوشے سے واقف ہوں۔ وہ اس قسم کی گری ہوئی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ اپنے کاریگر امین کو بے گناہ سمجھتے ہیں؟''

''مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ایسا قبیح قدم نہیں اٹھا سکتا۔'' وہ پُرخلوص لہجے میں بولا۔ ''اس مکار نوری نے کسی گہری سازش کے تحت امین کو پھنسانے کی کوشش کی ہے۔''

''اگر ضرورت پڑی تو .....'' میں نے مشتاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ عدالت میں کھڑے ہو کر امین کے نیک چال چلن کی گواہی دیں گے؟''

''اگر ایسا کوئی موقع آیا تو میں آپ کو سب سے آگے کھڑا نظر آؤں گا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''بیگ صاحب! اگر مجھے امین کی بے گناہی کا یقین نہ ہوتا تو میں اس وقت آپ کے پاس نہ بیٹھا ہوتا۔ میں ان حالات میں امین کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی ضعیف العمر دادی تو بہ مشکل فلیٹ کے اندر چلنے پھرنے کے قابل ہے۔ وہ پوتے کے کیس کے سلسلے میں گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی۔ امین کا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ نے اگر مجھے امین کا وسیلہ بنایا ہے تو میں ہر طرح سے اس کی مدد کروں گا حتیٰ کہ میں آپ کی فیس بھی اپنی جیب سے ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ بھی جو عدالتی اخراجات ہوں گے، میں وہ بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کو تیار ہوں۔''

''میں آپ کے ان گرانقدر جذبات اور خلوص نیت کا دل سے احترام کرتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس نیکی اور قربانی کا اجر آپ کو اللہ ہی دے گا۔''

''جناب! میں تو جو کچھ بھی کر رہا ہوں، اپنا فرض سمجھ کر کر رہا ہوں۔''

''یہ آپ کا بڑاپن ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے پوچھا۔ ''تو میں مطمئن رہوں کہ آپ نے امین کا کیس لے لیا ہے؟''

''کیس تو میں نے لے لیا ہے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''لیکن اگر مجھے کسی بھی موقع پر یہ احساس ہوا کہ آپ نے یا امین نے مجھے کسی [illegible] ہے یا کسی نوعیت کی غلط بیانی سے کام لیا ہے تو میں اسی لمحے کیس چھوڑ دوں گا۔''

''یہ آپ کا حق ہے۔'' وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے ان شاء اللہ ..... ایسا موقع کبھی نہیں آئے گا۔''

''یہ ہم دونوں کے لیے اچھا ہو گا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اور امین کے لیے بھی .....''

''جی ..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''مشتاق صاحب! آپ کے کاریگر امین کو جس جرم کے تحت گرفتار کیا گیا ہے اس کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم بڑا واضح اور اٹل ہے۔ کیا آپ احکام خداوندی سے پوری طرح آگاہ ہیں .....؟''

''نہیں جناب .....!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ پلیز ..... آپ میری راہنمائی کریں۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''اس فعل کے سلسلے میں احکام خداوندی ہیں کہ ..... ''بدکار (زانیہ) عورت اور بدکار (زانی) مرد میں سے ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک کو سو کوڑے (کوڑے) مارو اور تمہیں اللہ کے معاملے میں ان پر ترس نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کے ایک گروہ (جماعت) کو حاضر رہنا چاہیے۔ بدکار (زانی) مرد سوائے بدکار (زانیہ) عورت یا مشرکہ کے نکاح نہیں کرے گا اور بدکار (زانیہ) عورت سے بھی کوئی نکاح نہیں کرے گا سوائے بدکار (زانی) مرد یا مشرک کے اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اسی (80) درے (کوڑے) مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور وہی لوگ نافرمان ہیں۔''

میں نے محتاط توقف کرکے ایک گہری سانس لی۔ مشتاق بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے کہ...

''اگر ایک کنواری عورت ایک کنوارے مرد سے زنا کرے تو ان دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر ایک شادی شدہ عورت ایک شادی شدہ مرد سے زنا کرے تو ان دونوں کو سنگسار کیا جائے۔''

میری بات ختم ہوئی تو مشتاق نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ احکام تو بڑے واضح اور دوٹوک ہیں۔ کیا ہماری عدالتوں میں ایسے قوانین موجود ہیں جو ان احکام خداوندی پر عمل درآمد بھی کراتے ہوں؟''

''جہاں تک احکام خداوندی اور فرامین رسول کا تعلق ہے تو وہ اسی طرح ہیں جیسا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کیے تھے۔ ان میں ایک نقطے کی اونچ نیچ یا معمولی سا بھی ترمیم و اضافہ ممکن نہیں اور جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو...'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک افسردہ سانس خارج کی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''قانون کی کتابوں میں حدود آرڈیننس کے باب میں یہ تمام احکامات مختلف دفعات کی تشریح کے ذیل میں موجود ہیں اور وہاں باقاعدہ قرآنی آیات کو نقل بھی کیا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث مبارکہ کا باقاعدہ حوالوں کے ساتھ تذکرہ بھی دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے اور جہاں تک کوڑوں اور سنگساری وغیرہ کی سزا پر عمل درآمد کا سوال ہے تو یہ کام خاصا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے اس جرم کو ثابت کرنے کے لیے جو کڑی شرائط رکھی ہیں، اکثر اوقات انہیں پورا کرنا دشوار ہوتا ہے۔''

''وہ کون سی شرائط ہیں بیگ صاحب؟'' مشتاق نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ ''استغاثہ کو جرم ثابت کرنے کے لیے عدالت میں چار عینی شاہدین پیش کرنا پڑتے ہیں۔''

''عینی شاہدین....!'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''یعنی چار ایسے افراد جنہوں نے وہ جرم ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو؟''

''جی ہاں....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آئی وٹنس یا عینی شاہد کا یہی مطلب ہے کہ ایسا گواہ جس نے واردات اپنی آنکھوں سے وہ جرم ہوتے دیکھا ہو۔''

''پھر تو بڑی مشکل ہے۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ''ایسے چار گواہ کہاں سے لانا تو ناممکن ہی نظر آتا ہے۔''

''صرف چار عینی شاہدین ہی کی شرط نہیں ہے۔'' میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''ان گواہوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہوں، متقی اور پرہیزگار ہوں، باکردار ہوں اور صادق القول ہوں۔''

''اوہ....!'' وہ ایک بوجھل اور مایوسی بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

میں نے تسلی بھرے اور امید افزا لہجے میں کہا۔ ''مشتاق صاحب! اگر انسان ایمانداری، خلوص نیت اور پوری دیانت سے کام لے تو احکام خداوندی اور فرامین رسول کی پیروی بہت سہل ہو جاتی ہے لیکن بڑے دکھ اور شرم کی بات ہے کہ ہم میں سے اکثریت کے دل ودماغ سے ایمان، دیانت اور خلوص اٹھ گیا ہے اور.... یہی ہماری پستی اور بدحالی کا سبب ہے۔''

چند لمحات کی خاموشی کے بعد میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''مشتاق صاحب! آپ امین، نوری اور اس معاملے کے بارے میں جو کچھ بھی جانتے ہیں، پوری تفصیل سے مجھے بتا دیں تاکہ آئندہ کا لائحہ عمل بنانے کے لیے میں ذہنی طور پر تیار اور اپ ڈیٹ ہو جاؤں۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ میں آپ کو بھی بتا دیتا ہوں۔''

آئندہ بیس پچیس منٹ میں مشتاق نے مجھے بہت سی کارآمد باتوں سے آگاہ کیا۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے کہا۔ ''میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ میری درخواست ہے کہ آپ امین سے بھی ایک بھرپور ملاقات کرلیں۔ وہ آپ کو مزید اہم باتیں بتا سکتا ہے۔''

''وہ اس وقت کون سے تھانے کی حوالات میں بند ہے؟'' میں نے پوچھا۔

مشتاق نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتادیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ تھانے جاکر امین سے ملاقات کرچکے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سے ملنے دو مرتبہ وہاں جاچکا ہوں۔''

میں نے ایک اہم سوال کیا۔ ''پولیس اس کیس کا چالان کب پیش کررہی ہے؟''

''پولیس نے امین کو عدالت میں پیش کرکے دس دن کا ریمانڈ لیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''جس میں سے تین دن گزر چکے ہیں، سات روز باقی ہیں۔''

''پھر تو اچھا خاصا وقت ہے ہمارے پاس۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ ''میں ایک آدھ روز میں تھانے جاکر امین سے مل لوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!'' وہ تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب آپ جلد فرصت میں اپنی فیس وصول کرلیں تاکہ مجھے بھی اطمینان رہے کہ آپ نے اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس پر باقاعدہ کام شروع کردیا ہے۔''

میں نے اپنی فیس وصول کی۔ اس وصولی کی رسید اس کے حوالے کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مشتاق صاحب! ایک تو آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں۔ میں ضرورت پڑنے پر آپ سے رابطہ کرلوں گا۔ آپ دو تین دن بعد فرصت سے میرے دفتر کا ایک چکر لگائیے گا۔ میں چاہتا ہوں، عدالت میں جانے سے پہلے ہم ایک بھرپور ملاقات کرلیں۔''

''ضرور....!'' اس نے تعاون آمیز انداز میں گردن ہلائی پھر اپنی جیب میں سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس پر میری شاپ اور رہائش دونوں کے نمبر درج ہیں۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وزیٹنگ کارڈ رکھ لیا پھر کہا۔ ''مشتاق صاحب! اس کیس میں آپ کو پوری طرح مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔''

''آپ جو بھی حکم کریں، میں تیار ہوں۔''

''حکم وقت آنے پر آپ کو بتا دوں گا اور ضرور کروں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''فی الحال اتنا سمجھ لیں کہ عدالت کے اندر اور عدالت کے باہر آپ کو بہت سے کام کرنا ہوں گے۔''

''کس طرح کے کام؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''مجھے امین کو بےگناہ اور بےقصور ثابت کرنے کے لیے بہت سی مختلف نوعیت کی معلومات اور شواہد درکار ہوں گے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سلسلے میں آپ کو کال کرتا رہوں گا۔ آپ دوڑ دھوپ سے میری مطلوبہ معلومات فراہم کریں گے۔''

''ڈن!'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''جس حد تک بھی ممکن ہوا اور جو کچھ میرے اختیار میں ہوا، میں امین کی باعزت رہائی کے لیے ضرور کروں گا۔''

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''میں پہلے تھانے جاکر امین سے ایک تفصیلی ملاقات کرلوں، پھر آپ کو زحمت دوں گا۔''

''میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

''مشتاق صاحب! یہ انتظار طول نہیں پکڑنا چاہیے۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''یہ نہ ہو کہ آپ میرے فون کے انتظار میں بیٹھے رہ جائیں۔ آپ کو ہر دو تین دن کے بعد مجھ سے ملاقات کرتے رہنا ہے یا کم از کم فون پر رابطہ کرنا ہے۔''

''جی میں سمجھ گیا....'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بڑی اچھی طرح سمجھ گیا۔''

اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ گیا ہو تو پھر کسی بھی حوالے سے اس پر مزید دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے لہٰذا میں نے اس سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ میرے انداز سے سمجھ گیا کہ ملاقات کا وقت ختم ہوچکا۔

''ٹھیک ہے بیگ صاحب!'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''اب مجھے اجازت دیں۔'' میں نے گرم جوش مصافحے کے بعد اسے رخصت کردیا۔

☆☆☆

آئندہ روز عدالت میں بہت زیادہ مصروفیت رہی لہٰذا میں امین سے ملاقات کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ اس سے اگلے روز مجھے یہ موقع مل گیا اور لنچ کے بعد میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا اور تھانہ انچارج موجود نہیں تھا۔ میں نے ڈیوٹی آفیسر سے حوالاتی سے ملنے کی اجازت چاہی تو اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جناب آپ کون ہیں اور کس حوالاتی سے ملاقات کرنے آئے ہیں؟''

میں اپنا کوٹ وغیرہ گاڑی ہی میں چھوڑ آیا تھا اور میرے گیٹ اپ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ میں کوئی وکیل ہوں۔ میں نے اپنے پروفیشن کا ذکر گول کرتے ہوئے کہا۔

''میں امین نامی ایک نوجوان حوالاتی سے ملنے آیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔"

"اچھا وہ......" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "جو صدر ایرانی بزنس کے کیس میں دھرا ہوا پڑا ہے۔"

"جی جی......" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "میں اسی امین کی بات کر رہا ہوں۔"

"لیکن جناب...... وہ تو بڑا خطرناک مجرم ہے۔" وہ دکھائی سے بولا۔ "انچارج صاحب نے سختی سے اس کی ملاقات سے منع کر رکھا ہے۔"

"آپ مجھے انچارج صاحب سے ملوا دیں۔" میں نے ڈیوٹی آفیسر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں فوراً ان سے بات کر لیتا ہوں۔"

یہ دراصل میں نے اس لیے کہا تھا کہ مجھے معلوم تھا، انچارج موجود نہیں۔ اگر ڈیوٹی آفیسر کو یہ پتا چل جاتا کہ میں حوالاتی کا وکیل ہوں تو وہ انچارج کی غیر موجودگی میں مجھے ہرگز ہرگز حوالات میں بند امین سے ملاقات کی اجازت نہ دیتا۔ وہ بدستور روکھے لہجے میں بولا۔

"انچارج صاحب تو کسی ضروری کام سے گئے ہوئے ہیں۔ ایسا کریں، آپ رات میں آجائیں۔"

اس نے بڑے واضح انداز میں مجھے ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں ٹلنے کے لیے وہاں نہیں پہنچا تھا۔ "رات کو تو میں دبئی میں بیٹھا ہوں گا جناب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج رات میری فلائٹ ہے۔"

ڈیوٹی آفیسر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی جیسے مرغی کو دیکھ کر بلا خوش ہوتا ہے۔ ایسے ہی اوپر سے اچٹتی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جناب! آپ نے اپنا نام کیا بتایا ہے......؟"

میں نے ابھی تک اسے اپنا نام نہیں بتایا تھا لہٰذا موقع محل کی مناسبت اور حالات کے تقاضے کے پیش نظر میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میرا نام فیروز شیخ ہے۔ ادھر دبئی میں میرا پرفیوم کا بزنس ہے۔ امین سے میری دور کی رشتے داری ہے۔ میں دو دن کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا۔ آج صبح ہی مجھے پتا چلا ہے کہ بے چارہ ایک مصیبت میں بری طرح پھنس گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سے مل کر پوچھ لوں، اسے کسی شے کی ضرورت تو نہیں......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اداکاری کے جوہر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں عرب امارات میں پھیلے ہوئے اپنے بزنس کی وجہ سے مجبور ہوں، اس لیے یہاں زیادہ دن نہیں رک سکتا ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ یہاں رک کر امین کے کیس کو اپنی نگرانی میں لڑوں مگر دوں کی بات بزنس کی شکل میں تھی۔ بیچنی اس لیے مجبوری ہے۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں کوئی فوری ضرورت پوری کر دوں۔ میری فلائٹ تو ہو نہیں سکتی......"

اس نے تولنے والی گہری نظر سے مجھے دیکھا، مسکراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کہیں آپ وہی صاحب تو نہیں ہیں جن کا ذکر مشتاق نیلر نے کیا تھا......؟"

یہ ایک نئی چویشن سامنے آگئی تھی۔ میری اداکاری کے لیے ایک نیا امتحان...... مشتاق نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گرفتار امین سے ملنے حوالات آیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مشتاق نے یہاں کسی "پیسے والے شخص" کا ذکر کیا تھا جس کے بارے میں وہ مجھے بتانا بھول گیا تھا اور اس "شخص" کا حوالاتی امین کے ساتھ کوئی گہرا تعلق تھا۔ میرے ذہن نے چند سیکنڈ میں صورت حال کو سنبھال لیا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور زیر لب مسکراتے ہوئے ڈیوٹی آفیسر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا...... تو مشتاق کی آپ سے بات ہوئی تھی......؟"

"جی...... جی ہاں۔" وہ میکانکی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

ڈیوٹی آفیسر کے ذہن میں اس گفتگو کے حوالے سے ایک پورا کا سسپنس موجود تھا لیکن میں اس سلسلے میں واقفیت کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اپنا اور اپنی اداکاری کا بھرم قائم رکھتے ہوئے گول مول انداز میں کہا۔ "مشتاق نیلر سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان معاملات طے پا گئے ہیں۔ بس میں تو حوالاتی کو تسلی دینے آیا ہوں......"

"ضرور، ضرور...... کیوں نہیں۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔ پھر ایک کانسٹیبل کو بآواز بلند آواز دی۔ "غلام حسین! ادھر آؤ......"

تھوڑی ہی دیر میں کانسٹیبل غلام حسین وہاں حاضر تھا۔ ڈیوٹی آفیسر نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کانسٹیبل سے کہا۔ "شیخ صاحب کو ادھر حوالات میں لے جاؤ اور حوالاتی امین سے ان کی ملاقات کرا دو۔"

"آئیے جی شیخ صاحب!" کانسٹیبل نے معنی خیز انداز میں کہا پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے ڈیوٹی آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے تشکرانہ انداز میں گردن ہلائی اور بے نیازانہ قدم اٹھاتے ہوئے کانسٹیبل غلام حسین کے پیچھے ہولیا۔

یہ بات تو پتھر پر لکیر کی طرح مسلم ہے کہ پولیس

والے اسی حوالاتی کے ناز اٹھاتے ہیں جس کے ورثا کی طرف سے اچھا مال ملنے کی امید بلکہ یقین ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہی سلسلہ نظر آرہا تھا۔ امین کی حیثیت اور مالی حالت کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے بھی اب کوئی نہ کوئی ہو جو پولیس والوں کی "فرمائشیں" پوری کرنے کی سکت رکھتا ہو۔ مشتاق نیلر بھی اس زمرے کا بندہ نہیں لگتا تھا۔ ڈیوٹی آفیسر نے جس انداز میں مشتاق نیلر کا ذکر کیا تھا اس سے صاف پتا چلتا تھا ان دونوں کے بیچ اس نوعیت کی کوئی بات ہو چکی تھی۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ مشتاق وہ بات مجھے بتانا بھول گیا ہو یا پھر دانستہ اس نے پردہ رکھا ہو۔ اس مسئلے کو اس سے دوبارہ ملاقات پر ہی حل کیا جا سکتا تھا۔

میں کانسٹیبل غلام حسین کی رہنمائی میں حوالات تک پہنچ گیا۔

حوالات کے اندر امین موجود تھا۔ ابھی تک میں نے صرف اس کا نام ہی سنا تھا۔ اب وہ پورے کا پورا میرے سامنے موجود تھا۔ اس کی عمر ستائیس یا اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ مشتاق کی زبانی مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ امین شادی شدہ تھا۔ وہ پستہ قد اور مضبوط کاٹھی کا مالک تھا لیکن حالات اور واقعات نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ امین کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آرہے تھے جو بے خوابی کا نتیجہ تھا۔ اس کا شیو بھی بڑھا ہوا تھا اور وہ صورت سے خاصا پریشان اور ہراساں نظر آتا تھا۔ اسے ایسا نظر آنا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ ان لمحات میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا اس میں تو انسان کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ میری آمد پر اس نے گردن اٹھا کر بیزار نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں شناسائی یا جان پہچان کا تاثر نہیں تھا۔ وہ ایک سپاٹ اور ٹھہری ہوئی بے تاثر نظر تھی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر دلی افسوس ہوا۔

کانسٹیبل مجھے حوالات تک پہنچانے کے بعد خود بھی چند قدموں کے فاصلے پر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ میں اس کی موجودگی میں امین سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے گردن موڑ کر غلام حسین سے کہا۔

"سنتری بادشاہ! کیا ہمیں دس پندرہ منٹ کے لیے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل سکتا ہے......؟"

"کیوں نہیں مل سکتا جناب!" وہ کرارے لہجے میں بولا۔ "لیکن......؟"

اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ "لیکن کیا......؟"

"آپ صاحب لوگ ہیں!" وہ بدستور معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اس لیے آپ صاحب لوگوں کا ہی خیال کرتے ہیں۔ مجھ جیسے ایک معمولی کانسٹیبل پر تو آپ کی نظر ہی نہیں ٹھہرتی ہو گی......"

غلام حسین کے مقصد کی تہ تک پہنچنے میں مجھے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی، اپنی ہپ پاکٹ میں سے بٹوا برآمد کیا پھر اس میں سے پچاس روپے کا ایک کڑک نوٹ نکال کر کانسٹیبل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "غلام حسین! اللہ یہ رکھ لو۔ دیکھو، مجھے تمہارا بھی خیال ہے۔"

اس نے پچاس کے نوٹ کو چوم کر اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونسا پھر ایک آنکھ دبا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "شیخ صاحب! دس پندرہ منٹ کیا، آپ پورے آدھے گھنٹے تک تنہائی میں حوالاتی سے ملاقات کر سکتے ہیں۔"

وہ بات ختم کرتے ہی وہاں سے "غائب" ہو گیا۔

غلام حسین نے پیچھے ہٹاتے مجھے "شیخ صاحب" بنا دیا تھا۔ پتا نہیں اس سے اس کا مطلب پاکستانی شیخ تھا یا عربی شیخ! پچاس کا نوٹ آج کل بہت حقیر ہے تو حقیر ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن آج سے پچیس چھبیس سال پہلے ایک کانسٹیبل کی حیثیت کے آدمی کے لیے پچاس روپے کی بڑی قدر ہوا کرتی تھی۔

غلام حسین کے جاتے ہی میں امین کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ تمہارے سیٹھ مشتاق نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں اس کیس میں سے باعزت بری کرا دوں گا۔ تمہیں ذرا بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں!"

میرے تسلی بھرے الفاظ نے اس کی ذہنی کیفیت پر جادو جیسا اثر کیا۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا واقعی آپ مجھے بچا لیں گے......؟"

"ایک سو ایک فیصد!" میں نے اس کے اندر اعتماد کی توانائی بھرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے لیے تمہیں میری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔"

"میں آپ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔" وہ ٹرانس میں آئے ہوئے کسی معمول کی طرح بولا۔ "آپ کہیں گے تو میں حوالات میں پوری رات سر کے بل کھڑا رہوں گا۔"

"اس نوعیت کی تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تمہیں بس میری باتوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احسان سے سننا ہوگا اور انہیں یاد رکھنا ہوگا۔"
"جی یہ میں کروں گا۔" وہ بڑے ولولے سے بولا۔ "بتائیں، وہ کون سی باتیں ہیں؟"
"ان باتوں سے پہلے ایک اور ضروری کام کرنا ہے۔" میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اپنا بریف کیس کھول لیا۔ "چند نہایت ہی اہم کاغذات پر مجھے تمہارے دستخط چاہئیں۔"
میں نے حوالات کا رخ کرنے سے پہلے وکالت نامہ، درخواست ضمانت اور دیگر اہم کاغذات اپنے بریف کیس میں رکھ لیے تھے جو اس کیس کی پیروی کے لیے بہت ضروری تھے۔ آئندہ ایک منٹ کے اندر میں نے تمام اہم کاغذات پر امین کے دستخط لے لیے۔ اب وہ میرا موکل اور میں اس کا وکیل تھا۔ میں نے مذکورہ دستاویزات کو واپس اپنے بریف کیس میں رکھا اور ... امین کی جانب متوجہ ہو گیا۔
"امین!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یہاں کسی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں تمہارا وکیل ہوں اور تم سے ضروری کاغذات پر دستخط کرانے آیا تھا۔ جو بھی پوچھے، یہی بتانا کہ میں تمہارا دور کا کوئی عزیز ہوں۔ میرا نام فیروز شیخ ہے اور میں ملک سے باہر دبئی میں پرفیوم وغیرہ کا بزنس کرتا ہوں۔ میں تم سے ملنے اور تمہاری مدد کرنے حوالات تک آیا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے تمہارے سیٹھ مشتاق نیر سے تفصیلی بات چیت کرلی ہے۔" میں لمحے بھر کو تھما، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے پوچھا۔
"اتنا تو کرو گے ...؟"
"اتنا کیا، میں تو اس سے زیادہ بھی کروں گا جناب۔" وہ امنگ بھرے لہجے میں بولا۔ "آپ کی یہ ہدایات میں نے اپنے دماغ میں محفوظ کرلی ہیں۔"
"بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم ایک ذہین اور سمجھدار نوجوان ہو۔"
وہ خوش ہو گیا اور امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
میں نے کہا۔ "فی الحال تمہیں احتیاط کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں، تمہاری ریمانڈ کی مدت کے باقی دن امن و سکون سے گزر جائیں ...." میں نے لمحاتی خاموشی کے بعد اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "تفتیش کے نام پر پولیس والوں نے اب تک تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟"
"شاید ایسا ہو جاتا۔" وہ [illegible] انداز میں بولا۔
"لیکن مشتاق بھائی کی حکمت عملی نے سب ٹھیک کر دیا۔ فی الحال تو یہاں میرے لیے کوئی پریشانی نہیں۔ آگے کا اللہ ہی جانتا ہے ...."
"مشتاق کی حکمت عملی!" میں نے چونک کر امین کی طرف دیکھا۔ "ذرا اس بات کی وضاحت تو کرو ....؟"
امین کے بے ساختہ انکشاف نے میرے ذہن میں ڈیوٹی آفیسر کی معنی خیز گفتگو کو تازہ کر دیا تھا۔ اس وقت بھی مجھے محسوس ہوا تھا کہ مشتاق نے پولیس والوں کو کوئی آسرا دے رکھا ہے .... اس بات سے قطع نظر کچھ ہو یا نہ ہو .... اب امین کی بات بھی اسی امر کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔
وہ میرے استفسار کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب مشتاق بھائی پچھلی بار مجھ سے ملنے آئے تھے تو ان کی ایک سب انسپکٹر سے میرے سلسلے میں کوئی بات ہوئی تھی۔"
"کیسی بات؟" میں نے آواز دھیمی رکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں پوچھا۔
اس نے بتایا۔ "سب انسپکٹر نے مشتاق بھائی کو ایک پیش کش کی تھی۔"
"کس قسم کی پیش کش؟" میرے اضطراب میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ "کیا سب انسپکٹر نے کوئی رقم وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا؟"
"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وکیل صاحب!" وہ بڑی رسان سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ پیش کش رقم ہی کے عوض تھی۔"
"کتنی رقم؟" میں نے پوچھا۔ "اور اس کے عوض کون سی پیش کش ....؟"
اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "ہلکی دفعہ لگانے کے لیے پچاس ہزار اور ایک دم کیس ختم کرنے کے لیے پورے ایک لاکھ روپے مانگے تھے پولیس نے ...."
"تمہیں یہ بات کس نے بتائی تھی؟"
"مشتاق بھائی نے۔" اس نے جواب دیا۔ "پولیس والوں نے ان سے جو ڈیل کرنے کی کوشش کی ہے وہ مشتاق بھائی نے مجھے تفصیل سے بتایا ہے۔"
"مشتاق نے انہیں کوئی رقم دی تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔
"جی ہاں، کچھ پیسے دیے تو ہیں ....!"
"کتنے پیسے؟"
مجھے مشتاق نیر پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے مجھ سے تفصیلی ملاقات کے دوران میں پولیس والوں سے ہونے والے معاملات کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی حالانکہ یہ ایک اہم ایشو تھا۔
امین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "ایک ہزار روپے ....!"
"ایک ہزار ...." میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا ٹوکن کے طور پر ....؟"
جہاں پچاس ہزار اور ایک لاکھ کی باتیں ہو رہی ہوں وہاں ایک ہزار کی رقم ٹوکن (بیعانہ) ہی کی حیثیت رکھتی ہے مگر حوالاتی امین نے میری توقع اور اندازے کے برعکس جواب دیا۔
"جناب! مشتاق بھائی نے یہ ایک ہزار روپے مجھے ان کی خاطر داری سے بچانے کے لیے دیے ہیں اور انہیں یقین دلایا ہے کہ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے سے پہلے وہ میرے کسی صاحب ثروت رشتے دار کو ڈھونڈ کر ڈیل کی کوشش کریں گے۔"
"اوہ ....!" میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور کہا۔ "تو یہ چکر ہے ....!"
"جی ہاں، یہاں یہی صورت حال چل رہی ہے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مشتاق بھائی کے ایک ہزار نے بڑا کام دکھایا ہے۔ ابھی تک پولیس والوں نے میرے ساتھ کوئی سختی نہیں کی۔"
"لیکن وہ کب تک نرمی برتیں گے؟" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا، پھر اس سے پوچھا۔ "مشتاق نیر نے پولیس والوں کو جو آسرا دیا ہے، اس کے جواب میں انہوں نے کیا کہا تھا؟"
"پولیس والوں نے مشتاق بھائی کو اس وقت تک کی مہلت دی ہے جب تک میں ان کی کسٹڈی میں ریمانڈ کی مدت پوری کر رہا ہوں۔" امین نے بتایا۔ "اگر مشتاق بھائی اس دوران میں پولیس والوں کے ساتھ کوئی ڈیل کر لیتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ یہ لوگ انتہائی خطرناک دفعات لگا کر مجھے عدالت کے حوالے کر دیں گے۔"
"یہ تو پھر ٹھیک ہے ....!" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔
"کیا ٹھیک ہے جناب؟" اس نے شاکی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "کیا آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ مجھ پر خطرناک قسم کی دفعات عائد کر دی جائیں؟"
"ارے نہیں یار .... تم میری بات کو غلط رنگ میں لے گئے ہو۔" میں نے جلدی سے کہا پھر وضاحت کر دی۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں تمہارے ساتھ کوئی زبردستی یا زیادتی نہ ہو۔ مشتاق کے دیے ہوئے ایک ہزار روپے بڑا کام دکھا رہے ہیں۔ تم پولیس والوں پر یہی ظاہر کرتے رہو کہ مشتاق ان کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے بھرپور کوشش میں مصروف ہے۔ اس طرح تم یہاں محفوظ رہو گے اور ....." میں نے ایک فوری خیال کے تحت توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
"میرے پروگرام کے مطابق تمہیں اپنے ان بیانوں پر آج کے بعد یہ ظاہر کرنا ہے کہ مشتاق کو جس آدمی کی تلاش تھی وہ میں ہی ہوں یعنی .... فیروز شیخ دبئی والا۔ میری مشتاق سے بات ہو گئی ہے۔ ان شاء اللہ مشتاق عنقریب ان سے ڈیل کرنے آنے والا ہے۔ میں مشتاق کو سمجھا دوں گا کہ وہ اب بھی ادھر کا رخ نہ کرے۔"
"لیکن ...." وہ یک دم پریشان ہو گیا اور میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "مشتاق بھائی اگر منظر سے غائب ہو گئے تو پولیس والے سارا غصہ مجھ غریب پر نکالیں گے۔"
"جس مسکین ملزم کا وکیل میں ہوں وہ بھی بے چارہ اور بے بس نہیں ہے امین!" میں نے گہرے لہجے میں کہا۔ "اس لیے تمہیں قطعاً پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟"
"جی ....!" اس نے اطمینان بھرے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔
میں نے کہا۔ "میں پولیس والوں کی نفسیات اور طریقۂ کار ... طریقۂ واردات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جب کوئی ملزم ریمانڈ پر ان کی کسٹڈی میں ہوتا ہے تو یہ اس کے ورثا کو کمزور سمجھ کر ان سے نچوڑنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ "ایک دم کیس ختم" کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کیس تھانے میں رجسٹرڈ ہو جاتا ہے، اس پر کارروائی لازمی قرار پاتی ہے۔ یہ لوگ اس پیش کش کی آڑ میں کیس کو باقاعدہ اور لازمی کارروائی کی نوبت آنے سے پہلے ہی دام میں آئے ہوئے شکار کی اچھی طرح چھان بین کرتے ہیں۔ لیکن تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا ...." میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
"تمہارے خلاف نہ صرف باقاعدہ کیس رجسٹر ہوا ہے بلکہ اس پر لازمی قانونی کارروائی کا عمل بھی جاری ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جبھی تم عدالتی ریمانڈ پر اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہو۔ لیکن دن کے بعد تمہیں چھوڑ دینا پڑے گا کوئی بھی دفعہ لگا کر پولیس کے خلاف جائے گا لہٰذا وہ ابھی تفتیش بھی نہیں کریں گے۔ اگر مشتاق یا تمہارا کوئی مخبر یا پولیس والوں کی مٹھی گرم کر بھی جائے گا تو اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچنے والا۔ یہ لوگ رقم ہضم کر کے ڈکار بھی نہیں لیں گے اور چالان وہی بنائیں گے جس جرم کے تحت انہوں نے تمہیں گرفتار کیا ہے۔'' میں ایک دفعہ پھر متوقف ہوا پھر نہایت ہی تسلی بخش لہجے میں کہا۔

''یہ لوگ جو بھی کرتے ہیں انہیں کرنے دو۔ یہ تم پر جتنی بھی سخت اور خطرناک دفعات لگاتے ہیں، انہیں لگانے دو۔ تمہیں صرف اس حقیقت کے پیش نظر مطمئن اور پرسکون رہنا ہے کہ میں تمہاری پشت پر موجود ہوں۔ عدالت میں جو کچھ بھی پیش آئے گا، میں سنبھال لوں گا۔''

''ٹھیک ہے جناب……'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولا۔ ''آپ نے تو میرے دل اور دماغ کا سارا بوجھ اتار دیا ہے۔''

''لیکن ایک بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو میاں!'' میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''میں تمہاری پشت پر صرف ایک ہی صورت میں موجود ہوں……''

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو گے تو میں تمہارا وکیل ہوں گا ورنہ تمہیں بری طرح پچھتانا پڑے گا۔''

''انشاء اللہ! اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' وہ تیقن سے بولا۔ ''آپ مجھ سے جو بھی سوال کریں گے، میں اس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھنا شروع کر دیا۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ کانسٹیبل غلام حسین کی آمد تک جاری رہا۔ پھر میں مین کی طرف سے مکمل اطمینان حاصل کر کے وہاں سے واپس آ گیا۔ مین سے حاصل ہونے والی تحقیقی معلومات اور اہم نکات کو میں فی الحال آپ سے پوشیدہ رکھ رہا ہوں تاکہ سسپنس کی فضا برقرار رہے۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں جا بہ جا، یہ نکات آپ پر منکشف ہوتے رہیں گے۔

بوقت رخصت اسی ڈیوٹی افسر سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی۔ تھانہ انچارج ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو ڈیوٹی آفیسر مسکرایا اور میرے قریب چلا آیا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں نے تمہارے حوالاتی کو تسلی دے دی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی گڑ بڑ نہیں ہو گی۔ انشاء اللہ اشتاق علی ایک آدھ روز میں آپ سے مل کر ''معاملات'' طے کر لے گا۔''

''آپ بے فکر ہو کر دفع جائیں……'' وہ خاصی فراخ دلی سے بولا۔ ''ہم آپ کے بندے کا خیال رکھیں گے۔''

میں نے اس سے مصافحہ کیا اور تھانے سے نکل آیا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ وہ بڑا ہنگامہ خیز اور سنسنی خیز دن تھا۔ جب میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزم کی درخواست ضمانت دائر کی تو اس کیس کا انکوائری آفیسر مجھے عدالت کے کمرے میں دیکھ کر بری طرح اچھلا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی زہریلے بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

ہمارے کیس کا تفتیشی افسر عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ بعد ازاں اس کا نام وحید مرزا معلوم ہوا اور اس کے اچھلنے کا سبب یہ تھا کہ وہ مجھے وکیل کے روپ میں دیکھ کر چونک گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی ہم ایک مرتبہ مل چکے تھے لیکن اس وقت میں نے اپنا تعارف ایک بزنس مین کی حیثیت سے کرایا تھا…… فیروز شیخ دہلی والا!

جی ہاں…… وحید مرزا سب انسپکٹر وہی ڈیوٹی آفیسر تھا جس کے تھانے میں میری عجیب و غریب اور معنی خیز ملاقات ہوئی تھی۔ اب تو آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ ایک ایڈووکیٹ اور وہ بھی ملزم مین کے ایڈووکیٹ کی حیثیت سے مجھے عدالت میں دیکھ کر اس کے دل و دماغ پر کیا گزری ہو گی۔

''شیخ صاحب……'' وہ مرزا لی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ…… وکیل کب سے ہو گئے؟''

''شیخ صاحب؟'' میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے شیخ صاحب کیوں کہہ رہے ہیں…… اور میں وکیل تو سالہا سال سے ہوں۔ پورا کورٹ مجھے جانتا ہے……''

اس کی آنکھوں میں بے یقینی کے تاثرات پیدا ہوئے، جس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ مجھے ایک وکیل کی حیثیت سے واقعی نہیں جانتا تھا۔ ابھی اس روز تھانے میں میرے فیروز شیخ ہونے پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ اچانک پوچھ بیٹھا۔ ''کیا آپ کا نام فیروز شیخ نہیں جو دہلی میں پرفیوم کا بزنس کرتے ہیں؟''

''نہیں بھائی، آپ کو زبردست مغالطہ ہو رہا ہے۔'' میں نے سرسری اور تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں وکیل ہوں۔

مرزا وحید بیگ میرا نام ہے۔ وکالت میرا پیشہ ہے اور میں اسی کی کھاتا ہوں۔ دہلی اور پرفیوم کے بزنس سے میرا کوئی تعلق نہیں، البتہ……'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''البتہ عمدہ پرفیوم کا شوقین ضرور ہوں……!''

وہ کوئی نادان بچہ نہیں تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ اس روز تھانے میں، میں نے اس کے ساتھ ہاتھ کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواباً کچھ الٹا سیدھا بولنے کی کوشش کرتا، جج کمرے میں داخل ہوا۔ ٹیکنیکل افراد سمیت حاضرین عدالت یک بیک خاموش ہو گئے۔

جج اپنی مخصوص کرسی پر براجمان ہو چکا تو اس کے حکم سے عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیے۔

''جناب عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک شریف النفس اور امن پسند فرد ہے۔ اس کی شرافت اور بے داغ کردار کی گواہی دینے کے لیے میں نصف درجن معتبر اور معزز افراد کو عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔ عدالت سے میری بس اتنی سی استدعا ہے کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کر لیا جائے۔''

وکیل سرکار (وکیل استغاثہ) نے ضمانت کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ ''یور آنر! ملزم نے ایک انتہائی سنگین اور قبیح جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اپنے کیے کے لیے یہ عبرت ناک سزا کا مستحق ہے۔ اگر معزز عدالت نے اس کی ضمانت منظور کر لی تو یہ انصاف کے اصولوں کے منافی ہو گا۔''

''جناب عالی! استغاثہ نے جس سنگین اور قبیح جرم کی جانب اشارہ کیا ہے، وہ جھوٹ کے غبارے سے زیادہ کچھ نہیں۔ جج کی ایک پن اس ہوا بھرے غبارے کی ساری ہوا نکال دے گی۔'' میں نے وکیل کے جملے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جب عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہو گا تو میں یہ ثابت کر دوں گا کہ ایک گہری سازش کے تحت میرے موکل کو اس معاملے میں پھانسا گیا ہے۔''

''جس پن کی مدد سے آپ استغاثہ کے غبارے کی ہوا نکالنے کا دعویٰ رکھتے ہیں!'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز اپنائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ذرا معزز عدالت کو اس کا دیدار تو کرا دیں……؟''

''وہ پن…… اور اس سے بھی زیادہ خطرناک اور تیز دھار نشتر اپنے اپنے وقت پر معزز عدالت کے روبرو آ جائیں گے۔'' میں نے طنز کا جواب طنز ہی سے دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی استغاثہ کے آپریشن کا وقت نہیں آیا۔ اگر پھر بھی مطلوبہ نتائج برآمد ہو گئے تو……'' میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور تیکھے لہجے میں کہا۔

''ابھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ مطلوبہ نتائج لانے کے لیے انشاء اللہ استغاثہ کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کیا جائے گا…… یہیں پر…… آپ کی نظروں کے سامنے……''

وہ تلملا کر رہ گیا۔ میری اس نوکدار چوٹ نے اسے اندر سے گھائل کر دیا تھا۔ میری اس کڑوی وضاحت پر اس نے برا سا منہ بنایا اور مجھے یکسر نظرانداز کرتے ہوئے جج سے مخاطب ہو کر بولا۔

''یور آنر! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے فاضل دوست پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں۔ جو بات بعد میں کہنے کے لیے چھپا کر رکھ رہے ہیں اسے آج بیان کرنے میں کون سی قباحت ہے، جو بھی سانپ نکالنا ہے ابھی نکال دیں……!''

میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مائی ڈیئر کونسلر! میں جو سانپ نکالنا چاہتا ہوں وہ بہت ہی زہریلا اور خطرناک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی زہریلی چمک سے آپ کی آنکھیں چندھیا جائیں لہٰذا آپ تھوڑی دیر کے لیے صبر کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھیں تو یہ آپ کے حق میں بہتر ہو گا……'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جناب عالی! ہر کام کے لیے جس طرح ایک مناسب وقت مخصوص ہوتا ہے، بالکل اسی طرح کسی زیر سماعت کیس کے ذیل میں مخصوص ثبوت، ٹھوس حقائق اور مدلل شواہد کو بھی پیش کرنے کے مخصوص مواقع ہوتے ہیں۔ ابھی تو مقدمے کی سماعت شروع ہوئی ہے۔''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''یور آنر…… اس واردات کے تمام ثبوت پولیس کی تحویل میں محفوظ ہیں۔ مقتولہ کے بیانات سے بھی ملزم کے مجرمانہ حملے کی تصدیق ہوتی ہے لہٰذا کسی بھی طور ملزم کی ضمانت منظور نہیں ہونا چاہیے۔''

''جناب عالی! میرا موکل ایک صلح جو اور معزز شہری ہے۔ کسی خوفناک سازش کے تحت اس کو اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی نیک نامی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ میں ایک بار پھر معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت پر ہمدردانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

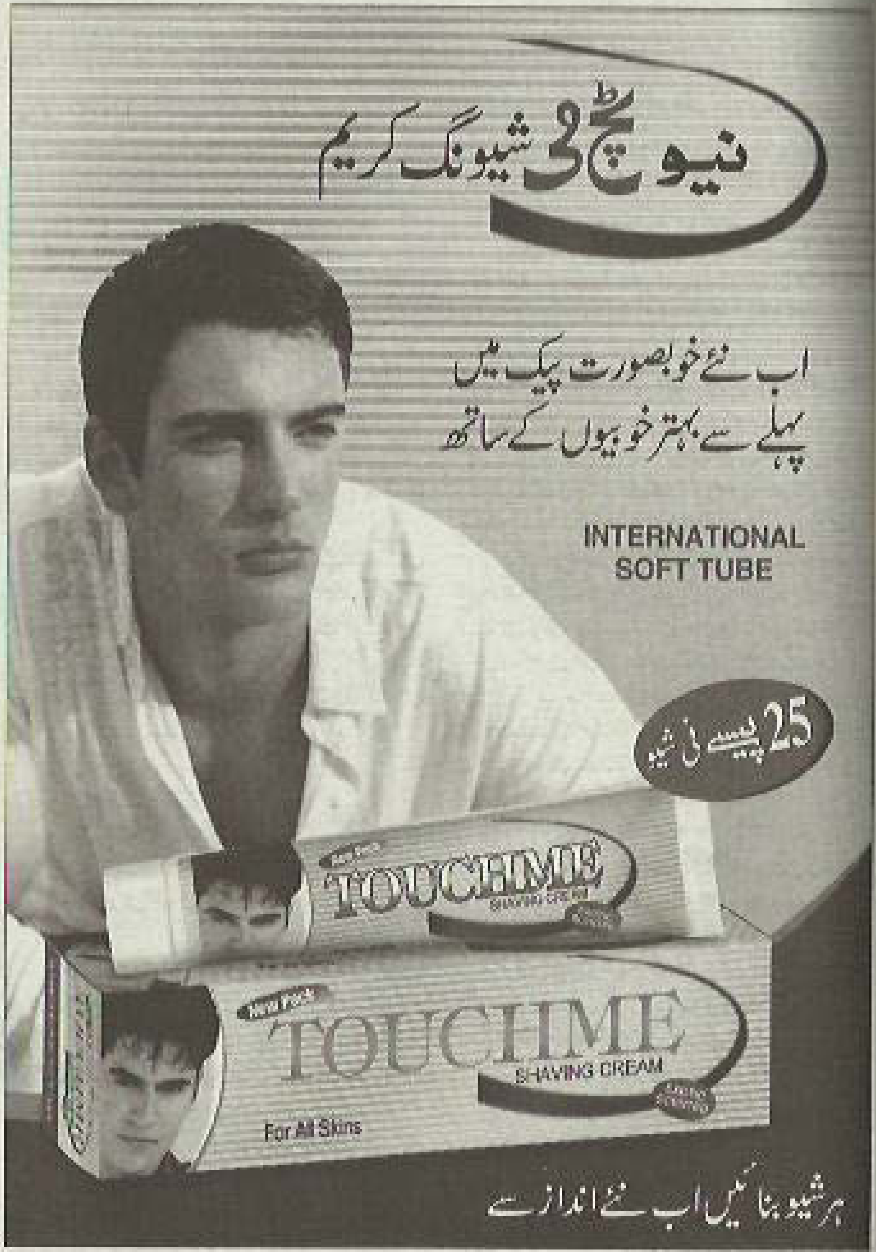

انداز میں غور فرمایا جائے۔"

"اگر معزز عدالت اس قسم کے خطرناک مجرموں کی درخواستوں پر ہمدردی سے غور کرنے لگے تو پھر ہو گیا کام....." وکیل استغاثہ نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"جناب عالی! مظلوم کا بھی معاملہ ہے۔ ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے بہت کافی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی پولیس کو جائے وقوعہ سے کچھ ایسے ثبوت ملے ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ملزم اس مذموم فعل کا مرتکب ہوا ہے۔ ہمارے پاس ایسے گواہ بھی موجود ہیں جو موقع واردات پر پہنچے اور انہوں نے وہاں ملزم کے بیٹے جو کی واضح علامات دیکھیں....." وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، ایک لمبی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"مذکورہ افراد کے نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ انہیں مناسب مواقع پر باری باری معزز عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا....."

"جناب عالی! میرے فاضل دوست خواہ مخواہ میرے موکل کی ضمانت رکوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں مظلوم کی اصل حقیقت کو معزز عدالت کے سامنے بے نقاب کروں گا لیکن مناسب وقت آنے پر۔"

میرے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ ایک مرتبہ پھر درخواست ضمانت کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ یہ سلسلہ دو طرفہ مزید دس منٹ تک جاری رہا پھر جج نے میرے موکل کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوا دیا۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو مشتاق نیازی نے مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! امین تو گیا جیل میں....."

"وہ جیسے جیل میں گیا ہے، ایسے ہی باہر بھی نکل آئے گا۔" میں نے اس کے ذہن پر طاری مایوسی کی فضا کو چھانٹتے ہوئے کہا۔ "عدالت کی باقاعدہ کارروائی شروع ہونے دیں۔ یہ کیس بہ مشکل تین چار پیشیوں کی مار ہے۔ میں نے تھانے میں اپنے موکل سے ملاقات کر کے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کی روشنی میں، میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کسی بڑی پیچیدگی کی غیر موجودگی میں، میں اپنے موکل کو باعزت بری کروا لوں گا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"مشتاق صاحب! اگر آپ میری کارروائی سے مطمئن نہ ہوں تو....."

"یہ بات نہیں ہے بیگ صاحب!" وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"پھر کیا بات ہے..... آپ انداز میں اپنے دل برداشتہ کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

"وہ دراصل..... میں تو توقع کر رہا تھا کہ آج امین کی ضمانت ہو جائے گی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "خیر..... اگر آپ کیس سے مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے۔"

"میں اس کیس سے پوری طرح مطمئن اور اس کی کامیابی کے لیے پر امید ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "شاید آپ کی دل شکنی کا سبب یہ ہو کہ آپ نے اس کیس کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ورنہ آزردگی کی کوئی معقول بات نہیں ہے مشتاق صاحب!"

"کیس چاہے کتنا ہی خطرناک اور سنگین ہو لیکن میرے لیے اطمینان کا پہلو یہ ہے کہ میں امین کو بے گناہ سمجھتا ہوں۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

"آپ کے میرے پاس آنے کی یہی وجہ ہے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مشتاق صاحب!" میں نے دو ٹوک الفاظ میں حقیقت اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ "عدالت ملزم کی بے گناہی کو ماننے کے لیے ٹھوس ثبوت اور حقائق و دلائل کا تقاضا کرتی ہے اور انشاء اللہ..... یہ تمام لوازمات ضرور میں معزز عدالت کو فراہم کروں گا۔ بس آپ قدم بہ قدم مجھ سے تعاون کرتے جائیں اور باقی سب مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"جناب! میں نے اب تک آپ کی ہدایات پر عمل کیا ہے۔" وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ "اور بھی جو حکم کریں گے میں تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ اس واقعے کے پس منظر سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور تمام کرداروں کو بھی پہچانتے ہیں....."

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے ایک کردار کا نام لیا اور فوری انداز میں کہا۔ "مجھے اس بندے کی ایک تصویر چاہیے۔"

مشتاق نے تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ "مل جائے گی....."

"تو کوئی ایسا بندوبست ہونا چاہیے کہ اس معاملے میں مذکورہ بندے کو بہ آسانی پہچانا جا سکے۔" میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میں شناخت کی غرض سے اس کی تصویر کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں بیگ صاحب!" وہ تشکر
آمیز انداز میں بولا۔ "میں آپ کی ضرورت کو مدنظر رکھتے
ہوئے منصوبہ سازی کی تصویر سجا کر دوں گا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ رخصتی کلمات کے بعد میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگا تو وہ جلدی سے بولا۔

"ایک بات تو بتائیں بیگ صاحب؟"

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ میں رک گیا اور پوچھا۔ "جی ... کون سی بات؟"

"عدالت میں انکوائری آفیسر آپ کو دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا تھا۔" اس نے کہا۔ "اور جب اس نے آپ کو فیروز کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے پرفیوم کے بزنس اور دبئی ڈیرہ کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ یہ کیا چکر ہے جناب؟"

"یہ جو بھی چکر ہے، سب آپ ہی کی مہربانی سے ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری مہربانی سے!" وہ چونک اٹھا، پھر پوچھا۔ "کیا مطلب جناب؟"

میں نے "مطلب" سمجھانے کے لیے اسے تفصیل سے آگاہ کیا کہ کس طرح میں نے امین سے ایک بھرپور ملاقات کرنے اور اس کو پولیس والوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے ڈیوٹی آفیسر کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی۔

"یہ ایک سنگین اتفاق ہے کہ وہی ڈیوٹی آفیسر اس کیس کا آئی او بھی ہے؟" آخر میں، میں نے کہا۔

"آپ نے تو کمال کر دیا جناب!" وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کمال تو آپ نے بھی کیا تھا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایک ہزار روپے والا معاملہ تو یاد ہے نا.....! میرے لیے اس میں شمولیت ہوگی۔" "کم از کم مجھے بتا تو دیا ہوتا؟"

"ہاں، یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "لیکن یقین کریں، یہ میرے ذہن میں نہیں رہا تھا۔"

"اگر میں نے بروقت اپنی اداکاری سے معاملہ نہ سنبھالا ہوتا تو بڑی مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔" میں نے بہ دستور شاکی لہجے میں کہا۔

"آئی ایم ریئلی ویری سوری بیگ صاحب!"

"اٹس اوکے....."

اس نے دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

میں تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

میں نے پچھلے دنوں حوالات میں جا کر امین کی زبانی اس کی جو کہانی سنی تھی اس سے مجھے بخوبی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ نوری نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت امین کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا تھا۔ تاہم اس سازش کے جال سے امین کو نکالنے کے لیے مجھے بہت زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت تھی اور میں یہ کوشش کر رہا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے آپ کی خدمت میں اتنا عرض کرتا چلوں کہ حدود آرڈیننس کی زیر دفعات جو کیس عدالت میں زیر سماعت ہوتے ہیں ان میں بہت ہی گھٹیا اور ناگفتنی باتیں سننا اور برداشت کرنا پڑتی ہیں کیونکہ ایسے معاملات میں جس نوعیت کے کھلے سوالات مبینہ مظلومہ سے پوچھے جاتے ہیں، ضابطہ اخلاق انہیں من و عن حوالہ تحریر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے میرے اشاروں اور کنایوں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔ "شرم اور قانون میں کوئی شرم نہیں ہوتی" کے مصداق وکلا حضرات نازک اور تیکھے سوالات کر کے مظلومہ کو آنسو بہانے پر اور کمرۂ عدالت میں موجود اس کے ورثا کو شرم سے پانی پانی ہو جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس نوعیت کی وارداتوں میں اکثر کیس تو رجسٹر ہی نہیں کرائے جاتے کہ گھر کی عزت تو داغدار ہو گئی۔ اب عدالت میں جا کر تماشا کیوں بنایا جائے۔ اس بات سے قطع نظر کہ متاثرین کا یہ رویہ درست ہے یا غلط، تاہم یہ بات طے ہے کہ یہ ایک المیہ ہے اور اس المیے پر ہمارا معاشرہ اور قانون، تا حال شرمسار ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆

ابتدائی چند پیشیاں عدالت کی ٹیکنیکل کارروائیوں کی نذر ہو گئیں۔ یہ کارروائیاں جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ ہو چکا ہے، بہت ہی خشک اور بور ہوتی ہیں اسی لیے میں نے ان کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے، جب باقاعدہ عدالتی کارروائی ہوئی۔ اس روز تمام متعلقہ افراد عدالت میں موجود تھے۔

جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔

ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ میں نے گزشتہ ملاقات پر امین کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے جج کے روبرو کیا بیان دینا ہے تاکہ اس سے پہلے پولیس کو دیے گئے بیان کی بھی نفی ہو اور آگے مجھے کھیلنے کے لیے بھی کھلا

[میدان] اور گپ مل جائیں۔ امین نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں میری توقعات کو کافی حد تک پورا کیا تھا۔

ملزم کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ جج کی اجازت پا کر کٹہرے کے یعنی ایکوزڈ باکس کے قریب چلا گیا۔ وہ چند لمحات تک ملزم کو تولنے والی نظر سے گھورتا رہا پھر بڑے معنی خیز انداز میں اس نے سوالات کا آغاز کیا۔

"تم مظلومہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"کون مظلومہ؟" ملزم نے لاتعلقی کے سے انداز میں پوچھا۔

"اچھا! اب تم اس عورت کو پہچاننے سے بھی انکار کر رہے ہو جو تمہارے ستم کا نشانہ بننے کے بعد اس عدالت تک آئی ہے۔" وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم اپنی اس مصنوعی معصومیت سے عدالت کو متاثر نہیں کر سکتے...... سمجھے؟"

"کہیں..... آپ کا اشارہ میری عیار اور بدکار پڑوسن نوری کی طرف تو نہیں؟" ملزم نے بہ دستور معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یاد آ گیا نا....." وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ، میں نے کیا سوال کیا تھا؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے جناب!" ملزم ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "آپ نے مجھ سے کسی مظلومہ کے بارے میں پوچھا تھا اور میری نظر میں وہ عورت ہرگز ہرگز مظلومہ نہیں ہے لہٰذا اس کی طرف میرا دھیان جا ہی نہیں سکتا تھا اور جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو....." اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"تو..... اس کا جواب میں یہی دوں گا کہ اتنی عیار، مکار، چالباز اور بدکردار عورت میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی اور کہیں نہیں دیکھی.....!"

ملزم کے جرأت مندانہ اور بے خوف اظہار خیال نے جج سمیت تمام حاضرین عدالت کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عدالت کے کمرے میں ملزم کا تصور عموماً ایک بے بس، لاچار اور مصیبت زدہ انسان کا سا ہوتا ہے جو ہر وقت ڈرا سہما نظر آتا ہے لیکن ملزم امین نے آغاز ہی میں بڑے توانا اور صحت مند رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس کے جواب پر وکیل استغاثہ سٹپٹا کر رہ گیا اور جارحانہ انداز میں مستفسر ہوا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ مظلومہ تم کو کچھ عرصہ پہلے تک تمہیں بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کو دیکھ کر تمہارے دل میں پسندیدگی کے جذبات ابھرتے تھے اور دو تین مرتبہ تم نے اس کے منہ پر..... جب تم دونوں کے سوا وہاں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا تو تم نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس کے حسن کی تعریف بھی کی تھی؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔" ملزم نے بڑی دیانت داری سے اقرار حقیقت کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ آپ کی مظلومہ اور میری پڑوسن نوری ایک خوب صورت اور پُرکشش عورت ہے اور کوئی بھی حسین چیز اگر کسی کو اچھی نہ لگے تو یہ بڑی بدذوقی اور بدبختی کی بات ہوتی ہے..... لیکن جب اس حسین پری چہرہ فتنہ پرور عورت کی اصلیت مجھ پر عیاں ہوئی تو میں محتاط ہو گیا تھا۔"

"تم محتاط ہو گئے تھے یا وہ؟" وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تمہاری اصلیت اس پر کھل گئی تھی یا اس کی حقیقت تم پر عیاں ہوئی تھی؟ تم نے اپنا راستہ بدلا تھا یا وہ تم سے کترانے لگی تھی.....؟"

"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" ملزم نے سادگی سے کہا۔ "جو سچ تھا وہ میں نے بیان کر دیا ہے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ....." وکیل استغاثہ نے زہر میں بجھے لہجے میں کہا۔ "مظلومہ نے تمہاری آنکھوں میں لپکتے ہوس کے سائے بڑے واضح طور پر دیکھ لیے تھے اسی لیے وہ تم سے کنی کترانے لگی تھی۔ مظلومہ کی شرافت اور احتیاط نے تمہیں شیطان بننے پر اکسایا اور انتقام کے طور پر تم نے اس کے شوہر فل ڈاز کے کان بھرنا شروع کر دیے جس کے نتیجے میں ان میاں بیوی میں اچھی خاصی لڑائی بھی ہوئی تھی۔"

"میں نے کسی کے کان نہیں بھرے تھے۔" ملزم نے عام سے لہجے میں کہا۔ "بلکہ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا تھا وہی فل ڈاز کو بتایا تھا اور یہ میرا فرض تھا۔"

"کیا تم اس بات سے انکاری ہو کہ....." وکیل استغاثہ کے سوالات میں اچانک تیزی آ گئی۔ "وقوعہ کی رات تم مظلومہ کے فلیٹ میں گئے تھے؟"

"یہ ایک حقیقت ہے، اس لیے میں انکاری نہیں ہوں۔"

"تم یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ مظلومہ اس وقت شاہ صاحب کو اپنی کسی پریشانی کے بارے میں بتا رہی تھی اور تم نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دی تھیں.....؟"

واقعات و حالات یہ بہ الفاظ دیگر استغاثہ کے مطابق، وقوعہ کی رات [illegible] مظلومہ نوری اپنے سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پڑوسی کمال شاہ کو بتا رہی تھی کہ ان کے فلیٹ کو خریدنا چاہتے ہیں اور اسے فلیٹ تبدیل کرنا نہیں آتا۔ اگر شاہ صاحب مہربانی کر دیں تو اس کے لیے آسانی ہو جائے گی لیکن شاہ صاحب نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی کے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اسی وقت ملزم وہاں پہنچ گیا اور اس نے مظلومہ کو پیشکش کی کہ یہ کام وہ کر دیتا ہے۔ پریشان حال مظلومہ نے اسے اپنے فلیٹ کے اندر آنے کی اجازت دے دی تھی۔

"خدیجہ پرائڈ" کے ہر فلور پر چار فلیٹ بنے ہوئے تھے جن میں سے دو بڑے یعنی صاف فلیٹ تھے اور دو بیڈ ایک کامن پر مشتمل تھے اور ان کی ترتیب کچھ اس طرح تھی۔ فلیٹ نمبر ایک بڑا تھا، فلیٹ نمبر دو چھوٹا، فلیٹ نمبر تین چھوٹا تھا اور فلیٹ نمبر چار بڑا۔ یعنی فلیٹ نمبر ایک کے سامنے فلیٹ نمبر تین پڑتا تھا اور فلیٹ نمبر دو کے سامنے فلیٹ نمبر چار۔ ہر فلور پر نمبروں کی یہی ترتیب تھی۔ جیسا کہ فورتھ فلور کے چار سو ایک میں نوری اور اس کا شوہر گلزار رہتے تھے۔ ان کے سامنے چار سو تین یعنی ایزی صبا فلیٹ میں کمال شاہ صاحب۔ فلیٹ نمبر چار سو دو میں امین اور اس کی ضعیف والدہ اور اس کے سامنے فلیٹ نمبر چار سو چار میں عباسی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ان کے دو بچے تھے۔ یہ تمام تر تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ یہ پوزیشن کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

"یہ بالکل غلط ہے کہ میں نے فلیٹ تبدیل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔" ملزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "شاہ صاحب نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس "بی بی" کی مشکل آسان کر دوں اور..... میں شاہ صاحب کو انکار نہ کر سکا۔"

"شاہ صاحب کے کندھے پر تم اس لیے بندوق رکھ رہے ہو کہ انہیں گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرنا ممکن نہیں....." وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ہیں نا؟"

"یہ درست نہیں ہے۔" ملزم نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ "تو وہ کل رات جو کچھ جس طرح پیش آیا تھا وہ میں نے بیان کیا ہے۔"

"تو شاہ صاحب نے تم سے درخواست کی کہ تم پڑوسن بی بی کی مشکل آسان کر دو اور تم نے وہ مشکل آسان کر دی۔" وکیل استغاثہ نے بڑے چبھتے ہوئے انداز میں جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم کتنے کمینے اور ذلیل انسان ہو کہ ایک شریف عورت نے تم پر بھروسا کر کے گھر کے اندر آنے دیا اور تم نے اسے بربریت کا نشانہ بنا ڈالا۔ تمہارے لیے تو عدالت جتنی بھی سخت سزا تجویز کرے وہ کم ہے۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" ملزم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "یہ سراسر مجھ پر الزام ہے، بہتان ہے۔"

"کیا تم نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی مظلومہ کی ناک پر رومال رکھ کر اسے بے بس نہیں کر دیا تھا؟"

"نہیں..... بالکل نہیں!" وہ قطعیت سے بولا۔

"اس رومال پر کلوروفارم یا کوئی ایسا کیمیکل لگا ہوا تھا جس کو سونگھنے سے انسان پر غفلت سی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوتا لیکن اس کے اعصاب شل ہو جاتے ہیں۔ وہ بے بسی محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی ہر "حرکت" سے آگاہ تو رہتا ہے لیکن اس کے خلاف مدافعت پیش نہیں کر سکتا۔ اس کا احساس بیدار ہوتا ہے لیکن قوت مزاحمت جیسے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے خلاف ہونے والی کسی بھی من مانی کارروائی کو روک نہیں سکتا....."

میں ضبط کیے خاموشی سے اپنی باری کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ میرے موکل نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا۔

"میں ایسے کسی رومال اور کیمیکل سے واقف نہیں ہوں۔"

وکیل استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! ملزم نے ابھی جس رومال کا ذکر کیا ہے وہ پولیس کو اس بیڈروم میں پڑا ملا تھا جہاں ملزم نے مظلومہ کو زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ مذکورہ رومال کا لیبارٹری ٹیسٹ بھی کرایا گیا ہے اور ٹیسٹ رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ اس رومال پر ایسے اثرات پائے گئے ہیں جیسے اسے کسی خواب آور کیمیکل میں بھگویا گیا ہو۔ علاوہ ازیں مظلومہ کے طبی معائنے سے بھی اس امر کی تصدیق ہوئی ہے۔"

جج نے سر کو تفہیمی جنبش دی تو وکیل استغاثہ دوبارہ گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم نے مظلومہ کی ناک پر وہ رومال رکھ کر اسے بے بس کر دیا اور بیڈروم میں لے آئے اور پھر..... تم نے اپنی ہوس کی تکمیل کر لی..... ہے نا؟"

"آپ بات کو جس انداز میں بھی گھما کر پیش کریں وکیل صاحب! اس سے حقائق میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔" ملزم نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔"

وکیل استغاثہ نے رخ تبدیل کیا اور جج کی جانب منہ موڑا اور غصے بھرے انداز میں بولا۔ "یور آنر! مظلومہ کے طبی معائنے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا

ہے..... مظلومہ کے میڈیکل ٹیسٹ سے بھی پتا چلا ہے کہ وہ کسی خواب آور شے کے زیر اثر رہی تھی۔ اس کے بیڈروم سے ملنے والا کیمیکل زدہ رومال بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے کہ مظلومہ کو مبینہ زیادتی کا نشانہ بنانے سے پہلے اس کے اعصاب اور قوت مزاحمت کو معطل کیا گیا تھا....." اس نے ذرا توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو ختم کرتے ہوئے بولا۔

"علاوہ ازیں پولیس نے اس بیڈشیٹ کا بھی لیبارٹری ٹیسٹ کرایا ہے جس کے اوپر یہ قبیح فعل وقوع پذیر ہوا تھا۔ مذکورہ بیڈشیٹ پر ایسے مخصوص دھبے پائے گئے ہیں جن سے ملزم کا جرم ثابت ہوتا ہے..... دیٹس آل یور آنر!"

جرح ختم کرنے کے بعد وکیل استغاثہ اپنی مخصوص سیٹ پر جا بیٹھا تو جج کی اجازت حاصل کر کے میں اٹھ کر وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے ملزم یعنی اپنے موکل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے دھیمے انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

"مسٹر امین! ابھی تم نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں بتایا ہے کہ تم مظلومہ یعنی اپنی پڑوسن کے حسن و خوبصورتی سے متاثر ہو گئے تھے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد جب اس کی اصلیت تم پر واضح ہوئی تو تمہیں اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں جناب..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے تصدیقی انداز میں جواب دیا۔ "میں نے یہی بیان دیا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے۔"

"ایسا کیا ہو گیا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے تم نے جس چہرے کو اپنے دل میں بسایا تھا اور بڑی جرأت مندی سے اس کی تعریف بھی کی تھی، اچانک اسی شخصیت سے نفرت ہو گئی۔" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "پڑوسن کی کون سی اصلیت تم پر آشکار ہوئی تھی؟"

"اس کا کردار!" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں دوسرے مردوں کو گھر میں بلاتی تھی۔ جب میں نے اس کے یہ لچھن دیکھے تو مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی۔ بس اتنی سی بات ہے جناب.....!"

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے مسٹر امین!" میں نے دانستہ ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اپنی پڑوسن کی اصلیت جاننے کے بعد تم خاموش نہیں بیٹھے رہے بلکہ اس کے کرتوتوں کے بارے میں اس کے شوہر گلزار کو بھی بتا دیا جس کے نتیجے میں میاں بیوی میں زبردست جھگڑا بھی ہوا

تھا اور اس پر کہتے ہو..... یہ تو میرا فرض تھا۔"

"جی ہاں، میں اب بھی یہی کہوں گا کہ یہ میرا فرض تھا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اصرار بھرے لہجے میں بولا۔ "ایک بدکردار عورت میرے پڑوس میں آ کر آباد ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بوڑھے شوہر کو الو کا پٹھا بنا کر رکھا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں غیر مردوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنے فلیٹ کے اندر کرتی تھی لیکن جناب فلیٹ سسٹم ایک محلے داری کی طرح ہوتا ہے۔ انسان کو اپنے آس پڑوس پر گہری نظر رکھنا پڑتی ہے کہ کہیں دوسرے کا وبال اپنے سر پر نہ آ جائے۔ ہماری اپارٹمنٹس بلڈنگ میں عزت دار اور شریف لوگ رہتے ہیں۔ ایسا تھوڑی ہے کہ آپ کے پڑوس میں چکلا کھل جائے اور آپ دانتوں میں زبان دبائے خاموش بیٹھے رہیں۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"جناب! میں نے تو بڑی شرافت کا ثبوت دیا کہ اس بدذات کے شوہر سے بات کی اور وہ بھی بالکل علیحدگی میں، ورنہ میں اپنے پڑوس کی اس گندگی کو پولیس میں بھی لے کر جا سکتا تھا یا اس معاملے کو بلڈنگ کی کمیٹی کے سامنے رکھ سکتا تھا اور..... میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر گلزار کو بتانے کے باوجود بھی حرام کاری کا یہ کھیل جاری رہا تو میں رفیق ہمدانی کو سب کچھ بتا دوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور اس مکار عورت نے مجھے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے ہوئے اس شرمناک کیس میں الجھا دیا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر یہ کہنے کو تیار ہوں کہ میں اسی فتنہ پرور عورت کی سازش کا شکار ہوا ہوں۔"

"تم نے ابھی رفیق ہمدانی کا ذکر کیا ہے۔" میں نے [illegible] پوچھا۔ "یہ کون صاحب ہیں؟"

"رفیق ہمدانی صاحب "خدیجہ پرائڈ" کی کمیٹی کے صدر ہیں۔" امین نے بتایا۔ "ان کے ساتھ معظم بھائی بھی ہوتے ہیں، یہ دونوں مل کر کمیٹی چلاتے ہیں۔"

"مسٹر امین! ابھی تم نے اپنی پڑوسن اور مبینہ مظلومہ کے کردار کا جو پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا یہ معاملات تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے..... یعنی اس کے شوہر کے غیاب میں غیر مردوں کی آمد و رفت؟"

"جی ہاں!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں نے اپنی ان گناہگار آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"کیا ہر بار تم نے کسی ایک ہی مرد کو آتے جاتے دیکھا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جواباً بولا۔ ''میں نے تو ایک ہی چیز سے کوئی چار مرتبہ حاضری دیتے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ [illegible] ہوتے ہوں تو مجھے خبر نہیں۔ میں دن بارہ بجے سے رات دس بجے تک دکان میں مصروف رہتا ہوں۔ بس کھانے کے لیے دوپہر میں ایک آدھ گھنٹے کو گھر آجاتا ہوں...... آپ جانتے ہیں، مجھے اپنی دادی کے کھانے پینے کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

''ہاں، یہ بات میرے علم میں ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''ابھی تم نے اپنی پڑوسن کے گھر میں جس آدمی کی آمدورفت کا ذکر کیا ہے، اگر وہ یا اس کی تصویر تمہارے سامنے آئے تو کیا تم اسے پہچان لو گے؟''

''کیوں نہیں جناب!'' وہ بڑے کرارے لہجے میں بولا۔ ''سو فیصد پہچان لوں گا۔''

میں نے جرح کا زاویہ تھوڑا سا تبدیل کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ شاہ صاحب کا کیا چکر ہے...... ایک استغاثہ نے کہا ہے کہ کمال شاہ کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے؟...... اس کے ساتھ ہی تم نے بتایا ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود بھی تم شاہ صاحب کا انکار نہیں کرسکتے تھے......''

''جناب! کمال شاہ صاحب ایک ایسی شخصیت تھے کہ کوئی بھی ان کی بات سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔'' وہ افسردہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اپنے پرائے سب ان کا احترام کرتے تھے۔ ہماری بلڈنگ میں وہ واحد چھڑے چھانٹ تھے اور کسی بھی فیملی والے کو ان کی یہاں رہائش پر اعتراض نہیں تھا۔ وہ بزرگ آدمی تھے۔'' اس نے توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی شاہ صاحب کا انتقال ہوا ہے...... آج سے ٹھیک ایک ماہ پہلے۔''

''اوکے...... اب ہم واقعہ کی رات کی طرف آتے ہیں۔'' میں نے بڑی روانی سے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم اپنی دکان...... مطلب یہ کہ مشتاق کی دکان سے چھٹی کرکے گھر پہنچے تو تمہاری پڑوسن نے فیوز کی تبدیلی کے حوالے سے شاہ صاحب مرحوم و مغفور سے بات کر رکھی تھی۔ شاہ صاحب نے معذرت کرتے ہوئے تم سے یہ کام کرنے کو کہا اور تم انکار نہ کرسکے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں...... بالکل درست!''

''تم نہ چاہتے ہوئے بھی، اپنے دل پر جبر کرکے پڑوسن کے گھر میں داخل ہوگئے۔'' میں نے کہا۔ پھر سوال کیا۔ ''کیا شاہ صاحب تمہاری اس پڑوسن سے [illegible] اس کے کردار سے واقف تھے؟''

''جی نہیں...... بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر انہیں ان معاملات کی بھنک بھی ہوتی تو وہ مجھے کسی بھی قیمت پر اس فاحشہ کے گھر میں جانے کو نہ کہتے۔''

''ٹھیک ہے......!'' میں نے جرح کے زاویے کو تھوڑا اور گھماتے ہوئے پوچھا۔ ''ذرا یہ بتاؤ کہ فیوز کی تبدیلی کا کیا چکر ہے؟''

''جناب! ہماری بلڈنگ میں بجلی کے تین فیوز آتے ہیں۔ کل فلیٹ پینتالیس ہیں۔ ہر پندرہ فلیٹ ایک فیوز پر ہیں۔ جب تینوں فیوز آرہے ہوتے ہیں تو پوری بلڈنگ روشن دکھائی دیتی ہے۔ ایک فیوز نہیں آرہا ہو تو پندرہ فلیٹ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں اور دو فیوز نہیں آرہے ہوں تو تیس فلیٹ۔ اسی طرح اگر تینوں ہی فیوز غائب ہو جائیں تو سمجھیں گھپ اندھیرا چھا جائے گا......''

اس نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ایک فیوز کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے بعض لوگوں نے اپنے گھر میں ''اسسٹم'' بنا رکھے ہیں۔ ایک بورڈ پر مختلف پن اور کلپ (کٹ آؤٹ) وغیرہ لگا کر دوسرا فیوز بھی لے رکھا ہے تاکہ جب ایک فیوز اڑ جائے تو دوسرے فیوز سے استفادہ کیا جائے۔ اس کے لیے کلپ یعنی کٹ آؤٹ کو تبدیل کرنا پڑتا ہے۔''

''کیا تم نے بھی اپنے گھر میں یہ سسٹم لگا رکھا ہے؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ''تو تمہاری پڑوسن کے ہاں یہ سہولت میسر ہے؟''

اب اس کی گردن نے اثبات میں جنبش کی۔ ''جی ہاں...... جب سے گلزار نے نوری سے شادی کی ہے، گھر میں فیوز چینج کا سسٹم بھی لگوا لیا ہے۔ سنا ہے، نوری کو گرمی بہت لگتی ہے۔ گلزار کی پہلی بیوی بڑی صابر شاکر تھی۔ ہر حال میں گزارہ کر جاتی تھی۔ اللہ اس کو جنت نصیب کرے۔''

''اوہ......!'' میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''تو کیا گلزار کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے؟''

''جی...... صفیہ ایک سال پہلے فوت ہوئی تھی۔'' اس نے

جواب دیا۔ ''اس کے انتقال کے کچھ عرصے بعد ہی تو گلزار نے نوری سے شادی کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں، صفیہ کو نوری کا غم کھا گیا تھا......''

''نوری کا غم......!'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

یہ تمام تر حالات و واقعات میرے علم میں تھے لیکن چونکہ ان تمام پوائنٹس کو عدالت میں رجسٹر کرانا ضروری تھا اس لیے میں چونکے ہوئے انداز میں یہ ڈراما کر رہا تھا۔

''جی، نوری کا غم!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''صفیہ نے گلزار کا خاصا طویل ساتھ دیا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ ان دونوں نے شادی شدہ زندگی کے بیس سال ایک ساتھ گزارے تھے۔ بس، صفیہ کی بدقسمتی کہ وہ گلزار کو باپ بنانے میں کامیاب نہ ہوسکی اور اس میں اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں تھا......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''بہرحال، صفیہ کے انتقال سے کوئی سال بھر پہلے نوری، گلزار کی زندگی میں ٹپک پڑی۔ نوری ایک شادی شدہ عورت تھی۔ اس کے شوہر انوار کی بجلی مارکیٹ میں ہارڈ ویئر کی دکان ہے۔ نوری کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ آئے دن ان میں سر پھٹول ہوتی رہتی تھی۔ بجلی مارکیٹ ہی میں گلزار کی بھی کریانے کی دکان ہے جسے وہ جنرل اسٹور کہتا ہے۔ نوری، گلزار کی دکان سے سودا وغیرہ لیا کرتی تھی۔ بس، وہیں ان کی سیٹنگ ہوگئی اور نوری کے گھر میں سودا مفت میں جانے لگا۔ یہ معاملہ زیادہ عرصے تک صفیہ سے چھپا نہ رہ سکا۔ اس نے گلزار کو سمجھانے کی کوشش کی تو گھر میں لڑائی جھگڑا شروع ہوگیا۔ اسی دوران میں نوری کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔ کچھ عرصے کے بعد گلزار نے نوری سے شادی کرلی۔ صفیہ نے اس پر جب احتجاج کیا تو گلزار نے اسے طلاق دے کر اپنے گھر سے نکال دیا۔ صفیہ اپنی بہن کے گھر چلی گئی، پھر چند ماہ بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ یہ ہے کل کہانی جناب......''

''بڑی افسوسناک کہانی ہے۔'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا، پھر اصل موضوع کی طرف آگیا۔

''امین! شاہ صاحب کی درخواست پر جب تم مقتولہ کے فلیٹ میں داخل ہوئے تو اس کے بعد کیا ہوا تھا؟'' میں نے اپنے موکل سے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے [illegible]

[illegible] راحت و سکون پر گفتگو کر رہے تھے، کسی شاگرد نے دوران گفتگو پوچھا۔ ''انسان راحت کس چیز سے حاصل کرسکتا ہے؟''

[illegible] نے جواب دیا۔ ''تمہارا سوال [illegible] کہ راحت کے بارے میں جاننا چاہتے ہو، جسم کی، دل کی یا زبان کی؟''

شاگرد نے پھر کر جواب دیا۔ ''تینوں کی۔''

استاد نے جواب دیا۔ ''جسم کی راحت کم کھانے میں، دل کی راحت کم گناہوں میں اور زبان کی راحت کم کلام میں ہے۔''

راحت

مرسلہ: ممتاز [illegible]، کراچی

کے فیوز کا کٹ آؤٹ تبدیل کیا، اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اپنے گھر آگیا۔''

''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' میرے استفسار میں تیزی آگئی۔

''میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ دکان سے گھر آنے کے بعد میں پہلے نہاتا ہوں پھر دادی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''واقعہ کے روز بھی میں نے یہی کیا لیکن جب میں نہا رہا تھا تو ایک غیر معمولی بات کے تحت چونک اٹھا۔ ہمارا اور نوری کا فیوز ایک ہی تھا۔ جب اس کا فیوز گم ہوا تھا تو ہمارا بھی نہیں آرہا تھا۔ ہمارے ہاں تو کٹ آؤٹ کی تبدیلی کا سسٹم نہیں تھا۔ اگر یہ فیوز گیا ہوا تو ہمارے گھر میں لائٹ نہیں ہونا چاہیے تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ نوری نے پہلے اپنے فیوز کا کٹ آؤٹ نکالا اور پھر مجھے دھوکے سے اپنے گھر میں بلایا لیکن کیوں...... اس دھوکے سے وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی؟''

وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ سوال چند منٹ تک میرے دماغ میں چکراتا رہا، پھر میں جیسے ہی نہا کر فارغ ہوا، مجھے اس سوال کا جواب مل گیا......''

''کیا جواب ملا؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں کپڑے پہن کر واش روم سے نکلا ہی تھا کہ باہر شور سنائی دیا۔'' ملزم امین نے بتایا۔ ''پھر ہماری ڈور بیل بجی، اس کے ساتھ ہی ہمارا دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جانے لگا۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھبرا کر دروازہ کھول دیا کہ دیکھوں تو باہر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ واقعی باہر ایک قیامت برپا تھی۔ کوریڈور میں درجنوں عورتیں اور مرد موجود تھے جن میں مظلومہ اور رفیق بند حانی بھی شامل تھے۔ یہ تمام افراد ہماری بلڈنگ ہی کے رہائشی تھے اور وہ سب کے سب نفرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی نگاہوں کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”کیا ہو گیا؟...... میرے اس سوال کے جواب میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ...... میں نے اپنی پڑوسن لوری کی عزت کا جنازہ نکال دیا ہے......“

بیان مکمل کرنے کے بعد ملزم نے گردن جھکا دی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں......؟“

آئی او وحید مرزا عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ جج کے اشارے پر وہ وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے قریب پہنچا اور اس کی آنکھوں میں شناسائی کا شائبہ تک تلاش کرتے ہوئے روکھے لہجے میں سوال کیا۔

”مرزا صاحب! آپ کو مبینہ زیادتی کے اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“

”ہمارے روزنامچے کے ریکارڈ کے مطابق، اطلاع وقوعہ کی رات کوئی پونے گیارہ بجے دی گئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اطلاع فراہم کرنے والے شخص کا نام رفیق بند حانی تھا جو اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کی یونین کا صدر بھی ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ رفیق بند حانی نے فون کر کے بتایا تھا کہ ان کی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے۔“

”آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”ٹھیک گیارہ بجے۔“

”پھر آپ نے ملزم کو گرفتار کیا......؟“

”اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا......!“ اس نے کندھے اچکائے۔

میں نے پوچھا۔ ”جائے وقوعہ کی کارروائی کیا تھی؟“

”ہم نے جائے وقوعہ پر موجود مظلومہ کے شوہر کے علاوہ بھی چند افراد کے بیانات قلم بند کیے تھے جو ملزم کی مخالفت میں جاتے ہیں۔“

”اور مظلومہ کا بیان؟“

”وہ تو سراسر ملزم کے خلاف ہے۔“

”آپ کی مبینہ مظلومہ کا طبی معائنہ کیا کہتا ہے؟“

”طبی معائنے نے اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی مکمل تصدیق کی ہے۔“

”دیگر شواہد کی کیا تفصیل ہے؟“

”بیڈ شیٹ پر ایسے دھبے پائے گئے تھے کہ اسے لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھجوانا پڑا۔“ آئی او نے فخریہ انداز میں بتایا۔ ”اور اس ٹیسٹ کی رپورٹ بھی ملزم کے خلاف ہے۔“

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا اس رپورٹ میں ملزم کا نام بھی آیا ہے......؟“

”کیا مطلب......؟“ وحید مرزا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ......“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا بیڈ شیٹ کے معائنے کی رپورٹ میں اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ آپ کی مبینہ مظلومہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ذمے دار میرا موکل ہے؟“

”جی نہیں......“ اس نے الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھا۔ ”رپورٹ صرف اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اس بیڈ شیٹ پر مذکورہ فعل وقوع پذیر ہوا ہے۔“

”اسی طرح مظلومہ کا طبی معائنہ بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ مذکورہ فعل سے گزری ہے۔“ میں نے جلدی جلدی کہا۔ ”لیکن یہاں بھی ملزم کی جانب کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ پھر......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر جارحانہ انداز میں آئی او سے پوچھا۔

”پھر آپ کس بنیاد پر میرے موکل کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں...... اگر آپ کی مبینہ مظلومہ کسی فعل سے گزری ہے یا اسے کسی فعل سے گزارا گیا ہے تو اس میں میرے موکل کا کیا قصور ہے؟“

”وکیل صاحب!“ انکوائری آفیسر وحید مرزا گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ملزم کو اس بنا پر قصوروار ٹھہرایا جا رہا ہے کہ مظلومہ نے اسے اپنا مجرم قرار دیا ہے۔ ہمارے پاس یہ واقعاتی ثبوت ہیں کہ ملزم، مظلومہ کے فلیٹ میں گیا، رومال سنگھا کر اسے بے بس کیا اور اپنی خباثت کی تکمیل کے بعد وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ ملزم نے خود اس امر کا اقرار کیا ہے کہ وہ مظلومہ کے فلیٹ کے اندر گیا تھا اور......“ وہ گیلے رومال کو سانس بیٹھنے کے لیے تھا بچا رہا تھا نذر کرتے ہوئے بولا۔

”ہمارے لیے سب سے اہم شے مظلومہ کا طبی معائنہ اور اس کا حلفیہ بیان ہے اور یہ دونوں چیزیں ملزم کے خلاف جاتی ہیں۔“

”اور میرے لیے سب سے اہم شے میرے موکل کا طبی معائنہ اور اس کا حلفیہ بیان ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے خاصے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میرے موکل کا حلفیہ بیان اس کے حق میں جاتا ہے اور اس کا طبی معائنہ تو آپ نے کرایا ہی نہیں حالانکہ آپ کی مظلومہ کی طرح میرے موکل کا طبی معائنہ بھی بے حد ضروری تھا...... آپ کا اس طرف دھیان کیوں نہیں گیا تھا؟“

”ہم اتنے نچے بچے تو نہیں ہیں وکیل صاحب!“ وہ طنزیہ انداز میں مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا دھیان تو سب سے پیشتر اس طرف گیا تھا لیکن چالاک ملزم نے یہاں بھی ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ وہ اپنے جرم کے ثبوت کو مٹانے کے لیے گھر جاتے ہی نہا لیا تھا۔ جب ہم نے اسے گرفتار کیا تو وہ نہا دھو کر اجلا لباس پہن چکا تھا۔ اس صورت میں اس کے طبی معائنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا اس لیے ہم نے ایسی کوشش نہیں کی۔“

”ڈیوٹی سے آنے کے بعد غسل کرنا میرے موکل کی عادت میں شامل تھا اور اس امر کو ثابت کرنے کے لیے میں دس گواہ بھی پیش کر سکتا ہوں۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”ملزم نہایا ہوا تھا تو کیا ہوا، آپ بیڈ شیٹ کے ساتھ ملزم کے لباس کو بھی لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیج سکتے تھے تاکہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی کہ آپ کی مظلومہ کے ساتھ ہونے والی مبینہ زیادتی کا ذمے دار میرا موکل ہی تھا۔“

”آپ اپنے موکل کو جتنا سیدھا سادہ سمجھ رہے ہیں یہ ویسا ہے نہیں......“ آئی او نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب......؟“ میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ جواب میں بتانے لگا۔ ”جناب! اس شاطر نے نہانے سے پہلے اپنے اترے ہوئے لباس کو سرف اور پانی کے ایک ٹب میں بھگو کر رکھ دیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں، ہم اس بھیگے ہوئے اور سرف لگے ہوئے آلودہ لباس کو لیبارٹری بھجوا کر کیا کرتے؟“

”واقعی، آپ کے ساتھ تو بڑی زیادتی ہوئی ہے۔“ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنے موکل کو بہت چھپا کر رکھنا پڑے گا۔“

”چھپا کر رکھنا پڑے گا...... کیا مطلب؟“ آئی او نے بے ساختہ پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”اس کی نہانے کی عادت کی وجہ سے...... اور کیوں؟“

”اس کے نہانے کو کیا ہوا ہے......؟“ اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

”آپ نے میرے موکل کے جو خواص بیان کیے ہیں......“ میں نے گہری سنجیدگی سے اس پر چوٹ کی۔ ”ان کی روشنی میں مجھے ڈر ہے کہ اس بندے کو کوئی اغوا نہ کر لے......“

”اغوا......!“ اس نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ”اسے کون اغوا کرے گا؟“

”آئی او صاحب!“ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ بندہ کبھی ایم آئی، آئی بی، آئی ایس آئی اور آئی آئی اے والوں کی خاص نظر میں نہ آئے لیکن امریکی اور یورپی انجینئرز کی نظر سے یہ نہیں بچ سکے گا۔ ایسے مجسم ملٹری اوزار کو تو وہ اغوا کر کے اپنے ملک لے جائیں گے اور اس کی برین واشنگ کر کے اپنا مطیع و فرماں بردار بنا کر ”کام“ سے لگا دیں گے...... ساری زندگی انہوں نے یہی کیا ہے......!“

وہ بگلا سا ہو کر مجھے گھورنے لگا۔ میں نے بآواز بلند کہا۔

”آپ استغاثہ کے ان معزز گواہوں کو کب عدالت میں پیش کر رہے ہیں جن کا زور بیان میرے موکل کو عبرت ناک سزا کا مستحق ٹھہرائے گا......؟“

”ان شاء اللہ! آئندہ پیشی سے گواہوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔“

”ان شاء اللہ! اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ میں نے بڑے وثوق سے کہا۔

وہ چونکا اور جزبز ہو کر پوچھا۔ ”آپ اتنی بڑی بات کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟“

میں نے آئی او کے استفسار کو جوتے کی نوک پر مارا اور روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا مخصوص اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈجرنڈ......!“

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن میں ...... روز قبل کے منظر کے تیور اور جارحانہ موڈ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سانحہ عدالت میں پہنچا تھا۔ میرے اس مزاج دوست کا ایک
خاص سبب تھا کہ میں نے اپنے ذہن میں بہت کچھ پلان کر
رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ کیس ہلکی پھلکی طرح سے برخاست
ہو جائے۔ مجھے آج اس کیس کے تابوت میں آخری کیل
ٹھونکنی تھی۔ اس سلسلے میں کام آنے والے تمام تر کیل کانٹے
اور ہتھوڑا وغیرہ میرے ’’پاس‘‘ موجود تھیں۔

اس سے پہلے کہ استغاثہ کی جانب سے استغاثہ کے
گواہوں کو پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا، میں نے جج سے
مخاطب ہوتے ہوئے استدعا کی۔

’’جناب عالی! میں صرف دس منٹ کے لیے مسز
مظلومہ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں، اگر معزز عدالت کو
کوئی اعتراض نہ ہو......‘‘

جج نے ایک لمحہ سوچا اور پھر مجھے اجازت دے دی۔

نوری اس سے پہلے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا چکی
تھی۔ اس نوعیت کے مجرمانہ حملے کا نشانہ بننے والی لڑکیاں اور
عورتیں عموماً اپنا بیان تحریری شکل میں داخل کرتی ہیں مگر پہلے
ایک ابتدائی پیشی پر نوری نے جس بہادری اور جرأت مندی
سے حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تھا، وہ اس کی بے حیائی اور بے
باکی کی نشاندہی کرتا تھا۔ وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے
پولیس کے روبرو دے چکی تھی اور اسی بیان کی بنا پر پولیس نے
میرے مؤکل کو ملزم گردانتے ہوئے حوالۂ عدالت کیا تھا۔
مظلومہ نے مجرمانہ حملے کی تفصیل کو جس بے باکی اور
’’جرأت مندی‘‘ سے بیان کیا تھا تقاضائے اخلاق اس کاروائی
کو تحریر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

نوری کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی لیکن دیکھنے
میں وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آتی تھی۔ وہ بمشکل چوبیس
پچیس کی لگتی تھی۔ وہ جاذب نظر اور پرکشش نقوش کی حامل
ایک خوبصورت گوری چٹی عورت تھی۔ نوری کی آنکھوں میں
ایک خاص قسم کی مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی جو سامنے
والے کو بے بس کر کے رکھ دیتی تھی۔

نوری نے موسم کی مناسبت سے ایک خوش نما لباس
زیب تن کر رکھا تھا اور بال جدید انداز میں کندھوں تک کٹوا
رکھے تھے۔ دوپٹے کو سر پر اوڑھنے کے بجائے گلے میں ڈال
رکھا تھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور شائستگی کو دیکھ کر
قطعی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے وہ کسی مجرمانہ حملے کا
نشانہ بن چکی تھی۔ اس کی شخصیت، ناز و انداز اور سجاوٹ سے
یہی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ شاپنگ وغیرہ کے لیے گھر سے نکلی ہے
یا پھر کسی پارٹی کے لیے تیار ہو کر جانے کا ارادہ ہے۔

میں نے اپنی جرح کا آغاز خاصے خشک اور جارحانہ
انداز میں کیا۔ ’’نوری صاحبہ!‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں
دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ’’گلزار سے آپ کی شادی کو کتنا
عرصہ ہوا ہے؟‘‘

’’لگ بھگ ایک سال ہونے والا ہے۔‘‘ اس نے
ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

’’کیا یہ سچ ہے کہ گلزار کی پہلی بیوی صفیہ کا انتقال آپ
کی وجہ سے ہوا تھا؟‘‘

’’یہ سچ نہیں ہے۔‘‘ وہ بڑی رسان سے بولی۔ ’’صفیہ
طبعی موت مری ہے۔ اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔‘‘

’’آپ کی وجہ سے گلزار نے صفیہ کو طلاق دے دی
تھی۔‘‘ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے
کہا۔ ’’وہ اس صدمے سے نڈھال ہو کر اپنی بہن کے گھر چلی گئی
اور پھر وہیں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کا ایک
سبب بہرحال آپ ہیں......؟‘‘

’’یہ تاثر بالکل غلط ہے کہ گلزار نے میری وجہ سے صفیہ
کو طلاق دی تھی۔‘‘ نوری نے کسی منجھے ہوئے کھلاڑی کے
مانند کہا۔ ’’طلاق کا مطالبہ صفیہ کی طرف سے آیا تھا جبکہ
گلزار تو ہم دونوں کو ایک چھت کے نیچے رکھنا چاہتا تھا۔ صفیہ
نے گلزار کی دوسری شادی پر گھر میں فساد ڈالا اور طلاق کا
مطالبہ کر دیا۔ گلزار نے تنگ آ کر اس کی یہ خواہش پوری کر
دی اور میں سمجھتی ہوں گلزار کا فیصلہ بالکل درست تھا......‘‘ وہ
لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر عجیب سے لہجے میں اضافہ
کرتے ہوئے بولی۔

’’جو عورت پندرہ بیس سال میں اپنے میاں کو ایک بچہ
نہ دے سکے، اس کو آخر کہاں تک برداشت کیا جا سکتا ہے۔‘‘

’’اگر چند سال کے بعد آپ کی گود بھی ہری نہ ہوئی تو
کیا یہی فارمولا آپ پر بھی اپلائی کیا جا سکتا ہے؟‘‘ میں نے
چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

’’مجھ میں اور صفیہ میں زمین آسمان کا فرق ہے وکیل
صاحب!‘‘ وہ بڑے فخر سے بیجان کر بولی۔

میں نے اس کے سوال کے پیش نظر پوچھنا ضروری
جانا۔ ’’مثلاً کیا فرق ہے...... آپ میں سے زمین کون ہے اور
آسمان کون؟‘‘

’’میں آسمان ہوں، صفیہ زمین تھی......‘‘ وہ بڑے
غرور سے بولی۔

’’ذرا وضاحت کریں نوری صاحبہ!‘‘ میں نے دلچسپی
لیتے ہوئے پوچھا۔

میں نے جج سے صرف دس منٹ کی اجازت لے کر
مظلومہ نوری سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا تھا اور دس
منٹ کی یہ مدت پوری ہو چکی تھی لیکن جرح جتنی دلچسپ اور
معلومات افزا ثابت ہو رہی تھی اس نے سب کو باندھ کر رکھ دیا
تھا۔ جج نے مجھے ٹوکنے کی کوشش کی اور نہ ہی وکیل استغاثہ نے
کوئی اعتراض بلند کیا لہٰذا میں بڑی ثابت قدمی سے اپنے
’’کام‘‘ میں لگا رہا۔

نوری نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔
’’عورت کے دل اور دماغ میں اگر گنجائش ہو اور وہ گھریلو
معاملات کو ہینڈل کرتے ہوئے سمجھداری کا ثبوت دے تو
اڑیل سے اڑیل مرد کو بھی مٹھی میں کیا جا سکتا ہے اور گلزار تو
بہت ہی سیدھا اور شریف النفس انسان ہے......‘‘ وہ بولتے
بولتے رکی، ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے
بڑھاتے ہوئے بولی۔

’’گلزار نے مجھ سے شادی کی تو صفیہ نے گھر میں ایسا
فساد برپا کیا کہ گھر میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ آئے
روز کے لڑائی جھگڑوں اور صفیہ کے طلاق والے مطالبے سے
تنگ آ کر گلزار نے اسے فارغ کر دیا۔ اگر صفیہ کی جگہ میں
ہوتی تو ہرگز ایسی حماقت کا ثبوت نہ دیتی......‘‘

’’یعنی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ اگر آج گلزار کسی اور
عورت سے شادی کر لیتا ہے تو آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا؟‘‘
میں نے اسے پاکرنے کی غرض سے کہا۔ ’’آپ اپنی سوتن
کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے ہنسی خوشی زندگی گزار لے
لیں گی۔‘‘

’’بالکل...... اس میں ایسی پریشانی اور حیرانی والی کون
سی بات ہے۔‘‘ وہ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بولی۔ ’’وکیل
صاحب! اگر ہمارے مذہب نے ایک مرد کو ایک وقت چار
بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے تو ہمیں اپنے مذہب کے
احکامات کا احترام کرنا چاہیے۔ اگر کوئی مرد انصاف کے
تقاضے پورے کر سکتا ہے اور اس میں ہمت ہے تو ایک وقت
میں اسے چار شادیاں کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔‘‘

’’میں مذہب اور شریعت کی بحث میں تو نہیں پڑوں گا
کیونکہ یہ میرا موضوع اور زیرِ سماعت کیس کا معاملہ نہیں
ہے۔‘‘ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
’’لیکن آپ پہلی خاتون ہیں جو دوسری، تیسری اور چوتھی
شادی کے معاملات میں مردوں کی حمایت میں یوں بڑھ
چڑھ کر بول رہی ہیں۔ میں آپ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔‘‘
بات کے اختتام پر میں نے باقاعدہ ہاتھ کو پیشانی سے
لگا کر نوری جیسی مظلومہ کو سلام بھی کیا۔ وہ بڑے دل آویز
انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکان میں کسی تیز فریب کی دعوت
نامہ چھپا تھا۔ ان لمحات میں میرے ’’مؤکلات‘‘ کو دیکھ کر وہ
یہی سمجھ رہی ہوگی کہ میں اس کے دام میں آ گیا ہوں۔ بے چاری
تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں آگے اسے کون کون سا سرپرائز دینے
والا ہوں۔

یہاں سے میں نے سوالات کے زاویے اور موڑ کو
بالکل تبدیل کر دیا۔ اگر ابھی تک کسی طرف سے اعتراض نہیں
آیا تھا تو کسی بھی وقت آ سکتا تھا لہٰذا مجھے اب اپنے مقصد سے
چپک جانا چاہیے تھا۔ حاضرینِ عدالت کی تفریحِ طبع کا سامان
بہت ہو چکا تھا۔

’’عورت کے دل و دماغ میں اگر گنجائش ہو اور وہ
گھریلو معاملات کو ہینڈل کرتے ہوئے سمجھداری کا ثبوت
دے تو اڑیل سے اڑیل مرد کو بھی بآسانی مٹھی میں کیا جا سکتا
ہے۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تصدیق
طلب لہجے میں پوچھا۔ ’’تھوڑی دیر پہلے آپ نے ان ہی
زریں خیالات کا اظہار کیا ہے......؟‘‘

’’جی ہاں......!‘‘ اس نے بڑے اعتماد سے اثبات
میں گردن ہلائی اور کہا۔ ’’میں اپنے کہے ہوئے الفاظ پر ثابت
قدم ہوں۔‘‘

’’ویری گڈ!‘‘ میں نے ستائشی نظر سے نوری کو دیکھا
اور کہا۔ ’’آپ کی یہ ثابت قدمی میرے مؤکل کے لیے پروانۂ
بریت ثابت ہونے والی ہے۔‘‘

’’جی...... جی......‘‘ وہ پہلی مرتبہ گڑبڑائی۔ ’’کیا
مطلب ہے آپ کا؟‘‘

میں نے اسے مطلب سمجھانا ضروری نہ جانا اور گہرے
لہجے میں پوچھا۔ ’’نوری! کیا یہ درست ہے کہ گلزار سے پہلے
آپ انوار نامی ایک شخص کی منکوحہ ہوا کرتی تھیں...... وہ انوار
جس کی ادھر محلے اور مارکیٹ میں پرچون کی دکان ہے......؟‘‘

’’ہاں...... یہ درست ہے......‘‘ اس نے مختصر سے
لہجے میں جواب دیا۔

’’انوار کے ساتھ آپ کی شادی کتنا عرصہ قائم رہی؟‘‘

’’صرف تین سال!‘‘

’’صرف تین سال......!‘‘ میں نے دائیں ہاتھ کی تین
انگلیاں نکال کر نوری کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا
پھر پوچھا۔ ’’شادی میں ناکامی کا سبب کیا تھا؟‘‘

’’انوار ٹھیک آدمی نہیں تھا......‘‘ وہ گول مول انداز میں
بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے کوئی سوال نہیں، صاف اور واضح جواب چاہیے تھا لہٰذا میرے سوالات میں جھنجھلاہٹ اور تیزی آ گئی۔ اب میں اسے چاروں خانے چت کیے بغیر چھوڑنے والا نہیں تھا۔

"سچ آدمی نہیں تھا..... کیا مطلب؟" میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ "کیا اس کی بازار میں کریانے کی دکان اچھی طرح نہیں چلتی تھی اور گھر میں معاشی پریشانی نے ڈیرا ڈال رکھا تھا؟"

"نہیں..... دکان تو اس کی اچھی خاصی چلتی تھی!" وہ متذبذب لہجے میں بولی۔

"کیا انور کوئی خطرناک اور قابل مذمت نشہ کرتا تھا؟"

"جی نہیں!"

"اسے جوا وغیرہ کھیلنے کی عادت تھی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا وہ دوسری عورتوں کا رسیا تھا؟"

"قطعاً نہیں!" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

"کیا آپ کا سابق شوہر کسی لاعلاج مرض میں مبتلا تھا؟"

"نہیں جناب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی....."

"کیا وہ وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے قابل نہیں تھا؟" میں نے اس کی پسپائی کو آخری دیوار سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "اسے کسی خاص قسم کے پوشیدہ علاج کی ضرورت تھی.....؟"

"اس کے ساتھ ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔"

"پھر کیا مسئلہ تھا اس کے ساتھ.....؟" میں نے جج سے مشابہ لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ نے ایک اچھے خاصے، بھلے مانس اور شریف النفس انسان کو چھوڑ کر دوسری شادی کیوں کی.....؟"

نوری نے پریشان ہو کر امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا تو اسی لمحے وکیل استغاثہ کو اپنے فرائض کا خیال آ گیا۔ وہ بڑے جارحانہ انداز میں احتجاجی صدا بلند کرتے ہوئے بولا۔

"آبجیکشن یور آنر! میرے فاضل دوست مظلومہ کے ساتھ بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔ انہیں اس کوشش سے روکا جائے.....!"

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "ایک تو میرے موکل کو مظلومہ کے ساتھ زیادتی کے الزام میں پھنسا دیا گیا ہے..... عدالت

اور جیل میں گھسیٹا جا رہا ہے اور اب بھی الزام مجھ پر عائد کرنے کا منصوبہ بن رہا ہے..... اللہ خیر کرے!"

وکیل استغاثہ نے جلالی انداز میں کہا۔ "..... نے صرف دس منٹ کی اجازت حاصل کر کے مظلومہ کا ذکر شروع کیا تھا اور اب آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔ مظلومہ کی پہلی شادی کی ناکامی کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میرے فاضل دوست اس فضول بحث سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

"..... !" میں نے نہایت ٹھہرے ہوئے انداز میں وکیل استغاثہ کی حماقت بڑھنے کا عمل شروع کرتے ہوئے جج سے کہا۔ "جناب عالی! جب تک میرا کوئی سوال بیوہ مظلومہ کی پہیلیوں میں نہیں الجھ رہا تھا، استغاثہ کو قطعاً خیال نہیں آیا کہ عدالت کا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے بلکہ حاضرین عدالت کے ساتھ ہی آئی او صاحب اور وکیل سرکار بھی اس سنسنی خیز اور دلچسپ پچویشن کو انجوائے کر رہے تھے اور جیسے ہی بیوہ مظلومہ کو میرے سوالات کے جوابات دینے میں دشواری محسوس ہوئی تو ..... اعتراض سامنے آ گیا جو میری نظر میں اعتراض برائے اعتراض سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں....."

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے متحمل انداز میں کہا۔ "جناب عالی! میں بڑے احترام و ذمے داری اور دعوے کے ساتھ معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ بیوہ مظلومہ کی پہلی شادی کی ناکامی والا معاملہ زیر سماعت کیس کے ساتھ اسی طرح جڑا ہوا ہے جیسے ہڈی کے ساتھ گوشت اور گوشت کے ساتھ چکنائی۔ اگر ہم مظلومہ کی سابق زندگی اور ماضی کی طرف سے نگاہ چرائیں گے تو معزز عدالت ان تلخ اور سنگین حقائق کو جاننے سے محروم رہ جائے گی جو میں اپنی جرح سے منظر عام پر لانا چاہتا ہوں لہٰذا..... مجھے چند منٹ مزید بولنے کا موقع دیا جائے....."

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ "بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ.....!"

"پھر کیا مسئلہ تھا انور کے ساتھ؟" میں نے دوبارہ نوری کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کڑے انداز میں استفسار کیا۔ "تم نے اسے چھوڑ کر گلزار سے شادی کرنے کا فیصلہ کیوں کیا..... انور 'سچ آدمی' کس حوالے سے نہیں تھا.....؟"

نوری کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں

..... تھا کہ میں اچانک اسے یوں آڑے ہاتھوں لے لوں گا۔ اس نے تھوک نگلا اور سنبھالا لیتے ہوئے بولی۔

"وہ مجھے مارتا تھا..... بے دریغ پیٹتا تھا۔ میرے ساتھ ..... سلوک کرتا تھا۔ انسان آخر کہاں تک برداشت کرے....."

"تم نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو ..... خیالات کا اظہار کیا ہے کہ اگر کوئی عورت گھر لے ..... کو ..... ڈیل کرتے ہوئے سمجھداری کا ثبوت دے تو ..... ازلی مرد کو بھی بہ آسانی مٹھی میں کیا جا سکتا ہے....."

میں نے نوری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ ..... میں پوچھا۔ "اور اس کے ساتھ ہی تم نے اس بات کا بھی ..... کیا ہے کہ ازلی سے ازلی مرد کو بھی بہ آسانی مٹھی میں ..... کی صلاحیت تمہارے اندر موجود ہے پھر..... پھر تم ..... انور کو اپنے قابو میں کیوں نہیں کیا تھا..... کیوں؟"

"م..... میں نے..... بتایا ہے نا.....!" وہ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ "انور کسی جنگلی درندے سے کم نہیں تھا۔ وہ ..... انداز میں مجھے مارتا تھا اور..... یہ کہ میں نے ..... نہیں چھوڑا..... بلکہ اس نے مجھے..... طلاق دے دی ..... عورت تو اس معاملے میں مجبور ہوتی ہے۔"

"اس نے تمہیں طلاق دی تھی یا کسی بھی طرح تم نے اس سے جان چھڑائی تھی؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اِشو یہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا اِشو ہے؟" اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

"اِشو یہ ہے کہ.....!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "انور تمہیں ظالمانہ انداز میں زد و کوب کیوں کرتا تھا جبکہ تھوڑی دیر پہلے تمہاری زبانی معزز عدالت کے ریکارڈ پر یہ بات آ چکی ہے کہ تمہارا سابق شوہر نکما اور نکھٹو تھا اور نہ ہی نشے باز۔ انور جوئے کی لت بھی اور نہ ہی بد کردار عورتوں سے اس کے مراسم تھے۔ وہ کسی پوشیدہ و پیچیدہ مرض میں بھی مبتلا نہیں تھا۔ یہ تمام تر صفات تو عموماً ولی اللہ لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ انور تمہیں کس بات پر مارتا پیٹتا تھا۔ کوئی نہ کوئی مسئلہ تو ہوگا اس کے ساتھ.....؟"

"اسے میرے کردار پر شک تھا.....!" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "وہ مجھ پر الٹے سیدھے الزام لگاتا تھا اور میرے انکار پر وہ غصے میں آ کر مار پیٹ شروع کر دیتا تھا..... شاید یہ اس کا کوئی نفسیاتی مرض تھا..... میں کسی سے ..... کر بھی

بڑے لوگ

بطرس بخاری گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ ایک دفعہ کمشنر ان سے ملنے آئے۔ بطرس کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے اشارے سے کمشنر کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گئے۔ تنگ آ کر کمشنر نے بطرس کی توجہ دلائی۔ انہوں نے پھر اشارے سے کہا بیٹھیے۔

"جناب میں کمشنر ہوں۔"

بخاری صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مسکرائے اور کہا۔ "اچھا آپ کمشنر ہیں تو دو کرسیوں پر بیٹھیے۔" یہ کہہ کر بطرس پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

میں نہ مانوں

ایک محفل میں مشفق خواجہ (ہندوستان .....) کے سامنے مجروح سلطان پوری کے اشعار فیض احمد فیض کا کلام کہہ کر سنانے لگے۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ یہ کلام فیض کا نہیں ہے۔ کسی اور کا ہے۔ ..... نے خواجہ صاحب سے بحث شروع کر دی کہ نہیں یہ کلام فیض کا ہی ہے۔ خواجہ صاحب نے مجروح کا مجموعہ کلام صاحب کے سامنے رکھ دیا جس میں یہ کلام موجود تھا۔ ..... نے مجروح کے مجموعے کو الٹا پلٹا اور بولے۔ "یہ جعلی ایڈیشن ہے۔"

خواجہ صاحب نے کہا۔ "یہ ایڈیشن جعلی نہیں، مجروح صاحب کی اجازت سے پاکستان میں چھپا ہے اس پر پاکستانی ناقد محمد علی صدیقی کا دیباچہ ہے وہ کسی جعلی ایڈیشن پر دیباچہ نہیں لکھ سکتے۔"

..... صاحب نے دیکھا کہ ان کا موقف کمزور پڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے کہا۔ "محمد علی صدیقی کا دیباچہ بھی جعلی ہے۔"

خواجہ صاحب نے کہا۔ "کہیے تو فون پر محمد علی صدیقی سے بات کرا دوں معلوم کر لیں کہ دیباچہ جعلی ہے یا اصلی۔" ..... صاحب کہنے لگے۔

"اس کی کیا ضرورت ہے کہ فون پر محمد علی صدیقی سے بات ہو کوئی بھی آدمی ان کے نام سے بات کر سکتا ہے۔"

ٹھیک نو بجے

خان بہادر شمس ..... احمد اسماعیل وقت کے بڑے پابند تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ٹھیک نو بجے اپنے گھر سے نکل کر کچہری جایا کرتے تھے۔ ایک دن جونہی گھر سے نکلے تو سڑک کے پیچھے گھڑی ساز کو گھڑی ہاتھ میں لیے اپنے دکان کے باہر پایا۔ خان بہادر نے پوچھا۔ "میاں کیوں کھڑے ہو؟" گھڑی ساز نے جواب دیا۔

"جی میں اپنی گھڑی کو چابی دینا بھول گیا تھا اس لیے بند ہو گئی۔ میں آپ کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اپنی گھڑی کا وقت درست کر لوں۔"

مرسلہ: ..... عباس ..... اوکاڑہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہٹ کر لی تھی تو وہ...... آپے سے باہر ہو جاتا تھا...... اور پھر مجھے وحشیانہ سلوک سے گزرنا پڑتا تھا......''

''تم ایک حسین اور پرکشش عورت ہو نوری!'' میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے خطرناک چہرے میں ہمدردی کے جذبات شامل کر کے نوری کو اپنے دام میں لانے کی کوشش کی۔ ''اسی لیے جب تم کسی نامحرم سے تھوڑی بے تکلف ہوتی تھیں تو انوار کو حد سے زیادہ حسد محسوس ہونے لگتا تھا۔ وہ اندر سے جل بھن کر رہ جاتا تھا، پھر اپنی اسی جلن کو مٹانے کے لیے وہ تم سے مار پیٹ کیا کرتا تھا...... میرے خیال میں تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ وہ جلاپے کے مرض میں مبتلا ایک نفسیاتی مریض تھا......!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے تائیدی انداز میں بولی۔

میں نے نظر، سر مشتاق کی کاوشوں سے حاصل ہونے والی معلومات کو دھیرے دھیرے استعمال میں لانا شروع کیا اور بڑے خلوص بھرے لہجے میں مظلومہ سے پوچھا۔

''کیا کبھی انوار نے کسی لیاقت علی کے حوالے سے بھی تمہارے کردار پر شک کیا تھا......؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا تاثر تھا۔

میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس لیاقت علی کی بات کر رہا ہوں جس کی ادھر پچھلی مارکیٹ میں دودھ کی دکان ہے...... لیاقت ملک شاپ؟''

''جی...... جی ہاں......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''انوار کو لیاقت پر بھی شک تھا۔''

''لیکن تمہارا لیاقت کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں تھا؟''

''جی بالکل نہیں......!''

''انوار کا شک بے بنیاد تھا...... اس کے بیمار ذہن کی پیداوار تھا؟''

''جی ہاں!''

''لیاقت علی کبھی تم سے ملنے گھر پر نہیں آیا تھا؟''

''کبھی نہیں......!'' وہ قطعیت سے بولی۔

''انوار سے طلاق کے بعد تم نے چیل پاڑہ اور پچھلی مارکیٹ کا علاقہ چھوڑ دیا تھا۔'' میں نے بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''پھر تم نے گلزار سے شادی کر لی اور گارڈن ویسٹ کے علاقے میں آ گئی تھیں؟''

''جی ہاں...... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

میرے نرمی بھرے انداز نے اس کے ذہن میں یہ تاثر بھر دیا تھا کہ میں اس کا حامی بن گیا ہوں جبھی وہ شرافت سے میرے سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔ میں نے سلسلہ گفتگو کو اختتامی موڑ کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

''نوری! گلزار سے تمہاری شادی کو لگ بھگ ایک سال ہونے والا ہے۔ کیا اس دوران میں بھی تمہیں لیاقت کی شکل نظر آئی؟''

''جی...... بالکل نہیں۔''

''اور اس ایک سال میں اس نے بھی تمہیں نہیں دیکھا ہوگا؟''

''ظاہر ہے جناب! جب آمنا سامنا ہی نہیں ہوا تو کوئی کسی کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟'' وہ قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وہاں تو میں اس کی دکان سے دودھ لینے چلی جاتی تھی تو سامنا ہو جاتا تھا......''

''تمہارے موجودہ شوہر گلزار کا جنرل اسٹور بھی تو پچھلی مارکیٹ ہی میں ہے۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''وہ انوار اور لیاقت علی کو نہیں جانتا؟''

''جانتا ہے جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک مارکیٹ کے دکاندار ایک دوسرے سے واقف نہ ہوں۔''

''اس کے باوجود بھی گلزار نے تم سے شادی کر لی!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''گلزار اگر انوار اور لیاقت سے واقف ہے تو وہ تمہارے حالات و واقعات سے بھی آگاہ ہوگا۔ ہوگا یا نہیں؟''

''بالکل ہے۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔ ''لیکن یہ اپنی اپنی ذہنیت اور فطرت کی بات ہوتی ہے۔ گلزار مجھے بے گناہ اور مظلوم سمجھتا تھا اسی لیے اس نے کوئی بھی منفی خیال دل میں لائے بغیر مجھے اپنا لیا......''

''اور تم نے اس کے احسان کو مٹی میں ملا دیا......؟'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''کک...... کیا مطلب......؟'' وہ ہکا بکا سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے دوستانہ اور ہمدردانہ لہجے کو خیر باد کہہ کر جو خالصتاً وکیل صفائی کا انداز اپنایا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ میں نے اسی اسٹائل کو آگے بڑھاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب بھی مجھے ہی سمجھانا پڑے گا؟''

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مم میں نے کیا...... کیا ہے......؟''

''تم نے...... گلزار کے اعتماد کی پیٹھ میں زنگ آلود خنجر

گھونپا ہے نوری!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس سنگین جرم پر کڑی سے کڑی سزا ملنا چاہیے۔''

نوری کی حالت خراب ہونے لگی۔ وہ میری بات کی تہ تک تو پہنچ گئی تھی تاہم زبان سے اقرار کی ہمت نہیں تھی اس میں۔ اسی موقعے پر وکیل استغاثہ نے حق استغاثہ ادا کرتے ہوئے احتجاجی نعرہ بلند کیا۔

''آبجیکشن یور آنر! میرے فاضل دوست مبہم الفاظ کا استعمال کر کے مظلومہ کو خوفزدہ اور پریشان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

جج نے میری جانب دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''بیگ صاحب! وکیل سرکار کا اعتراض بڑی حد تک درست ہے۔ پچھلے پانچ منٹ سے آپ نے نوری سے جس قسم کی جرح کی ہے اس کا موضوع اور مفہوم واضح نہیں۔ اس کی آسان زبان میں تشریح کریں۔''

''ابھی کرتا ہوں جناب عالی!'' میں نے بڑی فرماں برداری سے کہا پھر اپنی مخصوص سیٹ پر جا کر فائلوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

میں نے ایک فائل میں سے ایک لفافہ برآمد کیا اور بڑے ثابت قدموں سے چلتے ہوئے جج کے پاس آ گیا پھر مذکورہ لفافہ کھول کر اس میں سے ایک فوٹو نکال کر اس طرح جج کی طرف بڑھایا کہ اس پر نوری کی نظر نہ پڑے۔ پھر میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! آپ اس فوٹو کو اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ میں عدالت میں ایک چھوٹا سا سنسنی خیز ڈراما پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے نتائج اس کیس کو فیصلہ کن بنا دیں گے۔''

جج نے بڑی دریا دلی سے مجھے ڈرامے کی اجازت دے دی۔

میں بڑے اعتماد سے چلتے ہوئے اکیوزڈ باکس کے پاس پہنچا اور ملزم امین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے اپنے بیان اور بعد ازاں میری جرح کے جواب میں معزز عدالت کے روبرو یہ انکشاف کیا تھا کہ تم نے دو تین مرتبہ کسی غیر مرد کو گلزار کی غیر موجودگی میں نوری کے فلیٹ میں گھستے دیکھا تھا اور تمہارا دعویٰ ہے کہ نوری کے اس مرد کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے جبھی تم نے مذکورہ مرد کے بارے میں گلزار کو رپورٹ دی تھی۔''

''جی ہاں، میں نے یہ سب کیا تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''میں تمہارا وکیل ضرور ہوں!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور...... میرا یہ کہنا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا جو میرے دل کی آواز نہیں تھی۔ میں نے مزید کہا۔ ''لیکن اگر تمہارا کوئی دعویٰ یا بیان غلط ثابت ہو گیا تو میں تمہاری بچت کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ تم اس عدالت سے عبرت ناک سزا پانے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا۔''

''جی، میں ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار ہوں۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔

میں نے ڈرامے کا اگلا سین شروع کیا اور ملزم کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس بات کا دعویٰ بھی کیا تھا کہ اگر وہ شخص تمہیں دوبارہ نظر آ جائے جو چوری چھپے نوری سے ملنے آتا تھا تو تم فوراً اسے پہچان لو گے؟''

''جی ہاں...... میں اپنے دعوے پر قائم ہوں!'' اس کے انداز میں رتی بھر کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

''تم اپنے دعوے پر قائم ہو......'' میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ لفافہ دوبارہ کھولا اور اس میں سے ایک فوٹو نکال کر بڑی احتیاط سے امین کی جانب بڑھا دیا پھر تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو......؟''

''یہ...... تو وہی ہے......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جو گلزار کی عدم موجودگی میں نوری کے ساتھ گلچھرے اڑاتا تھا......''

''پکا......؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''بالکل پکا......'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔

میں نوری کی جانب بڑھ گیا اور لفافے میں سے ایک اور فوٹو نکال کر اسے دکھاتے ہوئے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

''ملزم کا پُرزور دعویٰ ہے کہ یہ شخص تمہارے شوہر کی غیر موجودگی میں تمہارے ساتھ وقت گزارنے آتا تھا۔ تم اس بارے میں کیا کہو گی؟''

وہ نفرت بھری نظر سے ملزم کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے، بکواس کر رہا ہے......'' پھر اس نے کن انکھیوں سے فوٹو کو دیکھا اور کہا۔ ''میں اس شخص کو نہیں جانتی۔''

''پکا......؟'' میں نے نوری سے بھی وہی سوال کیا۔

''جی...... بالکل پکا......!'' وہ وثوق سے بولی۔

میں نے فاتحانہ انداز میں جج کی جانب دیکھا اور سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! دراصل یہ ڈراما اور......!''

''کیا مطلب؟'' جج کے استفسار میں بڑا اضطراب چھپا

بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے عزم سے فوٹو واپس لے کر نوری کو دکھایا جانے والا فوٹو پہلے ہی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے یہ دونوں فوٹو جج کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔

"میرے اس ڈرامے کا یہ مطلب ہے یور آنر.....!"

ایک فوٹو جج کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ اس نے میرے پیش کردہ مزید دو فوٹوز کو بھی اپنے سامنے میز پر پھیلا دیا پھر اگلے ہی لمحے وہ مسکراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ تینوں فوٹوز تو ایک ہی ہیں..... ایک ہی شخص کی تصویر کی تین کاپیاں"

"جناب عالی! یہی حقیقت ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس شخص کو ملزم نے ایک خاص معاملے کے لیے شناخت کیا ہے، اسی شخص کو مظلومہ پہچاننے سے انکاری ہے.....!"

جج کا تجسس ساتویں آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے خاصے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔ "مگر یہ شخص ہے کون؟"

"لیاقت علی شیر فروش.....!" میں نے بھری عدالت میں دھماکا کیا۔

"وہی دودھ فروش جس کے حوالے سے مظلومہ کا پہلا شوہر نور اس کے کردار پر شک کرتا تھا اور بالآخر اسی شک کی بنا پر اسے طلاق بھی ہو گئی تھی۔" جج نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

"یس..... ویری رائٹ.....!" میں نے بڑے مسرور انداز میں جواب دیا۔

"لیکن مظلومہ اس کی پہچان سے کیسے انکار کرسکتی ہے؟"

"اقرار کرنے میں اس کی سازش کا پول کھل جائے گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ سازش جس کے ذریعے اس نے میرے موکل کو ناکارہ کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کی راہ کا کانٹا صاف ہو جائے اور یہ کھل کھلا کر 'کھل کھیل' سکے.....!"

جج کے چہرے اور آنکھوں میں ناگواری کے تاثرات جاگے اور اس نے نوری سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ "بی بی! تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو؟"

اس چالباز عورت نے ہارتے ہوئے بیچ میں آخری بال پر بھی شاٹ مارنے کی کوشش کی اور بڑی ڈھٹائی سے بولی۔ "یہ تصویر لیاقت علی کی نہیں ہے۔"

میں اس کی ہمت اور ڈھٹائی پر عش عش کر اٹھا۔ جج نے روئے سخن میری جانب موڑتے ہوئے استفسار کیا۔ "بیگ صاحب! اب آپ کیا کہیں گے؟"

"اگر لیاقت علی جانب جانے کا بہانہ کر کے منظر سے غائب نہ ہو گیا ہوتا تو میں اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر اسے عدالت میں لا کھڑا کرتا۔" میں نے بڑے بھرپور انداز میں کہا۔ "بہرحال مظلومہ کا سابق شوہر میری درخواست پر پچھلے دو گھنٹے سے عدالت کے احاطے میں موجود ہے۔ معزز عدالت انوار کو اندر بلا کر اس امر کی تصدیق کرسکتی ہے کہ یہ فوٹو لیاقت علی ہی کے ہیں یا نہیں اور..... مظلومہ کا موجودہ شوہر گلزار بھی اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ یہ تصدیق تو اس سے بھی کی جاسکتی ہے۔ وہ بھی لیاقت علی دودھ فروش کو اچھی طرح جانتا ہے..... مگر کوئی نہیں جانتا اور کوئی نہیں پہچانتا تو وہ ہے نوری..... حالانکہ لیاقت علی سے سب سے زیادہ جان پہچان بھی اسی کی تھی۔ اگر آپ کہیں تو.....!"

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی نوری ڈگمگائی اور چکرا کر وٹنس باکس کے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ متعلقہ عدالتی عملہ بڑی تشویش بھری سرعت سے اس کی جانب لپکا اور جلد ہی یہ انکشاف ہوا کہ وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔

نوری کی بے ہوشی اصلی تھی یا وہ کسی اداکاری کا مظاہرہ تھا لیکن میں ایک بات جانتا تھا کہ اپنے بچ نکلنے کا امکان ختم ہوتا دیکھ کر اس نے ہتھیار پھینک دیے تھے۔ جب فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں تو انسان بے بسی کے عالم میں آنکھیں بند کر کے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور..... اگر کوئی وٹنس باکس کے فرش پر گر کر آنکھیں موند لے تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے.....!

چوری اور سینہ زوری کے بارے میں آپ نے بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا ہوگا لہٰذا میں اس کی تفصیل میں جائے بغیر صرف اتنا کہوں گا کہ چوری اگر سنگین جرم ہے تو سینہ زوری سنگین ترین جرم کہلائے گا۔ جرم جتنا زیادہ سنگین ہوگا، اس کی سزا بھی اتنی ہی سخت ترین ہوگی۔ نوری بے چاری سینہ زوری میں ماری گئی تھی۔

یہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ استغاثہ پیش ہونے پر نوری کے اقبال جرم کے بعد عدالت نے میرے موکل امین کو اس کیس سے باعزت بری کر دیا تھا.....!

جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔

تحریر: حسام بٹ

دھوکا

کاشف زبیر

اکثر لوگ فطرتاً کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے ہمیشہ بے چین رہتے ہیں... شاید یہی بے کلی انہیں مرنے کے بعد بھی چین نہیں لینے دیتی۔ ادھوری خواہشیں ہر مقام پر ان کا پیچھا کرتی ہیں... وہ بھی اس سفر میں بہت دور تک نکل آیا تھا۔ اگرچہ رہنما بھی اس کے تعاقب میں تھے مگر... وہ تھا کہ اسی دھوکے میں زندگی بسر کرلینا چاہتا تھا۔

ایک رائیگاں سفر..... ایک مسافر بے نوا کا قصہ

ساحر حسن نے کار کی پشت سے ٹیک لگائے ہوئے خواب کیرن کو دیکھا اور محبت سے مسکرا دیا۔ وہ اس کی محبت جیسی اس کا سب کچھ تھی۔ کیرن اور اس کا تعلق تین سال سے تھا لیکن شادی کے لیے وہ اب راضی ہوئی تھی۔ دراصل کیرن سڈنی میں ایک نرسنگ اسکول سے فزیوتھراپسٹ کا کورس کر رہی تھی۔ اس کی ڈگری اب ملی تھی۔ فزیوتھراپسٹ کا شعبہ کیرن کو پسند تھا جس کا شوق اسے اسکول کے زمانے سے تھا۔ اس کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی اور دو دن پہلے اسے فزیوتھراپسٹ کی ڈگری ملی تھی۔ اپنے بیچ میں اس کا نمبر تیسرا تھا۔ ڈگری لینے کی تقریب میں کیرن کے ماں باپ اور دونوں چھوٹے بھائی بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کیرن ان کے ساتھ چلے لیکن
کیرن نے سائمن کے ساتھ بائی روڈ جانے کو ترجیح دی تھی۔

سائمن سڈنی میں ایک فرم میں مارکیٹنگ کے شعبے سے وابستہ تھا۔ کیرن سے اس کی ملاقات اس وقت ہوئی جب کیرن نرسنگ اسکول میں داخلے کے لیے سڈنی آئی تھی۔ نیو ایئر نائٹ کے موقعے پر ایک پارٹی میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور ان کے دل ایک ساتھ دھڑک اٹھے۔ سائمن چند مہینے پہلے ایم بی اے کرنے کے بعد ملازم ہوا تھا اور کیرن صرف اٹھارہ سال کی ایک اسکول گرل تھی اور سائمن سے چھ سال چھوٹی تھی لیکن عمر کا یہ فرق اتنا خاص نہیں تھا جب کہ سائمن دیکھنے میں نوجوان لگتا تھا اور پھر کیرن اسے پسند کرنے لگی تھی۔ پہلی ملاقات کے صرف دو مہینے بعد ہی جب سائمن نے اسے پروپوز کیا تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ بھی مان گئی تھی لیکن اس کا کہنا تھا کہ وہ پہلے اپنی ڈگری حاصل کرے گی اس کے بعد ہی شادی۔ ابتدا میں سائمن نے اس پر زور دیا کہ وہ مان جائے مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے اصرار سے ان کے تعلق میں دراڑ بھی آسکتی ہے اس لیے اس نے صبر کرلیا۔

کیرن نے اس سے کہا کہ اس کے پاس موقع ہے وہ بھی اپنے شعبے میں کوئی کورس کرلے جو بعد میں اسے فائدہ پہنچائے۔ سائمن کو اس کی تجویز اچھی لگی اور اس نے ایڈوانس مارکیٹنگ کورس میں داخلہ لے لیا۔ اب وہ جاب کرنے کے ساتھ ساتھ ہفتے میں تین کلاسز بھی لیتا تھا اور باقی تین دن دوسرے معاملات نمٹاتا تھا۔ اتوار کا دن کیرن کے لیے مخصوص تھا۔ وہ اس کے پاس چلا جاتا یا کیرن اس کے گھر آجاتی تھی۔ سائمن سڈنی میں اکیلا تھا۔ وہ نیو ساؤتھ ویلز کے ہی ایک ساحلی شہر لسمور کا رہنے والا تھا۔ سائمن کا باپ نیوین ایک ماہی گیر تھا۔ سائمن اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سائمن کی ماں اس وقت اسے چھوڑ گئی تھی جب وہ صرف دس سال کا تھا اور اس نے ماں کے بجائے باپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

ایک سال پہلے نیوین جب اپنی کشتی لے کر سمندر میں موجود تھا کہ ایک غیر متوقع طوفان نے اس کی کشتی کو ڈبو دیا اور نیوین کی لاش تین دن بعد سمندر سے ملی تھی۔ اس کے باقی تین ساتھی اپنی جان بچانے میں کامیاب رہے تھے۔ سائمن حادثے کی اطلاع ملتے ہی لسمور گیا اور باپ کی تدفین کے بعد واپس آیا تھا۔ اس وقت کیرن اس کے پاس جانے کے لیے بے تاب ہوگئی تھی کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ سائمن کو اس کی ضرورت ہے لیکن سائمن نے اسے آنے سے منع کر دیا تھا۔ کیرن ان دنوں اپنے دوسرے سال کے امتحان کی تیاری کررہی تھی اور اگر وہ سائمن کے پاس آتی تو اس کی تیاری یقیناً متاثر ہوتی۔ یہ سائمن کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ وہ اپنے باپ سے محبت کرتا تھا۔ دنیا میں خون کا یہی ایک رشتہ اس کے پاس تھا۔ وہ افسردہ واپس آیا تو کیرن نے اسے اپنی آغوش محبت میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود ایک ہفتہ اس کے گھر رہی۔ وہ اس کے کام کرتی اور اس کا دل بہلاتی رہی حتیٰ کہ سائمن سنبھل گیا۔ وہ اس کے لیے کیرن کا بہت شکر گزار تھا۔ اگر وہ نہ ہوتی تو وہ اتنی جلدی سنبھل نہیں سکتا تھا۔

وقت نے رفتہ رفتہ سائمن کے دکھ کو کم کردیا اور پھر وہ اپنے کورس اور جاب میں گم ہوگیا۔ اس کا کورس چونکہ مکمل ہونے والا تھا۔ والد کے انتقال کے دوران جو تعلیمی نقصان ہوا تھا وہ اسے جلد از جلد پورا کرنا چاہتا تھا۔ کورس کا اختتام ہوا تو نتائج حوصلہ افزا نکلے۔ وہ اپنے شعبے کا اب منیجر بن گیا۔ اس ترقی سے اس کی تنخواہ اور دوسری مراعات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ سائمن خوش تھا اب وہ بہتر انداز میں شادی اور ایک بھرپور ہنی مون بھی منا سکتے تھے۔ اس کے لیے اس نے ابھی سے تیاری شروع کردی تھی۔ کیرن اس کی بے تابی پر ہنستی بھی تھی اور کبھی شرماتی بھی تھی۔ سائمن نے ضد کرکے اس کے لیے ابھی سے عروسی جوڑا بھی لے لیا تھا۔ شادی برڈس وڈ میں ہونی تھی اور وہیں سے وہ ہنی مون پر بحرالکاہل کے جزائر کے ایک ٹرپ پر روانہ ہوجاتے۔

خدا خدا کرکے کیرن نے آخری امتحان دیا اور اس کے فوراً بعد وہ برڈس وڈ روانہ ہوگئی۔ چونکہ چھٹیوں میں وہ کام کرکے اپنے تعلیمی اخراجات خود پورے کرتی تھی اور اس وجہ سے اسے گھر جانے کا موقع کم ملتا تھا۔ اب وہ شادی سے پہلے کچھ وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ پھر ڈگری کی تقریب میں وہ گھر والوں کے ساتھ آئی اور واپسی کے لیے طے ہوا کہ وہ سائمن کے ساتھ بائی روڈ جائے گی۔ اس نے طے کیا تھا کہ ہنی مون سے واپسی پر وہ کچھ عرصے جاب نہیں کرے گی۔ اس کے بجائے وہ رضاکار کے طور پر دن میں چند گھنٹے کام کرے گی۔

اپریل کا مہینا آسٹریلیا اور خصوصاً جنوبی آسٹریلیا میں خزاں اور سرما کے آغاز کا مہینا ہوتا ہے۔ وہ بائی روڈ روانہ ہوئے تو موسم خنک اور ابر آلود تھا۔ اگرچہ ابھی گرم کپڑوں کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ انہوں نے کار کے شیشے بند کر لیے تھے۔ سڈنی سے برڈس وڈ تک کوئی نو سو میل کا سفر تھا۔ اس کا بیشتر حصہ پہاڑی علاقوں سے گزرتا تھا اس لیے ان کے دو

دن سفر میں گزر جاتے اور وہ اگلے دن شام کو برڈس وڈ پہنچتے۔ سڈنی سے روانہ ہونے کے چار گھنٹے بعد وہ لنچ کے لیے ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں رکے اور اس کے فوراً بعد وہ بروکن ہلز کے پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئے۔ یہاں سڑک چوڑی اور شاندار تھی اس کے باوجود موڑ بہت زیادہ تھے۔ اس لیے سائمن احتیاط سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ کیرن ریڈیو پر موسیقی سن رہی تھی اور ایک ناول کا مطالعہ کررہی تھی جو وہ وقت گزاری کے لیے اپنے ساتھ لائی تھی۔ ڈرائیونگ سائمن کی ذمے داری تھی۔ اس لیے وقت گزاری اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ ریسٹوران سے انہوں نے کچھ کھانے پینے کا سامان پیک کروالیا تھا۔ تین بجے کیرن بور ہوکر سوگئی۔ سائمن نے ریڈیو بند کردیا اور اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگادی۔ وہ صبح آٹھ بجے روانہ ہوئے تھے۔ لنچ کے لیے وہ ایک گھنٹا رکے تھے۔ اس وقت نقشے کے مطابق انہوں نے کوئی ساڑھے چار سو میل کا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ سائمن کی خواہش تھی کہ آج وہ کم سے کم سات سو میل کا فاصلہ طے کر لیں تاکہ اگلے دن کے لیے مسافت کم رہ جائے۔

شام پانچ بجے سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپ چکا تھا اور اندھیرا تیزی سے چھانے لگا۔ سائمن نے ہیڈ لائٹس روشن کرلیں۔ کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک جگہ روک دی۔ انجن بند ہوا تو کیرن بیدار ہوگئی۔ اس نے اپنے بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ "ہم کہاں تک پہنچ گئے؟"

"میں تھک گیا ہوں اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔" سائمن نے عقب سے شاپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ انہوں نے کافی کے ساتھ سینڈوچ لیے۔ کھانے کے بعد سائمن کار سے نیچے اتر آیا۔ بلند پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں سردی تھی لیکن اسے جسم کھولنے کا موقع ملا تھا۔ جب آدھے گھنٹے رک کر وہ آگے روانہ ہوئے تو سائمن کسی قدر تازہ دم ہوچکا تھا۔ انہوں نے ساڑھے پانچ سو میل کا فاصلہ طے کرلیا تھا اور اگر سائمن مزید ساڑھے تین گھنٹے ڈرائیو کرلیتا تو وہ نو بجے تک مزید ڈھائی سو میل کا فاصلہ طے کرسکتے تھے۔ اس لیے وہ تیز اور توجہ سے ڈرائیو کررہا تھا۔ اپنی توجہ برقرار رکھنے کے لیے وہ کیرن سے بات بھی نہیں کررہا تھا لہٰذا کیرن بور ہورہی تھی۔ وہ کچھ دیر ریڈیو پر گانے سنتی رہی پھر جھنجلا کر ریڈیو بند کردیا۔ سائمن نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔ "تم اپنا ناول مکمل کرلو۔"

کیرن نے پھر ناول سنبھال لیا۔ وہ سائمن سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ اسے دوران ڈرائیونگ بات کرنا پسند نہیں ہے۔ آٹھ بجے وہ ایک گیس اسٹیشن پر رکے کیونکہ کار کا ٹینک ایک چوتھائی سے کم رہ گیا تھا اور سائمن اسے فل رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کار میں پیٹرول بھروایا اور ادائیگی کے لیے اندر اسٹور میں آیا۔ اسٹور بھی اسٹیشن کے ساتھ ہی تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو اسے سامنے کھانے پینے کے ریکس کے درمیان ایک طویل قامت شخص نظر آیا۔ اس نے اونی پاجامہ اور کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کا تعلق آسٹریلیا کی پرانی نسل سے تھا جو سفید فاموں کی یہاں آمد سے قبل اس سرزمین پر رہتے تھے۔ سفید فاموں نے قتل و غارت گری کرکے اور ان کی زرخیز زمینیں چھین کر ان کی منظم نسل کشی کی اور آج یہ پورے آسٹریلیا میں چند لاکھ بھی نہیں ہیں۔ سفید فام حقارت سے انہیں ابوریجنی کہتے ہیں۔ آج بھی اکثر آسٹریلین ان لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ابوریجنی کے معنی بھی انسان سے کمتر مخلوق کے تھے۔

سائمن ذاتی طور پر ابوریجنی کو انسان ہی سمجھتا تھا لیکن اس سے پہلے اس کا واسطہ ان لوگوں سے کم پڑا تھا۔ اس نے بہت کم ابوریجنی دیکھے تھے اور یہ شخص ان میں سب عجیب لگا تھا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف گیا اور ادائیگی کرتے ہوئے اس نے گیس اسٹیشن کے مالک سے پوچھا۔ "کیا یہ ابوریجنی یہاں ملازم ہے؟"

مالک چونکا۔ "ابوریجنی...... یہاں ملازم؟ میں ان کو اپنے اسٹور میں گھسنے نہیں دیتا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟"

سائمن نے پلٹ کر ریکس کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ حالانکہ چند لمحے پہلے وہ شخص یہیں تھا۔ اسے تعجب ہوا وہ کتنی تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ گیس اسٹیشن کا بوڑھا مالک باہر کی طرف دوڑا...... اس کے خیال میں ابوریجنی اس کے اسٹور سے کچھ چرا کر لے گیا ہے۔ مگر جب اسے باہر بھی کوئی دکھائی نہیں دیا تو وہ پلٹ آیا۔ اس نے سائمن سے کہا۔ "مسٹر تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے...... یہاں کوئی ذلیل ابوریجنی نہیں آسکتا۔ اس علاقے کے سارے ابوریجنی جانتے ہیں کہ وہ میرے گیس اسٹیشن اور اسٹور میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔"

سائمن کو اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پہلے اس کا ارادہ یہاں سے کچھ خریداری کا تھا لیکن اب اس نے ارادہ ملتوی کردیا اور پیٹرول کی ادائیگی کرتے ہوئے مالک سے پوچھا۔ "یہاں آگے کوئی موٹل ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "دو گھنٹے کی مسافت پر ایک اچھا موٹل مل جائے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو گھنٹے مزید ڈرائیونگ کا خیال اچھا نہیں تھا لیکن انہیں رات گزارنے کے لیے کسی معقول جگہ کی ضرورت تھی۔ وہ واپس آیا تو کیرن نہیں تھی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو بتایا کہ وہ واش روم گئی تھی۔ گیس اسٹیشن سے نکل کر سڑک پر آتے ہوئے سائمن نے اسے بتایا کہ ابھی انہیں مزید دو گھنٹے سفر کرنا ہوگا تب کہیں وہ ایک موٹل تک پہنچیں گے۔

"دو گھنٹے۔" کیرن نے جھرجھری لی۔ "سردی بڑھ گئی ہے واش روم میں پانی ٹھنڈا آرہا تھا۔"

"تمہیں موٹل میں گرم پانی مل جائے گا۔" سائمن نے اسے تسلی دی تو کیرن نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اس کا موڈ رومانٹک ہو رہا تھا۔

"ہاں آخر ہم ایک ہونے جا رہے ہیں؟"

سائمن مسکرایا۔ "بس تین دن اور ہیں اور اس کے بعد ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔"

"میں نے اس وقت کے انتظار میں ایک ایک دن گن کر گزارا ہے۔"

"تو پھر تم پہلے مان جاتیں۔" سائمن نے شکوہ کیا۔ "خود بھی صبر کرتی رہیں اور مجھے بھی مجبور کر دیا۔"

کیرن ہنسی۔ "زندگی کا مزہ صبر کر کے کچھ پانے میں ہی تو ہے۔"

"لیکن اب میں صبر نہیں کر سکتا۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" کیرن ذرا آگے آئی۔ اس کے بالوں اور وجود سے آتی مسحور کن مہک نے چند لمحے کے لیے سائمن کی توجہ بھٹکا دی تھی۔ اس وقت سڑک ایک چوڑے پہاڑی کنارے سے گزر رہی تھی اور سڑک کے بعد بھی خاصی ہموار زمین تھی۔ اس وجہ سے بھی سائمن کی توجہ پہلے کی طرح ڈرائیونگ پر مرکوز نہیں رہی تھی۔ مگر جب اچانک کار سڑک سے نیچے آئی تو اس نے چونک کر اسٹیئرنگ کاٹا اور پوری قوت سے بریک لگایا۔ کار بری طرح لہرائی اور کچی زمین پر رگڑ کھاتی ہوئی کنارے کی طرف گئی۔ سائمن نے بریک لگا کر غلطی کی تھی ورنہ کار دوبارہ سڑک پر آجاتی۔ کیرن نے کنارے کو پاس آتے دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سائمن اسٹیئرنگ سے لڑ رہا تھا۔ وہ جام ہو گیا تھا۔ اب کنارہ کچھ ہی دور تھا۔ سائمن نے خود کو ذہنی طور پر حادثے کے لیے تیار کر لیا مگر اچانک ہی بالکل معجزانہ طور پر کار رک گئی۔ کنارہ پہیوں سے چند انچ دور تھا۔ کچھ دیر تو سائمن کو یقین نہیں آیا کہ وہ بچ گئے ہیں۔ کار بہت تیزی سے کنارے کی طرف جاتے جاتے رکی تھی۔ کیرن اس کے گلے سے لگ گئی۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ خود سائمن کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے کیرن کی پشت تھپکنے لگا۔

"ٹھیک ہے...... سب ٹھیک ہے۔ ہم بچ گئے ہیں۔"

"شکر ہے خدا۔" کیرن بھرائی آواز میں بولی۔ "یہ سب میری غلطی تھی، میں نے تم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔"

"اس میں میری بھی غلطی ہے۔" سائمن نے اسے تسلی دی۔ "میں بھی تمہاری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔"

سائمن کو احساس ہو گیا کہ ویران کنارے پر رات کے وقت یہ جگہ خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور احتیاط سے اسے دوبارہ سڑک پر لے آیا۔ سڑک پر آنے سے ان کا خوف کچھ کم ہو گیا تھا اور کچھ دیر سفر کے بعد وہ تقریباً نارمل ہو چکے تھے لیکن اب سائمن شدت سے آرام کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اسے ڈرائیو کرتے ہوئے دس گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے یہ حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ ابھی وہ چند کلومیٹر دور گئے ہوں گے کہ انہیں ایک طرف ایک بڑا موٹل نظر آیا۔ اس کے ساتھ گیس اسٹیشن اور کیفے بھی تھا۔ سائمن کو حیرت ہوئی گیس اسٹیشن کے بوڑھے مالک نے اسے بتایا تھا کہ انہیں دو گھنٹے بعد موٹل ملے گا اور ابھی انہیں سفر کرتے ہوئے پون گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ انہیں یہ موٹل مل گیا۔ تو کیا بوڑھے نے اس سے غلط بیانی کی تھی۔

"موٹل۔" کیرن خوش ہو کر بولی۔ "ہم یہاں رکیں گے۔"

سائمن نے کار موٹل کی طرف گھما دی۔ پورا موٹل روشنیوں سے جگمگ کر رہا تھا خاص طور سے گیس اسٹیشن، دفتر اور اسٹور والا حصہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ سائمن نے دفتر کے سامنے کار روک دی۔ کیرن بولی۔ "میں یہیں رک رہی ہوں تم کمرا لے لو پہلے۔"

سائمن اتر کر اندر آیا۔ دفتر بھی شاندار تھا اور اس میں شیشے کا بہت زیادہ کام کیا گیا تھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ سائمن نے گھنٹی بجائی۔ ایک منٹ تک کوئی نہیں آیا تو اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے عقب میں دائیں طرف ہے۔ اس نے ذرا سا سر گھما کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ وہی ایبوجی تھا جو اسے پون گھنٹے پہلے سروس اسٹیشن میں دکھائی دیا تھا۔ "تم یہاں بھی ہو؟"

وہ کچھ دیر سائمن کو گھورتا رہا پھر اس نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔ "یہ سب دھوکا ہے، واپس چلے جاؤ۔"

"کیا کہا ہے تم نے؟" سائمن بولا۔

"میں نے...... تو کچھ نہیں کہا۔" سائمن کو عقب سے آواز آئی اور وہ چونک کر اس طرف متوجہ ہوا۔ کاؤنٹر کے دوسری طرف ایک زرد چہرے والا جوان آدمی کھڑا تھا وہ پھر بولا۔ "تم نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں میں تو اس ایبوجی سے......" سائمن نے ایبوجی کی طرف اشارہ کرنا چاہا تو رک گیا۔ جہاں وہ پہلے ایبوجی موجود تھا اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ سائمن تیزی سے مڑا۔ دفتر کے اندر زیادہ گنجائش نہیں تھی اور کسی کے چھپنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن ایبوجی وہاں موجود نہیں تھا۔ شیشے کی دیوار کے باہر دور تک منظر بالکل واضح تھا۔ اگر ایبوجی باہر نکلتا تب بھی کہیں نہیں چھپ سکتا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر کھڑے جوان آدمی سے کہا۔ "وہ ابھی یہیں تھا۔"

"کون یہاں تھا؟"

"ایک ایبوجی۔"

جوان آدمی نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب میں یہاں آیا تو صرف تم یہاں تھے اور کوئی نہیں تھا۔"

سائمن کو لگا اس کا سر چکرا رہا ہے۔ اس نے خود ایبوجی کو دوبارہ دیکھا تھا لیکن دونوں بار وہ دوسرے شخص کو نظر نہیں آیا۔ سائمن کو خیال آیا کہ مسلسل ڈرائیونگ نے اس کے ذہن کو تھکا ڈالا ہے تب ہی اس کے ساتھ ایسا ہو رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور جوان آدمی سے کہا۔ "شاید مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ بہرحال مجھے ایک ڈبل بیڈ روم چاہیے۔"

جوان آدمی نے پلٹ کر ریک سے ایک چابی اٹھائی اور اسے...... کاؤنٹر پر رکھ کر کہا۔ "کمرا نمبر چھ دائیں طرف پہلی قطار میں تیسرا کمرا ہے ایک رات کے نوے ڈالرز ہوں گے اس میں ناشتا بھی شامل ہے۔"

سائمن نے اپنا ڈرائیونگ لائسنس اور کریڈٹ کارڈ اس کے سامنے رکھے۔ اس نے تفصیلات اپنے رجسٹر میں نوٹ کر کے کریڈٹ کارڈ مشین سے چیک کیا اور اس سے نکلنے والی رسید اس کے سامنے رکھ دی۔ سائمن نے رجسٹر پر سائن کر کے رسید اور اپنی چیزیں واپس پرس میں رکھ لیں۔ "میرا نام فریک ہے اگر کوئی مسئلہ ہو تو میں یہاں دفتر میں موجود ہوں۔"

سائمن چابی لے کر باہر آیا۔ کیرن انتظار کر رہی تھی۔ سائمن نے اس سے پوچھا۔ "تم نے دفتر سے کسی ایبوجی کو نکلتے دیکھا ہے؟"

"ایبوجی۔" کیرن نے حیرت سے کہا۔ "نہیں تو، کوئی بھی باہر نہیں آیا۔ کیا اندر کوئی ایبوجی تھا؟"

سائمن نے کوئی جواب نہیں دیا اور کار اسٹارٹ کر کے کمرا نمبر چھ کے سامنے لے آیا۔ اس موٹل میں تمام کمرے بالکل الگ الگ کاٹیج کی صورت میں تھے۔ وہ اتر کر برآمدے میں آئے اور سائمن نے چابی سے دروازہ کھولا۔ شاندار قسم کا ڈبل بیڈ روم تھا اور اس کے ایک طرف کچن بھی تھا۔ عقبی حصے میں بہترین واش روم اور اس کے برابر میں کپڑے وغیرہ رکھنے کے لیے الماری تھی۔ فرنیچر بھی بہترین تھا اور بیڈ پر صاف ستھری چادر اور تکیے موجود تھے۔ ان کا سامان کار کی ڈکی میں تھا اور انہیں فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ کیرن نے اندر آ کر اپنا کوٹ اتار دیا۔ اندر درجہ حرارت خوشگوار تھا حالانکہ باہر خاصی سردی تھی۔ سائمن واش روم میں آیا اور سب سے پہلے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی گرم آرہا تھا۔ اس نے کیرن کو اطلاع دی تو وہ خوش ہو گئی۔ اسے رات سونے سے پہلے نہانے کی عادت تھی۔ سائمن باہر آیا اور اس نے الماری کا دروازہ کھول کر دیکھا اس میں کچھ نہیں تھا۔ اوپر ایک پائپ تھا جس میں کپڑے ہینگ کیے جا سکتے تھے۔ پائپ سے کچھ خالی ہینگر بھی لٹک رہے تھے۔ کمرے میں ٹی وی بھی تھا۔ سائمن نے ٹی وی آن کیا اور چینل تبدیل کرنے لگا۔ کیرن نہانے کے لیے باتھ روم میں جا چکی تھی۔

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔" اس نے کیرن سے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن جلدی آ جانا، مجھے نیند آرہی ہے۔"

سائمن باہر آیا۔ سردی اچھی خاصی تھی اس نے کوٹ کے کالر اوپر کیے اور دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر دفتر کے ساتھ موجود ریستوران کی طرف جانے لگا۔ کمرا نمبر چھ کے ساتھ دو کمرے اور تھے اور ان کے پیچھے کمروں کی کئی قطاریں تھیں لیکن سب کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ اسے یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔ کیا ان کے علاوہ یہاں اور کوئی نہیں ٹھہرا تھا۔ ریستوران کے لیے راستہ کاؤنٹر کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ ریستوران بھی خالی تھا۔ اس نے کاؤنٹر کی گھنٹی بجائی۔ دوسری بار گھنٹی بجانے پر فریک آیا۔

"کھانے کو کچھ مل سکتا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "اسٹیک ہے اور جوس مل جائے گا۔ دودھ بھی مل سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے اسٹیک کے ساتھ مجھے کیلے کا شیک لا دو۔"

"تین منٹ لگیں گے۔" فریک نے کہا اور کچن کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف چلا گیا۔ سائمن ایک میز پر آ گیا۔ ریستوران بھی اچھا خاصا سجا ہوا تھا اور اس کا فرنیچر بھی کافی قیمتی تھا لیکن اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی آتا ہی نہ ہو۔ فرینک ہی ہر کام کر رہا تھا یعنی کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ اتنے بڑے موٹل اور دوسری سہولتوں کے لیے کوئی اور ملازم ہونا چاہیے تھا۔ فرینک اکیلا کس طرح یہ سب چلا رہا تھا۔ شیشے کی دیوار کے ساتھ میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ نشستوں کی آپس میں پشت ملی ہوئی تھی۔ ہر دو نشستوں کے درمیان ایک میز تھی جیسا کہ اس قسم کے ریستوران میں ہوتا ہے۔ ایک طرف بڑا سا کاؤنٹر تھا جس کے ساتھ اسٹول تھے۔ سائمن باہر دیکھ رہا تھا اور ایک بار اس نے سامنے دیکھا تو بڑبڑا گیا۔ اگلی میز کی سامنے والی نشست پر وہی ایوجی بیٹھا تھا اور اسے گھور رہا تھا۔ سائمن بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔

"تم...... کون ہو اور اچانک کہاں غائب ہو جاتے ہو؟"

ایوجی جواب دینے کے بجائے اسے گھورتا رہا۔ سائمن اس کے قریب آیا اور جھک کر بولا۔ "میری بات کا جواب دو۔"

ایوجی نے اس کا سوال نظر انداز کیا اور آہستہ سے بولا۔ "تم غلطی کر رہے ہو...... تم دھوکا کھا رہے ہو...... اپنی اصلیت بچاؤ...... واپس چلے جاؤ۔"

"کہاں واپس چلا جاؤں؟"

"یہ سب دھوکا ہے واپس چلے جاؤ۔" ایوجی نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ سائمن اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ مڑا اور بولا۔ "یہ کچھ مت کھاؤ یہ تمہارا مقدر نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ سائمن اس سے سوال کرتا وہ باہر جا چکا تھا۔ سائمن نے شیشے کی دیوار سے باہر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر چکرا گیا۔ ایوجی پہلے کی طرح پراسرار انداز میں غائب ہو گیا تھا۔ اسے پتا نہیں چلا کس وقت فرینک آ گیا۔ اس نے عقب سے کہا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

وہ چونکا اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ جھکا ہوا پاگلوں کی طرح شیشے کی دیوار کے پار دیکھ رہا تھا۔ فرینک نے اس کے لیے اسٹیک اور ڈرنک میز پر رکھا۔ "کچھ نہیں بس ایسے ہی کھڑا تھا۔"

فرینک نے کہا۔ "تم یہ کھاؤ میں بعد میں برتن اٹھاؤں گا۔"

سائمن نے پلیٹ سامنے کی۔ "کیا یہاں کوئی اور نہیں ٹھہرا ہوا ہے؟"

فرینک جاتے جاتے رک گیا۔ "نہیں آج بس تم آئے ہو۔"

"کوئی اور ملازم بھی نہیں ہے؟"

"نہیں فی الحال میں اکیلا ہوں کیا تمہیں یا تمہاری بیوی کو کوئی شکایت ہے؟"

"نہیں۔" سائمن نے کھانا شروع کیا۔ "وہ ابھی میری بیوی نہیں ہے البتہ تین دن بعد ہماری شادی ہے۔"

فرینک مسکرایا۔ "مبارک ہو۔"

"شکریہ۔" سائمن نے کہا اور اسے محسوس ہوا کہ اپنی اور کیرن کی شادی کا سن کر اسے پہلے کی طرح خوشی نہیں ہوئی تھی۔ فرینک چلا گیا۔ اسٹیک اچھا تھا لیکن وہ اسے بے دلی سے کھاتا رہا مگر اس نے ڈرنک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ابھی اسٹیک آدھا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اس کا مزید کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ باہر آیا تو اسے اپنے کمرے کے آگے ایک پک اپ کھڑی نظر آئی۔ جب وہ آ رہا تھا تو یہ پک اپ نہیں تھی۔ ایوجی کی وجہ سے اس کا ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے اس نے پک اپ پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ وہ کمرے میں آیا۔ کیرن نہا کر آ چکی تھی اور مختصر لباس میں چادر اوڑھ کر لیٹ گئی تھی۔ اس نے متبسم نظروں سے سائمن کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال تھا کہ تم جلدی آ جاؤ گے۔"

"ہاں...... میں کھانے کے لیے رک گیا تھا تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟"

"نہیں۔" کیرن نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ سائمن اس کے قریب تو آ گیا لیکن نہ جانے کیوں اس کا موڈ رومانی نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر میں کیرن نے بھی یہ بات محسوس کر لی اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے تمہارا موڈ کیوں نہیں ہو رہا ہے؟"

سائمن نے اپنی پیشانی سہلائی۔ "پتا نہیں کیا بات ہے، شاید میں تھک گیا ہوں۔"

کیرن پیچھے ہٹ کر اپنی جگہ لیٹ گئی۔ "تب تم سو جاؤ۔"

سائمن لیٹنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنی طبیعت بھاری لگ رہی تھی۔ اچانک اس کے پیٹ پر بوجھ سا محسوس ہوا اور وہ واش روم کی طرف بھاگا۔ کموڈ پر جھکتے ہوئے اس نے بے اختیار الٹی کر دی اور اس میں کھایا ہوا سارا اسٹیک نکل گیا تھا۔ الٹی کر کے اس کے پیٹ کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اس نے بیسن

میں سے پانی لے کر کلی کی اور منہ صاف کرتا ہوا کمرے میں آیا۔ کیرن نے پوچھا۔ "کیا ہوا تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

سائمن گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "ہاں بہتر ہے شاید سفر کی وجہ سے میرا پیٹ خراب ہو گیا ہے۔"

"تم لیٹ جاؤ۔" کیرن نے اسے شانے سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیا اور چادر اوڑھا دی۔ سائمن سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کیرن تو کچھ دیر میں گہری نیند سو چکی تھی مگر سائمن کو دیر سے نیند آئی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے بے چینی ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ٹی وی کھلا ہوا تھا اور اسکرین پر ایک سنہرے بالوں والی لڑکی ایک جوان آدمی کے ساتھ ایک پک اپ میں سفر کر رہی تھی۔ سائمن کو تعجب ہوا اس نے سونے سے پہلے ٹی وی بند کیا تھا۔ اب یہ کس طرح کھل گیا۔ اسکرین پر پک اپ آ کر رکی اور کیمرے نے اس موٹل کو دکھایا تو سائمن چونک گیا۔ پک اپ موٹل کے کمرا نمبر چھ کے سامنے رکی تھی۔ لڑکی اور آدمی اتر کر اندر آئے اور ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی نفسانی تسکین کے لیے یہاں آئے تھے۔ اچانک ٹی وی بند ہو گیا اور کمرے کے اس کونے سے ایک سایا حرکت میں آیا جہاں الماری تھی۔ سایا چلتا ہوا دروازے کی طرف گیا اور جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو سائمن دنگ رہ گیا یہ وہی سنہرے بالوں والی لڑکی تھی جسے اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ وہ بے آواز چلتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی سائمن جیسے ہوش میں آ گیا تھا اور وہ جھپٹ کر دروازے پر آیا اور اسے کھول کر باہر دیکھا لیکن دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ پک اپ ابھی تک کمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ سائمن واپس آیا اور جب اس نے الماری کھولی تو اس میں ہینگ کیا ہوا ایک لیڈیز کوٹ لٹکا ہوا تھا اور یہ وہی کوٹ تھا جو ٹی وی میں سنہری بالوں والی لڑکی نے پہنا ہوا تھا۔ سائمن کا سر چکرانے لگا تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ۔ کیا وہ کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا تھا۔

اس نے کوٹ اتارا تو اس کی جیب میں کوئی چیز محسوس ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا تو اس میں سے موٹل کی چابی نکلی اور اس پر کمرا نمبر چھ کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ اس نے چابی اپنی پتلون کی جیب میں رکھی اور کوٹ لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ دفتر میں داخل ہوا اور کاؤنٹر کی گھنٹی پر ہاتھ مارا اور اس وقت تک مارتا رہا جب تک فرینک نہیں آ گیا۔ اس نے کہا۔

"آرام سے دوست کیا ہوا ہے؟"

"یہ کوٹ ایک عورت میرے کمرے کی الماری میں ٹانگ گئی ہے۔ میں نے اسے ٹی وی میں بھی دیکھا وہ ایک نوجوان کو لے کر میرے کمرے میں آئی اور وہ دونوں......"

فرینک نے چونک کر اس کے ہاتھ سے کوٹ لے لیا۔ "یہ تو میری بیوی کا ہے۔"

سائمن دنگ رہ گیا تھا۔ "تمہاری بیوی کا ہے تو میرے کمرے میں کیا کر رہا تھا اور تمہاری بیوی وہاں کیوں آئی تھی۔ پہلے میں نے اسے ٹی وی پر دیکھا اور پھر وہ خود میرے کمرے میں دکھائی دی۔ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ کیا میں پاگل ہو گیا ہوں مجھے ایک ایوجی بھی دکھائی دیتا ہے جو اچانک ہی غائب ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے کسی دھوکے سے خبردار کرتا ہے۔"

سائمن مسلسل بول رہا تھا اور فرینک اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سائمن خاموش ہوا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو لیکن میری بیوی نورا مر چکی ہے۔"

"مر گئی ہے؟" سائمن نے بے یقینی سے کہا۔ "مگر میں نے خود اسے دیکھا ہے۔"

فرینک نے گہری سانس لی۔ "میرا خیال ہے تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

"خواب۔" سائمن نے کوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بھی خواب ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا کہ نورا کا کوٹ وہاں کیسے آیا لیکن حقیقت ہے نورا دو سال پہلے مر چکی ہے۔" فرینک نے اس کا شانہ تھپکا۔ "میرا خیال ہے تم بہت تھکے ہوئے ہو اب جا کر آرام کرو۔" فرینک نے کہا اور کوٹ اٹھا کر اندر لے گیا۔ تب سائمن نے کاؤنٹر کے عقب میں لگی تصویروں میں سے ایک تصویر میں فرینک اور اس سنہرے بالوں والی لڑکی نورا کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھا۔ سائمن نے سر تھام لیا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ اسی وقت یہاں سے نکل جائے۔ وہ واپسی کے لیے پلٹا تھا کہ اس نے ایوجی کو گیس اسٹیشن میں ایک پمپ کے پاس کھڑے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی سائمن کے جیسے پر لگ گئے اور وہ دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ اسے دھڑکا تھا کہ اس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی ایوجی سے ہٹی تو وہ غائب ہو جائے گا۔ اس لیے سائمن نے اسے مستقل اپنی نظروں میں رکھا تھا۔ اس نے جاتے ہی ایوجی کا گریبان پکڑ لیا اور جھنجوڑ کر بولا۔

"یہ سب کیا ہے؟"

"یہ سب دھوکا ہے۔" ایوجی نے نرمی سے کہا۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ''اس دھوکے سے باہر آؤ، حقیقت کو پہچانو۔''

''کیسا دھوکا؟..... کیسی حقیقت؟..... مجھے بتاؤ۔'' سائمن دہشت زدہ ہونے لگا۔ ''مجھے بتاؤ ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔''

''اپنی حقیقت پہچانو..... اس دھوکے سے باہر آؤ جو تمہارے چاروں طرف ہے۔''

سائمن نے چاروں طرف دیکھا۔ اتنا بڑا ہوٹل کیا یہ دھوکا تھا؟ نہیں یہ ابوجی کو اس کر رہا تھا۔ وہ شاید کوئی جادوگر تھا اور اپنے شعبدوں سے اس پر اپنے سحر کا سکہ جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''میری بات سنو......'' سائمن نے اس سے مزید کہنا چاہا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ اس کے سامنے کوئی نہیں تھا اور وہ شاید صرف ہوا کو اپنی مٹھی میں پکڑے ہوئے تھا۔ ابوجی نے کب اپنا گریبان چھڑوایا اور کب وہاں سے چلا گیا اسے بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ سائمن اس وسیع و عریض ہوٹل کے وسط میں تنہا کھڑا تھا۔ اس نے دفتر کی طرف دیکھا اب وہاں تاریکی تھی۔ شاید فریک بھی سونے کے لیے چلا گیا تھا۔ سائمن واپس کمرے کی طرف آیا۔ پک اپ بدستور اپنی جگہ موجود تھی۔ اس نے پک اپ میں جھانکا۔ اس کے اندر کوئی نہیں تھا۔ اچانک گیس اسٹیشن، اسٹور اور ریستوران والے حصے کی جگمگاتی روشنیاں بجھ گئیں۔ اب وہاں بس چند ایک روشنیاں جل رہی تھیں۔ روشنیاں بجھیں تو ہوٹل مزید ویران اور اجاڑ نظر آنے لگا تھا۔ سائمن ڈر کر جلدی سے کمرے میں آیا۔ کیرن بے خبر سو رہی تھی۔ وہ واش روم میں آیا اور روشنی جلا کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہا تو اسے جھٹکا لگا۔ آئینے پر جیسے کسی نے لپ اسٹک سے الفاظ لکھے تھے۔ ''اپنی حقیقت پہچانو۔''

سائمن جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور دروازے سے ٹکرا کر پیچھے گرا۔ اس کا ہاتھ برابر میں رکھے بڑے سے گلدان سے لگا اور وہ گرا تو کیرن کی آنکھ کھل گئی۔ سائمن کو نیچے گرے دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھی اور اسے سہارا دیا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''مجھے نہیں وہ......'' سائمن نے آئینے کی طرف دیکھا تو اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ آئینہ بالکل صاف تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ ''کچھ نہیں ہے۔''

سائمن کھڑا ہو گیا۔ کیرن اسے غور سے دیکھ رہی تھی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سائمن کو کوئی چوٹ نہیں لگی ہے تو وہ اسے سہارا دے کر بستر تک لے آئی۔ کیرن نے اسے لٹانا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ''ابھی میرا موڈ نہیں ہے تم سو جاؤ۔ مجھے نیند آئے گی تو میں لیٹ جاؤں گا۔''

کیرن فکرمند تھی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' سائمن نے اسے یقین دلایا۔ ''تم سو جاؤ۔''

کیرن لیٹ گئی۔ سائمن اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا اور کچھ دیر میں وہ سو چکی تھی۔ سائمن سوچ رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایسے واقعات کیوں پیش آ رہے تھے جن کے بارے میں اس نے پہلے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے خود پر اعتماد تھا وہ نفسیاتی مریض نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس حوالے سے کوئی مسئلہ درپیش تھا۔ خدا سے پراسرار باتوں میں کوئی دلچسپی تھی۔ وہ مکمل طور پر حقیقت پسند انسان تھا۔ پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ یہی سب سوچتے ہوئے وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ پھر اس نے کوشش کی کہ اپنے ذہن کو ان معاملات سے ہٹائے اور سو جائے اس کی بلا سے یہاں اگر کچھ پراسرار بھی تھا تو کل صبح وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ مگر سوچوں کو جھٹکنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

لیٹے ہوئے اس کی نظر ٹی وی کی طرف گئی۔ اس کی اسکرین تاریک تھی۔ اسے وہ منظر یاد آیا جو اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا اور پھر اس عورت کو دیکھا جو فریک کی بیوی تھی اور فریک کے مطابق وہ مر چکی تھی۔ وہ کسی اور آدمی کے ساتھ تھی۔ فریک کے دفتر میں لگی تصویر سے بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ نورما ہی تھی۔ دیکھنے میں لگ رہا تھا کہ تصویر زیادہ پرانی نہیں تھی پھر نورما کی موت کیسے واقع ہوئی۔ وہ طبعی موت مری تھی یا اسے کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟ وہ سوچ رہا تھا کہ یک لخت ٹی وی اسکرین روشن ہو گئی۔ وہ اچھل پڑا کیونکہ ٹی وی آف تھا اور اب خود بخود آن ہو گیا تھا۔

اسکرین پر کسی کلب کا منظر ابھرا جہاں لوگ پی رہے تھے اور تیز میوزک پر ناچ رہے تھے۔ ان میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے۔ پھر اسکرین پر نورما نمودار ہوئی۔ وہ اکیلی تھی اور آس پاس کسی کو ڈھونڈ رہی تھی پھر اس کا ایک جوان آدمی پر گیا جسے سائمن پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر کیا بیٹھا سامنے رکھے گلاس سے چسکیاں لے رہا تھا۔ نورما اس کے قریب آئی اور انجان بن کر پاس والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پھر دیر میں وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ منظر خاموش تھا اور صرف ان کے تاثرات سے پتا چل رہا تھا۔ ان کے درمیان کیا بات ہو رہی ہے۔ وہ بے آواز تھی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بغیر سنے ہی

سب کچھ سائمن کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

پھر وہ دونوں اٹھے اور کلب سے باہر آئے جہاں نورما کی پک اپ کھڑی تھی۔ دونوں پک اپ میں آئے اور وہ روانہ ہو گئے۔ یہاں سے منظر ختم ہوا اور پھر اسکرین پر ہوٹل کا منظر ابھرا۔ پک اپ آ کر کمرا نمبر چھ کے سامنے رکی اور نورما آدمی کے ساتھ اتر کر دروازے تک آئی۔ اس نے کوٹ کی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا تھا۔ اندر آتے ہی آدمی نے اسے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی لیکن نورما نے اسے روک دیا۔ اس نے اپنا کوٹ اتار کر الماری میں لٹکایا۔ پھر دونوں بستر کی طرف بڑھے۔ یہاں منظر ختم ہو گیا۔ سائمن چونکا اس کا خیال تھا کہ ٹی وی بند ہو گیا ہے وہ سمجھ رہا تھا کہ ٹی وی دوبارہ روشن ہو گیا۔ اس بار فریک کے دفتر کا منظر تھا اور وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور دفتر کے سامنے والے حصے میں آیا۔ تب اس نے کمرا نمبر چھ کے سامنے موجود پک اپ دیکھی اور وہ تیزی سے باہر آیا۔ اس کا رخ پک اپ کی طرف تھا۔ پک اپ خالی تھی پھر وہ کمرے کی طرف آیا۔ اس نے ایک کھڑکی سے اندر جھانکا اور پھر اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے یقیناً اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر پلٹ کر تیزی سے واپس آیا اور اس نے دفتر میں اپنی میز کی دراز سے ایک عدد پستول نکالا اور کمرا نمبر چھ کی اضافی چابی لی۔

فریک تیزی سے کمرا نمبر چھ تک آیا۔ اس نے چابی سے تالا کھولا اور خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ نورما اور دوسرا آدمی ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے لہٰذا انہیں فریک کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔ فریک نے پستول سیدھا کیا۔ سائمن کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اصل کہانی سامنے آ رہی تھی۔ اسی لمحے ان دونوں کو فریک کی موجودگی کا علم ہو گیا اور وہ جلدی جلدی اپنی حالت درست کرنے لگے۔ مرد خوف زدہ تھا لیکن نورما بالکل نہیں ڈری تھی اس کے بجائے وہ فریک پر چیخنے چلانے لگی تھی۔ جواب میں وہ بھی چلا رہا تھا اور پھر اچانک اس نے گولی چلا دی۔ گولی نورما کے سینے پر دل سے ذرا نیچے لگی اور وہ بے یقینی کے تاثرات لیے قالین پر گر گئی۔ جوان آدمی صرف نیکر میں اٹھ کر بھاگا اور کمرے سے نکل گیا۔ فریک بھی اس کے پیچھے آیا اور عقب سے گولی چلائی۔ جوان آدمی منہ کے بل گرا اور ساکت ہو گیا۔ فریک واپس اندر آیا اور اس نے نورما کو دیکھا۔ وہ زندہ تھی۔ فریک رونے لگا اور اسے سینے سے لگا کر کچھ کہنے لگا شاید وہ اس سے معافی مانگ رہا تھا لیکن نورما بے سدھ ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ کچھ دیر کی مہمان لگ رہی تھی۔ فریک اسے اٹھا کر واش روم میں لایا اور باتھ ٹب میں لٹا دیا۔ نورما کا جسم نزع کے عالم میں جھٹکے لے رہا تھا۔ فریک تولیے کی مدد سے اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کی کوشش بے کار گئی اور نورما نے ایک آخری جھٹکا لیا پھر وہ ساکت ہو گئی۔ اس کی روح نکل چکی تھی اور جسم بے جان تھا۔ فریک اسے سینے سے لگا کر دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ وہ بار بار اسے جھنجوڑ رہا تھا لیکن نورما ہمیشہ کی نیند سو چکی تھی۔

اچانک ٹی وی اسکرین تاریک ہو گئی اور سائمن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے ٹی وی کی طرف غور سے دیکھا۔ مگر وہ بدستور بند تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے جو دیکھا تھا وہ خواب تھا یا سچ تھا۔ کیرن بے خبر سو رہی تھی۔ سائمن نے اٹھ کر ٹی وی کے پاس جا کر دیکھا وہ سوئچ سے بند تھا اور تکنیکی طور پر اس کا آن ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے ساکٹ سے ٹی وی کی تار کھینچ کر نکال لی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ سائمن نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پک اپ اسی جگہ کھڑی تھی۔ یہ وہی نورما کی ٹی وی اسکرین والی پک اپ تھی۔ سائمن کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر باہر آیا۔ اس کا رخ پک اپ کی طرف تھا۔ اس نے پک اپ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ کھل گیا۔ سائمن اندر جھکا اگنیشن میں چابی دیکھ رہا تھا۔ چابی موجود تھی۔ اس نے چابی نکال لی اور پھر ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا۔ اس میں ایک عدد [illegible] تھا۔

''مسٹر کیا کر رہے ہو؟'' عقب سے آواز آئی تو سائمن چونک کر مڑا اور سامنے نورما کو کھڑے دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔

''تم...... لیکن تم تو مر چکی ہو۔''

''تم شاید پاگل ہو۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ ''میں زندہ ہوں۔''

سائمن پک اپ سے باہر آیا۔ اس نے نورما کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اس نے مزاحمت کی۔ ''چھوڑو مجھے......''

''تم جھوٹ بول رہی ہو میں نے خود فریک کو تمہیں گولی مارتے دیکھا تھا...... تم مر چکی تھیں۔''

''میں زندہ ہوں۔'' اس نے مزاحمت جاری رکھی پھر چیخ کر چلائی۔ ''فریک۔''

سائمن نے مڑ کر دیکھا۔ فریک دفتر سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے پستول سائمن پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تان لیا اور بولا۔ ''اسے چھوڑ دو۔''

''یہ مر چکی ہے تم نے اسے گولی ماری تھی۔'' سائمن بولا اور نورما کو چھوڑ کر فرینک کی طرف بڑھا۔ ''میں نے خود دیکھا تھا۔ تم نے اس عورت کو ایک اور مرد کے ساتھ دیکھ لیا تھا اسی کمرا نمبر چھ میں اور پھر اسے شوٹ کر دیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''فرینک، یہ شخص پاگل ہے۔'' نورما بولی۔ ''اسے شوٹ کر دو ورنہ یہ مجھے قتل کر دے گا۔''

''میں تمہیں قتل نہ کروں۔'' سائمن نے تلخی سے کہا۔ ''تم پہلے ہی مر چکی ہو سنا تم نے۔'' وہ پھر اس کی طرف بڑھا اور نورما کا گلا پکڑ لیا۔ ''سنا تم نے تم مر چکی ہو۔'' وہ اس کا گلا دبانے لگا۔ نورما کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر فرینک تیزی سے آگے آیا اور اس کا پستول والا ہاتھ بلند ہوا پستول کا دستہ سائمن کے سر پر لگا۔ وہ چکرا کر پیچھے گرا تو نورما کا گلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ نورما اور فرینک اسے دھندلائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ فرینک نے نورما کو گلے سے لگا لیا۔ وہ اسے تسلی دے رہا تھا پھر وہ سائمن کے پاس آیا اس کا ہاتھ دوبارہ بلند ہوا اور پستول کا دستہ ایک بار پھر سائمن کے سر سے ٹکرایا۔

☆☆☆

سائمن کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر تھا۔ اس نے اپنا سر ٹٹولا لیکن اس کا سر بالکل ٹھیک تھا۔ نہ اس میں زخم تھا اور نہ ہی درد۔ وہ بالکل فریش تھا جیسا کہ گہری نیند سے سو کر اٹھنے کے بعد محسوس کرتا تھا۔ کیرن بستر پر نہیں تھی اور واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تولیہ باندھے باہر آئی۔ سائمن کو جاگتے دیکھ کر مسکرائی۔ ''گڈ مارننگ، تیار ہو جاؤ ہمیں روانہ ہونا ہے۔''

سائمن اٹھ بیٹھا۔ اس نے گہری سانس لی اور سوچا کیا وہ سب خواب تھا۔ ابھی نورما اور اس نے جو کچھ رات میں دیکھا تھا۔ کیرن اس کے پاس آئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' سائمن نے کہا اور بستر سے اٹھ گیا۔ اس نے سب سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ سورج نکل آیا تھا اور سامنے میدان میں روشنی پھیل رہی تھی۔ اس میدان میں صرف ایک گاڑی کھڑی تھی اور وہ سائمن کی کار تھی۔ کیرن کپڑے بدل رہی تھی۔ سائمن واش روم میں آیا اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ برش کیا اور باہر آ کر اپنی قمیص اور کوٹ پہنا۔ کیرن نے سارا سامان اپنے ہینڈ کیری میں رکھ لیا تھا اور وہ روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھے۔

وہ باہر آئے۔ سائمن نے صبح کی تازہ ہوا میں گہری سانس لی اور دو دن بعد ہونے والی شادی کے بارے میں سوچا۔ کیرن کار کی طرف چلی گئی اور سائمن موٹل کے دفتر کی طرف بڑھا۔ اسے چابی واپس کرنا تھی۔ دفتر میں داخل ہو کر اس نے کاؤنٹر کی گھنٹی بجائی تو فرینک مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔

''کیا حال ہیں دوست رات کیسی گزری؟ ناشتا ہو گیا؟''

''رات بہت اچھی گزری۔'' سائمن نے اسے غور سے دیکھا لیکن فرینک کے تاثرات میں کہیں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ معصوم نظر آ رہا تھا۔ سائمن نے چابی کاؤنٹر پر رکھ دی۔ ''ناشتے کا موڈ نہیں ہے۔''

فرینک نے شانے اچکائے۔ ''جیسی تمہاری مرضی۔''

''بائے۔'' سائمن نے کہا اور جانے کے لیے مڑا پھر رک گیا۔ ''فرینک تمہاری بیوی کی موت کیسے ہوئی تھی؟''

اس سوال پر فرینک کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اس نے کچھ دیر رک کر کہا۔ ''اسے گولی لگی تھی۔ مجھے امید ہے تمہارا سفر اچھا گزرے گا۔''

اس سے پہلے سائمن کوئی سوال کرتا فرینک چابی بورڈ پر لٹکا کر اندر جا چکا تھا۔ وہ باہر نکل آیا۔ سورج کی روشنی تیز ہو گئی تھی اور اب سائمن کو رات کے واقعات خواب ہی لگ رہے تھے۔ کیرن کار کے پاس کھڑی تھی۔ سائمن نے پوچھا۔ ''تم اندر کیوں نہیں بیٹھیں؟''

''تم بھول رہے ہو چابی تمہارے پاس ہے۔'' کیرن بولی۔

سائمن نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کار کی چابی کے ساتھ اس کی انگلیاں کسی اور چیز سے بھی ٹکرائی تھیں۔ اس نے وہ چیز باہر نکالی تو وہ کمرا نمبر چھ کی چابی تھی اس پر چھ کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ لیکن یہ چابی تو وہ فرینک کو واپس کر آیا ہے۔ اس نے سوچا اور تب اسے یاد آیا کہ اس نے الماری میں موجود کوٹ سے یہ چابی نکال لی تھی اور اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ اس نے تعجب سے سوچا تو کیا وہ سب خواب نہیں تھا...؟ یعنی سب کچھ حقیقت میں بھی ہوا تھا۔ کیرن اپنا ہینڈ کیری دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے پریشانی سے کہا۔ ''میرا ہیئر برش نہیں ہے شاید وہ کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل پر رہ گیا ہے۔ تمہیں پھر چابی لانا ہو گی۔''

سائمن نے ہاتھ میں دبی چابی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کار کی چابی کیرن

کی طرف بڑھا دی۔ ''تم اندر بیٹھو میں برش لے کر آتا ہوں۔''

کیرن نے اسے حیرت سے دیکھا لیکن وہ اس کے بولنے سے پہلے کمرا نمبر چھ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے چابی تالے میں ڈالی اور دروازہ کھول لیا۔ اندر جانے سے پہلے اس نے مڑ کر کیرن کو دیکھا جو حیران تھی کیونکہ اس کے سامنے سائمن چابی دفتر میں دے آیا تھا۔ سائمن اندر داخل ہوا۔ اس نے کیرن کا برش دیکھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل پر نہیں تھا۔ بستر اور سائیڈ درازوں پر بھی نہیں تھا۔ پھر اسے واش روم کا خیال آیا۔ وہ واش روم کی طرف بڑھا تھا کہ رک گیا۔ اندر روشنی تھی جب کہ وہ روشنی بند کر کے نکلے تھے۔ یہ روشنی کس نے جلائی؟ وہ دھڑکتے دل اور محتاط قدموں سے واش روم کی طرف بڑھا۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہینڈل پکڑ کر گھمایا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے کوئی نہیں تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ شاید اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ واش روم کی بتی جلتی رہ گئی تھی۔ وہ اندر آیا۔ وہ برش دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ٹب کی طرف گئی۔ اس کے آگے پلاسٹک کا نیم شفاف پردہ تھا اور پردے کے ایک سرے سے ایک نسوانی ہاتھ جھانک رہا تھا۔

سائمن بے ساختہ پیچھے ہٹا تھا۔ وہ ڈر گیا تھا پھر اس نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا۔ اندر ٹب میں نورما کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس کے سینے سے رسنے والا خون اب بھی تازہ تھا۔ سائمن نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور الٹے قدموں سے واش روم سے باہر نکل آیا۔ وہ بیٹھ کر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس نے سر تھام لیا۔ کیا وہ اب بھی کوئی خواب دیکھ رہا تھا؟ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اچانک کمرے کا بیرونی دروازہ کھلا اور فرینک اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے سائمن کی طرف دیکھا تو وہ ڈر کر بستر میں سمٹ گیا۔ لیکن فرینک نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور اس کے پاس سے ہوتا ہوا واش روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے اندر جا کر ایک بار پھر سائمن کی طرف دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔

سائمن کھڑا ہو گیا۔ وہ واش روم کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اندر سے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی اور وہ لرز گیا۔ اس ایک دھماکے کے بعد اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ سائمن کانپتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے دروازہ کھولا۔ فرینک ٹب کے پاس اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کے سر سے بہنے والا خون اس کے آس پاس فرش پر پھیل

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

دیکھیے جون 2011ء کے جاسوسی شمارے کی ایک جھلک

جگر خراش — اثر نعمانی
محبت اور دولت کا ساتھ ہر شخص کا مقدر نہیں ہوتا
دونوں میں سے ایک کو راہِ سفر کے لیے چننا پڑتا ہے
پسندیدہ مصنف کے اثر انگیز قلم سے یادگار شاہکار

للکار — طاہر جاوید مغل
زندگی اور موت کے درمیان جاری سنسنی خیز مقابلے
کا احوال جیت اور مات کے لیے بازیگروں کی دوڑ

گرداب — اسماء قادری
چلیے تو کٹ ہی جائے گا سفر... پے در پے
رونما ہونے والے حادثات کی خونی داستان

مشرق و مغرب کے رنگ ڈھنگ
مغربی دنیا کے رسم و اطوار... معاشرت و تغیرات
کے گرد گھومتی مختلف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

سرورق کی رنگ
سلیم فاروقی اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے تخیل و قلم سے جنم لینے والے سرورق کے دو رنگ

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور بہت دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا تھا۔ سائمن کو چکر آ گیا۔ اس نے دروازے کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے سوچا کہ اس سے پہلے وہ اس سوٹ میں کسی طرح سے ملوث ہو اسے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ دو دن بعد اس کی شادی ہے اور وہ کسی چکر میں پڑنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف آیا اور جھٹک گیا۔ دروازے پر ایبوجی موجود تھا۔

''تم......'' سائمن نے دانت پیس کر کہا اور اس کی طرف لپکا۔ اس نے ایبوجی کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچ ''مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے، میں پاگل ہونے والا ہوں۔''

''یہ کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ سکون سے بولا۔ ''یہ صرف دھوکا ہے، اس دھوکے میں پڑ کر تم اپنی حقیقت فراموش کیے ہوئے ہو۔''

سائمن نے اسے گالی دی اور زہر بلے لہجے میں بولا۔ ''حقیقت میں بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے پوری قوت سے ایبوجی کے منہ پر مکا مارا۔ وہ الٹ کر قالین پر جا گرا۔ سائمن اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ ''اور حقیقت بتاؤں یہ تو......'' اس نے پھر مکا مارا اور ہر بار وہ مکا مار کر یہی الفاظ کہتا تھا۔

''تم خود کو دھوکا دے رہے ہو۔'' ایبوجی کی آواز آئی سائمن نے سر گھما کر دیکھا، وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ جب کہ وہ تو اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سائمن نے قالین کی طرف دیکھا تو وہ خالی تھا۔ ایبوجی وہاں نہیں تھا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا وہ بالکل ٹھیک لگ رہا تھا جب کہ سائمن کے مکوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

''کیسا دھوکا؟'' سائمن حلق کے بل چلایا۔ ''تم سب مجھے الو بنا رہے ہو۔ اس ہوٹل کے مالک نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔''

''یہ دو سال پرانی بات ہے۔'' ایبوجی نے کہا۔ ''فریک نے دو سال پہلے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر دیا تھا اور پھر خود بھی اسی واش روم میں خودکشی کر لی تھی۔''

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں بد روحوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔'' سائمن ہنسی سے بولا۔ ''کیونکہ میں تمہیں بتا دوں میں اس قسم کی باتوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا ہوں۔''

''تم منطقی مزاج رکھنے والے آدمی ہو۔'' ایبوجی بدستور نرمی سے بات کر رہا تھا۔ ''تم سچ تسلیم کرتے ہو لیکن اس وقت تم سچ تسلیم کرنے سے ہچکچا رہے ہو۔ خود کو اس دھوکے میں مبتلا کیے ہوئے ہو۔ حالانکہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، تمہیں حقیقت بہر حال تسلیم کرنا پڑے گی۔''

''کیسا دھوکا اور کیسی حقیقت؟'' سائمن نے اپنے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ''کیا یہ حقیقت ہے کہ میں روحوں کے چکر میں آ گیا ہوں یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔''

''نہ تم روحوں کے چکر میں آئے ہو اور نہ تم کوئی خواب دیکھ رہے ہو۔''

''تم صرف بکواس کر رہے ہو۔'' سائمن نے تند لہجے میں کہا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا جب اس نے کیرن کو کار میں چھوڑا تھا وہاں نہ اب کار تھی اور نہ ہی کیرن تھی۔ وہ دونوں غائب تھے۔ اس نے پاگلوں کی طرح آس پاس دیکھا اور پھر دفتر کی طرف بڑھا۔ وہ پولیس کو کال کرنے جا رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ سارا چکر مافیا کا تھا اور ان لوگوں نے کیرن کو اس کی کار سمیت غائب کر دیا تھا۔ ابھی وہ گیس اسٹیشن کے پاس تھا کہ اسے سامنے ایبوجی دکھائی دیا۔ سائمن نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم چاہتے کیا ہو؟''

''کچھ نہیں میں صرف تمہیں خبردار کر رہا ہوں، تم جو کرنے جا رہے ہو وہ بے کار ہے۔ تمہاری منگیتر کو کسی نے اغوا نہیں کیا ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔''

''یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟''

''وہ وہیں ہے جہاں کل رات تمہاری کار کو حادثہ پیش آیا تھا۔''

سائمن کو اس بار لگنے والا جھٹکا شدید تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود گول گول گھوم رہا ہو۔ جیسے کسی بگولے کی زد میں آ گیا ہوں۔ اس نے دیکھا کہ اس کی کار سڑک سے پھسلتی ہوئی کنارے کی طرف جا رہی ہے۔ وہ اسے روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیرن خوف سے چیخ رہی ہے۔ کار بالکل کنارے پر آ گئی ہے۔ سائمن سمجھ رہا تھا کہ وہ اس طرح رک جائے گی جس طرح رکی تھی لیکن وہ نہیں رکی بلکہ کنارے سے گری اور قلابازیاں کھاتی نشیب میں جا گری۔ کار گرنے کے دوران اسے کیرن اور اپنی چیخیں سنائی دیں اور جب کار رک گئی تو ان کی چیخیں بھی رک گئیں۔ اب وہاں سناٹا تھا۔

منظر دوبارہ بدل گیا اور وہ اسی موٹل میں کھڑا تھا۔ اس نے بے بسی سے ایبوجی کو دیکھا وہ افسردہ تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''یہ وہ حقیقت ہے جس سے تم نظریں چرا رہے ہو میرے دوست۔''

سائمن بالکل ساکت تھا لیکن اس کے اندر شدید...... ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس نے جو دیکھا تھا اسے اس کا ذہن ماننے کو تیار نہیں تھا... کل رات حادثہ پیش آ گیا تھا

تو وہ یہاں کیسے تھا؟ اس نے ایبوجی کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''تم نے حقیقت کو تسلیم نہیں کیا اس وجہ سے تم بھٹکتے ہوئے یہاں آ گئے۔ تم تسلیم کر لو تم مر چکے ہو اور اب اس دنیا سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

سائمن نے آس پاس دیکھا۔ ''کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ حقیقی دنیا ہے۔ یہ موٹل اور اس کی ساری چیزیں یہ سب حقیقی ہیں۔''

''میں نے کہا یہ دھوکا ہیں۔''

''فریک اور لورا؟''

''وہ بھی دھوکا ہیں۔''

''اور تم؟''

''میں بھی ظاہری دھوکا ہوں لیکن اصل میں تمہارا ضمیر ہوں، تمہیں سچائی کا راستہ دکھانے آیا ہوں۔''

اب وہ اندر سے کمزور پڑنے لگا تھا۔ اس نے لرزتے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایسا کیوں ہے۔ کیا انسان مرنے کے بعد خود کو اسی طرح زندہ سمجھتا ہے؟''

''ہر انسان نہیں...... لیکن انسان اتنی آسانی سے موت کی حقیقت تسلیم نہیں کرتا۔ خاص طور سے وہ انسان جو کسی مقصد کے لیے جینا چاہتا ہو جیسے کہ تم کیرن سے شادی کے لیے جینا چاہتے ہو۔''

کیرن پر اسے یاد آیا۔ ''میں اسے یہاں چھوڑ کر اندر گیا تھا اور باہر آیا تو وہ نہیں تھی۔''

''وہ بھی تمہاری نظر کا دھوکا تھی۔ وہ اصل میں وہیں ہے جہاں کار کو حادثہ پیش آیا تھا۔''

''تو میں یہاں کیوں ہوں؟''

''کیونکہ تم مر چکے ہو اور اپنی مرضی سے کہیں جانے کے لیے آزاد ہو۔''

''کیا کیرن زندہ ہے؟''

ایبوجی نے سر ہلایا۔ ''ہاں ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔''

سائمن کا جسم کانپنے لگا تھا۔ ''میں اب اسے حاصل نہیں کر سکوں گا۔''

''وہ زندہ ہے اور اس دنیا سے تمہارا ہر رابطہ گزشتہ رات ٹوٹ چکا ہے۔ اب تمہارے مقدر میں اس دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کیرن اس دنیا کی ہے۔''

سائمن کو یاد آیا اس نے گزشتہ رات جو ایک خواب دیکھا تھا وہ اسے ہضم نہیں ہوا تھا اور الٹی کی صورت میں نکل گیا تھا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اب زندہ نہیں ہے اور اس کے

مقدر کا رزق ختم ہو چکا ہے؟ اس نے ایبوجی کی طرف دیکھا۔ ''کیا میں سچ مچ مر چکا ہوں؟''

''ہاں اپنے آس پاس غور سے دیکھو۔'' ایبوجی نے موٹل کی طرف اشارہ کیا اور جب اس نے موٹل کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ چند لمحے پہلے جہاں ایک شاندار موٹل گیس اسٹیشن، ریستوران اور اسٹور تھا۔ وہاں اب سوائے گرد آلود کھنڈر عمارتوں کے کچھ نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ جگہ برسوں سے ویران پڑی ہو۔ گرانچی چھ کے سامنے ایک زنگ آلود اور خستہ حال پک اپ کھڑی تھی۔ موٹل کا بورڈ ٹوٹ گیا تھا اور اس کا شیشوں والا دفتر اس وقت بھوتوں کا بسیرا لگ رہا تھا۔ وہ سچ مچ بھوتوں کا بسیرا تھا۔ سائمن نے ایبوجی کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلایا۔

''اب تم حقیقت دیکھ رہے ہو۔''

''میں مر چکا ہوں تو پھر یہاں کیا کر رہا ہوں مجھے تو کہیں اور ہونا چاہیے؟''

''اس جگہ تم اسی صورت میں جا سکتے ہو جب اپنی حقیقت پہچان لو اور تم نے حقیقت پہچان لی ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

''کہاں؟''

ایبوجی نے سامنے نظر آنے والی نہایت لمبی اور سیدھی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تمہیں تمہاری منزل پر لے جائے گی۔''

سائمن ایبوجی سے منزل کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن اب وہ اپنی جگہ نہیں تھا وہ ہمیشہ کی طرح غائب ہو چکا تھا اور اس بار شاید ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ سائمن نے گہری سانس لی اور سڑک پر آ گیا۔ وہ لا متناہی حد تک طویل لگ رہی تھی لیکن منزل تک تو پہنچنا تھا۔ اس لیے سائمن نے اپنا سفر شروع کر دیا۔

☆☆☆

کیرن کو لگا کہ اس کا جسم درد کے سمندر میں تیر رہا ہے۔ وہ کراہنے لگی اور پھر اس نے بہ مشکل آنکھ کھولی۔ وہ سائمن کے جسم سے لگی ہوئی تھی۔ سائمن کا جسم کھڑکی کی طرف لڑھکا ہوا تھا اور اس کی کھلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اسے مرے ہوئے بہت دیر گزر چکی ہے۔ کیرن پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے وہ آوازیں سنائی نہیں دی تھیں جو اوپر سے آ رہی تھیں کیونکہ حادثے کے بعد امدادی کارکن اب پہنچے تھے۔

M.M.M

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محفلِ شعر و سخن

ثمینہ رزاق۔۔۔۔۔لیہ
سانجھ ڈھلی تو اڑتے پنچھی لائے یہ پیغام
تو بھی گھر جا پاگل لڑکی ہوگئی اب تو شام

نذیر احمد بزمی۔۔۔۔۔رحیم یار خان
دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو، دشمن کو بھی مات کرو ہو
دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

محمد کمال انور۔۔۔۔۔اورنگی ٹاؤن، کراچی
غیروں کا بھی غم رکھتے ہو تم دل میں ہمیشہ
کہنے کو تو تم میرے وفادار بہت ہو

ooo

محمد ہمایوں تنولی۔۔۔۔۔مانسہرہ
کچھ ہوش میں بھی آنے دے مجھ کو خدا سے ڈر
اے بے خودی چلی ہے تو لے کر کدھر مجھے

شوکت علی۔۔۔۔۔گلبرگ، لاہور
چراغ گھر میں جلا رہا ہوں
ہوا سے رشتہ نبھا رہا ہوں
اٹھا رہا ہوں زمیں سے موتی
فلک پہ تارے سجا رہا ہوں

محمد صدیق چوہان راجپوت۔۔۔۔۔ساہیوال
زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے
خدا کرے تمہیں مجھ سے دشمنی ہو جائے

ماہ نور بلوچ۔۔۔۔۔فقیرپور
تمام رات برستی رہیں ساون کی گھٹائیں
ہم بھی تیری یاد میں دل کھول کے روئے

باقر عباس۔۔۔۔۔کلیانہ روڈ کھاریاں
میرے غم کا ساتھی، میرے بخت کا ستارہ
تیری آرزو نے لوٹا، تیری جستجو نے مارا
کبھی لے بساط زندگی پہ غم آرزو کی بازی
کبھی ان کی شہ پہ جیتی، کبھی دل کی شہ پہ ہارا

ریاض بٹ۔۔۔۔۔حسن ابدال
سمجھ کر کانچ کا گھر میرے دل کو
اس بے وفا نے ہاتھ میں پتھر اٹھا لیا ہے

حسنین عباس بلوچ۔۔۔۔۔ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
خود کو بانٹ نہ ڈالوں کہیں دامن دامن
کر دیا تو نے اگر میرے حوالے مجھ کو
بادہ پھر بادہ ہے میں زہر بھی پی جاؤں قتیل
شرط یہ ہے کہ کوئی بانہوں میں سنبھالے مجھ کو

محمد اشفاق سیال۔۔۔۔۔شورکوٹ سٹی
کچھ چاہت کو چھپائے کوئی پہ چھپتی نہیں
پیار کی آنکھ اور الفت کی نظر چھپتی نہیں

ادریس احمد خان۔۔۔۔۔ناظم آباد، کراچی
وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ماہا ایمان۔۔۔۔۔حافظ آباد
وہ دل کی بازی جہاں مجھ سے جیتنا چاہے
میں مان لوں گا وہیں مات اس سے کہہ دینا
وفا کی راہ میں، میں آج بھی اکیلا ہوں
کوئی نہیں ہے میرے ساتھ اس سے کہہ دینا

عاصم اقبال جپال۔۔۔۔۔سالم بھلوال
مری نظر کی بلندیاں مجھے کس مقام تک لے گئیں
[illegible] سے بلندیوں کی دھول تھی مجھے کہکشاں کا گماں ہوا

محمد یوسف میاں۔۔۔۔۔ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اگر دریا دل سمندر ہے شور پھر کیسا میرے جامد ہے
اک درویش نے کہا مجھ سے وقت سب سے بڑا استاد ہے

محمد اسماعیل اجاگر۔۔۔۔۔پنڈی گھیب
سوچ کر چنی ہے میں نے آخری آرام گاہ
میں تھا مٹی کا اور مجھے مٹی کا گھر اچھا لگا

ایم ڈی مل اے۔۔۔۔۔شنکیاری، مانسہرہ
شہر میں حسن سادہ کو کانٹوں میں تولا گیا
بک گئے کوڑیوں کے مول جو گاؤں کے پھول تھے

رضوان تنولی کریڑوی۔۔۔۔۔اورنگی ٹاؤن
رونا میرا پوچھتے کیا ہو چشم سے آنسو بہنے دو
مجھ کو تصور اور بندھا ہے ایک ذرا چپ رہنے دو

شہباز احمد۔۔۔۔۔سینٹرل جیل کوٹ لکھپت
یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے کبھی تم کو بھی یاد آتا ہوں میں
اک دھندلا سا تصور ہے کہ دل بھی تھا یہاں
اب تو سینے میں فقط اک ٹیس سی پاتا ہوں میں

رمضان پاشا۔۔۔۔۔گلشن اقبال
ارادہ ہے اک غزل کہوں، کبھی پیش جس میں کر سکوں
کوئی حرف تیرے حضور میں، کوئی شعر تیری جناب میں

فرخ بلوچ۔۔۔۔۔[illegible]، شورکوٹ
مجھ کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام تیرا
ہو اگر تجھ سا تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

محمد آصف ساجد۔۔۔۔۔قصور
لذت دیدار کی اے ساعت درخشاں ٹھہر
پڑھ رہا ہوں میں تیرے چہرے پہ لکھا ہوا

محمد اطہر حسین۔۔۔۔۔کراچی
خیال ہے تو ابھی ڈھونڈ پھر ملوں نہ ملوں
ابھی میں تیرے اڑائے ہوئے غبار میں ہوں

مسز ضیا القمر سلطانہ۔۔۔۔۔رتی ٹبی، ساہیوال
بہت کھو چکا ہوں اب کھونے کی طاقت نہیں مجھ میں یارب
یہ جو کچھ لوگ میرے ہیں، انہیں میرا ہی رہنے دے

جنید احمد ملک۔۔۔۔۔گلستان جوہر، کراچی
نہ کر ناز حسن پہ نہ چل سر اٹھا اٹھا کر
خدا نے ہزاروں چہرے مٹا دیے بنا بنا کر

ڈاکٹر وسیم خالق۔۔۔۔۔کھاریاں، گجرات
ہجر کا باب ہوگئے ہو تم بھی
کتنے کامیاب ہوگئے ہو تم بھی
میں نہ کہتا تھا وقت ظالم ہے
دیکھ لو خواب ہوگئے ہو تم بھی

صوبیدار (ر) ذوالفقار علی بگش۔۔۔۔۔[illegible]، خیبر پختونخواہ
جب میری ہستی کا گماں خاک میں مل جائے گا
یاد میری زیست کی ہوگی میری تصویر سے

این ایس آر درد۔۔۔۔۔بلدیہ ٹاؤن، کراچی
میرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر وہ حساب آج چکا دیا

یمنیٰ احمد۔۔۔۔۔کراچی
پوچھو نہ سبب آنکھ میں آئے ہوئے نم کا
یوں بھید نہ کھل جائے کہیں اہل کرم کا

صائمہ۔۔۔۔۔نیو کراچی
سفر تھا دھوپ کا اور راستہ بھی شیشے کا
بدن تھا موم کا سو مختصر گزار آئی

محمد امین۔۔۔۔۔گولیمار، کراچی
من کی آگ میں جلتے ہیں اور انگاروں پہ چلتے ہیں
دشت بلا میں جو لوگ شہر بسانے آتے ہیں

چوہدری طاہر نذیر۔۔۔۔۔ساہیوال
حسرت وصال کا مارا ہوا ہے
دل اسے جیت کے ہارا ہوا ہے

طاہرہ یاسمین۔۔۔۔۔سرگودھا
چلتے چلتے زمیں تمام ہوئی
عکس خواب میں آ کے شام ہوئی

بشیر احمد بھٹی۔۔۔۔۔بہاولپور
اسے حیران کر دوں گا میں اک دن
بہت جچتی ہے یہ دنیا سہانی

تفسیر عباس بابر۔۔۔۔۔اوکاڑہ
کوئے جاناں ہی کبھی عشق کبھی وحشت بلا لے جاتی ہے
ہم خشک پتے ہیں جہاں چاہے ہوا لے جاتی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محفلِ شعر و سخن

❋ احمد خان توحیدی ..... پاکستان اسٹیل، کراچی
دنیا کے ستائے ہوئے ٹھکرائے ہوئے لوگ
آتے ہیں یہ کس زمرۂ تحریر کے اندر

❋ حسن عقیل چشتی ..... حافظ آباد
گھر پھونکنے میں صرف ہوائیں نہیں شریک
شامل کچھ اس میں گھر کے دیے کا ہنر بھی ہے

❋ محمد اقبال ..... کورنگی
صحرا صحرا خاک اڑاتا قیس پھرا، دیوانہ تھا
جس بستی میں ہم ہیں اس کا کوچہ کوچہ صحرا ہے

❋ ارسلا فضل ..... رو ہڑی
نکلے نہیں جب پاؤں زمیں پہ تو فضا میں
ذروں کی طرح لوگ بکھر کیوں نہیں جاتے

❋ رضوان احمد ..... لاہور
میں ابھی تک اسی مکاں میں ہوں
میری تصویر جس مکاں میں تھی

❋ مولا بخش ..... میرپور ساکرو
بجھا تھا دل تو چراغاں کیا تھا دنیا نے
دھواں اٹھا ہے تو دیوار و در کو دیکھتے ہیں

❋ سدرہ ظہیر ..... ساہیوال
عمر گزری روتے لیکن ایسا سناٹا نہ تھا
میں نہ تھا کل رات یا وہ میرا ہمسایہ نہ تھا

❋ فیصل اقبال ..... روہڑی
غازۂ رخسار کی صورت مہک اٹھتی ہے دھوپ
دیکھ کر کنجِ لبِ جاناں نکل جاتی ہے شام

❋ ایم الیاس ..... سرگودھا
کیا خبر کب درد کی لے ٹوٹ جائے
چھیڑ دیں کب سازِ دل کے تار کیا

❋ شریف خان ..... شورکوٹ
پیالہ ہو تو اچھالوں شراب ہو تو پیوں
حیات ہو تو لٹاؤں قضا کے رستے میں

❋ زوہیب احمد ملک ..... گلستان جوہر، کراچی
رنگ اڑ جاتا ہے تحریر تو رہ جاتی ہے
خواب کے بعد کی تعبیر تو رہ جاتی ہے

❋ دردانہ عمر ..... ساہیوال
یہ زمیں نہ جانے کس دستِ کوزہ گر کی
اک جہاں ہے گردش میں آب و گِل کی قسمت کیا

❋ محمد اقبال خان احمد شیل ..... چوہوان
سوزِ فراق یار میں مرنا کہیں کمال
عمر کے ہجرِ یار میں جینا کمال ہے

❋ چوہدری طاہر ..... ساہیوال
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

❋ ماہم طاہر ..... ساہیوال
خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

❋ راشد حبیب نابش ..... ضلع اٹک
ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

❋ محمد یونس چوہدری ..... سلطان پورہ، لاہور
نہ سائباں تجھے دھوپ سے بچاتا ہے
نہ دھوپ سر پہ اترتی ہے سائباں کی طرح

❋ شکیل الرحمٰن ..... کھاناں
ہم تجھ سے اتنی تو عنایت کرتے
اور کچھ دے محبت کرتے

❋ محمد بشارت ..... سنگر دوڑہ
ساقی کی اک نگاہ کے افسانے بن گئے
کچھ پھول ٹوٹ کر مرے پیمانے بن گئے

❋ سلیم عثمانی بھون ..... گلبہار
وہ خوش جمال کتنا رہتا تھا بدگماں سا
باتوں میں کچھ جلن سی، آنکھوں میں کچھ دھواں سا

کوپن برائے شمارہ اگست 2011

محفلِ شعر و سخن

نام: ....

پتا: ....

....

بہاء الدین ولد

تسلیم بلگرامی

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی ایک ایسی شخصیت، جس کے عظیم فرزند نے جب تصوف اور صوفیانہ شاعری میں بے مثل مثنوی کے حوالے سے ایک بلند مقام حاصل کرلیا۔۔۔ تو باپ کی شہرت رفتہ رفتہ ماند پڑ گئی۔ بہاء الدین ولد۔۔۔ خوارزم شاہی دور کی ایک انقلاب آفریں شخصیت۔۔۔ خوارزم شاہ جو بڑی بڑی حکومتوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اس کے درباری عالم طاقت کے نشے میں چور کسی کی پروا نہیں کرتے تھے مگر بہاء الدین ولد کی ذہانت، علمیت اور دینی علوم پر غیر معمولی دسترس نے درباری عالموں کو حسد میں مبتلا کر دیا جبکہ بہاء الدین ولد اپنی کشف سے اپنے شہر کے مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے رہے۔ وہاں جو کچھ ظاہر ہونے والا تھا اسے بہاء الدین ولد نے عالم رویا میں بہت پہلے دیکھ لیا تھا مگر۔۔۔ حاسدین نے بادشاہ کو ان کے خلاف اتنا برگشتہ کیا کہ بادشاہ دان سے ملاقات کرنے پہنچ گیا مگر ان کے چاروں طرف شہریوں کا عقیدت مندانہ ہجوم دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھا۔ ”اتنا زبردست ہجوم“۔۔۔ خوارزم شاہ نے یہ سوچ کر اپنے خزانے اور قلعے کی کنجیاں ان کے حوالے کرنا چاہیں کہ لوگوں کے دل تو بہاء الدین ولد کے قبضے میں ہیں اور خوارزم شاہ صرف خزانے اور قلعوں پر حکومت کر رہا ہے لیکن بہاء الدین ولد نے بادشاہ کو اس کے حال پر چھوڑ اور دوسرے شہر میں سکونت اختیار کرلی۔

ایک بے بدل شخصیت کے والد محترم کی سوانح جو بذات خود بہت بڑی شخصیت تھی

بلخ کو تاریخ میں بڑی اہمیت اور شہرت حاصل رہی ہے۔ پارسیوں کے عظیم نبی زرتشت کا تعلق بھی بلخ ہی سے تھا۔ یہیں سے گویا پارسی مذہب کی بنیاد پڑی۔ جہاں ابعد میں بھی بہت سی نامی گرامی شخصیات پیدا ہوتی رہیں۔ بلخ کا تعلق خراسان سے تھا اور خراسان میں بڑے بڑے مشاہیر پیدا ہوتے رہے۔ یہاں 547 ہجری میں ایک غیر مقامی خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کے مادری اور پدری سلسلے پر نظر ڈالی جائے تو 19 واسطوں سے باپ کی جانب سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سلسلہ مل جاتا ہے اور ماں کی طرف سے حضرت علیؓ سے۔

محمد کا لقب بہاء الدین ولد تھا۔ یہ لوگ دنیاوی اور علمی اعتبار سے بڑی شہرت اور بلند مقام رکھتے تھے۔ محمد بہاء الدین ولد کی والدہ ملکہ جہاں خوارزمی شاہوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

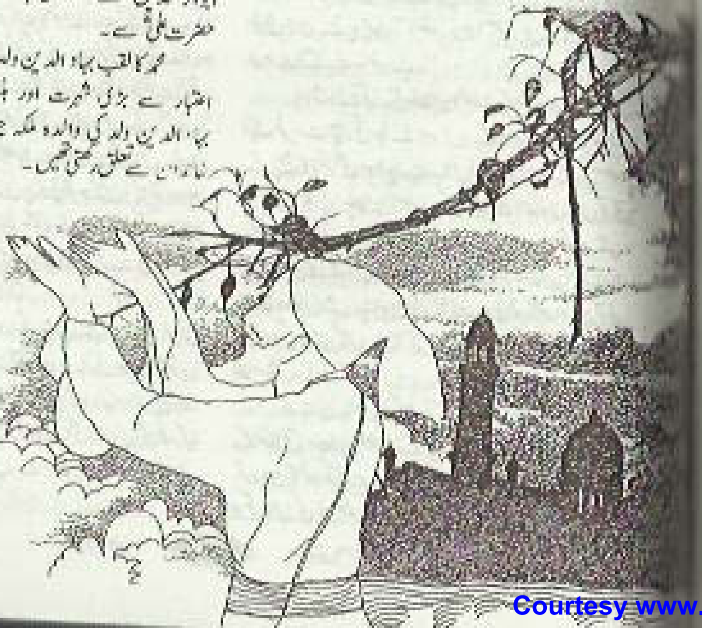

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

547 ہجری میں پیدا ہونے والے محمد بہاء الدین ولد نے تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو نوعمری ہی میں مروجہ علوم میں کامل دماہر ہو گئے اور علم و فضل کی کیفیت یہ تھی کہ خراسان کی اطراف سے مشکل فتاوے انہی کے پاس آنے لگے۔ ان کی مجلس کا طریق اور انداز بادشاہوں جیسا ہوتا تھا، انہیں اپنی بے مثل مذہبی اور علمی کارکردگی کی وجہ سے سلطان العلما کا خطاب دیا گیا۔

ان کا معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص احباب کے حلقے میں حقائق و معارف بیان فرماتے، دوشنبے اور جمعے کو عام وعظ کہتے۔ ان کی ہیبت ہر جگہ نمایاں رہتی اور جو بھی درباری عالم انہیں دیکھتا ششدر ہو جاتا۔ بہاء الدین ولد جو اب سلطان العلما کہلاتے تھے، ان کے عقیدت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور جن علما کو شاہی دربار میں قدر و منزلت حاصل تھی وہ سلطان العلما کی عوامی مقبولیت کو حسد کی نظروں سے دیکھتے مگر بے بس تھے۔

جس دن سلطان العلما عوام سے مخاطب ہوتے، بازار سنسان ہو جاتے اور ہر کسی کا رخ سلطان العلما کے جلسے کی طرف ہوتا۔ اگر بادشاہ کی سواری گزر رہی ہوتی تو لوگ اس کی طرف بھی متوجہ نہ ہوتے۔ درباری علما مولانا کے ان جلسوں کا ذکر حسد سے بادشاہ کے روبرو کرتے اور رعایا کی شکایت کرتے ہوئے کہتے۔ ”لوگوں کو تمیز اور اتنا احساس تو ہونا چاہیے کہ وہ بادشاہ وقت اور ایک عالم کے مقام اور مرتبے کے فرق کو سمجھیں۔ ایک عالم سے رعایا کو کیا ملے گا، خالی باتیں اور ان باتوں سے کسی غریب کی معیشت تو نہیں سدھر سکتی۔ عالم اگر کسی سے خوش ہو جائے تو وہ اس کو بخشش یا انعام میں کیا دے گا لیکن بادشاہ سلامت خوش ہو جائیں تو انسان کو فرش سے عرش تک پہنچا دیں گے۔“

بادشاہ کو بھی سلطان العلما سے عقیدت تھی اس لیے وہ درباری علما کی حاسدانہ شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا اور علما کو منع کرتا تھا کہ بہاء الدین ولد جیسی سلطان العلما کو اپنا کام کرنے دیں۔ یہ لوگوں کو دین و دنیا اور آخرت کی جو تعلیم دیتے ہیں وہ ہر کوئی نہیں دے سکتا۔

بادشاہ کی سلطان العلما کی شان میں یہ مدح سرائی درباری عالموں کو بالکل پسند نہ آئی اور درباری علما کی نفرتوں میں اضافہ ہو گیا۔ بادشاہ نے علما کو منع کیا کہ وہ بہاء الدین ولد کی مخالفت سے باز آ جائیں۔ ”تم لوگ کبھی اس پر بھی غور کیا کرو کہ بہاء الدین ولد کو لوگوں نے سلطان العلما کا خطاب یونہی نہیں دے دیا۔“

ایک درباری عالم نے بادشاہ کے اس فقرے سے فائدہ اٹھایا اور بادشاہ کی توجہ سلطان العلما کی طرف مبذول کرائی۔ ”حضور! بہاء الدین ولد، سلطان العلما کہلاتے ہیں آپ غور فرمائیں کہ انہیں لفظ سلطان سے کتنی انسیت ہے۔ واقعی سلطان بننا ان کے بس کی بات تو ہے نہیں لیکن اس لفظ سلطان سے ان کی اندرونی خواہش کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ صبح شام ان کے در پر لوگوں کا اژدحام رہتا ہے اور لوگ ان سے جس احترام اور عزت سے پیش آتے ہیں اس سے سلطان العلما کے جذبۂ انانیت کو تسکین ملتی ہے۔ بادشاہ سلامت کو ان رموز پر نظر رکھنی چاہیے۔ یہ لوگ حکومت کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں اور خراسان تو یوں بھی فسادیوں کی جگہ ہے اور اکثر و بیشتر فتنے یہیں سے جنم لیتے رہتے ہیں۔“

بادشاہ نے ان تمام باتوں کا بظاہر کوئی اثر نہیں لیا مگر دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ بہاء الدین ولد امیر العلما بھی ہو سکتے تھے۔ امیر العلوم کا لقب اختیار کر سکتے تھے آخر لفظ سلطان انہیں کیوں پسند ہے...... یہ بات تو واقعی خطرے کی معلوم ہوتی ہے اور درباری علما، بادشاہ کی توجہ جس خطرے کی طرف مبذول کرا رہے ہیں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فی الحال بادشاہ نے موضوع کو ٹالنا چاہا، کہا ”میں بہاء الدین ولد المخاطب بہ سلطان العلما کو اپنے لیے خطرہ نہیں سمجھتا، تم لوگ اگر کوئی خوف یا خطرہ محسوس کرتے ہو تو تمہیں میرے لیے ایک کام کرنا ہوگا۔“

جو عالم اس معاملے میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا فی الحال اس نے پوچھا۔ ”حضور والا! حکم دیں، بندہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”سلطان العلما کے عقیدت مندوں کی ایک فہرست تیار کی جائے اور ان کے ناموں کے ساتھ ان کے پیشے کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ اس فہرست سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ سلطان العلما کے عقیدت مندوں میں کون کتنے ہیں، غریب دہقان اکثریت میں ہیں یا اقلیت میں، ہنرمند اور کاریگروں کی تعداد کیا ہے۔ اگر سلطان العلما کے ماننے والوں میں سپاہیوں کی کثرت ہوئی تو مجھے ان پر توجہ دینا ہوگی، میں نہیں چاہتا کہ میری حکومت میں دُہرا ریاستی نظام چل رہا ہو۔“

درباری عالم نے کہا۔ ”میں بادشاہ سلامت کی مرضی کے مطابق سلطان العلما کے عقیدت مندوں کی فہرست تیار کر دوں گا، ہو سکتا ہے اس فہرست میں سپاہیوں کی تعداد کم ہو مگر اس کمی کا حضور والا یہ مطلب ہرگز نہ لیں کہ واقعی

سپاہیوں کی تعداد کم ہو گی، سپاہیوں سے سلطان العلما کے تعلقات مخفی بھی ہو سکتے ہیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”تو اپنا کام کر، یہ باتیں میں بھی سمجھتا ہوں۔“

بظاہر تو درباریوں نے بھی سمجھا کہ بادشاہ سلطان العلما کا عقیدت مند ہے اور ان کے مخالف اور حاسد درباری عالم کو آئندہ شکایتوں سے باز رکھنے کے لیے ایک دشوار کام اس کے سپرد کر دیا ہے تاکہ یہ درباری عالم اس میں الجھا رہے اور سلطان العلما کی جھوٹی شکایتیں نہ کرے۔

درباری عالم نے اپنی مدد کے لیے کچھ آدمی ساتھ رکھ لیے مگر اسے بعد میں یہ خیال بھی آیا کہ بادشاہ نے اس کے سپرد جو کام کیا ہے اس سے دربار کے دوسرے بہت سے لوگ بھی واقف ہو چکے ہیں اور ان درباریوں میں سلطان العلما کے عقیدت مند بھی ہوں گے لہٰذا یہ ساری خبریں سلطان العلما تک پہلے ہی سے پہنچ چکی ہوں گی اور سلطان العلما اب اپنے فوجی عقیدت مندوں کو منع کر دیں گے کہ وہ فی الحال سلطان العلما سے دور رہیں۔ اس طرح یہ درباری عالم ایسی کامیاب فہرست نہیں تیار کر سکے گا جس سے بادشاہ کو سلطان العلما کے خلاف بھڑکایا جائے اور اس طرح درباری عالم بادشاہ کی نظروں سے گر جائے گا۔

اپنے زوال کا خیال کر کے یہ درباری عالم پریشان ہو گیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا جسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔

وہ کچھ دن آوارہ و سرگرداں رہا۔ سلطان العلما کے وعظ سنتا رہا، لوگوں کی گنتیاں کرتا رہا۔ ان میں معروف چہروں کو حافظے میں محفوظ کرتا رہا اور بلخ دس دن کی تگ و دو کے بعد اسے اتنا بھی حاصل نہیں ہوا تھا جسے وہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے سرخرو ہو جاتا۔

بادشاہ نے ایک دن اس سے پوچھ لیا۔ ”تیرے سپرد جو ذمے داری کی گئی تھی تو نے وہ کس حد تک پوری کر دی؟“ عالم نے اپنی کمزوری اور مجبوری بیان کی۔ ”بادشاہ سلامت سے اس دن جو باتیں عام درباریوں کے سامنے ہوئی رہیں اس کا مجھے بعد میں احساس ہوا۔ یہ کام حضور والا اگر خفیہ میں میرے سپرد کرتے تو میں بہت جلد بادشاہ سلامت کی خدمت میں سرخرو ہو جاتا۔“

بادشاہ علاؤ الدین خوارزم شاہ تھا جس کی فتوحات اور دبدبہ شہروں شہروں، ملکوں ملکوں میں تھا۔ جس کی پیشانی کی شکن سے ہی انقلابات برپا ہو جاتے تھے۔ درباری علما بھی خوارزم شاہ سے بہت ڈرتے تھے اور بادشاہ سے باتیں کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ جب اس درباری عالم نے بادشاہ کی اس غلطی کی طرف توجہ دلائی کہ اگر خوارزم شاہ نے اس عالم کے ذمے جو فرض سونپا تھا وہ اگر عام درباریوں کی موجودگی میں نہ سونپا جاتا تو یہ عالم بادشاہ کی سونپی ہوئی ذمے داری کو بطریق احسن انجام دے سکتا تھا۔

خوارزم شاہ نے عالم کو تنکھیوں سے دیکھا تو اس عالم کی جان نکل گئی اور ہکلاتے ہوئے عرض کیا۔ ”بادشاہ سلامت بالکل فکرمند نہ ہوں، اگر درباریوں کو بھی مجھ سے متعلق یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میں سلطان العلما کے ارادت مندوں کی کوئی فہرست تیار کر رہا ہوں اور ان درباریوں میں سے کسی نے سلطان العلما کو آگاہ کر دیا ہے تب بھی میں فکرمند نہیں ہوں، مجھے دشوار کام انجام دینے کا سلیقہ آتا ہے، میں اب حضور والا کو یہ کام آٹھ دس دن میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہوا ملے گا اور میری بادشاہ سے عاجزانہ درخواست ہے کہ مجھے کچھ اور وقت دیا جائے تاکہ میں یہ کام سلیقے اور ہوش مندی سے انجام دے لوں۔“

خوارزم شاہ نے اس عالم کی طولانی تمہید سے تنگ آ کر جواب دیا۔ ”میں نے تو تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ کام آٹھ دس دن کے اندر ہو جانا چاہیے اب اگر تو مزید وقت چاہتا ہے تو میری طرف سے وہ تجھے مل گیا۔ جا اور یہ کام اطمینان اور ہوش مندی سے انجام دے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ تو سلطان العلما کے عقیدت مندوں میں شامل ہو جا اس طرح تیرا کام آسان ہو جائے گا۔“

اس عالم نے خوارزم شاہ کا شکریہ ادا کیا اور بادشاہ کی صحبت سے اٹھ کر سلطان العلما کے پاس جا پہنچا۔ یہ دوشنبہ یا جمعہ کا دن نہیں تھا اس لیے وہ آسانی سے سلطان العلما کے پاس نہیں پہنچ سکا اور سلطان العلما کے مریدوں نے اس عالم کو بتایا کہ وہ اپنا نام اور پتا اور ملاقات کی غرض لکھ کر کاغذ ان کے حوالے کر دے۔ سلطان العلما سے جواب حاصل کر کے وہ بتا دیں گے کہ اس کی ملاقات سلطان العلما سے کب اور کہاں ہو سکتی ہے۔

عالم نے کسی کاغذ پر کچھ لکھ کر دینے کے بجائے اپنا تعارف زبانی کروا دیا اور کہا۔ ”میں ایک بادشاہ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا رہا ہوں اور اب سلطان العلما کی خدمت میں حاضری دے کر دینی فیض حاصل کرنے کی فکر میں ہوں۔ خوارزم شاہ کے دربار سے مجھے مالی فائدے حاصل ہوئے اور سلطان العلما کی خدمت میں رہ کے میں روحانی فیض حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

مرید کے دل پر بڑا اثر ہوا کہ وہ جس شخص کو ابھی تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک عام سا عالم سمجھ رہا تھا وہ تو بادشاہ کا جانشین نکلا۔

مرید کے اطوار، انداز اور لہجے میں فرق آ گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر پرجوش طریقے سے مصافحہ کیا اور معافی مانگتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! آپ اپنا تعارف پہلے ہی کرا دیتے تو آپ سے اتنی طویل فضول گفتگو نہ ہوتی۔ آپ ذرا تشریف رکھیں میں اپنے پیر و مرشد سے بات کر کے آتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اسی وقت آپ کی ملاقات حضرت بہاءالدین ولد المعروف سلطان العلماء سے ہو جائے۔“

درباری عالم نے اس مرید کی مرعوب ہو جانے والی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور کہا۔ ”تو اسی وقت اپنے پیر و مرشد سے مل اور اسی وقت میری ملاقات کروا دے۔“

مرید اندر چلا گیا اور کافی دیر بعد منہ لٹکائے ہوئے واپس آیا اور نظریں جھکا کے عرض کیا۔ ”حضرت! میں نے تو پوری کوشش کی کہ اسی وقت آپ کی ملاقات کروا دی جائے مگر پیر و مرشد کا کہنا ہے کہ آج ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اب آپ جمعے کے دن محفلِ وعظ میں ان سے ملاقات کر سکتے ہیں۔“

اس عالم کو بے حد غصہ آیا اور کہا۔ ”میں تو پیر و مرشد کی خدمت میں عاجزانہ قدم بوسی کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا مگر پیر و مرشد نے مجھے اندر نہ بلوا کر میری بے عزتی کی ہے۔ میں پیر و مرشد کو بہت فائدے پہنچا سکتا ہوں۔ تو ایک بار پھر ان کے پاس جا اور میری طرف سے کہہ دے کہ مجھے ان کی خدمت میں خوارزم شاہ نے بھیجا ہے اور اب شاہ صاحب کو میرے توسط سے بہت فائدے پہنچیں گے۔“

مرید دوبارہ اندر جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا، کہنے لگا۔ ”جناب! آپ کے کہنے سے میں اندر دوبارہ چلا جاؤں گا مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پیر و مرشد نے جو بات کہہ دی ہے وہ اسی پر قائم رہیں گے اور اب آپ کی ملاقات جمعے کی شام یا دو شنبے کی شب کو ہو سکتی ہے۔“

درباری عالم نے پوچھا۔ ”اب اگر میں دوبارہ دو شنبے یا جمعے کو پیر و مرشد سے ملاقات کروں تو مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ میں تو اسی وقت پیر و مرشد کی مریدی میں داخل ہونا چاہتا تھا اور اس کے بعد خوارزم شاہ کا ایک خاص پیغام بھی پیر و مرشد کے گوش گزار کر دیتا۔“

مرید نے بادلِ ناخواستہ دوبارہ اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے کہنے سے اندر جا رہا ہوں مگر پیر و مرشد کی طبیعت سے واقف ہونے کی وجہ سے تو نے فوری ملاقات پر زور دیا پر میں یہ کہتا ہوں کہ تیری بات نہیں بنے گی اور بادشاہ سلامت کو پیر و مرشد سے زیادہ تجھ سے شکایتیں پیدا ہو جائیں گی۔“

اس بار یہ مرید جلد ہی واپس آ گیا اور ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”آیئے ملاقات کر لیں۔“

درباری عالم اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

سلطان العلماء کی خلوت میں اس وقت بھی دو عالم طالب علموں کی طرح مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔

سلطان العلماء نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔ ”تیری آمد کا شکریہ مگر جب تجھے یہ بتایا گیا کہ میری تجھ سے ملاقات دو شنبے یا جمعے کو محفلِ وعظ میں ہو سکتی ہے تو تو آج ہی ملاقات پر کیوں زور دے رہا ہے؟“

درباری عالم نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد! آپ تو جانتے ہیں کہ خوارزم شاہ کی خدمت میں رہنے والوں کو فرصت بہت کم ملتی ہے اور میں جمعے یا دو شنبے کو حاضری نہیں دے سکتا۔“

سلطان العلماء نے پوچھا۔ ”اب غایت ملاقات بھی بتا دے اور یہ بھی کہ خوارزم شاہ کا میرے لیے خاص پیغام کیا ہے؟“

درباری عالم نے جواب دیا۔ ”غایت ملاقات تو یہ ہے کہ میں آپ کی سیرت اور سوانح لکھنا چاہتا ہوں اس لیے مجھے آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا جائے اور یہ کہ میں جو کچھ معلومات حاصل کرنا چاہوں تو اس میں مجھے سہولتیں ملنی چاہئیں۔“

سلطان العلماء نے جواب دیا۔ ”تو میری سیرت اور سوانح لکھ کے کیا فائدہ اٹھائے گا۔ کیونکہ میری سیرت اور سوانح تو کھلی کتاب کی طرح ہے اور تو خوارزم شاہ کے دربار سے وابستہ عالم ہے، تیرے ہی بقول تجھے تو خوارزم شاہ کے دربار سے ہی فرصت نہیں ملتی، اس لیے تو میری سوانح پر دل جمعی سے کام کس طرح کرے گا؟“

درباری عالم نے جواب دیا۔ ”جب میں آپ کی سیرت اور سوانح پر کام شروع کروں گا تو مجھے سلطان سے اس کی اجازت بھی لینا پڑے گی اور خوارزم شاہ تو آپ سے اتنی عقیدت رکھتا ہے کہ وہ مجھے اس کام کے لیے وقت اور اجازت دے دے گا۔“

سلطان العلماء نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا اور اس کے بعد اپنے دونوں طالب علموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو ان دونوں سے ملاقاتیں کرتا رہے گا اور انہی سے میرے متعلق معلومات بھی حاصل کر لیا کرے گا۔“

درباری عالم نے اس میں اپنی بے عزتی محسوس کی اور کہا۔ ”حضرت اب آپ مجھے اتنا کم تر بھی نہ سمجھیں کہ میں ان دونوں طالب علموں سے آپ کی سیرت اور سوانح کے لیے

رجوع کیا کروں گا۔ حضرت میں خوارزم شاہ کے دربار سے تعلق رکھنے والا انتہائی لائق و فائق عالم ہوں اور مجھے آپ سے براہِ راست تعلق قائم رکھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔“

سلطان العلماء نے چھڑتے ہوئے موضوع سے گریز اختیار کیا اور پوچھا۔ ”مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ تو میرے پاس خوارزم شاہ کا کوئی پیغام لایا ہے۔“

درباری عالم نے جواب دیا۔ ”ہاں میں ایک پیغام بھی لایا ہوں۔ خوارزم شاہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کے ارادت مندوں کی ایک فہرست تیار کروں کیونکہ خوارزم شاہ کو کسی نے یہ بتایا ہے کہ آپ کے مریدوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آپ چاہیں تو ایک فوج تیار کر سکتے ہیں۔“

سلطان العلماء نے پوچھا۔ ”بس یا کچھ اور۔ اس شاہی فرمان کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ جب تو میرے سوانح اور سیرت پر کام کرے گا تو اسی سلسلے میں میرے مریدوں کا ذکر بھی ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ آخر خوارزم شاہ میری فوج نہیں مریدوں کی تعداد سے پریشان کیوں ہے؟“

درباری عالم نے جواب دیا۔ ”نہیں، خوارزم شاہ آپ کے مریدوں سے ذرا بھی پریشان نہیں۔“

سلطان العلماء نے کہا۔ ”جب تو نے میرے مریدوں کی تعداد کے ساتھ سلطانی فوج کا ذکر کیا تو میں فکرمند ہو گیا کہ اگر یہ خیالات خوارزم شاہ کے ہیں تو مجھے احتیاط سے کام کرنا چاہیے۔“

دونوں میں کچھ دیر اسی قسم کی مکالمت ہوتی رہی۔ آخرکار درباری عالم نے بتایا۔ ”حضرت! آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں، خوارزم شاہ آپ کا مرید ہونا چاہتا ہے۔“

سلطان العلماء نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیسی عجیب بات ہے کہ خوارزم شاہ میرا مرید ہونا چاہتا ہے جبکہ اسے اپنے امورِ سلطنت سے وقت ہی نہیں ملتا۔“

درباری عالم سلطان العلماء کی اس ذہانت اور ہوشیاری پر حیران تھا۔

آخرکار سلطان العلماء نے کہا۔ ”اس وقت تو تو چلا جا اور دو شنبے یا جمعے کو مجھ سے دوبارہ مل۔ اور میری ذات سے متعلق جتنی معلومات تجھے درکار ہوں گی وہ ملتی رہیں گی۔ خوارزم شاہ کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور میری طرف سے پوچھنا کہ کیا بادشاہ کو میری صحبت میں آنے کا وقت مل جائے گا؟“

درباری عالم نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں بادشاہ سے آپ کا سوال نہیں کر سکتا، وہاں تو دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔“

سلطان العلماء نے اپنے دونوں طالب علموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تیری باتوں سے انہیں نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس لیے اب تو میرے ان دونوں بتائے ہوئے دنوں میں سے کسی دن ملاقات کرے گا اور بقیہ باتیں وہیں طے پا جائیں گی۔“

درباری عالم ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا مگر اب اسے یہ امید ضرور ہو گئی تھی کہ آئندہ ملاقاتوں میں وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لائق ہو جائے گا۔

یہ درباری عالم سلطان العلماء کے دونوں ہاتھوں کو عقیدت مندی سے بوسہ دینے لگا تو سلطان العلماء نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا۔ ”مجھے اپنی اس عقیدت مندی سے شرمندہ نہ کر۔ میں سیدھا سادا انسان ہوں اور خدا نے بندگانِ خدا کے بارے میں مجھے جو ذمے داریاں سونپی ہیں مجھے انہیں انجام دینے دے۔“

درباری عالم پیر و مرشد کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے دو شنبے کو ملاقات کرنے کا وعدہ کر کے باہر آ گیا۔ وہ جس مرید نے اس درباری عالم کا پیر و مرشد سے رابطہ کروایا تھا اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”پیر و مرشد نے تجھ کو بہت وقت دے دیا، تیری بات بن گئی یا اب بھی کچھ باقی ہے؟“

درباری عالم نے جواب دیا۔ ”بات تو ابھی نہیں بنی مگر دوسری ملاقات میں بات ضرور بن جائے گی۔“

اس مرید نے پوچھا۔ ”مجھے اگر اعتماد میں لیا جائے تو میں تیری بہت زیادہ مدد کر سکتا ہوں مگر اس صورت میں جب مجھے بھی بادشاہ کو قریب سے دیکھنے کا تو کوئی موقع فراہم کر دے گا۔“

درباری عالم نے بے پروائی سے کہا۔ ”تیرا یہ کام بھی ہو جائے گا اور تو میرا ایک کام وقتاً فوقتاً کرتا رہے گا۔ بس یہ سمجھ لے کہ اگر مجھے تجھ سے فائدے پہنچے اور تو میرے لیے کام کرتا رہا تو میں بھی تیرے بہت کام آؤں گا۔“

مرید نے جو یہ دیکھا کہ اتفاق سے اسے خوارزم شاہ کے ایک درباری عالم سے تعارف حاصل ہو گیا ہے اور وہ اس کے ذریعے بڑے فائدے بھی حاصل کر سکتا ہے تو اس نے درباری عالم سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کا ہر کام خوشی سے کرے گا مگر اس کے صلے میں یہ درباری عالم بھی اسے بادشاہ کے دربار تک پہنچا دے گا۔

دونوں میں ایک دوسرے کے کام آنے اور ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے کے لیے کام کرنے کا زبانی معاہدہ ہوگیا۔ اب درباری عالم کو یقین ہوگیا تھا کہ اگر وہ اسی طرح ہوشیاری اور عقل مندی سے کام کرتا رہا تو وہ بہت جلد سلطان العلما کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوجائے گا اور سلطان العلما کا خطاب بھی ان سے چھن جائے گا۔

خوارزم شاہ کا ہرگز یہ خیال نہیں تھا کہ وہ سلطان العلما کو درباری عالم کے کہنے سے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ درباری عالم نے اپنے طور پر خوارزم شاہ کے پوچھے بغیر ہی آگاہ کردیا کہ وہ سلطان العلما کے سلسلے میں جو کام کر رہا ہے اس میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوجائے گی اس لیے اب خوارزم شاہ سے بھی سلطان العلما کے بعض مریدوں کو دربار میں آنے جانے کی اجازت ملنی چاہیے۔

لیکن خوارزم شاہ کے وہ جذبات جنہیں سلطان العلما کے ذکر سے بھڑکایا گیا تھا، سرد پڑ چکے تھے اور خوارزم شاہ نے پوچھا۔ "تو جن لوگوں کے لیے دربار میں آنے جانے کی اجازت مانگ رہا ہے ان کا تعلق زندگی کے کن شعبوں سے ہے۔ اگر وہ لوگ شوقیہ میرے دربار میں حاضریاں دینا چاہتے ہیں تو میں انہیں یہ اجازت نہیں دوں گا۔"

☆☆☆

درباری عالم نے اپنا کام شروع کردیا۔ وہ وعدے کے مطابق دوپہر کو شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں پہنچ گیا اور وہاں انسانی ہجوم کے سمندر کو ٹھاٹھیں مارتے دیکھا تو اس کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے۔

یہ شخص ہجوم کا جائزہ لیتا ہوا سلطان العلما کے پاس پہنچ اور عاجزانہ درخواست کی۔ "اب تو مجھے آپ سے ملتے جلتے رہنے کی عام اجازت ہونی چاہیے۔ میں نے خوارزم شاہ سے بھی اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کردیا تھا اور خوارزم شاہ میری اس ملاقات سے بہت خوش ہوا۔ اب مجھے بھی آپ اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرلیں تاکہ میں آپ کی سیرت اور سوانح لکھنے کا کام شروع کردوں۔"

بہاء الدین ولد نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے، میں تجھے ہر روز ایک گھنٹا دیا کروں گا تو میری ذات سے متعلق جو چاہے پوچھتا رہے۔ میں ان کے جوابات دیتا رہوں گا۔"

اس کے بعد سلطان العلما نے اپنے ایک مرید خاص، بلند پایہ بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی کو ہدایت کی کہ وہ خوارزم شاہ کے عالم کو سیرت و سوانح لکھوانے میں مدد دیں اور دونوں سے کہا۔ "جہاں میری ضرورت ہو مجھ سے پوچھ لیا جائے۔"

درباری عالم کو سید برہان الدین محقق ترمذی سے خطرہ محسوس ہوا کہ اس شخص سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکے گا جس کے لیے وہ اتنی محنت کر رہا ہے لیکن سلطان العلما کے اس مرید سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا جو خوارزم شاہ کے دربار تک رسائی حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔

یہ شخص سیرت اور سوانح تو کیا لکھتا بس سلطان العلما کے ارادت مندوں کی چھان بین میں لگا رہا۔

سید برہان الدین ترمذی نے بھی یہی محسوس کیا کہ درباری عالم کسی اور ہی جستجو میں ہے اور اس مجلس میں آنے کا وہ مقصد نہیں ہے جسے یہ درباری عالم ظاہر کر رہا ہے۔ محقق ترمذی نے یہ بھی دیکھا کہ یہ سیرت و سوانح لکھنے والا عالم سلطان العلما کے ایک معمولی مرید سے زیادہ باتیں کرتا ہے اور یہ بھی محسوس کیا کہ اس شخص کی نگاہیں سلطان العلما سے ملنے جلنے والوں پر خاص طور پر مرکوز رہتی ہیں۔

کچھ دنوں بعد محقق ترمذی نے سلطان العلما سے درباری عالم کی عدم توجہی کی شکایت کی اور کہا۔ "مجھے تو یہ شخص مشتبہ لگتا ہے اور بظاہر یہ جس مقصد سے یہاں آرہا ہے وہ اس کا حقیقی مقصد نہیں ہے۔"

سلطان العلما نے بھی محقق ترمذی سے اتفاق کیا اور کہا۔ "مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ یہ ہمارے پاس کس مقصد سے آتا ہے۔ اگر اس کی نیت میں کھوٹ ہے تو بالآخر اسے شرمندگی اٹھانا پڑے گی کیونکہ میں سبھی کے لیے کھلی کتاب کے مانند ہوں جو اس کتاب کی عبارت میں ہے اس میں کسی ابہام کا پایا جانا ممکن نہیں۔"

یہ درباری عالم یونہی آتا جاتا رہا مگر اسے سلطان العلما کے مریدوں میں کوئی فوجی نظر نہیں آیا حالانکہ فوجی آتے ضرور تھے مگر وہ سلطان العلما کے مریدوں کی فہرست میں نہیں تھے۔

اس عالم نے سلطان العلما کے خدمت گار مرید سے پوچھا۔ "تو نے یہاں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار دیا اس لیے تجھے یہاں کی اندر کی باتیں بھی معلوم ہوں گی۔"

مرید نے جواب دیا۔ "بے شک میں تو حضرت پیرومرشد کی خلوت اور جلوت کا خدمت گار ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں اپنے پیرومرشد کی بہت سی ایسی باتیں بھی جانتا ہوں جن کا عام لوگوں کو بھی پتا نہیں۔"

درباری عالم نے کہا۔ "تب پھر تو مجھے یہ بتا کہ تیرے پیرومرشد کی کوئی ایسی خفیہ فہرست بھی ہے جس میں ان مریدوں کا ذکر ہو جن کا تعلق خوارزم شاہ کے دربار اور فوج

سے ہو؟"

مرید نے جواب دیا۔ "ہمارے پیرومرشد خوارزم شاہ کے درباریوں اور فوجیوں سے روابط اس لیے نہیں رکھتے کہ انہیں ان لوگوں سے ایک خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ پیرومرشد کی تعلیمات پر عمل نہیں کرسکیں گے اور ان کی وجہ سے خوارزم شاہ کو بدگمانی ہوسکتی ہے۔"

درباری عالم نے اپنی ناامیدی کے اثرات چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیے اور کہا۔ "میں نہیں مان سکتا کہ اپنے وقت کی اس بے مثال شخصیت سے خوارزم شاہ کے درباری اور فوجی فیض نہ اٹھاتے ہوں۔"

مرید نے جواب دیا۔ "میں اپنے پیرومرشد کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں مجھے ہمارے پیرومرشد کی سیرت اور سوانح لکھنا ہے تو اسے آزادی سے لکھتا رہ اور فضول قسم کی جستجو سے باز رہ۔"

درباری عالم نے کہا۔ "تیری بڑی مہربانی ہوگی کہ تو پیرومرشد کے ان چند مریدوں کے نام مجھے بتادے جن کا تعلق اپنے بادشاہ کے دربار یا فوج سے ہو۔"

مرید کو غصہ آیا کہ یہ شخص اپنی ہی کہے جارہا ہے اور اس کی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔

سلطان العلما کے اس مرید نے بے رخی اختیار کی اور کہا۔ "تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے خوارزم شاہ کے دربار میں لے جائے گا مگر تو وعدہ کرکے بھول گیا اور مجھ سے اپنا کام مسلسل لے رہا ہے۔"

درباری عالم نے اپنی وقتی مجبوری بیان کی۔ "دوست! تجھے شاہی دربار کا اندازہ نہیں ہے وہاں لوگ جس طرح پہنچتے ہیں یا کسی کو وہاں جس طرح پہنچایا جاتا ہے وہ عمل اور شرائط بہت دشوار ہوتی ہیں۔ میں نے تیرا تذکرہ خوارزم شاہ سے کیا تھا۔ وہ سلطان العلما کے کسی صحبت یافتہ کو اپنے دربار میں نہیں آنے دے گا۔ خوارزم شاہ کو لوگوں نے سلطان العلما کی طرف سے برگشتہ کردیا ہے لیکن میں موقعے کی تلاش میں ہوں اور میں تجھے دربار تک پہنچا کر رہوں گا۔"

درباری عالم کو نہیں معلوم تھا کہ اس مرید کی نگرانی ہورہی ہے محقق ترمذی کو اس مرید پر کچھ عرصے سے یہ شبہ تھا کہ اس کا درباری عالم سے ربط و ضبط اور غیر معمولی تعلق کوئی راز رکھتا ہے۔

محقق ترمذی کو دونوں کے مکالمات کا علم ہوگیا اور اب جو اس درباری عالم نے محقق ترمذی سے سلطان العلما کے بارے میں کچھ سوالات کیے تو محقق ترمذی نے کہا۔ "مجھے تو اس سے زیادہ معلومات پیرومرشد کے خدمت گار سے مل رہی ہیں پھر تو اپنا سارا وقت اس کو کیوں نہیں دے دیتا۔"

درباری عالم نے کہا۔ "مجھے عمومی معلومات تو اس سے حاصل ہورہی ہیں مگر خصوصی واقفیت کے لیے وہ ذریعہ بالکل مناسب نہیں ہے اور اے محقق ترمذی، وہ خاص معلومات آپ ہی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔"

محقق ترمذی نے پوچھا۔ "آج تو مجھے ایک بات بتا دے تاکہ میں تیرا مسئلہ حل کردوں اور تو بہت زیادہ محنت و مشقت سے بچ جائے۔"

درباری عالم بہت حیران اور ششدر رہ گیا کہ محقق ترمذی نے اچانک یہ کس قسم کی باتیں شروع کردیں۔ "حضرت! میں آپ کی باتوں کا مفہوم نہیں پاسکا آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

محقق ترمذی نے جواب دیا۔ "دیکھ بھائی! تو جہاں سے تعلق رکھتا ہے وہ دنیا داروں کی خاص جگہ ہے۔ وہاں خدمتوں کا معاوضہ بلکہ انعام و اکرام بھی ملتا ہے اور وہاں کے لوگوں کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ جس کام میں انہیں اپنا فائدہ نظر نہیں آتا وہ نہیں کرتے جبکہ سلطان العلما کے احوال میں دنیاداری نہیں ہے کہ یہاں لوگ بے لوث خدمات انجام دیتے ہیں کوئی کسی سے اپنی خدمت کا صلہ نہیں چاہتا تو خود بھی ایک عرصے سے یہ دیکھ رہا ہے کہ سلطان العلما جتنے میں دو دن شہر بھر سے طالب ہوتے ہیں، انہیں دین اور آخرت کی باتیں بتائی جاتی ہیں اور ہمارے پیرومرشد اپنے اس بے لوث کام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتے۔"

محقق ترمذی بولتے بولتے خاموش ہوگئے اور درباری عالم سوچ میں پڑ گیا کہ محقق ترمذی کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے اور یہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ بہرحال اسے یہ احساس ضرور ہوا کہ وہ یہاں جس مقصد سے آیا تھا، اس میں اسے بری طرح ناکامی ہوچکی ہے۔

درباری عالم نے کہا۔ "حضرت محقق ترمذی! میں بے شک خوارزم شاہ کے دربار سے تعلق رکھتا ہوں اور وہاں مجھی کو مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں مگر ان فائدوں کے علاوہ نقصانات بھی اٹھانا پڑتے ہیں اور لوگ قتل بھی کردیے جاتے ہیں، قید خانوں میں زندگیاں گزر جاتی ہیں۔ میں تو یہاں نہایت خلوص اور عقیدت سے آیا تھا، میں سلطان العلما کی سیرت اور سوانح لکھ کر شہرت دوام حاصل کرنا چاہتا ہوں، ایک بہت بڑے آدمی کی صحبت میں رہ کر اور اس سے متعلق کام کرکے مجھے ایسی شہرت مل جائے گی جو بادشاہ کے دربار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں رہنے سے نجات مل سکتی۔"

محقق ترمذی نے جواب دیا۔ "تیری ساری باتیں مجھے سمجھ میں آ رہی ہیں اگر تو واقعی سلطان العلما کے دربار سے وابستہ رہ کے شہرت دوام حاصل کرنے کا خواہش مند ہے تو تجھے خوارزم شاہ کے دربار سے تعلق منقطع کر لینا چاہیے۔ یہ ذرا سی بات تیری سمجھ میں آ جانا چاہیے کہ تو بیک وقت دو کشتیوں میں نہیں رہ سکتا یعنی بیک وقت دو گھوڑوں کی سواری نہیں کر سکتا۔"

درباری عالم بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، پوچھا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ بادشاہوں کے دربار سے جو لوگ وابستہ ہوتے ہیں وہ اللہ والوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کے لائق نہیں ہوتے اور انہیں اللہ والوں کی محفل میں بیٹھ کر اچھی باتیں سننے کا حق نہیں ہوتا جبکہ میں یہ جانتا ہوں کہ بادشاہوں کے دربار میں اور بادشاہ کی صحبت میں اچھے آدمیوں کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ اچھے لوگ بادشاہوں کو برائیوں سے روکتے ہیں اور نیک عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ میں یہاں سے جو کچھ حاصل کروں گا وہ بادشاہ کے کام میں آئے گا۔"

محقق ترمذی نے یہ ساری باتیں سلطان العلما کو بتا دیں اور کہا۔ "اس شخص کی نیت ٹھیک نہیں ہے اسی لیے مجھے آپ حکم دیں کہ میں اس کے بارے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کروں۔ پیرومرشد، مجھے یہ شخص مشتبہ لگتا ہے۔"

سلطان العلما نے محقق ترمذی کو منع کیا کہ اس شخص کو آنے جانے دیا جائے اور اگر اس کی نیت میں کھوٹ بھی ہے تو مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا۔

کئی روز بعد خوارزم شاہ کو یاد آیا کہ اس کا درباری عالم سلطان العلما کے سلسلے میں کوئی کام کر رہا تھا پھر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ عالم اپنے کام میں کس حد تک کامیاب ہوا جبکہ سلطان العلما کے دوسرے کئی حاسد خوارزم شاہ کو مسلسل ورغلا رہے تھے اور خوارزم شاہ بھی کچھ کچھ سلطان العلما کے خلاف ہوتا جا رہا تھا۔

یہ درباری عالم بری طرح تھک چکا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ وہ شاہ صاحب کی صحبت میں زیادہ وقت دے کر اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے مخبروں کی کوششوں کے باوجود یہ پتا لگانے میں ناکامی ہوئی کہ سلطان العلما کی صحبت میں درباریوں اور فوجیوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے اور سلطان العلما یا محقق ترمذی کو ان لوگوں کی تعداد کا کوئی علم ہے۔ بس وہ محقق ترمذی سے اتنا ہی جان سکا کہ درباری اور فوجی یہاں آتے جاتے تو ہیں مگر ان کی یہاں نہ تو کوئی فہرست ہے اور نہ وہ مریدوں میں شامل کیے گئے ہیں۔

اسی دوران بہاءالدین ولد کے ہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی۔ یہ 604 ہجری کی چھ ربیع الاول کا واقعہ ہے۔ بچے کا نام جلال الدین رکھا گیا۔

بادشاہ کو بہاءالدین ولد کی طرف سے بدگمان کیا جا رہا تھا اور شہر میں علمائے وقت کا یہ حال تھا کہ وہ یونانی فلسفے کو بڑی اہمیت دے رہے تھے اور یونانی فلسفے کی کسوٹی پر اسلامی عقائد اور خدائی قوانین کو جانچا اور پرکھا جا رہا تھا اور لوگوں کا یہ حال تھا کہ ان کے ایمان اور عقیدے میں فتور پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے دل و دماغ پر یونانی فلسفے نے غلبہ پا لیا تھا۔ اس لیے بہت سے دنیادار عالم بہاءالدین ولد کی خالص اسلامی تقاریر اور وعظ سن کر آگ بگولا ہو جاتے اور ان سے حد درجہ حسد بلکہ دشمنی کرنے لگے تھے۔

خوارزم شاہ نے اپنے عالموں سے جب مسلسل بہاءالدین ولد کی شکایتیں سنیں اور وہ یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ بہاءالدین ولد کی مخالفت کرنے والے ان کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکے تو اسے سخت کوفت ہوتی تھی مگر یہ بات اسے واقعی پریشان کرتی تھی کہ بہاءالدین ولد سے لوگوں کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وعظ کے دنوں میں پورا شہر ان کے سامنے کھنچ جاتا تھا اور یہ باتیں خوارزم شاہ کا ہر آدمی شاہ کے گوش گزار کر رہا تھا۔ خوارزم شاہ ان خبروں سے حسد کا شکار ضرور ہوا مگر وہ اب بھی ان کا احترام کرتا تھا اور عقیدت مند تھا۔

یہ بالکل اتفاقی امر تھا کہ خوارزم شاہ کے درباری عالموں میں بہاءالدین ولد کا جو سب سے بڑا مخالف عالم تھا اس کا نام بھی بہاءالدین تھا اور یہ شخص ایران کے مردم خیز رے نامی خطے سے تعلق رکھتا تھا اور اسی نسبت سے یہ عالم بہاءالدین رازی کہلاتا تھا۔

بہاءالدین ولد نے کئی سال اسی کشمکش میں گزار دیے۔ چونکہ خوارزم شاہ کی بدگمانی کا ذکر لوگ ان سے کرتے تھے مگر بہاءالدین ولد ایک عرصے تک اس کشمکش کو برداشت کرتے رہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے دل و دماغ میں بادشاہ کے خلاف کچھ بھی نہیں ہے تو بادشاہ کے دل و دماغ میں بھی ان کے خلاف کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

درباری عالموں نے ان کے ایک ایسے وعظ کو بطور سند جس میں بہاءالدین ولد نے حکمائے یونان کی بڑی مذمت کی تھی۔ انہوں نے اپنے وعظ میں یونانی فلسفے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا۔ "کچھ لوگوں نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور فلسفیوں کے از کار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے۔ یہ لوگ نجات کی امید کیونکر رکھ سکتے ہیں۔"

بہاءالدین ولد کا یہ وعظ درباری علما کے علاوہ غیر درباری علما کو بھی پسند نہیں آیا اور انہوں نے بھی آپس میں مشورہ کیا کہ بہاءالدین ولد فلسفے کے دشمن ہیں اور انہیں ایسی تقریریں کرنے سے روک دینا چاہیے لیکن یہ درباری اور غیر درباری علما شہری عوام اور خواص کو دیکھتے تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے، کیونکہ سلطان العلما زبردست عوامی قوت رکھتے تھے۔

بالکل اتفاقی بات تھی کہ سلطان العلما نے اپنے مخصوص عقیدت مندوں کی نشست میں اعلان کیا۔ "تو گویا یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے اس لیے نقل مکانی ضروری ہو گئی ہے۔"

اس مخصوص نشست کے شرکا کو خوارزم شاہ کی طرف سے خوف محسوس ہوا کہ شاید ان کے پیرومرشد کو کوئی ایسی خفیہ خبر مل گئی ہے جس سے خوارزم شاہ کے کسی خطرناک اقدام کا قبل از وقت پتا چل گیا۔

محقق ترمذی نے پوچھا۔ "حضرت! کیا آپ بھی نقل مکانی کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

سلطان العلما نے جواب دیا۔ "بے شک مجھے تو یہ سارے علاقے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ میں نے ہر طرف آگ ہی آگ دیکھی ہے، شہر جل رہے ہیں اور ہر طرف ایک بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ لوگ پناہ گاہیں تلاش کر رہے ہیں لیکن زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کہیں کوئی پناہ گاہ نہیں مل رہی ہے۔"

سلطان العلما کی یہ دل دہلا دینے والی باتیں سننے والوں کے لیے ناقابل فہم تھیں کیونکہ اگر خوارزم شاہ سلطان العلما اور ان کے ارادت مندوں کے خلاف کوئی خطرناک قدم اٹھانے والا ہے تو کیا خوارزم شاہ پوری پوری آبادیوں کو تہ تیغ کر دے گا۔ شہروں کو آگ لگا دے گا اور جو لوگ یہاں سے بچ کر وقت سے پہلے کہیں چلے جائیں گے بس وہی محفوظ رہیں گے۔

سلطان العلما سے استفسار کیا گیا کہ وہ اشاروں میں بات نہ کریں اور جن ہاتھوں کا انہیں قبل از وقت علم ہو گیا ہے اس سے شہریوں کو بھی آگاہ کر دیں۔

سلطان العلما نے کہا۔ "ابھی مجھے شہر چھوڑ دینے کا حکم نہیں ملا ہے لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ ہمیں یہ شہر عارضی طور پر چھوڑنا ہو گا۔"

مخصوص نشست کے شرکا نے پوچھا۔ "ہمارے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "تمہیں بھی یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔"

یہ لوگ یہ نہیں معلوم کر سکے کہ سلطان العلما شہر کو چھوڑ دینے کی باتیں کیوں کر رہے ہیں اور یہ بات تو زیادہ تشویشناک تھی کہ وہ دوسروں کو بھی شہر چھوڑ دینے کی تلقین کر رہے ہیں۔

محقق ترمذی نے پوچھا۔ "تو حضرت ہمیں کب تک اس شہر کو چھوڑنا ہو گا؟"

سلطان العلما نے جواب دیا۔ "میں نے آنے والے برے حالات کی خبر تو دے دی ہے مگر قطعی یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ ہمیں یہ شہر کب چھوڑنا ہو گا اور کہاں پناہ لینا ہو گی؟"

اس مخصوص نشست میں جو خطرناک گفتگو ہو گئی تھی اس نے سامعین کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا کر دی تھی مگر وہ سلطان العلما کو مجبور نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ساری تفصیل ایک ہی وقت میں بتا دیں۔ سلطان العلما کا کہنا تھا کہ انہیں نقل مکانی کا ابھی حکم نہیں دیا گیا ہے اور جب یہ حکم ملے گا تو وہ اپنے خاص آدمیوں کو بتا دیں گے کہ اب اس شہر کو چھوڑ کر فلاں شہر میں پناہ لینی چاہیے۔ اور وہ اس حکم کے منتظر تھے۔

اب آپ اپنی تقریروں اور مواعظ میں بھی آنے والے خطرات کا ذکر کرنے لگے تھے۔ آپ نے لوگوں کو بتایا۔ "اللہ کی رسی مضبوطی سے پکڑو ورنہ تمہیں کسی دوسری قوم کے ذریعے عبرت ناک سزا دی جائے گی۔"

اب پورے شہر میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ سلطان العلما شہریوں کو نقل مکانی کی تلقین کرتے ہیں اور خود بھی اپنے احباب اور عقیدت مندوں کے ساتھ نقل مکانی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

شہر بھر میں یہ خبر گشت کر گئی کہ شہر جلا دیے جائیں گے اور لاشوں کے ڈھیر لگے ہوں گے لیکن ایسا کیونکر ہو گا یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ پورا شہر کس طرح ہلاک کیا جا سکتا ہے اور شہروں کو کیوں اور کس طرح جلا کر خاکستر کر دیا جائے گا۔

اب محقق ترمذی سے اکثر نومولود جلال الدین کے بارے میں سلطان العلما کے استفسار پر کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے۔ محقق ترمذی کا جلال الدین کے بارے میں یہ قول تھا کہ اس نے اتنا ذہین، عقل مند اور تیز...... کمسن چار سال کا بچہ نہیں دیکھا۔

سلطان العلما کو اپنے بیٹے کی تعریفیں سن کر بڑی خوشی ہوئی اور پانچ سال کی عمر میں اس بچے کو اپنی تربیت میں لے لیا۔

سلطان العلما جمعہ کی شب وعظ فرما رہے تھے اور خوارزم شاہ کو اچانک خیال آیا کہ اسے ان کا وعظ سننا چاہیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کتنے شہری ان کا وعظ سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔

درباری عالم بہاء الدین رازی کو جب یہ معلوم ہوا کہ خوارزم شاہ خود بھی مجلس وعظ میں شرکت کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا کہ آج اس کی خواہش پوری ہو جائے گی اور وہ سلطان کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دے گا کہ سلطان العلما کے عقیدت مندوں سے بادشاہ کو ہوشیار رہنا چاہیے۔

سلطان العلما کو یہ خبر نہیں ہونے دی کہ آج خوارزم شاہ بھی مجلس وعظ میں شریک ہوگا۔

بہت بڑا ہجوم موجود تھا اور لوگوں کے پہنچنے کا سلسلہ جاری تھا لوگ قریب سے سلطان العلما کی تقریر سننا چاہتے تھے اور یہ لوگ گھنٹوں پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔

سلطان العلما نے اس دن بھی یونانی فلسفیوں اور ان کے فلسفے کو ہدف بنایا اور ان پر دیر تک تنقید کرتے رہے اور پھر اچانک موضوع تقریر سے گریز اختیار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''لوگو! میں عالم اسلام کو نزع کے عالم میں دیکھ رہا ہوں، آبادیاں تہ تیغ کی جارہی ہیں، مکانات جل رہے ہیں، کھیتوں اور شاہراہوں پر مسلمانوں کی لاشیں بکھری ہوئی ہیں، ہر طرف بھگدڑ جاری ہے اور ان کے دشمن بھاگنے والوں کا پیچھا کر رہے ہیں اور جو بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے قتل کر دیا جاتا ہے۔''

خوارزم شاہ نے بھی یہ خطرناک تقریر سنی مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ سلطان العلما کس دشمن کی بات کر رہے ہیں جس سے مسلمانوں کو اتنا زبردست نقصان پہنچ جائے گا اور آبادیاں تہ تیغ کر دی جائیں گی، شہر، قصبے، گاؤں اور فصلیں پھونک دی جائیں گی اور ہر طرف لاشیں بکھری ہوں گی۔

سلطان العلما کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خوارزم شاہ اپنے امرا اور علما کے ساتھ آیا ہوا ہے اور وہ نہایت توجہ سے ان کی تقریر سن رہا ہے۔

سلطان العلما نے خوارزم شاہ کی پروا کیے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی۔

خوارزم شاہ کے مصاحبین نے بادشاہ کی توجہ سلطان العلما کی بے توجہی کی طرف دلائی اور کہا۔ ''بادشاہ سلامت! ملاحظہ فرمائیں کہ سلطان العلما آپ کی تشریف آوری سے آگاہ ہو جانے کے بعد بھی آپ کو نظر انداز کر رہا ہے، اس کی اتنی جرأت کہ وہ بادشاہ وقت کی بھی پروا نہیں کرتا۔''

بادشاہ کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ''مجمع تو نہایت کثیر ہے۔''

بہاء الدین رازی کو بادشاہ کی زبان سے یہ فقرہ سن کے ایک موقع ہاتھ آ گیا، برجستہ عرض کیا۔ ''حضور والا! اس خاکسار نے کئی بار اس خطرے سے آگاہ کیا اور چاہا کہ اس کا سد باب ہو مگر بادشاہ سلامت کی مصروفیات آڑے آ گئیں اور ادھر کوئی توجہ نہ دی جا سکی۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اگر اس کی طرف توجہ نہ دی گئی اور کوئی تدبیر نہ کی گئی تو یہ اندیشہ موجود ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو اور تدارک مشکل ہو جائے۔''

بہاء الدین رازی کی یہ باتیں بادشاہ کے دل و دماغ پر اثر کر گئیں اور اس نے بہاء الدین رازی کو حکم دیا۔ ''جاؤ اور سلطان العلما کو مطلع کرو کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں اور اسے اب تک میری آمد کی خبر کیوں نہ ہوئی؟''

یہ خبر سلطان العلما کو پہنچائی گئی مگر انہوں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

ہجوم کو جیسے ہی یہ خبر ہوئی کہ خوارزم شاہ اس مجلس میں موجود ہے تو ان میں بے چینی پیدا ہو گئی اور خوارزم شاہ کو راستہ دے دیا گیا اور بادشاہ اپنے مصاحبین کے ساتھ سلطان العلما کے قریب پہنچ گیا۔

واعظ کا دور یہ مختصر کر دیا گیا اور خوارزم شاہ نے بھی اسے محسوس کر لیا اور اشارے سے سلطان العلما کو تقریر جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود بھی تقریر بڑی محویت سے سنتا رہا، اسے تقریر میں بڑا مزہ آیا۔ تقریر کے اختتام پر سلطان العلما نیچے اترے اور خوارزم شاہ کا استقبال کیا۔

خوارزم شاہ نے ان کی پر مغز تقریر کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی آپ کے مواعظ کو پابندی سے سننا چاہیے۔''

سلطان العلما نے کہا۔ ''آپ کے پاس اتنا وقت کہاں کہ امور سلطنت کو نظر انداز کر کے پابندی سے میری مجلسوں میں شرکت فرمائیں۔''

ہجوم میں سے اکثریت خوارزم شاہ کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتی تھی اس لیے ان لوگوں نے بادشاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا لیکن خوارزم شاہ کے محافظ دستے نے ڈنڈوں کے ذریعے ان سب کو مار بھگایا۔

بادشاہ نے سلطان العلما سے تخلیے میں بات کرنا چاہی تو سلطان العلما نے کہا۔ ''میں اپنے آس پاس موجود لوگوں کو ہٹا سکتا ہوں مگر ہجوم پر میرا اختیار نہیں ہے۔''

خوارزم شاہ نے اپنے محافظ دستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہجوم کو وہ لوگ بھگا دیں گے۔''

سلطان العلما کے قریب کے لوگوں نے بھی دوری

اختیار کی کیونکہ بادشاہ سلطان العلما سے تخلیے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

جب یہ دونوں تنہا رہ گئے تو بادشاہ نے بہاء الدین رازی کو اپنے قریب بلایا اور سلطان العلما نے بھی محقق ترمذی کو قریب آ جانے کا اشارہ کیا۔

خوارزم شاہ نے کہا۔ ''حضرت! مجھے آپ سے بڑی عقیدت ہے اور آپ کی تقریر میں جو طلاوت پائی جاتی ہے اس نے تو پورے شہر کو مسخر کر لیا ہے مگر بعض عالموں کو آپ کی تقریر کے اس حصے سے اختلاف ہے جس میں آپ یونانی فلسفے اور فلسفیوں کو رد کرتے ہیں اور عقل کو مسترد کر دیتے ہیں۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''ہمارے عالموں کو بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ انسانی فکر اور خیال کو اللہ کے کلام اور فرمودات پر ترجیح نہ دیں۔''

خوارزم شاہ نے محسوس کر لیا کہ اگر یہ گفتگو جاری رہی اور نوبت بحث و مباحثے تک جا پہنچی تو بدمزگی پیدا ہو جائے گی اور حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔ چنانچہ خوارزم شاہ نے موضوع بدل دیا اور کہا۔ ''اب حضرت مجھے یہ ضرور بتائیں کہ آخر بستیوں کو تہ تیغ کون کرے گا اور فصلیں، شہر، بازار اور قصبات کس طرح جلا دیے جائیں گے اور ہر طرف لاشوں کے ڈھیر کیوں لگ جائیں گے؟ آپ کس غارت گر قوت کا ذکر اپنے وعظ میں فرما رہے تھے۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ بتایا وہ مجھے عالم رویا میں دکھا دیا گیا ہے۔ ایک وحشی اور درندہ صفت قوم مشرق سے نمودار ہوگی اور دنیا کو جلا کر خاک کر دے گی۔''

خوارزم شاہ مسکرایا اور کہا۔ ''یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا خوارزم شاہ سے بڑی کوئی قوت اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ حکومتیں میرے نام سے کانپتی ہیں۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''اب میں طاقت اور ناطاقتی کے موضوع پر کیا بات کروں۔ بخدا میں نے مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر دیکھے ہیں اور شہروں کو فصلوں کے ساتھ جلتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بخدا مجھے تو کوئی پناہ کی جگہ بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ میں نے مسلمانوں کو دہشت زدہ عالم میں دوڑتے بھاگتے دیکھا ہے اور اسی کو میں نے اپنے وعظ میں بیان کر دیا۔''

خوارزم شاہ نے کہا۔ ''حضرت! آئندہ اس قسم کی تقریر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میری حکومت اور میری موجودگی میں کوئی دشمن اتنا طاقتور نہیں ہو سکتا کہ خوارزم شاہ کی حدود سلطنت میں قدم رکھنے کی جرأت کرے۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''اے خوارزم شاہ! تو ایک معمولی بندہ ہے، طاقت کے نشے میں چور ہے مگر میں نے مشرق کی طرف سے آتی ہوئی درندہ قوم کو بھی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو کچھ بھی دیکھا ہے وہ میرا خیال اور محض اندیشہ نہیں ہے، میں کئی مہینوں سے لوگوں کو مسلسل بتا رہا ہوں کہ وہ نقل مکانی کے لیے تیار رہیں اور انہیں اپنا وطن بھی چھوڑنا پڑ جائے گا۔''

بہاء الدین رازی دونوں کی دلچسپ باتیں سن رہا تھا اور آخر کار خوارزم شاہ کا ساتھ دیا اور سلطان العلما سے کہا۔ ''حضرت! آپ کے علم و فضل کا کوئی جواب نہیں مگر یہ جو آپ بھیانک مستقبل کی نشاندہی کر رہے ہیں، اس پر کون یقین کرے گا؟''

سلطان العلما نے سادگی سے جواب دیا۔ ''جو یقین کریں گے وہ نقل مکانی کر جائیں گے اور آنے والے درندوں سے محفوظ رہیں گے اور جو یقین نہیں کریں گے وہ مارے جائیں گے اور بھگدڑ میں انہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔''

خوارزم شاہ نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ آئندہ اپنی تقریروں میں ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے جس کا تعلق مستقبل سے ہو۔''

سلطان العلما نے جواب دیا ہے۔ ''میں مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں اور اس سے بادشاہ وقت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اس لیے آپ مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہ لگائیں۔''

خوارزم شاہ نے کہا۔ ''آپ سلطان العلما کے لقب سے مشہور ہیں اس لیے آپ کی باتیں سننے والوں کے دل و دماغ میں مرتسم ہو جاتی ہیں۔ آپ خود غور فرمائیں کہ جب آپ تقریر میں لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ہر طرف بھگدڑ مچی ہوگی، کوئی غارت گر قوم مسلمانوں کا قتل عام کر رہی ہوگی۔ شاہراہوں، سڑکوں، گلی کوچوں میں لاشیں بکھری پڑی ہوں گی۔ فصلیں، مکانات، آبادیاں جلا دی جائیں گی تو ان باتوں کا لوگوں کے دل و دماغ پر بھی اثر ہوگا کہ آئندہ یہاں کوئی حکومت نہیں ہوگی اور لوگ حکومت کے نہ ہونے کا یہی مطلب لیں گے کہ خوارزم شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو چکا ہوگا۔ کیا ان باتوں سے میری اور میری حکومت کی تحقیر نہیں ہوتی ہے۔''

سلطان العلما نے جواب دیا۔ ''خوارزم شاہ! بخدا میں تیری تحقیر نہیں کر رہا ہوں، آنے والے دنوں کے بارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں جو کچھ میں نے بتایا اگر تو اسے قابل ذکر نہیں سمجھتا تو آئندہ میں احتیاط سے کام لوں گا اور لوگوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ نہیں کروں گا لیکن میرے خاموش رہنے سے تقدیر اٹل نہیں جائے گی۔"

بہاء الدین رازی نے سلطان العلما کو سمجھایا۔ "حضرت! آپ بادشاہ کا مفہوم سمجھ گئے ہوں گے آپ نے عالم رویا میں جو کچھ دیکھا وہ دوسروں کو نہیں دکھا سکتے اس لیے آپ اس کا چرچا بھی نہ کریں کیونکہ آپ کا چرچا فتنہ و فساد کا سبب بن جائے گا۔"

محقق ترمذی نے بہاء الدین رازی کو جواب دیا۔ "اے شخص! تو مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ سلطان العلما نے بھلائی کا کام کیا ہے کہ مسلمانوں کو قبل از وقت خطرات سے آگاہ کر دیا۔ جب خوارزم شاہ کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی کہ مشرق سے نمودار ہونے والی کوئی غارت گر قوم یہاں تباہی پھیلائے گی تو سلطان وقت کو بھی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ سلطان العلما کا ہم سب پر احسان ہے کہ وہ ہمیں ان خطرات سے قبل از وقت آگاہ کر رہے ہیں ہمیں ان سے بچنے کا انتظام اور اہتمام کر لینا چاہیے۔"

خوارزم شاہ کو یہ ساری باتیں فضول لگ رہی تھیں۔ اس نے بظاہر خوش ہو کر اپنی غیر معمولی..... عقیدت ظاہر کی اور سلطان العلما سے درخواست کی وہ ان کی باتیں سننے کا اہل ہے اس لیے اسے مرید کر لیا جائے۔

سلطان العلما نے جواب دیا۔ "بادشاہ کا معتقد ہو جانا ہی میرے لیے کافی ہے۔"

خوارزم شاہ واپس چلا گیا اور سلطان العلما اس واقعے سے اتنے بددل ہوئے کہ بلخ کو چھوڑ دینے کا قطعی ارادہ کر لیا۔

اب سلطان العلما نے اپنی تقریروں میں آنے والے برے دنوں کا ذکر کرنا چھوڑ دیا لیکن ذاتی محفلوں کی نشستوں میں وہ یہی مشورہ دیتے رہے کہ بلخ کو چھوڑ دیا جائے اور دور دراز کسی شہر میں سکونت اختیار کی جائے۔

محقق ترمذی نے پوچھا۔ "حضرت! جب آپ کسی دور دراز شہر کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں دور دراز شہر کے نام سے بھی آگاہ فرما دیں۔"

سلطان العلما نے جواب دیا۔ "فی الحال میری نظر میں ہم سب کے لیے محفوظ شہر بغداد ہے وہ یہاں سے دور بھی ہے اور محفوظ بھی۔"

☆☆☆

خوارزم شاہ نے سلطان العلما کے پاس سے واپس جانے کے بعد اپنے مشیروں سے پوچھا۔ "مجھے یقین نہیں کہ سلطان العلما اپنی حرکتوں سے باز آ گیا مگر میں نے اسے خود کو خوبصورت منظر دکھا کر خاموش رہنے کی تلقین کر دی ہے مگر مجھے یقین نہیں کہ یہ شخص اپنی حرکتوں سے باز آ جائے گا۔"

بہاء الدین رازی نے پھر وہی الفاظ دہرائے جو اس نے سلطان العلما کے مجمع کثیر کو دیکھ کر خوارزم شاہ کے اس فقرے کے جواب میں کہے تھے جب خوارزم شاہ نے کہا تھا کہ کتنا کثیر مجمع ہے تو اس کے جواب میں بہاء الدین رازی نے کہا تھا۔ "حضور والا! اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو اور تدارک مشکل ہو جائے۔"

خوارزم شاہ نے بہاء الدین رازی سے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ ہمیں تجھ جیسا مخلص مشیر و مصلاح کار میسر ہے اب ہمیں یہ مشورہ درکار ہے کہ ہمیں سلطان العلما کو ان حرکتوں سے باز رکھنے کے لیے کیا تدبیر کرنی چاہیے؟"

بہاء الدین رازی نے جواب دیا۔ "رموز مملکت سلطان سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ میری ناقص رائے تو یہ ہے کہ حضور والا خزانے اور قلعوں کی کنجیاں سلطان العلما کے حوالے کر دیں اور ساتھ ہی یہ پیغام دیں کہ جمعیت اور کثرت سب کچھ آپ کو حاصل ہے اور میرے پاس امور سلطنت میں سے صرف کنجیاں رہ گئی ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہیں۔"

خوارزم شاہ اس مشورے سے خوش ہوا اور اس نے اپنے خزانے اور قلعوں کی کنجیاں سلطان العلما کے پاس بہاء الدین رازی کے ذریعے روانہ کر دیں۔

یہ کنجیاں جس وقت سلطان العلما کے پاس پہنچیں اس وقت وہاں محقق ترمذی کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔

ان سب نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا اور اسے خوارزم شاہ کی طرف سے خطرے کی گھنٹی قرار دیا گویا خوارزم شاہ نے اس طرح سلطان العلما کو یہ پیغام دیا تھا کہ وہ اگر اپنی خیریت چاہتے ہیں تو بلخ چھوڑ کر خوارزم شاہ کی حدود سلطنت سے دور چلے جائیں۔

سلطان العلما نے کسی سے مشورہ بھی نہیں لیا کہ انہیں خوارزم شاہ کے اس اقدام کا کیا جواب دینا چاہیے۔ سلطان العلما نے بہاء الدین رازی کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ خزانے اور قلعے کی کنجیاں اس کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "سلطان اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فانی کا یہ تمام خزانہ دفینہ ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہیں، ہم درویشوں

کو اس سے کیا سروکار۔ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں تا کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں بہ استقلال سلطنت کریں۔ جمعے کو وعظ کر کے میں چلا جاؤں گا۔"

بہاء الدین رازی نے سلطان العلما کا جواب خوارزم شاہ کو پہنچا دیا اور اس جواب سے خوارزم شاہ کے ساتھ ہی سلطان العلما کے حاسدوں کو بھی بڑی خوشی ہوئی کہ اب ان سب کا سلطان العلما سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔

یہ خبر سلطان العلما کے حجرے سے نکل کر پورے شہر میں پھیل گئی اور یہ بھی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ اس جمعے کو سلطان العلما کا بلخ میں آخری وعظ ہو گا۔ پورا شہر کرب و اضطراب میں مبتلا تھا اور جگہ جگہ لوگوں کے جتھے خوارزم شاہ اور سلطان العلما کے حاسدوں کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ شاہی مخبروں نے شہر کی اس صورت حال سے خوارزم شاہ کو مطلع کیا اور یہ خطرہ بھی ظاہر کیا کہ اب جمعے سے پہلے شہر میں ہنگامے ہو سکتے ہیں اور مسلمان بادشاہ کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔

خوارزم شاہ کو خوف اور خطرہ محسوس ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فی الحال سلطان العلما کو روکنے کی کوشش کرے گا۔ اسی رات وہ اپنے وزیر اور بہاء الدین رازی کو ساتھ لے کر سلطان العلما کی خدمت میں پہنچا۔

سلطان العلما کو خوارزم شاہ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو انہوں نے نہایت خوش اخلاقی سے بادشاہ کا استقبال کیا۔

خوارزم شاہ نے شہر میں پائی جانے والی بے چینی کا ذکر کیا اور کہا۔ "ان حالات میں آپ کو اپنا شہر بلخ نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ مجھے احتجاج اور مظاہرہ کرنے والوں کے خلاف تشدد آمیز کارروائیوں کا حکم دینا پڑے گا اور جو منظر آپ نے عالم رویا میں دیکھا ہے اسے بھی ہم سب دیکھ لیں گے۔"

سلطان العلما نے پوچھا۔ "تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

خوارزم شاہ نے جواب دیا۔ "آپ اسی شہر میں رہیں گے اور نقل مکانی کا خیال دل سے نکال دیں۔"

سلطان العلما نے پوچھا۔ "خوارزم شاہ! یہ تیرا حکم ہے؟"

خوارزم شاہ نے کہا۔ "میں آپ سے یہ استدعا کر رہا ہوں آپ کو حکم نہیں دے رہا ہوں۔"

سلطان العلما نے جواب دیا۔ "بادشاہ کو معلوم ہے کہ میں نقل مکانی کا ایک عرصے سے ارادہ کر رہا ہوں۔ میرے بلخ کو چھوڑنے میں بادشاہ کے کسی عمل کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے مجھے خزانے اور قلعے کی کنجیاں

ماہنامہ سرگزشت
شمارہ جولائی 2011ء کی جھلک
فخرِ اندلس
اسلامی دنیا کی ایک قابلِ فخر و قابلِ تقلید شخصیت کا زندگی نامہ
اٹک ریلوئے برج
اپنا وطن لازوال اس کا ہر گوشہ بے مثال معلومات بھری تحریر
جل پری
سمندر کی انسان نما مخلوق کی روداد
میں کون ہوں
ایک دل دکھا دینے والی سچ بیانی
اس کے علاوہ
بھی بہت ساری سچ بیانیاں، سچے واقعات اور دلچسپ تحریریں
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں
بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں،
آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔
خاص شمارہ..... ہر شمارہ خاص شمارہ..... ہر شمارہ خاص شمارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ وہ پیغام مند ملا ہوتا، میں پھر بھی نقل مکانی کر جاتا۔''

جب خوارزم شاہ نے یہ دیکھا کہ سلطان العلما اس کی درخواست نہیں مانیں گے تو اس نے کہا۔ ''اچھا اگر آپ بلخ چھوڑ دینے پر مصر ہیں تو آپ یہ سفر جمعے یا دو شنبے کی شب نہیں کریں گے۔ کیونکہ ان دونوں دنوں میں آپ کے وعظ میں پورا شہر جمع ہو جاتا ہے اور جب آپ وعظ کے بعد بلخ کو چھوڑیں گے تو پورے شہر میں آگ سی لگ جائے گی اور قتل وغارت گری اور خون خرابے کا بازار گرم ہو سکتا ہے۔ اس لیے آپ ان دو دنوں کے علاوہ نقل مکانی کریں گے تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔''

سلطان العلما نے خوارزم شاہ کی یہ درخواست مان لی اور آہستہ سے بادشاہ کو بتایا۔ ''میں جمعے کو وعظ کہہ کر خاموشی سے اپنے گھر آجاؤں گا اور ہفتے کی شب بلخ کو چھوڑ دوں گا۔''

خوارزم شاہ نے درخواست کی۔ ''آپ ہفتے کی شب اتوار سے قبل پچھلے پہر سفر شروع کریں گے کیونکہ اس وقت پورا شہر نیند کے مزے لے رہا ہوگا اور کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہیں ہوگا۔''

سلطان العلما نے خوارزم شاہ کو یہ یقین دلایا کہ سلطان کی مرضی کے مطابق وہ اپنے سفر کا آغاز کریں گے اور خلق خدا کو فتنہ وفساد میں مبتلا نہیں ہونے دیں گے۔

خوارزم شاہ ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد جانے لگا تو سلطان العلما نے بطور خاص اسے مخاطب کیا۔ ''اے بادشاہ! اب میری بات غور سے سن۔ میں نے مشرق سے جس غارت گر درندہ خو قوم کو اپنے شہروں پر حملہ آور ہوتے عالم رویا میں دیکھا تھا آج میں اس کی وضاحت کر رہا ہوں یہ قوم یقینی حملہ آور قوم تاتاریوں کی ہے۔ وہ حملہ آور ضرور ہوں گے اور انہیں قتل وغارت گری سے کوئی بھی نہیں روک سکے گا۔''

خوارزم شاہ نے سلطان العلما کی یہ باتیں توجہ سے نہیں سنیں، کیونکہ وہ اپنی سلطنت کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا۔

جمعے کو وعظ کہنے کے بعد ہفتے کی صبح سفر کی خفیہ تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سفر میں جو لوگ یا جو خاندان ان کا ساتھ دے رہے تھے وہ بھی تیاریاں کرتے رہے اور ہفتے کی رات جب نصف شب گزر گئی تو یہ مختصر قافلہ بلخ کو چھوڑ کر بغداد روانہ ہو گیا۔

لیکن سلطان العلما کے سفر کی خبریں دور دور تک ان کے پہنچنے سے پہلے پہنچتی رہیں اور یہ جس شہر کے قریب پہنچتے تھے وہاں کے اکابر اور علما شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کرتے اور نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ اپنے شہر میں لے جاتے۔

بغداد پہنچنے کے بعد انہوں نے یہاں زیادہ قیام نہیں کیا اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ یہاں بھی ان کا شاندار استقبال ہوا اور لوگوں نے ان کی ایسی قدر ومنزلت کی کہ بادشاہ بھی اس قدر ومنزلت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہاں بھی کچھ عرصہ رہنے کے بعد انہیں دمشق کا خیال آیا اور مکہ معظمہ چھوڑ کر دمشق تشریف لے گئے۔ یہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد انہیں اپنے علاقے یاد آنے لگے لیکن جیسا کہ وہ خوارزم شاہ اور بلخ کے لوگوں کو مطلع کر چکے تھے کہ تاتاری مسلمانوں کے ان علاقوں کو روند کر رکھ دیں گے، اس لیے وہ ان علاقوں میں واپس جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بغداد کے بارے میں بھی انہیں قبل از وقت معلوم ہو گیا تھا کہ تاتاری یہاں بھی پہنچ جائیں گے اور چالیس شب وروز یہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوگا اور مسلمانوں کے خون سے دریائے دجلہ کا رنگ سرخ ہو جائے گا، اسی لیے وہ بغداد میں بھی مستقل قیام سے باز رہے۔ دمشق پہنچنے کے بعد انہیں بتایا گیا کہ یہاں بھی تاتاری پہنچ جائیں گے۔

یہ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوششیں کرتے رہے مگر عالم اسلام میں ہر جگہ انہوں نے مسلمانوں کو غافل پایا۔ ان کی باتوں پر اکثریت دھیان نہیں دیتی تھی، وہ سلطان العلما کے وعظ سن کر سر دھنتے تھے مگر ان پر عمل نہیں کرتے تھے۔

دمشق میں کئی سال رہنے کے بعد انہیں روحانی طور پر بتایا گیا کہ وہ ترکی کا سفر کریں اور وہیں کسی شہر میں مستقل سکونت اختیار کریں۔ یہ پرسکون جگہ ان کے لیے مناسب ہوگی۔ چنانچہ سلطان العلما نے دمشق کو بھی چھوڑ دیا اور ترکی کے آق شہر میں سکونت اختیار کی، یہ شہر ان کی تشریف آوری کو اپنے لیے نعمت سمجھتا تھا۔ یہاں سلطان العلما نے ایک مدرسہ قائم کیا اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔

چار سال قیام کرنے کے بعد لارندہ تشریف لے گئے۔ یہ وہاں کے مشہور شہر قونیہ کا ایک قصبہ تھا۔ قونیہ میں روم کے سلطان علاؤ الدین کیقباد کی حکومت تھی اور وہ سلطان العلما کا غائبانہ ارادت مند تھا۔ اسے ان کا لارندہ نامی چھوٹے سے قصبے میں قیام پسند نہیں آیا اور اس نے ان کی خدمت میں کچھ تحائف بھیجے اور درخواست کی کہ آپ قونیہ تشریف لائیں۔

سلطان العلما نے خوارزم شاہ کو بھگتا تھا اور بادشاہوں کی خوش اخلاقی اور منافقت سے خوب واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ بادشاہ کے دربار میں علما بھی ہوتے ہیں جو کسی

غیر درباری مشہور مخلص عالم کو پسند نہیں کرتے اور اس کے خلاف حاسدانہ ایک محاذ کھڑا کر دیتے ہیں۔

سلطان العلما نے علاؤ الدین کیقباد کو شکریے کا جوابی پیغام بھیجا اور کہا۔ ''میں لارندہ کے چھوٹے سے قصبے میں لوگوں کو درس دینے میں خوشی محسوس کرتا ہوں اور درباری زندگی میں اپنے لیے کوئی جگہ نہیں پاتا۔ وہ لوگ مجھے پسند نہیں کریں گے، اس لیے بادشاہ کو تلخیوں سے بچانے کے لیے میں اس چھوٹے سے قصبے میں عافیت محسوس کرتا ہوں۔''

لیکن سلطان العلما کا یہ معذرت خواہانہ جواب کیقباد کو پسند نہیں آیا اور اس نے سلطان العلما کو یقین دلایا کہ وہ سلطان العلما کی عزت اتنی غائبانہ کرتا ہے تو ان کی تشریف آوری کے بعد اس میں اضافہ ہو جائے گا اور کسی درباری کو بھی ان کے خلاف بات کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

کیقباد کے بے حد اصرار کے بعد پہلے آپ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ انہیں کیقباد کی بات مان لینا چاہیے یا یہ جگہ چھوڑ کے کہیں اور چلے جانا چاہیے۔

سلطان العلما کے صاحبزادے جلال الدین اب بائیس سال کے ہو چکے تھے اور چار پانچ سال کے علاوہ ساری تربیت اور تعلیم اپنے والد بہاء الدین ولد سلطان العلما ہی سے حاصل کرتے رہے تھے۔

یہ عجیب اتفاق کی بات تھی کہ بہاء الدین ولد کے انتہائی قریبی ساتھی محقق ترمذی نے آپ کا نقل مکانی میں ساتھ نہیں دیا تھا اور اپنے وطن ترمذ چلے گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں جلال الدین اپنے والد ہی سے تعلیم وتربیت حاصل کرتے رہے اور اب جو انہیں کیقباد قونیہ بلا رہا تھا تو جلال الدین نے بھی اپنے باپ کو یہی مشورہ دیا کہ وہ سلطان علاؤ الدین کیقباد کی درخواست رد نہ کریں اور قونیہ میں مستقل سکونت اختیار کریں۔

کیقباد کو مطلع کر دیا گیا کہ سلطان العلما قونیہ میں رہنے کے لیے تیار ہیں۔

کیقباد کی طرف سے آدمی بھیج دیے گئے۔ سلطان العلما ان کے متعلقین اور ان کے ارادت مندوں کو اپنے ساتھ عزت واحترام سے قونیہ لے گئے۔

626ہجری کا وہ دن قونیہ میں یادگار ہو گیا۔ جب شہر کے باہر سلطان کیقباد نے سلطان العلما کا استقبال کیا اور انہیں اپنے ساتھ محل تک لے گیا اور پھر گھوڑے سے اتر کر سلطان العلما کو گھوڑے سے اترنے میں مدد دی اور اس طرح اپنی عاجزی اور انکساری ظاہر کی۔

سلطان العلما نے کسی محل کے بجائے قونیہ کے مدرسے میں قیام کیا اور یہیں کیقباد اکثر امرا کے ساتھ ان کا مرید ہو گیا۔

کیقباد کے اتالیق امیر بدر الدین گوہر تاش نے اپنے سلطان کو ان کی طرف زیادہ مائل دیکھا اور کچھ عرصے کے بعد سلطان العلما کے تبحر علمی اور خداداد ذہانت کا اندازہ ہوا تو اس نے ان کے لیے ایک شاندار مدرسہ تعمیر کروایا اور اس کا نام مدرسہ خداوندگار تجویز ہوا اور اس کے لیے بہت بڑا خزانہ وقف کیا گیا۔ یہاں کئی سال سے ایک قلعہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ سلطان العلما کی تشریف آوری اور قیام کے بعد قلعے کی تعمیر تکمیل کو پہنچی تو سلطان کیقباد نے درخواست کی کہ آپ قلعے کو ملاحظہ فرما کر دعائے خیر فرمائیں۔

سلطان العلما سلطان کے ساتھ قلعے کو گھوم پھر کے دیکھتے رہے اور آخر میں فرمایا۔ ''بے شک یہ قلعہ آفات کے سیل کے روکنے کے لیے اچھا ہے مگر مظلوموں کے تیر دعا کا کیا علاج؟ انصاف کا قلعہ بناؤ کہ اس میں دنیا کے امن اور عاقبت کی خیر ہے۔''

سلطان پر آپ کی نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

سلطان العلما کو قونیہ میں دو برس رہنا میسر آیا اور 628ہجری میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کے متنبہ کرنے کے باوجود خوارزم شاہ اور اس کے حدود سلطنت میں غارت گر تاتاریوں سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا اور خوارزم شاہ اپنی طاقت کے نشے میں تاتاریوں کو حقیر سمجھتا رہا اور آخر کار ان کے سیلاب میں سمرقند وبخارا اور پورا ملک اور اس کا شہر تباہ وبرباد ہوا۔ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، لوگ پناہ گاہوں کی تلاش میں دوڑتے بھاگتے رہے اور قتل کر دیے گئے۔ فصلیں جلا دی گئیں، شہر پھونک دیے گئے اور آبادیاں ویران ہو گئیں۔

یہ سلطان العلما بہاء الدین ولد کون تھے اور ان کے بیٹے جلال الدین کو دنیا کس حیثیت سے جانتی ہے؟

یہ جلال الدین مثنوی مولانا روم کے خالق اور عالم گیر شہرت دوام کے مالک کے پدر بزرگ وار تھے مگر بیٹے کی شہرت نے ان کی شہرت کو ماند کر دیا۔

مضمون کے مآخذ:

مولانا روم، مولانا شبلی نعمانی۔ نفحات الانس، جامی۔ تاریخ دعوت وعزیمت، مولانا ابو الحسن علی ندوی۔ انوار اصفیا، شیخ غلام علی (شعبہ تصنیف وتالیف)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

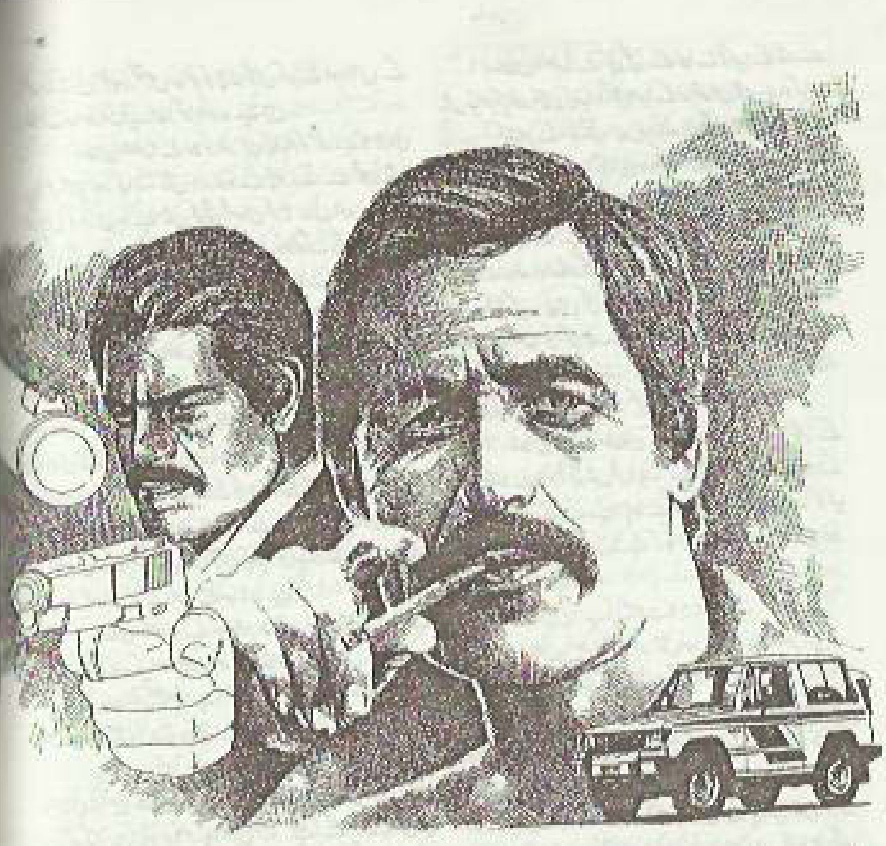

خوب صورت رنگ رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

قسط نمبر 63

اناڑی

قسمت کے بھنور میں الجھی ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد... وہ لوٹا... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دورِ حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک داستان رنگ برنگ

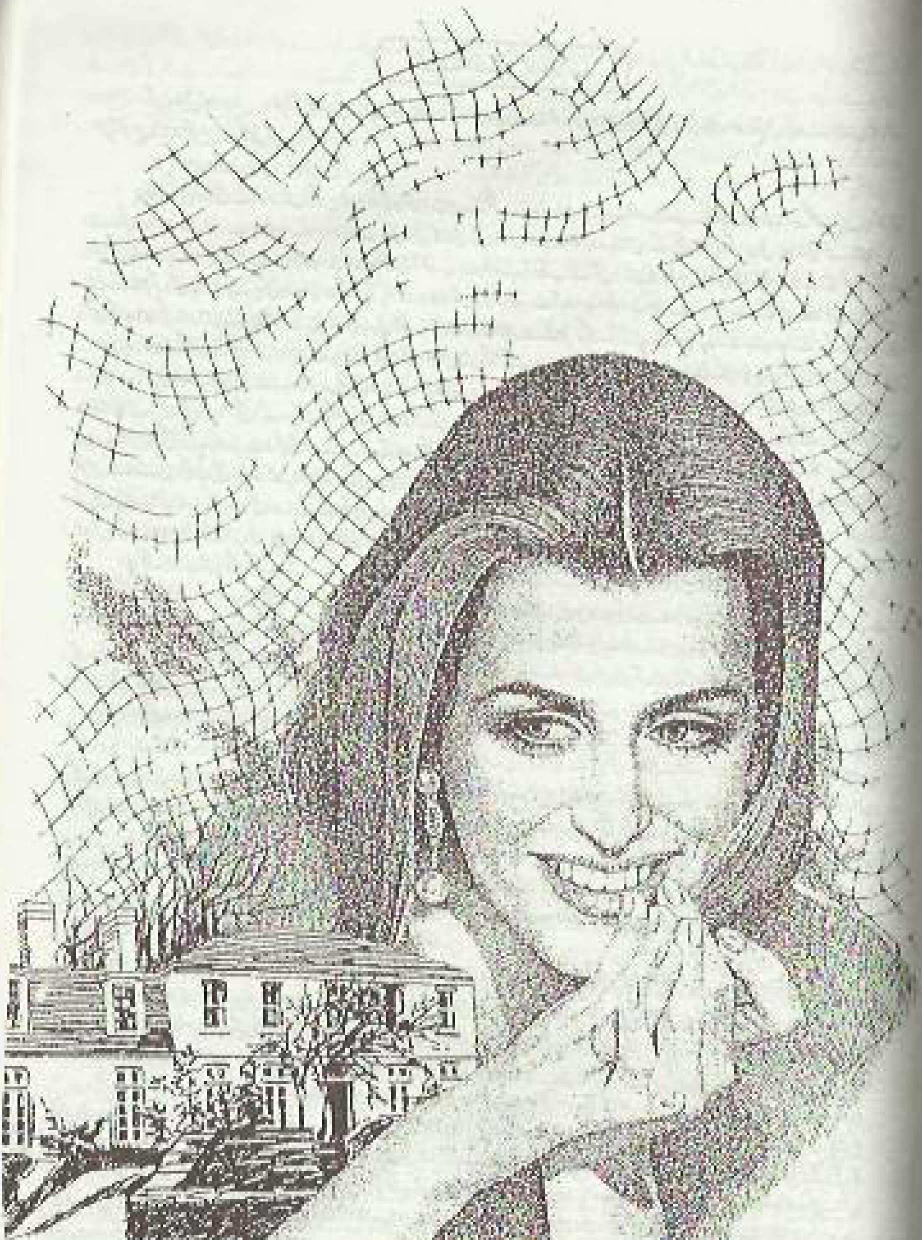

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

گرد و پیش کا احوال۔ معاشرتی کا کمال۔ ایک داستان در داستان۔ آج کے زندہ کرداروں کی حقیقی کہانی جسے احمد اقبال کی زود نویس قلم اور سحر آفریں انداز تحریر نے تخلیق کیا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریز فوج کو شاہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرتناک شکست دی۔ بچ جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے زخمی حالت میں میرے پردادا نے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر بحفاظت ریاستی کے قصبے میں انگریز کی چھاؤنی تک پہنچا دیا۔ انعام کے طور پر انگریز حاکم نے اجازت دی کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جتنی زمین کا چکر اپنی بیل گاڑی پر لگا لیں گے وہ ان کے نام کر دی جائے گی۔ یوں ست بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میرے آبا و اجداد نواب کہلائے۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بددعا لگی اور اس کے چھ جوان بیٹے باری باری مختلف حادثات کا شکار ہو کے مر گئے۔ آخری بچے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات سمندر پار لندن بھیج دیا لیکن کسی خرابی کے باعث جہاز بحر اوقیانوس میں غرق ہو گیا۔ باپ نے عالم دیوانگی میں اپنی تمام بیویوں کو مار دیا اور پھر خودکشی کر لی.... حویلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میرے والد لاہور کے ایک کالج سے ریٹائر ہوئے.... میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں میرا تعلق ایک سیاسی تنظیم کے دہشت گردوں سے ہو گیا۔ میری زندگی بچانے کے لیے والد صاحب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے بہانے امریکا بھیج دیا۔ ہارورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لارڈ ارنسٹ کی بزنس فرم میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی ملیحا مجھ پر فریفتہ ہو گئی اور اپنا تمام تمکنت بھول کر عاشق بن گئی.... مگر میں نے اسے ٹھکرا دیا کیونکہ میں فریال کو چاہتا تھا۔ فریال پہلے، اول اول اور آخر بس میری تھی.... عیش اور عیاشی کے باعث ایک عیاش.... فحش اور قلساز چوہدری سلطان سے منگنی بھی کر بیٹھی تھی.... میں نے اور فریال نے چھ سال تک اس کی عدت کا مطالبہ کیا۔

اچانک لندن میں مجھے ایک وکیل کے ذریعے اپنے کسی رشتے کے پردادا نے طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور وہ ماضی کے سوالوں کا سارا نظم مطلوب تھا.... ان کی معلومات کے مطابق میں ان کا رشتے دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انہوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنا دیا۔ یہ وہی ساتویں بیٹے تھے جن کا جہاز لندن جاتے ہوئے سمندر میں غرق ہو گیا تھا.... وہ بچ جانے والے واحد مسافر تھے جو بے ہوشی میں کسی تختے پر تیرتے ہوئے برطانیہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ کئی برس انسان اور اس کی مدد سے انہیں لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا تھا اور مجھے اپنا وارث مقرر کر کے مر گئے۔

ایک دن مجھے وطن کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی عالی شان مگر منحوس کہی جانے والی حویلی اور جاگیر ساٹھ ستر سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ ریاست کی ملکیت پر لالہ اور بھیم کے ہونہار بیٹے جانے والی ملکیت پر بیٹا کے تحت تھی جو کھنڈرات سے ہوکر بیس بیگھہ کے فاصلے پر تھی.... حویلی کے تہہ خانوں، پوشیدہ گوداموں اور مقفل الماریوں سے مجھے کتنی ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے زیور، برتن اور نقشی ہتھیار اور ان میں کاریگری بھی شامل تھی۔ ان بے شمار خزانوں اور دولت کی حفاظت کرداروں سے ہوکر جو بے شمار برسوں تک پہنچ چکی تھی۔

اپنے چند دوستوں کی مکمل حمایت سے میں نے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ جنگلات کا فروغ، زرعی فارم بنانے اور ایکسپورٹ کرنے اور روایتی سامان سے بڑی ملیں قائم کرنے کا منصوبہ شامل تھا۔ مجھے دوستوں سے مدد اور لوگوں سے پذیرائی ملی لیکن علاقے کا جاگیردار میرا دشمن ہو گیا۔ میری انسان دوستی اور غریب پروری کی شہرت پھیلی تو راناکو اپنی صوبائی اسمبلی کی سیٹ خطرے میں نظر آنے لگی جسے وہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔

ابتدا میں شہر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے والوں میں میرا اسکول کا دوست ساجد اور اس کی منگیتر ڈاکٹر شہناز کے علاوہ میری چچا زاد بہن راحیلہ اور میرے والدین شامل تھے۔ پھر علاقے کا ڈی آئی جی زاہد کو میرا ساتھی اور دوست بن گیا۔ شاہی بادشاہ نے میرے کہنے سے فیصلہ کیا کہ معافی لے کے بعد ست بدھائی میں عزت زندگی گزارے گا لیکن اسی خفیہ پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انہوں نے پولیس مقابلے کا ڈرامہ رچا کے سب کو مار دیا.... رانی شاہی بادشاہ کی بیوی کو بھی نکال کر لے گئی۔

شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میرے والد اور چچا ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک بنانے والا برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں تعلیم اور ملازمت کے دوران برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چچا اور چچی کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی راحیلہ سے شادی کر لیتا تو حق ادا ہو سکتا تھا لیکن میں فریال کے سوا کسی کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے راحیلہ کو اس کا حق دیا اور دوست بدھائی میں میرے ساتھ رہی۔ اس نے محبت کی شادی میں دو بار دھوکا کھایا۔ بدقسمتی سے دھوکا دینے والے میرے دوست تھے۔ رفتہ رفتہ راحیلہ بھی مجھے حق کی اور اپنے والدین کی موت کا ذمے دار سمجھنے لگی۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے ملازم کی بیوی نور جہاں کو دیکھا جو درحقیقت اس کی داشتہ تھی اور وہ فروشی سے نشاط فروشی تک ہر کاروبار میں نور جہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تھی لیکن نور جہاں جیسی حسین عورت نہیں دیکھی.... اس نے مجھ سے مراسم استوار

کرنے میں جلد بازی نہیں کی۔ دیکھا۔ فریال سے محبت اور شادی کے عہد و پیمان کے باوجود میں نور جہاں کے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے میرے لیے اپنے نام نہاد شوہر کو بھی قتل کر دیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ فریال میرے ساتھ لندن، پیرس اور نیویارک جیسے شہروں کی چکا چوند والی زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ نور جہاں کے معاملے نے اسے بدظن کر دیا اور وہ لوٹ کر شوبزنس میں چلی گئی جہاں چوہدری سلطان کے ذریعے اسے زبردست کامیابی ملی۔ سوچ سمجھ کر اس نے چوہدری سلطان کو قبول کر لیا اور اپنے اعلیٰ مراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آنے سے بھی محفوظ رہی۔

نور جہاں نام نہاد شوہر کے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر اچانک غائب ہو گئی۔ ایک نئے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا حصول مشکل نہ تھا۔ میں اسے لندن لے گیا تاکہ وہ اپنی شخصیت کے ساتھ ست بدھائی واپس آ جائے۔ میں اسے لارڈ ارنسٹ کی مدد سے برطانوی شہریت بھی دلوانا چاہتا تھا۔ وہاں بعد لندن پہنچ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ عائشہ وہاں ملیحا بن چکی ہے اور ڈپریشن کے باعث خودکشی کر چکی ہے۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور باپ سیاسی اور کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ عائشہ کا عشق مجھے سمجھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا۔ اس نے زور ڈال کر کے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ لڑکی کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ ارادہ بھی کرنا پڑا۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو دل کا دورہ پڑا اس کی وراثت صرف وہ لڑکی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس کی بزنس ایمپائر کو سنبھال نہیں سکتی۔ اس نے مرنے سے پہلے اپنی ایک سو ملین پاؤنڈ کی جائداد اور وسیع کاروبار کا مالک مجھے بنا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد عائشہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ میرے انکار اور ماں باپ کی موت نے عائشہ کے احساس جرم کو شدید تر کر دیا اور وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے لڑکیوں کی چیریٹی میں ہو گئی۔ قدرت کی طرف سے خوش نصیبی کی یہ دوسری ڈوری میرے لیے ایک آزمائش بن گئی۔ نور جہاں اکیلا ہے پر راضی نہ تھی اور اسے میں جہاں رہتا تھا، وہیں جاتی تھی.... پھر کچھ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ اب تک مجھے دھمکیاں ملتی تھیں کہ میں بیچ نہ سکا تھا۔ اس نے دس سال پہلے لاہور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلاوطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے مجھ کو گھر میں اسے اپنا سیاسی مشیر بنالوں تو آئندہ انتخابات میں اپنے حریف رانا کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے بظاہر اس کی یہ پیشکش قبول کر لی۔

ست بدھائی کے اسپتال کو وسعت دینے میں میرے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بیٹا شامل تھے۔ اس کنبے کی تیسری رکن لیلا بھی ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ناکامی اور پھر شوہر کے قتل نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے سابق محبوب وحید ان لیا اور کسی حد تک نارمل بھی ہو گئی۔ وحید ایک لاابالی مصور تھا جو لندن میں عریاں تصاویر بنا کے پیسہ اڑانے پر لگ جاتا تھا اور اسمگلنگ کا اڈا تھا.... لیلا نے اپنی جان چھڑانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جانا ضروری تھا۔ وہ جو میری کار میں کام کر رہا تھا۔ میں نے اس کے تمام جرم سے بے باک کے ادارے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کر لیا۔ چیف نے مجھے تھپکی دی کہ میں وحید کو اپنے ذاتی کیٹ کے طور پر بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ چیف کا اصل نام غلام علی تھا۔

اگرچہ میں یہ کر سکتا تھا کہ ست بدھائی کو راحیلہ کے سپرد کر دوں جسے اس کا حق تھی کا احساس ختم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں رہ کر کاروبار کو مزید پھیلاؤں۔ مگر نور کے سمجھانے سے میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں جگہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ لارڈ ارنسٹ کے تمام ملازم مجھے ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ وہ سب احتیاطاً ملازمت چھوڑ گئے.... لارڈ کے سابق شوفر اور باڈی گارڈ نے میری راستوں سے ناواقفیت کے باعث مجھے ایک ویران احاطے میں لے جا کر قتل کرنے کی کوشش کی انہیں ناک آؤٹ کر کے میں نے غلام علی کو طلب کیا اور خود ملیحا سے ملنے چرچ چلا گیا۔ غلام علی نے احاطے میں کھڑا ڈیکر جلا کر ریت کے ڈھیر میں دفن کر دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چونکہ میں بھی گزرتے سے پہلے وہ گرفتار ہو گیا.... میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتایا جو غلام نے اعتماد میں مجھے بتایا تھا۔ چاری کے مددگار اپنی جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بن گئے۔ حالات نے پلٹا کھایا اور مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مگر مرخز کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ جس کا مقصد تھا کہ میں سارے الزامات اپنے سر لے لوں۔ چیف کی شکل دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس واردات میں چیف کی ایک الماری کی کمزوری کی بدولت میں نے پہچان لیا کہ سرغنہ اصل چیف نہیں بلکہ اس کا ڈپلی کیٹ ہے۔ ادھر لندن پولیس کی مہارت اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے چیف اور اس کے گرگے گرفتار کر لیے گئے۔ میں قید خانے سے نکل کر ایک معمر انگریز جوڑے کی مدد سے اپنے گھر پہنچا۔ پھر میں نور کے ساتھ ان کی اپنی ذمے داریوں کو ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں اور نور تمام امور سے فرصت کر مستقل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اچانک ملیحا جو رہے تھے میں ملیں پہنچ گئی۔ اب وہ اپنی جائداد کی واپسی کا مطالبہ کر رہی تھی مگر مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ تھا چنانچہ میں نے اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا جس پر مشتعل ہو کر اس نے پستول نکال لیا اور دیوانگی کی حالت میں مجھ پر فائر کر دیا۔ پولیس اسے لے گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو ملیحا نے جوابًا مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی لیکن وہ اب کچھ نہیں کر سکتی تھی لارڈ ارنسٹ کے وکیل نے مجھے جذباتی بلیک میل کرتے ہوئے ملیحا کی حالت کے پیش نظر اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ تجویز بختی سے مسترد کر دی۔ دوسری جانب نور مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں ست بدھائی واپس کے نام کر دوں اور لندن میں اس کے ساتھ رہوں۔ میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بہرحال حالات کے پیش نظر میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو بڑی مشکل سے نور لندن میں رہنے پر راضی ہوئی۔ ایئرپورٹ پر میرا بریف کیس چوری ہو گیا جس کے باعث فلائٹ سے میری روانگی خطرے میں پڑ گئی۔ اسی کشمکش میں غیر معمولی مہارت سے مجھے بے ہوش کر دیا گیا اور ایمبولینس میں ڈال کر نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ مجھے تنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

[illegible]

[illegible]

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایس پی کے پیچھے پیچھے جب میں بھی کمرے سے باہر نکلا۔ تو میں نے عجیب منظر دیکھا۔ وہاں ایک عورت کھڑی تھی۔ جو اپنے حلیے اور حرکتوں سے پاگل سی لگ رہی تھی۔ اس نے میکسی نما لمبا چوغہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک تھا۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے تھے، گلے میں منکوں کی چھوٹی بڑی کئی مالائیں پڑی تھیں۔ ایک پیر میں گھنگرو تھے۔ اس کے گھنے بال کھلے اور دھول مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی خاصا پُرکشش رہا ہوگا لیکن اس وقت اجڑا اجڑا سا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں وحشت ناچ رہی تھی۔

اس نے ایس پی کو دیکھ کر اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! رب سائیں شاداں آپکی رکھے، پولیس دا سب توں وڈا افسر بنا دے، خوش رہو، وسدا رہ!'' وہ میری طرف مڑی۔ ''نواب صاحب! کو مجھے دھرے دے دیں، آباد رہے، رب سائیں آپ دے وعارے!'' اس نے ایک نعرۂ مستانہ لگایا اور دیوانہ وار رقص کرنے لگی۔ ''میری تیکنی دا چھلا ماہی لیا، گھر جا کے شکایت لاواں گی!''

غنی پھر چیخا۔ ''بس کر مائی!''

میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ وجد میں آ کر گانے لگی۔ ''پیارے...... پیارے...... پیارے...... تمہارے بنا لاگے نہیں ہمارا جیارے!''

ایس پی نے دلچسپی سے اسے دیکھا، پھر مجھ سے بولا۔

''کون ہے یہ؟''

''آئی ڈونٹ نو!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ میں واقعی اسے نہیں جانتا تھا۔

مجھے اب اپنے گارڈز پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ پگلی اندر کیسے آ گئی۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''غنی، ایس پی صاحب کو باہر تک رخصت کر کے آؤ۔''

پگلی اسے دیکھ کر گانے لگی۔ ''دیس پرائے جانے والے، وعدہ کر کے جانا کہ خط لکھو گے..... مجھے خط لکھو گے روزانہ!''

ایس پی نے مجھ سے ہاتھ ملایا، پھر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

پگلی ابھی تک گانے میں مصروف تھی۔ میں نے احمد شاہ سے پوچھا۔ ''یہ پگلی اندر کیسے آئی؟''

''اللہ لوک ہے نواب صاحب!'' سرور کے بجائے ایک دوسرے گارڈ نے عقیدت بھرے انداز میں پگلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر پگلی نے ٹھمکا لگایا اور گانے لگی۔ ''اب غلطی آئی، پھر پگلی، جا اور بیعت کر پگلی!''

''خاتون!'' میں نے پگلی کو مخاطب کیا۔ ''مانا کہ آپ بہت زبردست گلوکارہ ہیں لیکن خدارا اس وقت مجھے معاف کریں، میں آپ کے فن سے......''

''کوئی یوں بھی روٹھتا ہے۔'' پگلی نے تان لگا کر میرا جملہ کاٹ دیا۔ ''ماما میری خطا ہے، مگر اب معاف کر دو...... مگر اب معاف کر دو!''

غنی واپس آیا تو میں نے اس پر آنکھیں نکالیں۔ ''یہ سب کیا ہے چیف سیکیورٹی آفیسر صاحب! یہ تان سین کا فی میل ایڈیشن اندر کیسے آیا؟''

''سر! یہ اللہ لوک ہے۔'' غنی نے کہا۔ ''یہ جو کچھ کہتی ہے، وہ پورا ہو جاتا ہے۔ گارڈز نے اسے روکنے کی کوشش کی ہوگی لیکن یہ رکی نہیں اور سیدھی اندر آ گئی۔''

مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ ''کوئی اگر یہاں آ کر ایسی ہی حرکتیں کرے گا، اچھل کود کرے گا، گانے گائے گا تو تم اسے اندر آنے دو گے، چاہے وہ اندر آ کر مجھے گولی مار دے؟''

''سر، ایسی بات نہیں ہے۔'' ایک گارڈ جلدی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولا۔ "اس مائی کو سبھی جانتے ہیں۔ یہ اگر کسی کو بددعا دیدے تو وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہمیں بھی اس موڑ میں آتی ہے۔ ویسے تو یہ کسی سے بات بھی نہیں کرتی۔ بس سائیں بڑے شاہ کے مزار پر پڑی رہتی ہے۔ کبھی کبھار رات چلی جاتی ہے اور کبھی ادھر چار کھیتوں والا دربار پر پڑی رہتی ہے۔"

"اوہو، تمہیں تو اس کا پورا شجرہ معلوم ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

بگی نے مڑ کر مجھے دیکھا، پھر رقص کرتے ہوئے میری طرف بڑھی اور تان لگائی۔ "کر دیا پیار کا وہ سوال، میرے پاس بیٹھے تھے تم یہاں۔ لیا ہاتھ میرا جو ہاتھ میں، گئیں ٹوٹ کانچ کی چوڑیاں۔ تو گئے سے مجھ کو لگا گیا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"

حویلی کی خواتین کچھ فاصلے پر کھڑی کھی کھی کر رہی تھیں۔

"غنی!" میں چیخ کر بولا۔ "اسے باہر نکالو یہاں سے۔"

غنی اس کی طرف بڑھا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

"چلو باہر نکلو۔" غنی نے درشت لہجے میں کہا۔

مجھے ناصر دکھائی دیا۔ وہ نہ جانے اب تک کہاں تھا؟ اس نے غنی سے کہا۔ "چھوڑو اسے۔" پھر وہ بگی سے مخاطب ہوا۔ "تم یہاں ہو، اندر چل کر بیٹھو، وہ یہاں نہیں آئے گا۔"

"وہ کہاں ہے؟" بگی نے چونک کر ناصر کی طرف دیکھا، پھر بولی۔ "وہ نہیں ہے تو کیا؟ اس کی پرچھائیں ہے، اس کا احساس ہے۔"

"اندر چلو مائی!" ناصر نے کہا۔ "وہ تمہارے لوگوں کے سامنے نہیں آئے گا۔"

"چلو!" بگی نے کہا اور ناصر کے ساتھ اندر چلی گئی۔

شہباز نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "کون ہے یہ؟"

"یہ اللہ لوک ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اللہ لوک ہے تو یہاں کیا کر رہی ہے؟" نور نے کہا۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔

"یہ تو وہی بتا سکے گی۔" راجہ نے کہا۔ "اسے اس موقعے کا بھی کوئی گانا ضرور یاد ہو گا۔"

"نہ جانے یہاں کیا ہو رہا ہے؟" شہباز نے منہ بناتے ہوئے نور سے کہا۔ "چلو، اندر چلو، یہ سب پاگل ہیں۔" پھر وہ مجھ سے بولی۔ "چلتا کرو اس مخلوق کو، وہ نہ جانے کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ حویلی کے اندرونی حصے کی طرف روانہ ہو گئی۔

ہاتھ ہلاتے ہلاتے مجھے بھی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ میں بھی اندر کی طرف چلا آیا۔

وہ بگی مجھے برآمدے میں دکھائی دی۔ وہ اس وقت گانے اور اچھل کود کرنے کے بجائے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ ناصر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ "بس اب بتاؤ، تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں، ایسے تو حالات نہیں، ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں۔"

"دیکھو، اب یہ ڈراما بند کرو۔" ناصر نے کہا "ورنہ......"

"تم اسے جانتے ہو ناصر؟" میں نے پوچھا۔

ناصر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر اسے یہاں سے چلتا کرو۔" میں نے انگلش میں کہا۔ "یہ ابنارمل عورت ہے۔ ہمارے لیے بعد میں کوئی پریشانی بھی کھڑی ہو سکتی ہے۔ پولیس کا وہ اے ایس پی اسے اپنی آنکھوں سے یہاں دیکھ چکا ہے۔"

"لیکن یہ دراصل اندر کیسے آئی؟" راجہ نے کہا۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے غنی بھی تھا۔

"یہ کیا بتائے گی کہ یہاں کیسے آئی؟ اس کا جواب تو غنی دے گا۔" میں نے کہا پھر غنی سے مخاطب ہوا۔ "ہاں بھئی چیف سیکیورٹی آفیسر؟"

"سر!" غنی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "میں تو اس وقت ڈاکٹر حسن صاحب کا کچھ سامان لینے جہلم گیا ہوا تھا۔ میں......"

"تو کیا حویلی کی سیکیورٹی کے لیے تمہاری یہاں موجودگی ضروری ہے؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "یہ ہے تمہارا فول پروف حفاظتی انتظام؟"

"سر! آپ مجھے ایک گھنٹا دے دیں۔ میں ان گارڈز کی کھال اتروا دوں گا جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔"

"تم اسے جانتے ہو؟" میں نے غنی سے پوچھا۔

غنی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں سر! میں اسے نہیں جانتا۔"

"تم نہیں جانتے کہ یہ 'اللہ لوک' ہے؟" راجہ اور ناصر بھی حیرت سے بولے۔

"مجھے ڈیوٹی والے گارڈز نے بتایا تھا کہ یہ اللہ لوک ہے۔"

"اسے نکال یہاں سے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن اسے اپنی گاڑی میں رکھنا، اسے کچھ کھلا پلا دو اور ان گارڈز کو یہاں بھیج دو۔"

"اور سنو!" راجہ نے کہا۔ "اسے تہ خانے میں مت لے جانا۔"

غنی اس "اللہ لوک" کو لے کر چلا گیا۔ میں نے ایک ملازم سے کرسیاں منگوائیں اور برآمدے ہی میں بیٹھ گیا۔ دونوں گارڈز میرے سامنے مودبانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

"جب وہ عورت اندر آئی تو تم ڈیوٹی پر تھے؟" میں نے پوچھا۔

"یس سر!" ان دونوں نے کہا۔

"پھر وہ اندر کیسے آ گئی؟" راجہ نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"وہ جی...... وہ......"

"اللہ لوک ہے۔" راجہ نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

"جی سر...... وہ...... جی ہاں......" ایک گارڈ ہکلایا۔

"بکواس کرو گے تو کھال اتار لوں گا۔" راجہ بھڑک کر بولا۔ "حویلی میں کوئی بھی منہ اٹھا کر چلا آئے گا اور تم لوگ اس کی عقیدت میں جھومتے رہو گے۔"

"سر...... وہ باہر سے اندر آئی تو ہم سمجھے کہ اسے باہر سے بھیجا گیا ہے۔ باہر بھی تو گارڈ ہوتے ہیں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟" راجہ پھر گرجا۔

"میرا نام صابر علی ہے جی!" وہ گارڈ ہکلا کر بولا۔

"اب تم اپنی غلطی باہر والوں کے سر منڈھنے کی کوشش کر رہے ہو؟ باہر والوں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا، تمہاری کیا ڈیوٹی تھی؟"

"غلطی ہو گئی سر!" صابر علی گھگھیا کر بولا۔

غنی واپس آیا تو میں نے کہا۔ "غنی! ان دونوں کو فوری طور پر حویلی کی سیکیورٹی سے ہٹا کر کہیں اور لگا دو۔"

"ٹھیک ہے سر!" غنی نے کہا، پھر ان سے بولا۔ "تم دونوں اپنے ہتھیار اور سیل فون سرور کے حوالے کر دو۔"

صابر علی شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ "سرور سے کہنا کہ وہ باہر والے دونوں گارڈز کو بھی یہاں بھیج دے اور صوبیدار بشیر صاحب کو بھی۔"

"جی سر!" اس مرتبہ دوسرا گارڈ مری مری آواز میں بولا۔

ان کے جانے کے بعد راجہ نے مجھ سے کہا۔ "یار، اب تو بھی آرام کر لے۔ ابھی تجھے کمزوری ہے۔ تجھے کم سے کم دو ہفتے تک بیڈ ریسٹ کرنا ہو گا۔"

میں نے منہ بنا کر کہا۔ "یار تو مجھ سے اتنا ہی بیزار ہو گیا ہے تو مجھے مار دے۔ مجھے بستر پر قید مت کر۔"

"یار بہت اچھا خیال ہے، اسیر بستر۔"

"یار اب تو میرے اس عالی شان بیڈ کو بستر کہہ کر میرے ساتھ ساتھ اس نگوڑی بیڈ کی بھی توہین کر رہا ہے۔"

"چل اسیر چھپر کھٹ ہی سہی۔"

مجھے دور سے وہ دونوں گارڈز دکھائی دیے جن کی ڈیوٹی حویلی سے باہر تھی۔ ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شاید پہلے والے گارڈز نے انہیں سچویشن کے بارے میں بتا دیا تھا۔

وہ دونوں برآمدے میں آ کر رکے ان میں سینئر آدمی نے بلند آواز میں کہا۔ "سلام باش!" فوراً ہی ان دونوں کی ایڑیاں فرش سے ٹکرائیں اور ان دونوں نے بہت زوردار انداز میں مجھے سلیوٹ کیا۔

"حویلی کے گیٹ کے باہر تم لوگوں کی ڈیوٹی تھی؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"یس سر!" دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"وہ پاگل عورت اندر کیسے آ گئی؟" راجہ نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"سر...... وہ پاگل نہیں ہے وہ......"

"چلو پاگل نہ سہی، وہ اندر کیسے آ گئی؟"

"سر...... اس نے کہا تھا کہ...... مجھے ایک نظر نواب صاحب کو دیکھنا ہے۔ وہ زخمی ہو گئے ہیں نا؟ میں انہیں ٹھیک کر دوں گی۔" ایک گارڈ نے گھگھیائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"چاہے وہ مجھے یہاں آ کر گولی ہی مار دیتی؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں تم دونوں کو آج سے حویلی کی سیکیورٹی سے ہٹا رہا ہوں۔ اب تم چاہو تو حویلی میں دوسرے کام کر سکتے ہو۔"

"سر، ہم سے واقعی بہت غلطی ہوئی ہے۔ ہم......"

"تم لوگ ابھی اپنے ہتھیار اور سیل فون غنی کے حوالے کر دو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "غنی تمہیں بتائے گا کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے؟"

"سر! وہ......" سینئر گارڈ نے جھجکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"ہاں بولو!" میں نے کہا۔ "تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟"

"سر...... ہم ریٹائرڈ کمانڈوز ہیں، ہم اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"او کے!" میں نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔ "تم گارڈ روم میں ٹھہرو۔"

وہ دونوں سیلوٹ کر کے چلے گئے۔ صوبیدار میجر صاحب برآمدے میں داخل ہوئے تو ناصر نے ان کے لیے کرسی چھوڑ دی۔

"آپ بیٹھیے!" صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔

"آپ تشریف رکھیں سر!" ناصر نے کہا۔ "میں اپنے لیے کرسی منگوا لیتا ہوں۔" اس نے بلند آواز میں ملازم سے کرسی لانے کو کہا۔

"صوبیدار میجر صاحب!" میں نے کہا۔ "میں نے حویلی کے چار گارڈز کو معطل کر دیا ہے۔"

"ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔" انہوں نے کہا۔

"اکرم اور علی احمد ملازمت چھوڑنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

صوبیدار میجر صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "رفیق میاں! کیا آپ نے انہیں حویلی چھوڑنے کو کہا ہے؟"

"میں نے صرف انہیں سیکیورٹی کی ڈیوٹی سے ہٹایا ہے لیکن وہ دونوں کوئی اور کام کرنا نہیں چاہتے۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "لیکن صوبیدار میجر صاحب! وہ حویلی کے دفاعی انتظام کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تہ خانے کے بارے میں بھی ضرور جانتے ہوں گے۔ اب اگر وہ میرے کسی دشمن کے پاس چلے گئے تو......"

"آپ پریشان نہ ہوں رفیق میاں!" صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ "وہ کہیں نہیں جائیں گے۔ ان کی جگہ دوسرے گارڈز ہوتے تو مجھے واقعی فکر ہوتی لیکن وہ دونوں ہمارے بہترین گارڈز ہیں۔ آپ فکر مت کریں، میں انہیں جانے نہیں دوں گا۔"

"صوبیدار میجر صاحب! اس مسئلے سے آپ ہی نمٹیں۔" میں نے کہا۔

غنی واپس آیا تو کچھ فکر مند تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے غنی! تم پریشان کیوں ہو؟"

"سر، میں اس پاگل عورت ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" غنی نے کہا۔ "ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پاگل ہونے کا ڈراما کر رہی ہے۔ پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ اسے حویلی کی حدود سے باہر چھوڑ آؤں۔ پھر میں نے سوچا اسے پولیس کا ایک افسر حویلی میں دیکھ چکا ہے۔ اب اسے کوئی نقصان پہنچا تو شبہ ہم لوگوں پر جائے گا۔ یہ سوچ کر میں اسے تھانے لے گیا اور انچارج کو بتایا کہ یہ پاگل عورت زبردستی حویلی میں گھس آئی تھی۔ اس وقت تمہارے ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ اس عورت کو پولیس کے حوالے کر دو اور درخواست دے دو کہ یہ عورت زبردستی حویلی میں داخل ہوئی ہے اور پاگل پن کا ڈراما کر رہی ہے۔ انچارج صاحب مناسب سمجھیں گے تو اسے پاگل خانے بھجوا دیں گے۔"

"اور تم نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا؟" راجا نے کہا۔

"سر! تو اور میں کیا کرتا؟" غنی نے کہا۔ "ایس پی صاحب اسے یہاں دیکھ چکے تھے۔ اب اگر اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو......"

"وہ جوان عورت ہے، شکل کی بھی بری نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تھانے میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟" ناصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔"

ناصر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تھانے میں اس عورت کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ناصر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملا کر ٹہلتا ہوا برآمدے کے دوسرے سرے کی طرف چلا گیا۔

صوبیدار میجر صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے راجا سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ڈاکٹر حسن نے میرے زخم کی صفائی کی اور بینڈیج کرتے ہوئے بولے۔ "نواب صاحب! آپ کا زخم بہت تیزی سے بھر رہا ہے۔ اگر آپ نے بے احتیاطی سے کام نہ لیا تو زخم چار پانچ دن ہی میں بھر جائے گا۔"

بینڈیج کرنے کے بعد اس نے مجھے ایک کیپسول اور دو ٹیبلیٹ کھلائیں۔ پھر انجکشن تیار کرنے لگا۔

"یہ کیسا انجکشن ہے ڈاکٹر؟"

"پریشان مت ہوں، نیند کا نہیں ہے۔" ڈاکٹر حسن نے مسکرا کر کہا۔

وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ میں نے ملازم سے کہا کہ ناصر صاحب اور راجا صاحب کو یہیں بھیج دو۔ راجا اور ناصر میرے کمرے میں آ گئے۔ میں اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

راجا ہنس کر بولا۔ "اچھے بچے! تو تو اپنی اس تکلیف کو باقاعدہ سیلی بریٹ کر رہا ہے۔"

"یار! اس سیلی بریشن میں زیادہ ہاتھ ڈاکٹرز کا خصوصاً ڈاکٹر شہزاد کا ہے۔ وہ لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ میں بستر سے ہلوں بھی نہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے تو مجھے بھی آرام کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چل تو کہتا ہے تو بیڈ کو ...... جاتے۔" میں اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"او نواب کی دم! یہ کیا کر رہا ہے؟" راجا سنجیدگی سے بولا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تجھے واقعی ابھی آرام کی ضرورت ہے۔"

ناصر نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "مجھے اب اجازت دیں نواب صاحب! مجھے پنڈی میں ایک دو بہت ضروری کام ہیں۔"

"اگر کام ہیں تو میں روکوں گا نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم یہاں سے جاؤ گے کیسے؟"

"جیسے آیا تھا؟" ناصر نے مسکرا کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس ناقابل اعتبار گاڑی میں جاؤ گے؟"

"نہیں۔ اب تو میری گاڑی بالکل ٹھیک ہے۔" ناصر مسکرا کر بولا۔ "اس کی ظاہری شکل وصورت پر مت جائیں۔ وہ جب چلتی ہے تو اچھی اچھی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔"

"تمہیں ایک شرط پر اجازت ملے گی۔" میں نے کہا۔ "تم پنڈی کے کام نمٹا کر یہاں آ جاؤ گے۔"

"او کے نواب صاحب!" ناصر نے کہا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "یوں بھی اب آپ لوگوں کی ایسی عادت پڑ چکی ہے کہ پنڈی کے اپنے گھر میں مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔"

"تم بیٹھو، میں تمہاری گاڑی نکلواتا ہوں۔" میں نے غنی کو آواز دی اور کہا۔ "غنی! ناصر صاحب کی گاڑی نکلوا کر اس کا آئل، پانی وغیرہ چیک کر لو۔"

"یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں سر!" غنی نے کہا۔ "ناصر صاحب کی گاڑی کی سروس ہو چکی ہے۔" غنی چابی لے کر چلا گیا۔

"سوری نواب صاحب!" میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ کس کا فون آ گیا؟" اور سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو...... کیا؟...... کب؟...... اچھا...... یہ تو اچھی خبر نہیں ہے...... ہاں، میں پنڈی آ رہا تھا...... ابھی...... میں پنڈی سے زیادہ دور نہیں ہوں...... ہاں، میں پہنچ رہا ہوں...... آپ کہاں ہیں؟...... او کے۔ خدا حافظ!" اس کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے۔

"کیا ہوا؟" راجا نے پوچھا۔

"اچھی خبر نہیں ہے۔" ناصر نے کہا۔ "ہوم منسٹر کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے...... اور ان کی جگہ جو شخص ہوم منسٹر بنا ہے، اس کی پروٹیکشن ابھی نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ راؤ سمیع سے اس کے دیرینہ تعلقات ہیں۔"

"یار خبر تو واقعی اچھی نہیں ہے۔" راجا نے کہا۔ "نیا ہوم منسٹر کون ہے؟"

"اشفاق احمد گردیزی!" ناصر نے کہا۔ "سیاسی حلقوں میں اپنی رنگین مزاجی اور کرپشن کے باعث خاصا 'نیک' نام ہے۔ اے اے گردیزی کے نام سے مشہور ہے وہ۔"

"یار واقعی یہ آدمی تو اچھا نہیں ہے۔ نہ جانے اسے ہوم منسٹر بنایا کیوں گیا ہے؟"

"یہاں تو ہر آدمی ایسا ہی ہے۔ پورے نظام میں اکا دکا لوگ ہی ایسے ہوں گے جن کا دامن بے داغ ہو۔" میں نے کہا۔

"اچھے بچے! مسئلہ یہ نہیں ہے کہ گردیزی کرپٹ ہے، مسئلہ یہ ہے کہ راؤ سے اس کے گھریلو تعلقات ہیں۔" راجا نے کہا۔ "اب پولیس میں بھی کچھ اکھاڑ پچھاڑ ہوگی۔"

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے چلنا چاہیے۔" ناصر نے کہا۔

غنی نے آ کر بتایا کہ میں نے ناصر صاحب کی گاڑی نکال دی ہے۔

ناصر عجلت میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

"اچھے بچے!" راجا نے کہا۔ "لگتا ہے تیرا ستارہ بھی گردش میں آنے والا ہے۔"

"میرا ستارہ تو اسی دن سے گردش میں ہے جب میں پہلی دفعہ لندن سے پاکستان آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سکون کے لمحے تو مجھے بہت کم نصیب ہوئے ہیں۔"

"یار! میرا مشورہ ہے کہ تو کچھ دن کے لیے لندن چلا جا۔" راجا نے کہا۔

"ایسی کیا آفت آ گئی؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "کہ میں چوروں کی طرح یہاں سے فرار ہو جاؤں۔"

"تیرا واسطہ ابھی سیاست دانوں سے نہیں پڑا ہے۔" راجا نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ گردیزی اول درجے کا کرپٹ آدمی ہے۔ یہ تیرے لیے مشکلات کھڑی کرے گا۔ راؤ کی طاقت بھی اب کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ عجب خان کریلہ بھی اس کے دوستوں میں سے تھا لیکن اس گردیزی کی تو بات ہی اور ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یار، تو مجھے کیوں ڈرا رہا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں تجھے ڈرا نہیں رہا ہوں بلکہ اس نئی صورت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "زاہدہ کو بھی یہاں سے کہیں اور منتقل کر دے۔ دانا ہے، کچھ بعید نہیں کہ اس مرتبہ وہ پولیس کو تلاشی کے وارنٹ دے کر بھیج دے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اس زاہدہ کا پتا صاف ہی کر دے۔" راجا نے سفاکی سے کہا۔

میں نے چونک کر راجا کی طرف دیکھا۔ "تو چاہتا ہے کہ....."

"ہاں یار! میں یہی چاہتا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "اس کم بخت نے ہمارا سکون حرام کر رکھا ہے۔ یہ جب تک زندہ رہے گی تیرے لیے عذاب ہی بنی رہے گی۔ ست بدھائی کی جاگیر کے لالچ میں لوگ اسے آلۂ کار بناتے رہیں گے۔ وہ خود بھی تیرے خون کی پیاسی رہے گی۔ اس کا یہی علاج ہے کہ تو ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارا پا لے۔"

"لیکن یار! میں کیسے....."

"میں تیری تقریر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" راجا نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "اب خاندان، خون اور رشتے داری کی دہائی شروع مت کر دینا۔ تیری یہ عادت بھی تیری اسی چیچی کزن کی وجہ سے ہے۔"

"ابھی تو اس سے بہت کچھ معلوم کرنا ہے راجا!" میں نے کہا۔ "وہ لندن کیوں گئی تھی؟ دلاور سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس نے دھوکے سے مجھے لاہور کیوں بلایا؟"

"اور تیرا خیال ہے کہ وہ یہ باتیں تجھے بتا دے گی؟"

"اسے بتانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"کوشش کر کے دیکھ لے۔" راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔ "ابھی تو تو آرام کر۔ تو کافی دیر سے ان ہی جھمیلوں میں الجھا ہوا ہے۔"

اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ واقعی مجھے آرام کی ضرورت ہے۔

میں اس وقت راجا کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ سیل فون کی چھوٹی سی اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

"ہاں ناصر!"

"ست بدھائی سے نکلنے کے بعد میری گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا ہے نواب صاحب!" ناصر کی آواز آئی۔

"حادثہ پیش آ گیا ہے؟" میں عالم اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔ "کیسا حادثہ ناصر؟ تم ٹھیک تو ہو؟"

"مجھے معمولی چوٹیں آئی ہیں۔" ناصر نے کہا۔ "میں اس وقت پنڈی میں ہوں۔"

"حادثہ کہاں پیش آیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس وقت پنڈی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جب ایک گاڑی سے ٹکر ہو گئی۔ میں اس وقت پنڈی کے ایک اسپتال میں ہوں۔"

"اچھا پریشان مت ہو، میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

"کیا ہوا پیکے؟" راجا نے پوچھا۔ "ناصر خیریت سے تو ہے؟"

"یار، اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت پنڈی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور شہلا متوحش سی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر شہناز بھی تھی۔

اسے اس حال میں دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ "کیا ہوا شہلا؟"

"نواب صاحب! ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" شہلا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"حوصلہ رکھو شہلا! تمہارے ابو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ شہلا بری طرح رونے لگی۔

"ارے بھئی، تم کیسی ڈاکٹر ہو؟" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "ڈاکٹر تو بہت مضبوط ہوتے ہیں۔"

"میں ابھی لاہور جانا چاہتی ہوں۔" شہلا نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے جی ٹی روڈ تک ڈراپ کرا دیں۔ وہاں سے میں چلی جاؤں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" شہناز نے کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"راجا! تم ایسا کرو کہ شہلا اور شہناز کو لاہور لے جاؤ۔ میں پنڈی چلا جاتا ہوں۔"

"تم اس حالت میں کیسے جاؤ گے؟" شہناز نے کہا۔

"میری حالت کو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "اور میں وہاں ہاتھوں کے بل نہیں جاؤں گا، گاڑی میں جاؤں گا۔ ناصر کو اس وقت میری ضرورت ہے۔"

میں نے تنی کو آواز دی۔ وہ میرے کمرے کے آس پاس ہی رہتا تھا فوراً ہی چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

"تنی! سرور سے کہو کہ لینڈ کروزر نکال لے۔ ڈاکٹر صاحبہ اور راجا صاحب لاہور جا رہے ہیں اور تم بھی میری گاڑی نکال لو۔"

تنی نے چونک کر پہلے مجھے پھر شہناز کو دیکھا۔ "آپ

بھی لاہور جا رہے ہیں؟"

"نہیں، ہم پنڈی جائیں گے۔" میں نے کہا۔

تنی کے جانے کے بعد راجا نے شہلا سے کہا۔ "تم بھی جلدی چلنے کی تیاری کرو۔"

"مجھے کیا تیاری کرنا ہے؟" شہلا نے کہا۔ "میں بالکل تیار ہوں۔"

راجا نے بغلی ہولسٹر لگایا اور کوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔

"زیادہ بھاگ دوڑ مت کرنا پیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "ان لوگوں کو لاہور چھوڑ کر میں بھی پنڈی آ جاؤں گا۔"

"مجھے کون سے ہل چلانا ہیں۔" میں نے کہا۔ "گاڑی تنی ڈرائیو کرے گا۔ میں تو بس پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اونگھوں گا۔"

سرور نے آ کر بتایا کہ گاڑی تیار ہے۔ راجا اور شہناز نے پھر مجھے ہدایات دیں اور روانہ ہو گئے۔

میں نے بھی اٹھ کر جوتے پہنے۔ جب بغلی ہولسٹر لگانے لگا تو مجھے شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ نور بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "زخمی شانے پر اتنا وزن اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اتار دو اور مجھے دے دو میں رکھ لیتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "میں کیا خالی ہاتھ جاؤں؟"

"تمہیں ضرورت پڑے تو کسی بھی وقت مجھ سے لے لینا۔"

"کیا؟... کیا تم بھی میرے ساتھ جا رہی ہو؟"

"آف کورس!" نور نے سر جھٹک کر اور شانے اچکا کر کہا۔

"یہ مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں بس ناصر کی مزاج پرسی کر کے لوٹ آؤں گا۔ ممکن ہے میں اسے بھی اپنے ساتھ ہی لے آؤں۔"

"لیکن رفیق....."

"نور پلیز!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں وہاں تفریح کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ حالات پہلے ہی مخدوش ہیں۔"

"آخر یہ سب کچھ کب تک چلے گا رفیق؟" نور نے کہا۔

"جب تک حالات میرے قابو میں نہیں آ جاتے۔" میں نے کہا۔

"اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم یہ ریاست یہاں کسی کے حوالے کر دو اور لندن چلو۔ ایسی جاگیر کا ہمیں کرنا بھی کیا ہے؟"

دستک کی آواز سن کر نور کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے کہا۔ "آ جائیں، دروازہ کھلا ہے۔"

دوسرے ہی لمحے نیلم کمرے میں داخل ہوئی۔

"جی، فرمایئے، آپ کو کیا پریشانی ہے؟" نور کا لہجہ طنزیہ تھا۔

نیلم نے اس کے لہجے کا بالکل برا نہیں مانا اور مجھ سے بولی۔ "نواب صاحب! آپ پنڈی جا رہے ہیں؟"

"ہاں، لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میرا بابا اڈیالہ جیل میں ہے۔" نیلم نے کہا۔ "اس کی حالت بہت خراب ہے۔ میرے ایک ملنے والے نے بھی فون کیا تھا جی کہ اس کا بچنا مشکل ہے۔" نیلم کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

باپ کیسا بھی ہو لیکن اولاد خصوصاً بیٹیوں کے لیے وہ بہت اہم ہوتا ہے۔ اس کے باپ نے پوری زندگی مجرمانہ سرگرمیوں میں گزاری تھی۔ دنیا کے لیے وہ ایک ڈاکو اور بردہ فروش تھا لیکن بہرحال وہ نیلم کا باپ تھا۔

"نواب صاحب! اگر آپ پنڈی تک چھوڑ دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جی۔ میں وہاں سے خود ہی واپس آ جاؤں گی۔"

"خود ہی کیوں نیلم؟" نور نے کہا۔ "نواب صاحب پنڈی سے واپسی پر تمہیں بھی لیتے آئیں گے۔ جاؤ، تم تیاری کرو۔"

"نور جی، مجھے کیا تیاری کرنی ہے، میں تو بالکل تیار ہوں۔ میں نے بابا کے لیے کریلا بھی بنایا ہے۔"

"تو کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں پنڈی جاؤں گا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں، مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا۔" نیلم نے کہا۔ "میں نے تو سوچا تھا کہ آپ سے کہوں گی کہ مجھے لاری اڈے تک چھڑوا دیں۔"

"چلو، پھر جلدی کرو۔" میں نے کوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

نور نے کوٹ مجھ سے لے لیا اور گھریلو بیویوں کی طرح مجھے کوٹ پہنانے لگی۔ کوٹ پہنتے ہوئے بھی مجھے شدید تکلیف محسوس ہوئی لیکن میں نے نور پر ظاہر نہیں ہونے دی۔

پھر میں نے نور کے ماتھے پر بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل کر پورچ میں آ گیا۔ تنی میری گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم مستعد ہو گیا۔ پورچ میں وہ چاروں گارڈز بھی موجود تھے جنہیں میں نے آج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معطل کر رہا تھا۔ وہ بھی ایک دم مستعد ہو گئے اور مجھے زوردار سلیوٹ کیا۔

صوبیدار میجر صاحب بھی پورچ میں نکل آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”رفیق میاں! سنا ہے آپ پنڈی جا رہے ہیں؟“

”جی ہاں، ناصر ایک حادثے میں زخمی ہو گیا ہے اور اسپتال میں پڑا ہے۔ راجا، شہناز اور شہلا کے ساتھ وہ گیا ہے ورنہ میری جگہ راجا پنڈی جاتا۔“ پھر میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”صوبیدار میجر صاحب ان گارڈز کا کیا کرنا ہے؟“

”انہیں ابھی چھوڑیں۔“ صوبیدار میجر صاحب نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔ ”میں نے ان سے کہا ہے، میں کوشش کروں گا کہ نواب صاحب تم لوگوں کو معاف کر دیں، اس لیے میں نے اب تک انہیں کوئی دوسری ذمے داری نہیں سونپی ہے۔“

”اوکے سر!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”حویلی کا دھیان رکھیے گا۔ آج قمی بھی نہیں ہوگا اور سرور بھی راجا کے ساتھ جا چکا ہے۔“

”آپ اس طرف سے بے فکر رہیں۔“ صوبیدار میجر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

قمی گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

میں گاڑی کی طرف بڑھا تو ریشم بھاگی بھاگی آئی۔ اس کے ہاتھوں میں کافی کا فلاسک تھا۔ ”نواب صاحب! میں نے اس تھرماس میں کافی بھر دی ہے، بی بی انیلا کہہ رہی ہیں کہ ابھی کچھ دیر بعد آپ کو کافی کی ضرورت پڑے گی۔“ اس نے کافی کا تھرماس قمی کے حوالے کر دیا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا تو قمی نے دروازہ بند کر دیا۔ میرے آرام کے خیال سے شاید وہ نیلم کو پسنجر سیٹ پر بٹھانا چاہتا تھا لیکن ریشم کو دیکھ کر اس نے نیلم کو بھی پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔

گاڑی حویلی سے باہر نکلی تو فلیش لائٹ کی روشنی باہر بھی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سٹ بھائی سے جی ٹی روڈ تک سڑک زیر تعمیر تھی لیکن سڑک اس حالت میں بھی قابل استعمال تھی۔

جی ٹی روڈ پر آنے کے بعد قمی نے حسب عادت گاڑی طوفانی انداز میں بھگانا شروع کر دی۔

”قمی بھائی!“ نیلم نے کہا۔ ”گاڑی ذرا آہستہ چلاؤ۔ نواب صاحب کو جھٹکے نہیں لگنا چاہیے۔“

قمی نے فوراً گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ اتنی تیز رفتاری میرے لیے مناسب نہیں ہے۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں نے نیلم سے کہا۔ ”قمی سے کافی کا تھرماس لے کر ذرا مجھے کافی نکال دو۔“

”سر! میں گاڑی کہیں روک دوں؟“ قمی نے پوچھا۔

”نہیں چلتے رہو۔“ میں نے کہا۔ ”بس گاڑی کی رفتار ذرا آہستہ کر دو تاکہ کافی پر نہ چھلکے۔“

نیلم نے قمی سے تھرماس لے کر میرے لیے کافی نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ کافی کا مگ پکڑتے ہوئے مجھے ریشم کے کھردرے پن کا احساس ہوا۔ اس نے تھرماس کے ساتھ ایک مگ بھی اس شاپر میں ڈال دیا تھا۔

نیلم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے میرا زخمی ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیا تھا۔ اس کا نرم گداز لمس مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

اچانک میں بری طرح سامنے والی سیٹ سے ٹکرا گیا۔ کافی کا مگ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور پسنجر سیٹ پر مگ کے ٹکڑے اور کافی بکھر گئی۔ میرا زخمی بازو بھی نیلم کی پشت سے ٹکرایا۔ تکلیف کی شدت سے میری حالت غیر ہو گئی۔ اگر نیلم درمیان میں نہ ہوتی تو وہ بازو بہت زوردار انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹکراتا۔ نیلم بھی بہت بری طرح سیٹ سے ٹکرائی تھی لیکن وہ چوٹ برداشت کر گئی۔

چند لمحوں تک تو کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک دیوہیکل ٹرک کھڑا تھا۔ قمی نے اس کو دیکھ کر ہنگامی طور پر بریک لگائے تھے۔ گاڑی رکتے ہی عقب سے بھی ایک ڈبل کیبن پک اپ نمودار ہوئی اور اس نے راستہ مسدود کر دیا۔ مجھے اچانک خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے بے اختیار ریوالور کے لیے ہولسٹر پر ہاتھ مارا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ اس وقت ریوالور تو دور کی بات، میرے پاس تو سرے سے ہولسٹر بھی نہیں تھا۔

گاڑی کی دونوں اطراف میں خودرو گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں میں انسان تو کیا، گاڑی بھی چھپ سکتی تھی۔ میں نے پلک جھپکتے ہی دروازہ کھولا اور بائیں طرف کی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔

زمین پر گرنے سے مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میرا ہاتھ جھٹکے سے زمین سے ٹکرایا تھا۔ اس کے علاوہ کانٹے دار جھاڑیوں نے زخمی ہاتھ سمیت میرے پورے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میں ایک پہلو پر گرا تھا۔ زمین پر شاید کوئی ابھرا ہوا پتھر تھا جو مسلسل میرے پہلو میں چبھ رہا تھا۔ میں نے ٹٹول کر وہ پتھر ہٹانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ پتھر نہیں

بلکہ میرے کوٹ کی جیب میں پڑا ہوا ریوالور ہے۔ وہ ریوالور جب میں ہولسٹر میں نہیں رکھ سکا تھا تو اسے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا اور بھول گیا تھا۔

میں نے جلدی سے وہ ریوالور نکال لیا۔ اچانک مجھے جھٹکا لگا اور کوئی مجھ پر آ گرا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ اب مجھے ایک ہاتھ سے اس حملہ آور کا مقابلہ کرنا تھا۔

میں نے بائیں ہاتھ کا پورا زور لگا کر اسے پیچھے دھکیلا اور اس کے چہرے پر گھونسا مارنے ہی والا تھا کہ مجھے آواز آئی۔ ”ارے گاڈ! نواب صاحب! میں نیلم ہوں۔“

میرے کشیدہ اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”استراحت فرمانے کی اچھی جگہ ڈھونڈی ہے آپ نے؟“

وہ بہت احتیاط سے الگ ہٹ گئی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے ہٹنے سے جھاڑیاں ہلنے نہ پائیں۔

میں نے کروٹ لے کر ریوالور کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ بالآخر مجھے ریوالور مل گیا۔ ریوالور اٹھا کر میں جھاڑیوں میں مزید اندر کی طرف رینگ گیا۔

سڑک کی طرف سے اچانک فائر ہوا۔ نہ جانے کس نے کس پر فائر کیا تھا۔ اس فائر کا جواب دیا گیا تو مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ فائر قمی نے کیا ہے۔ یہ پوائنٹ تھری ایٹ کے کولٹ ریوالور کا فائر تھا۔ اتنے مہنگے ریوالور جرائم پیشہ اور بدمعاش کم ہی رکھتے ہیں۔ کوئی اگر اچھے ہتھیاروں کا شوقین ہو تو بات الگ ہے۔

اچانک مجھے سڑک کی طرف سے روشنی نظر آئی۔ سڑک کے درمیان میں کھڑے ہوئے ٹرک پر شاید فلیش لائٹ نصب تھی۔ لائٹ کی روشنی سے وہ ویرانہ دن کی طرح روشن ہو گیا تھا لیکن حملہ آوروں میں سے کوئی بھی مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ لوگ اتنے احمق تو ہوں گے نہیں کہ اس تیز روشنی میں سامنے آ جاتے کہ لو اب ہمیں آسانی سے گولی مار دو۔

سڑک کی طرف اکا دکا گولیاں چل رہی تھیں۔ اچانک میں نے فلیش لائٹ کو ایک فائر سے تباہ ہوتے دیکھا۔ دھماکے کی آواز سے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ فائر قمی نے کیا ہے۔ قمی کا نشانہ بے خطا تھا۔ فلیش لائٹ تو خیر بہت بڑا ہدف تھا، وہ تو اس سے کہیں چھوٹی چیزوں کو بھی نشانہ بنا سکتا تھا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی جھاڑیوں میں راستہ بناتا میری طرف بڑھ رہا ہو۔ میں نے بائیں ہاتھ میں ریوالور پکڑ

سنہری باتیں

☆ کسی کا ظرف آزمانا ہو تو اسے زیادہ عزت دے کر دیکھو۔ اگر اعلیٰ ظرف ہوا تو آپ کو اور زیادہ عزت دے گا اور اگر کم ظرف ہوا تو خود کو اعلیٰ سمجھے گا۔

☆ تم اپنا مستقبل تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن تم اپنی عادت تبدیل کر سکتے ہو اور یہ یقینی بات ہے کہ آپ کی عادت آپ کا مستقبل تبدیل کر دے گی۔

☆ آپ کی خوشیوں کا انحصار آپ کی سوچوں، آپ کے خیالات کی خوبیوں پر ہے۔ مگر آپ کی سوچوں، آپ کے خیالات کی خوبیوں کا انحصار ان لوگوں پر ہے جن سے آپ اپنی زندگی میں ملتے ہیں۔

☆ ہم لوگ کتنے پاگل ہیں کہ ہر کسی کو کہتے رہتے ہیں کہ "I MISS YOU" لیکن کبھی ہم نے یہ سوچا ہے کہ آج ہم نے کتنی نمازیں MISS کر دیں؟ اس سال کتنے روزے MISS کر دیے؟ کیا کبھی ہم نے قرآن کو MISS کیا؟ یہ ہم کبھی نہیں کہتے۔ ”اے اللہ، آئی MISS یو۔“ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کیونکہ ہم لوگ یہ نہیں جانتے یا پھر جان بوجھ کر بھول جاتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو روز ستر بار کہتا ہے کہ "I MISS YOU"

☆ چہرے کے تاثرات ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن دل کی مایوسیاں صرف اور صرف بہترین دوست ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے اپنے بہترین دوست کو زندگی بھر نہ کھونا۔

☆ کچھ رشتے کبھی بھی موجودگی نہیں چاہتے۔ یہ رشتوں میں ایسا اعتماد ہوتا ہے جو آپ کے اس یقین کو قائم رکھتا ہے کہ جب بھی آپ کو ضرورت پڑی۔ وہ شخص آپ کے ساتھ ہوگا۔

اختر شاہ عارف ..... جہلم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا۔ میں فائر تو کر دیتا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ میری گولی کس طرف جائے گی۔ میں بائیں ہاتھ سے تو نشانہ لے ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے ریوالور دائیں ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن مجھ سے ریوالور اٹھایا نہ جا سکا۔ اتنی دیر تک اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئی تھیں۔

نیلم نے جلدی سے میرے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔

"یہ کیا ہو رہی ہے؟" میں سرگوشی میں غرایا۔

"نواب صاحب! آپ اس ہاتھ سے فائر نہیں کر سکتے لیکن میں کر سکتی ہوں۔ بھروسا رکھیں، میں اپنے جیتے جی آپ پر آنچ نہ آنے دوں گی۔" اس نے اندھیرے میں آہٹوں کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ شخص ہم سے کچھ فاصلے پر رک گیا، پھر وہ آہستہ آہستہ بائیں جانب چلا گیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ ابھی تک سڑک پر کوئی دوسری گاڑی کیوں نہیں آئی؟ آئی بھی تو وہ گزر رہی کیسے؟ سڑک کے بیچ تو وہ ویگن رک کھڑا تھا؟

پھر مجھے سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت محسوس ہوئی۔ جی ٹی روڈ پر رات بھر گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ میں نے سوچا چیخ کر کسی گاڑی والے کو روک لوں لیکن اس سے پہلے میرے "دوست" وہاں پہنچ جاتے، پھر وہ مجھے کسی کی مدد سے آزاد کر دیتے اور میں یوں چوہے کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔

نیلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک کے متوازی اس خاردار جنگل میں چلنے لگی۔ میرے بازو کا درد شدید ہوتا جا رہا تھا۔ اس جگہ سے کافی دور آنے کے بعد میں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میری ہتھیلی کی پشت پر کوئی چیز رینگ رہی ہو۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا تو مجھے ایک دم خیال آیا کہ اسے سائلنٹ پر لگا دوں۔ مجھے یہ خیال بروقت آیا تھا۔ میں نے سیل فون سائلنٹ پر لگایا ہی تھا کہ کسی کی کال آ گئی۔ میں نے سیل فون کان سے لگایا اور سرگوشی میں بولا۔ "ہیلو!"

"کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف سے نسوانی آواز سنائی دی لیکن وہ آواز میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔

"آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" میں نے جھنجلا کر سرگوشی کی۔

"آپ کے گلے میں کچھ خرابی ہے؟" بولنے والی نے پوچھا۔

"آپ کو بات کس سے کرنی ہے؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"مجھے نثار صاحب سے بات کرنی ہے۔" اس نے کہا۔

"رانگ نمبر۔" میں نے درشت انداز میں کہا اور سیل فون آف کر دیا۔

سیل فون میں لگی ہوئی چھوٹی سی ٹارچ کے ذریعے میں نے اپنے زخمی ہاتھ کا جائزہ لیا۔ میرے بازو سے خون بہہ رہا تھا جو میری کلائی پر رینگتا ہوا میری ہتھیلی تک آ کر قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

نیلم نے بھی میرا خون دیکھ لیا۔ اس بھاگ دوڑ میں میرا زخم کھل گیا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹا پھاڑا، پٹی کی شکل دے کر میرے گلے میں ڈالا اور میرا بازو اچھی طرح اس میں ڈال دیا۔ اس سے میری تکلیف خاصی کم ہوئی۔ میرے جسم پر شرٹ تھی، کوٹ تھا۔ ان چیزوں کی موجودگی میں وہ میرے زخم پر پٹی نہیں باندھ سکتی تھی۔ پھر وہ مجھے لے کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

تھکن اور نقاہت سے میری حالت غیر ہو رہی تھی لیکن نیلم مجھے گویا گھسیٹ رہی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ ہم نے کم سے کم تین میل کا فاصلہ طے کر لیا ہو گا۔ مجھ سے اب مزید نہیں چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ اچانک مجھے روشنی نظر آئی۔ نیلم بھی وہ روشنی دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ہم لوگ بہت محتاط انداز میں کچھ مزید آگے بڑھے تو مجھے وہاں کچھ ٹرک نظر آئے۔

"یہ کوئی جھونپڑی ہوٹل ہے۔" نیلم نے کہا۔ ٹرک ڈرائیوروں کے لیے سڑک کے کنارے بنے ہوئے یہ ہوٹل ساری رات کھلے رہتے تھے۔

ہم مزید آگے بڑھے تو مجھے وہاں موجود ڈرائیوروں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔

ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "یار پتا نہیں اس حرام زادے کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ہماری ساری محنت پر پانی پھر گیا۔ باس تو ہماری کھال اتروا دے گا۔ کچھ پتا نہیں کہ وہ ہمیں گولی ہی مار دے۔"

"یار پہلے کھانا تو کھا لے۔" دوسرے آدمی نے کہا۔ "باس تو جو کچھ کرے گا بعد میں کرے گا۔ بھوک سے تو میں فوری طور پر مر جاؤں گا۔ میں نے دوپہر کو بھی برائے نام کھایا تھا۔"

"یار، کھانا آنے تو دے۔" پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "ہم نے جھاڑیوں کو اچھی طرح دیکھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں گاڑی میں موجود ہی نہیں تھے۔"

اسی وقت ہوٹل کا بیرا کھانا لے آیا۔ روٹیوں کی اشتہا انگیز مہک سے مجھے بھی بھوک کا احساس ہوا۔ یوں بھی میرا

تجربہ تھا کہ سڑک کنارے واقع ان چھپر ہوٹلوں کا کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔

"یار ویسے ایک بات ہے۔" پہلے آدمی نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ "اس حرام زادے نواب کا نشانہ بہت بہترین ہے۔ اس نے کس خوبی سے مرزا کے کولہے کا نشانہ بنایا تھا۔"

"یار، ہم ناکام ہوتے تو وہ ہمیں واقعی گولی مار دے گا۔"

"یار تو کھانا کھا۔ ریاض انہیں چھوڑے گا نہیں۔ وہ کہاں بچ کر جا سکتے ہیں۔ وہ ہم سے تو بچ سکتے ہیں لیکن کتے انہیں نہیں چھوڑیں گے۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "ریاض اندھیرے میں دیکھنے والے چشمے بھی لے کر آئے گا۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ پہلے کتے، اب انفراریڈ کا مرا یہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟ عام چور، اچکے یا ڈاکو اس انداز میں کام نہیں کرتے کہ کتوں کا اہتمام بھی کریں اور ان کے پاس جدید قسم کے انفراریڈ گلاسز بھی ہوں۔

مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر شدید چبھن کا احساس ہوا۔ میرا وہ ہاتھ نیلم نے پوری قوت سے دبا رکھا تھا۔ پھر وہ دبی دبی آواز میں بولی۔ "نواب صاحب! کتے آ گئے تو وہ ہم تک پہنچ جائیں گے۔ پھر وہ آدمی اندھیرے میں دیکھنے والے چشمے کی بات بھی کر رہا ہے۔ یہاں سے جلدی نکلیں۔"

"مجھے کچھ سوچنے دو نیلم۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ کتے لے آئے تو ہم یہاں سے بھاگ کر بھی نہ بچ سکیں گے۔ کتے تو چشم زدن میں ہم تک آ پہنچیں گے۔ یہاں سے فرار ہونے کے لیے ہمیں گاڑی چاہیے۔ ہم پیدل فرار نہیں ہو سکتے۔"

"پھر... کیا یہاں بیٹھ کر ہم ان کا انتظار کریں؟"

میں نے گھور کے اسے دیکھا۔ "تم کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتیں؟" میں بھنا کر بولا۔

وقت اور حالات انسان پر کس تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہی نیلم جو بات کرتے ہوئے میرے سامنے نگاہ بھی نہیں اٹھا سکتی تھی، اس وقت کیسے مجھ سے بحث کر رہی تھی۔ اپنی تجاویز دے رہی تھی لیکن میرے درشت لہجے نے اسے خاموش کر دیا تھا۔

"میں دیکھتا ہوں، ممکن ہے کوئی ٹرک ڈرائیور اگنیشن میں چابی لگی چھوڑ گیا ہو۔"

"یہ تو بہت خطرناک ہے نواب صاحب!" نیلم نے کہا۔ "پھر آپ کو چابی مل بھی گئی تو آپ ڈرائیونگ کیسے کریں گے؟"

"ڈرائیونگ بھی کر لوں گا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بہتر ہے کہ میں آخری کوشش کرتے ہوئے مارا جاؤں۔"

اچانک مجھے چکر سا آ گیا۔ میں نے نیلم کا سہارا لے لیا۔ اس نے مجھے آہستگی سے زمین پر بٹھا دیا اور بولی۔ "آپ بیٹھیں، میں سر دبا دیتی ہوں۔"

"تم کیا کر سکتی ہو؟" میں نے کہا تو مجھے اپنی ہی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔

میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ پانی اور کافی کے تھرماس سب کچھ گاڑی میں رہ گیا تھا۔ نیلم کو بھی کچھ پتا نہیں تھا۔

میں نے سوچا کہ سیل فون پر رابطہ کرنا چاہیے۔ میں نے سیل فون نکالا اور کئی نمبر ملایا لیکن کسی سے میرا رابطہ نہیں ہو سکا۔ معلوم ہوا کہ میرے سیل فون کی بیٹری جواب دے گئی ہے۔ میرے سر میں اب بھی دھماکے سے ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔

"میں آپ کے لیے پانی لے کر آتی ہوں۔" نیلم نے کہا۔ "وہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ گاڑی میں صرف آپ اور ڈرائیور تھے۔ میرے بارے میں تو وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔"

"نہیں نیلم!" میں نے انکار کر دیا۔ "تمہارا حلیہ اس قابل نہیں ہے۔" میں نے اس کے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا جو کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس کی سفید و شفاف جلد نظر آ رہی تھی۔

"لیکن نواب صاحب! ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتے۔" نیلم نے کہا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں لیٹ کر سو جاؤں۔ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا دایاں ہاتھ موجود ہی نہ ہو۔ پھر میں نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ میری شرٹ اور جیکٹ کا اگلا حصہ خون میں تر تھا۔ زخم سے بہنے والا خون میرے لباس کو تر کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر خون اسی طرح بہتا رہا تو کچھ دیر میں میری سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے گی۔ کفن باندھے ہوئے سر سے یہاں سب بیٹھے ہیں، بہت آگے کے پیچھے ہیں جو تیار بیٹھے ہیں۔

اچانک نیلم نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ "نواب صاحب! وہ دیکھیے، سامنے والا ٹرک روانہ ہونے والا ہے۔ آپ بس تھوڑی سی ہمت کر لیں۔ کسی طرح اس ٹرک میں سوار ہو جائیں۔ پھر ہم یہاں سے بہت دور نکل جائیں گے۔"

میں نے دیکھا، وہاں سامنے کھڑے ہوئے ٹرک کا ڈرائیور اور کلینر اس میں سوار ہو چکے تھے۔ بس چند قدم کی بات تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آیئے نواب صاحب!'' نیلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک اسٹارٹ ہوا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں ٹرک سے اڑنے والی گرد کو تکتا رہ گیا۔

''میں کیا کروں؟'' نیلم عالم اضطراب میں بڑبڑائی اور وحشت زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

میں اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر ابھی تک ہوش و حواس میں تھا۔ اگر میرا خون اسی طرح بہتا رہا تو میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میں نے ہولے سے سوچا۔

اسی وقت وہاں ایک گاڑی آ کر رکی۔ گاڑی میں کوئی فیملی تھی۔ مجھے کھڑکی میں سے چھوٹا سا ایک بچہ اور ایک خاتون کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے صاحب نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اس سے گاڑی کا اندرونی بلب روشن ہو گیا تھا۔ پھر بہت دور سے کسی کی آواز سنائی دی۔

''میں گاڑی میں ڈالنے کے لیے پانی لے کر آتا ہوں۔''

اس کے بعد میرا ذہن آہستہ آہستہ ماؤف ہونے لگا۔

پھر میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں کسی کمرے میں تھا۔ کمرے کی دیواریں صاف ستھری تھیں اور کھڑکیوں پر سفید پردے لہرا رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کون سی جگہ تھی؟ میری پلکیں بہت بھاری ہو رہی تھیں۔ انہیں اوپر اٹھانے میں دقت ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ غنودگی میں چلا گیا۔ پھر میری آنکھ کھلی تو وہی کمرا تھا لیکن اب کھڑکیاں بند تھیں۔ میری حالت بھی اب پہلے سے بہتر تھی۔

میں نے نظریں گھما کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ میری بائیں جانب اسٹینڈ پر خون کا بیگ لٹک رہا تھا جس میں سے قطرہ قطرہ میری رگوں میں اتر رہا تھا۔ سفید یونیفارم میں ملبوس ایک نرس اسٹینڈ پر ایک دوسرا بیگ لٹکا رہی تھی۔ وہ ڈرپ تھی۔ نرس نے اس ڈرپ میں سرنج کے ذریعے کوئی اور دوا ملائی، پھر وہ ڈرپ بھی مجھے لگا دی۔

اس کا مطلب ہے کہ میں کسی اسپتال میں ہوں لیکن کیوں؟ میں اسپتال میں کیوں ہوں؟ نور کہاں ہے؟ راجا کہاں ہے؟ اور یہ کیا میرے ست بدھائی کے اسپتال کا تو نہیں ہے۔ دن ہی وہاں کوئی نرس ہے پھر...... میں کہاں ہوں؟

میں نے دوسری جانب نظر ڈالی تو مجھے نیلم دکھائی دی۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔

میرے حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔ میں نے پانی، پانی پکارنا چاہا لیکن میرے حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت مجتمع کر کے نیلم کو آواز دی۔ ''پا...نی...نیلم...''

نیلم نے چونک کر میری طرف دیکھا اور جھپٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پا...نی...'' میں نے بمشکل تمام کہا۔

''سسٹر!'' نیلم کی آواز مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''نواب صاحب کو ہوش آ گیا سسٹر!'' پھر اس نے جلدی سے پانی کا گلاس پکڑا اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے پانی کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگایا تو کچھ پانی میرے حلق میں گیا اور کچھ میرے کپڑوں پر گر گیا۔

''آرام سے نواب صاحب...... آرام سے!'' نیلم نے کہا۔

اسی وقت نرس ایک ڈاکٹر سمیت واپس آئی۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا، میری نبض دیکھی، بلڈ پریشر چیک کیا، آنکھیں دیکھیں، پھر بولا۔ ''میڈم اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' نیلم نے بے اختیار کہا۔

''مجھے کیا ہوا ہے ڈاکٹر صاحب؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''آپ زخمی ہو گئے تھے سر!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''لیکن پریشان مت ہوں۔ اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس زیادہ سوچیں مت، آرام کریں۔''

ڈاکٹر نے ڈرپ اور خون کے بیگ کا جائزہ لیا اور چلا گیا۔

مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے نیلم سے کہا۔ ''مجھے بھوک لگ رہی ہے نیلم! ریشم کو بلاؤ، میں کچھ کھانا چاہتا ہوں۔''

''سسٹر!'' نیلم نے نرس سے کہا۔ ''نواب صاحب کو سینڈوچ دے دوں؟''

''نہیں میڈم!'' نرس نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب نے ابھی صرف جوس دینے کو کہا ہے۔''

نیلم نے بٹن کے ذریعے میرے بیڈ کا سرہانہ اونچا کیا اور جوس کا گلاس لے کر میری طرف بڑھی۔

''میں نے کہا ہے کہ ریشم کو بلاؤ۔'' میں نے نیلم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''نور کہاں ہے، راجا کہاں ہے اور داؤد شہباز...''

''نواب صاحب...... آپ ست بدھائی میں نہیں ہیں۔'' نیلم نے آہستہ سے کہا۔

''ہم ست بدھائی میں نہیں ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''تو پھر......؟''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ میں ست بدھائی سے راولپنڈی جا رہا تھا، پھر میری گاڑی کے سامنے ایک ٹرک آ گیا اور پیچھے سے ایک ڈبل کیبن پک اپ نے راستہ مسدود کر دیا تھا۔ میرے ساتھ نیلم بھی تھی۔ ہم نے گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ پھر...... پھر ہم لوگ بھاگتے رہے تھے۔ مجھے وہ ہوٹل یاد آ گیا جہاں بہت سے ٹرک کھڑے تھے۔ نیلم نے مجھے ایک ٹرک میں چڑھنے کو کہا تھا لیکن میں نہیں چڑھ سکا تھا...... پھر...... ہاں، پھر ایک گاڑی ہمارے عین سامنے آ کر رکی تھی اور...... اور...... پھر کیا ہوا تھا؟ نیلم کہاں ہے اور...... میں اس وقت کہاں ہوں؟

نیلم نے جوس کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں ایک ایک گھونٹ کر کے آہستہ آہستہ جوس پینے لگا لیکن میرے ذہن میں سوالات کی ایک یلغار تھی۔ میں یہاں تک کیسے پہنچا تھا؟

''نیلم!'' میں نے کہا۔ ''ہم یہاں کیسے پہنچے؟''

''جہاں ہم چھپے ہوئے تھے، وہاں ایک گاڑی آ کر رکی تھی۔ جو صاحب گاڑی چلا رہے تھے، وہ پانی لینے چلے گئے تھے۔'' نیلم نے کہنا شروع کیا۔ ''میں اس وقت بہت پریشان تھی۔ میں سوچے سمجھے بغیر اس گاڑی کے نزدیک پہنچ گئی۔ گاڑی میں ایک بیگم صاحبہ اپنے بچے کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ڈر گئیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ 'ڈریں مت میڈم! ہم بہت مصیبت میں ہیں۔ ہماری گاڑی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔'

اسی وقت صاحب بھی واپس آ گئے۔ بیگم صاحبہ نے ان سے کہا۔ 'دیکھیے، یہ بیچاری کیا کہہ رہی ہے؟ ان کی گاڑی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔'

صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولے۔ 'ہاں، یہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاڑی کھڑی تو ہے۔'

'جی ہاں سر! وہ ہماری ہی گاڑی ہے۔ ہم لوگ گاڑی سے کود کر جھاڑیوں میں چھپتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔'

'ہم لوگ؟' صاحب نے پوچھا۔ 'کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'

'جی ہاں سر! میرے صاحب بھی ہیں۔ وہ بہت زخمی ہیں۔ ہمارے ساتھ ڈرائیور بھی تھا وہ بے چارہ تو جانے کہاں ہے۔ میرے صاحب بہت زخمی ہیں سر!' میں اتنا کہہ کر رونے لگی۔

بیگم صاحبہ نے ہمدردی سے کہا۔ 'آپ پریشان نہ ہوں۔ کہاں ہیں آپ کے صاحب؟'

میں نے جھاڑیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

پھر میں نے صاحب کی مدد سے آپ کو گاڑی میں لٹایا اور وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے۔

'آپ لوگ کہاں جا رہے تھے؟' صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

'ہم لوگ راولپنڈی جا رہے تھے۔' میں نے جواب دیا۔

'میرا نام افتخار ہے، میں گجرات کا ڈی سی ہوں۔' انہوں نے بتایا۔ 'آپ لوگ آئے کہاں سے ہیں؟'

'ہم لوگ ست بدھائی سے آئے ہیں۔' میں نے جواب دیا۔

'ست بدھائی سے؟' افتخار صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ 'یہ جگہ کہاں ہے؟'

'سر! یہ جگہ دینہ سے تقریباً پندرہ، بیس کلومیٹر دور ہے۔ جی ٹی روڈ سے بھی اتنے ہی فاصلے پر ہوگی۔ یہ نواب صاحب کی جاگیر ہے۔'

'میں آپ کو ست بدھائی پہنچا دیتا لیکن گجرات یہاں سے نزدیک ہے اور ان صاحب کو فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ان کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔'

'پھر آپ گجرات ہی چلیں سر!' میں نے کہا۔''

''تو کیا ہم اس وقت گجرات میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں نواب صاحب! ہم اس وقت گجرات میں ہیں۔''

''راجا، نور اور شہباز میری وجہ سے بہت پریشان ہوں گے۔ تم نے انہیں اطلاع دی؟''

''نہیں نواب صاحب!'' نیلم نے کہا۔ ''میں انہیں اطلاع نہیں دے سکی۔ میرے پاس سیل فون ہی نہیں ہے۔ سب لوگوں کے نمبر اسی میں تھے۔''

''تو میرے سیل فون سے اطلاع کر دیتیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ...... آپ کا سیل...... فون......''

''چارج نہیں تھا؟'' میں نے کہا۔ ''چارجر کسی سے منگا لیتیں۔ میرا پرس تو میری جیب میں ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں سر...... وہ...... آپ کا سیل فون بھی وہیں کہیں گر گیا تھا۔" نیلم نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں کسی سے سیل فون لے لو۔" میں نے کہا۔ "مجھے راجا کا سیل نمبر بھی یاد ہے اور نور کا سیل نمبر بھی میرے ذہن میں ہے۔"

"میں ابھی نرس سے سیل فون مانگ لیتی ہوں۔" نیلم نے کہا اور باہر جانے ہی والی تھی کہ نرس خود ہی کمرے میں آ گئی۔

"سسٹر!" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس سیل فون ہے؟"

"یس سر!" نرس نے ہنس کر کہا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اس سے ایک کال کر لوں؟"

"شیور سر!" نرس نے کہا اور اپنا سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے سیل فون اس سے لے کر راجا کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد کسی نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو!" مجھے راجا کی آواز سنائی دی۔

"راجا میں......"

"تو کہاں غائب ہو گیا ہے او کے پتّے!" راجا نے کہا۔ "تُو کوئی خیر خبر نہ دیا!"

"یار، جب ہم پنڈی جا رہے تھے تو ہماری گاڑی کو رکنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔" پھر میں نے اسے تفصیل بتانے سے پہلے کہا۔ "تو اپنا یہ ہی نمبر پر فون کر لے۔ میں اصل میں کسی سے سیل فون مانگ کر تجھے فون کر رہا ہوں۔"

"اچھا تو بند کر، میں کال کرتا ہوں۔" راجا نے کہا۔

نرس نے مسکرا کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ "آپ بات کر لیجیے سر! اس فون میں کافی کریڈٹ ہے۔"

"آپ کا بہت شکریہ سسٹر!" میں نے کہا۔ "ابھی میرا دوست خود ہی مجھے کال کرے گا۔"

سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر راجا ہی کا نمبر تھا۔ "ہاں، اب بتا، کیا ہوا تھا؟" راجا نے پوچھا۔

میں نے جواب میں اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

"تجھے چار دن بعد ہمیں اطلاع دینے کا خیال آیا ہے؟" راجا نے کہا۔

"کیا؟" میں بری طرح چونک اٹھا۔ "چار دن بعد؟"

"جی ہاں نواب صاحب!" نیلم نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کو آج چار دن بعد ہوش آیا ہے۔"

"یہ کس کی آواز ہے؟" راجا نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تو چار دن تک بے ہوش رہا؟" راجا نے تشویش سے پوچھا۔ "غنی کہاں ہے؟"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ "غنی ست بدھائی نہیں پہنچا؟"

"وہ ست بدھائی پہنچا ہوتا تو میں تجھ سے پوچھتا؟" راجا نے کہا۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔ "تو کیا غنی...... نہیں...... غنی نہیں مر سکتا۔" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"اچھا تو پریشان مت ہو، میں گجرات پہنچ رہا ہوں۔ کیا نام بتایا تو نے اس ڈی سی کا...... افتخار؟"

"ہاں، نیلم نے مجھے یہی نام بتایا ہے۔ میری تو ابھی تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچتا ہوں۔" راجا نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سیل فون نرس کی طرف بڑھا دیا۔ "تھینک یو سسٹر!" میں نے کہا۔

"یو آر ویلکم سر!" نرس نے مسکرا کر کہا۔

میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ غنی اگر ست بدھائی نہیں پہنچا تھا اور اس نے حویلی میں کسی سے رابطہ بھی نہیں کیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ...... وہ...... اب دنیا میں نہیں ہے یا پھر...... وہ دشمنوں کی قید میں ہے۔

"کیا ہوا نواب صاحب! آپ اچانک بہت زیادہ پریشان ہو گئے ہیں۔"

میں نے نظریں گھما کر نیلم کو دیکھا۔

وہ گھبرا کر بولی۔ "ارے...... آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

اس کے کہنے پر مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ نیلم نے ٹشو پیپر سے میرے آنسو خشک کر دیے۔

"غنی نے میری بہت خدمت کی ہے نیلم...... اس نے میری جان بچانے کے لیے بے شمار دفعہ اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ آخر...... اس نے مجھ پر جان قربان کر دی نیلم...... غنی مر گیا......" میں ایک مرتبہ پھر رونے لگا۔

"حوصلہ رکھیں سر!" نیلم نے کہا۔ "غنی کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہے۔ وہ بھی کہیں

نکل گیا ہوگا۔"

میں نے اپنے آنسو خشک کیے اور نیلم سے پوچھا۔ "ٹائم کیا ہوا ہے اس وقت؟"

"رات کے دس بج رہے ہیں۔" نیلم نے کہا۔ "آج ہمیں یہاں چوتھا دن ہے۔ آپ چار دن تک بے ہوش رہے ہیں۔"

"اس دوران میں افتخار صاحب آئے تھے؟"

"وہ کئی دفعہ آ چکے ہیں۔ ایک دفعہ تو ان کی بیگم بھی آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے کپڑے دے دیے ہیں۔"

مجھے یاد آیا کہ نیلم کے کپڑے تو جھاڑیوں میں الجھ کر پھٹ گئے تھے۔ اس وقت وہ صاف ستھرے کپڑوں میں تھی۔

"نیلم! اس وقت کافی مل سکتی ہے؟"

"جی ہاں نواب صاحب!" نیلم نے کہا۔ "چائے اور کافی کا سامان آج ہی ڈی سی صاحب نے بھجوایا ہے۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ گویا اچھلتی کمرے سے نکل گئی۔

مجھے اس وقت وہ کہیں سے بھی بچی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ ایک بھرپور دوشیزہ لگ رہی تھی۔ میں نکلا تھا عمرے کی عبادت... کرنے اور نیلم کو اس کے بابا سے ملوانے، اب لوگ میری عیادت کو آ رہے تھے اور اگر نیلم نہ ہوتی تو لوگ نور اور راجا سے میری تعزیت کر رہے ہوتے۔ میں نے تو نیلم کو بھی اتنی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ اچانک ہی میرے لیے اہم ہو گئی تھی۔ یہ اسی کی ہمت تھی کہ مجھے اس ویرانے سے اٹھا کر گجرات لے آئی تھی۔

نرس کمرے میں داخل ہوئی اور کوئی انجکشن تیار کرنے لگی۔

"یہ انجکشن کیسا ہے سسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"میں سمجھی نہیں!" نرس نے سر گھما کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ یہ نیند کا انجکشن تو نہیں ہے؟"

"نو!" نرس مسکرائی۔ "آپ کو اب اور انجکشن کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سکون کا سانس لیا۔

"کیونکہ وہ انجکشن تو میں پہلے ہی ڈرپ میں ملا چکی ہوں۔ آپ کے لیے سکون بہت ضروری ہے۔"

"اوہ نو!" میں نے کہا۔ "میں ابھی سونا نہیں چاہتا۔"

"اس سے آپ کو فوراً نیند نہیں آئے گی سر!" نرس پھر مسکرائی۔ "ہاں، وہ آپ کی بیگم کہاں گئیں؟"

"میری بیگم؟" میں حیران ہو کر بولا۔

"کیا میڈم نیلم آپ کی بیگم نہیں ہیں؟" نرس شرمندہ سی ہو گئی۔

"وہ میری سیکریٹری ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ آئی سی!" نرس نے مسکرا کر کہا۔ "سوری سر! میں غلط سمجھی۔" اس نے وہ انجکشن بھی ڈرپ میں ملا دیا۔ "یہ اینٹی بائیوٹک انجکشن ہے۔" وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد نیلم کافی لے کر آ گئی اور بہت احتیاط سے مجھے پلانے لگی۔

کافی تو میں یوں بھی بہت دیر میں پیتا ہوں۔ کافی پی کر مجھے توانائی کا احساس ہوا۔ میں نے نیلم سے کہا۔ "اب تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ تمہاری آنکھیں بھی کم خوابی سے سرخ ہو رہی ہیں۔"

"مجھے اتنی مشکل اردو نہیں آتی سر!" نیلم نے مسکرا کر کہا۔

"مشکل اردو؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔ "میرا مطلب ہے کہ جاگ جاگ کر تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اب تم بھی سو جاؤ۔"

"میں آج دن میں کچھ دیر سو لی تھی۔ میری فکر مت کریں نواب صاحب! میں تو راتوں کو جاگنے کی عادی ہوں۔ جب بابا رات رات بھر گھر سے باہر رہتا تھا تو میں اس کے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔" وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

مجھے اس کی آنکھوں میں پھر وہی چمک دکھائی دی۔ اس وقت مجھے اس چمک سے وحشت نہیں ہو رہی تھی۔

"نیلم! تمہاری ماں بہت حسین ہوگی؟"

نیلم نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر مسکرا کر بولی۔ "میری ماں کا خیال آپ کو کیسے آ گیا؟ جی ہاں، ماں بہت خوب صورت بلکہ حسین تھی۔"

"تم نے اپنی ماں ہی کا حسن لیا ہے۔" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے شرما کر سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولی۔ "میری ماں بہت حسین تھی سر! بابا بتاتا تھا کہ تجھے دیکھ کر مجھے تیری ماں یاد آ جاتی ہے۔ میری ماں ایک حادثے میں مر گئی تھی۔"

"تمہارا کوئی اور بھائی بہن، کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے؟"

"نہیں نواب صاحب! بابا کے علاوہ دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں تھا۔ اب بابا بھی......" وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے راجا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ میرے پاس آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر جذباتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں بولا۔ "دیکھے! تو نے یہ کیا حالت بنالی ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو ......"

"او بھائی! تو میرا حال پوچھنے آیا ہے یا مجھے رلانے آیا ہے؟" میں نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ "اس نیلم کا شکریہ ادا کر۔ یہی مجھے سلامت یہاں لائی ہے۔"

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے نواب صاحب!" نیلم سر جھکا کر بولی۔ "میں نے کون سے پہاڑ توڑے ہیں؟"

"اس ویرانے میں جہاں میرے دشمن بھی موجود تھے، وہاں سے مجھے نکالنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔"

"میرے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے۔" راجا نے مسکرا کر کہا۔

"کیا نور آئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تو خود ہی دیکھ لے۔" یہ کہہ کر اس نے بلند آواز میں کہا۔ "اندر آجاؤ بھئی۔"

دوسرے ہی لمحے اندر آنے والے کو دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اندر آنے والا غنی تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے اور ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

غنی بلکتا ہوا آگے بڑھا اور میرے پیر پکڑ کر رونے لگا۔ "مجھے معاف کر دیں سر!" وہ روتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی حفاظت نہ کر سکا۔"

"احمق ہو تم!" میں نے کہا۔ "میرے پاؤں کو چھوڑو۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں سر! میں ......"

"غنی!" میں نے اسے جھڑک دیا۔ "یہ کیا پاگل پن ہے۔ تم کیوں شرمندہ ہو۔ یہ رونا دھونا بند کرو ورنہ ڈاکٹر صاحب تم سب کو باہر نکال دیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور ان سے پہلے میں نکال دوں گا۔"

غنی میرے پیر چھوڑ کر میرے سرہانے سے لگ گیا۔

"نواب صاحب!" نیلم نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ بھی غنی کے لیے بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ غنی صاحب! آپ بہت بھاگوں والے ہیں کہ آپ کو نواب صاحب جیسا مالک ملا ہے۔"

"اچھا، یہ بتاؤ غنی!" میں نے اس سے پوچھا۔ "تم وہاں سے کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"میں نے بھی آپ کے ساتھ ہی گاڑی سے باہر چھلانگ لگائی تھی جناب۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں مخالف سمت کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس کا یہ نقصان ہوا کہ دشمنوں کی توجہ میری طرف ہی رہی۔ میں نے جان بوجھ کر ان پر فائرنگ بھی کر دی۔"

مجھے یاد آ گیا کہ غنی نے فائرنگ بھی کی تھی۔

"مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ گاڑی میں اچھا خاصا اسلحہ موجود تھا لیکن وہ میری دسترس میں نہیں تھا ورنہ میں کئی گھنٹے تک انہیں مصروف رکھتا۔ مجھے آپ کی طرف سے زیادہ فکر تھی۔ آپ کے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔"

"میرے پاس ایک ریوالور تھا لیکن اس کا بھی ہونا نہ ہونا برابر تھا کیونکہ مجھے بائیں ہاتھ سے فائرنگ کی پریکٹس بالکل نہیں ہے۔ جیسے انگریزی فلموں کے ہیرو دونوں ہاتھوں سے دھواں دھار فائرنگ کرتے ہیں۔"

"میرا پورا دھیان آپ ہی کی طرف تھا۔ پھر مجھے نیلم کی بھی فکر تھی۔ حملہ آور اسے بھی اٹھالے جاتے۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح میں سڑک کی دوسری جانب والی جھاڑیوں میں چلا جاؤں۔ اچانک پشت سے کسی نے میرے سر پر کوئی وزنی چیز ماری۔ میں کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور میں اسی ویرانے میں پڑا تھا۔ حملہ آوروں میں سے دو آدمی وہاں موجود تھے، باقی دو آپ کی تلاش میں چلے گئے تھے۔ وہ دونوں مجھے بے ہوش ہی سمجھ رہے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے سڑک پر دونوں جانب 'تعمیراتی کام جاری ہے، متبادل راستہ اختیار کریں' کے بورڈ لگا دیے تھے لیکن یہ بندوبست زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ اسی لیے ان لوگوں نے آپ کی گاڑی سڑک کے کنارے لگا کر اس کا بونٹ کھول دیا تھا تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ گاڑی کے انجن میں کچھ خرابی ہو گئی ہے اور مالک مدد کی تلاش میں گیا ہے ورنہ رات کے اس پہر لاوارث گاڑی دیکھ کر کوئی بھی شبے میں پڑ سکتا تھا۔ مجھے انہوں نے گاڑی کے قریب ہی باندھ کر ڈالا تھا۔ میرے منہ میں انہوں نے حلق تک کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ آخر ڈھائی تین گھنٹے بعد ان کے دوسرے ساتھی بھی لوٹ آئے۔ وہ بہت جھنجلائے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ آخر گیا کہاں؟ ہم نے اس علاقے کا چپا چپا چھان مارا۔ [illegible] وہ خود نکل گیا۔"

"وہ کون لوگ تھے غنی؟"

"میں نے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون لوگ تھے؟" غنی نے کہا۔ "مجھے اس وقت یہ سکون ہو گیا تھا کہ آپ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ نیلم کہاں گئی؟"

"نیلم ہی کی وجہ سے تو میں ان کے ہاتھ نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ مجھے وہاں سے لے کر بھاگ نہیں جاتی تو شاید وہ لوگ مجھے پکڑ لیتے۔ کانٹے دار جھاڑیوں کی پروا کیے بغیر یہ میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگتی رہی۔ یہ تو مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہم بائیس پچیس کلومیٹر تک بھاگتے رہے۔"

"وہ لوگ مجھے کسی پک اپ میں ڈال کر لے گئے۔" غنی نے کہا۔ "وہاں پہنچ کر انہوں نے اتنا ضرور کیا کہ میرے منہ سے کپڑا نکال دیا اور میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ پھر میں کئی گھنٹے اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑا رہا۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے سوکھی ہوئی ایک روٹی اور بدمزہ چائے دی۔ وہ میری طرف سے زیادہ محتاط نہیں تھے اور مجھے محض ڈرائیور ہی سمجھ رہے تھے۔ اسی کوٹھری میں ایک طرف پانی کا گھڑا سا ایک مٹکا رکھا ہوا تھا اور ایک کونے میں اینٹیں رکھ کر رفع حاجت کے لیے جگہ بنادی گئی تھی۔ غلاظت اور بدبو سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ لوگ صبح شام مجھے بھی سوکھی روٹی اور ابلے ہوئے بدبودار چاول دیتے تھے۔ کوشش کے باوجود مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کس کے اشارے پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ کھانا لے کر آنے والا شخص پہلے تو بہت محتاط تھا لیکن میرے مفاہمانہ رویے سے بعد میں بے پروا ہو گیا۔ مجھے اب کسی موقع کی تلاش تھی۔ ایک دفعہ رات کو وہ آیا تو اچانک میں نے اسے دبوچ لیا اور گھونسوں میں اسے بے ہوش کر دیا۔ اس کے ریوالور پر قبضہ کرنے کے بعد میں وہاں سے دبے پاؤں نکلا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت میں کہاں ہوں؟ وہ آبادی سے دور کوئی بے آباد مکان تھا۔ مکان بھی کیا، وہ کوئی کھنڈر تھا جسے وہ لوگ اپنے ٹھکانے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ وہاں گھوڑے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ ڈاکو آج بھی جنگل کے دشوار گزار راستوں میں سفر کے لیے گھوڑے استعمال کرتے ہیں۔ گویا وہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تھا۔ کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ ڈاکو کس کے لیے کام کر رہے ہیں؟"

"یہ معلوم کر کے آپ کون سا تیر مار لیتے؟" راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "پہلے ہی میں آپ کو بتا رہا ہوں وہ راجا کے آدمی تھے۔ اب آپ نے کر جانا ہے اور راجا کا نام و نشان مٹانا ہے؟"

"آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں؟" غنی نے برا مان کر کہا۔ "میں ایسی جرأت کر سکتا ہوں؟"

"راجا کی بات کو چھوڑو غنی!" میں نے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"میں کچھ دور ہی تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے لیکن اچانک ایک آدمی میرے سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور سر کے بال بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اس نے درشت لہجے میں کہا تو کیا سمجھتا ہے، ہم اتنے ہی غافل ہیں۔ واپس چل ورنہ ......' اس نے اپنی کلاشنکوف سے اشارہ کیا۔ میں اس وقت اتنا جھنجلایا ہوا تھا کہ نتائج کی پروا کیے بغیر اس پر جھپٹ پڑا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اس نے گرتے گرتے بھی خنجر نکال لیا۔ میرے پاس اس شخص کا ریوالور تھا جو میرے لیے کھانا لے کر آتا تھا۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا لیکن اس نے مجھے فائر کرنے کا موقع نہیں دیا اور میری پنڈلی پر لات مار کے مجھے نیچے گرا لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا خنجر میرے شانے میں پیوست ہو گیا۔ اس نے تو میرے سینے پر وار کیا تھا لیکن میں تھوڑا سا ترچھا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ اگر اسے ذرا بھی موقع مل گیا تو یہاں میری لاش پڑی ہوگی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ جنون کے عالم میں میری گرفت کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے عالم دیوانگی میں اس کی ناک پر زوردار ٹکریں ماریں، وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ میں نے اس کا خنجر اس کے گلے پر پھیر دیا۔ وہاں چوکیداری کے لیے شاید صرف وہی تھا۔ باقی لوگ وہاں نہیں تھے یا پھر کھنڈر میں کسی اور جگہ ہوں..... میں نے ایک گھوڑا کھولا اور جدھر منہ اٹھا، بھاگ نکلا۔ آدھا گھنٹے تک گھوڑا سرپٹ دوڑانے کے بعد مجھے آبادی کے آثار نظر آئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میں اس وقت اٹک کے علاقے میں موجود ہوں۔ میرے بازو سے خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر گھوڑا دوڑاتا رہا اور سیدھا حویلی پہنچ کر گر گیا۔"

"غنی کے اس ایڈونچر میں ایک فائدہ تو ہوا ہے۔" راجا نے کہا۔ "یہ جو گھوڑا لے کر آیا ہے، وہ بہت قیمتی ہے۔ بعد میں اگر قبلہ نواب صاحب کو ریس کا مرض لاحق ہوا تو وہ گھوڑا ریس میں کام آئے گا۔ اپنا حرام حلال کرنے کے بعد نواب صاحب اس معزز شوق کو بھی عزت بخشیں گے۔"

"اور میرے منیجر ہوں گے راجا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویسے ان کی مرضی ہے۔ یہ جو کچھ بھی بن سکتے ہیں۔" پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ "لیکن نہیں، ان کے وزن سے گھوڑا تو دور کی بات ہے، گھوڑا اصل بھی نہیں چل پائے گا۔ جو کہ بہت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔"

"مگر راجا صاحب کا اتنا وزن بھی نہیں ہے۔" غنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا۔

"ان کا وزن تو زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے گناہوں کا وزن اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔"

ڈاکٹر کمرے میں آیا تو میں خاموش ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "سر! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اب آپ آرام کریں۔" پھر اس نے راجا کی طرف دیکھا۔

"سر......!"

"او کے ڈاکٹر۔" راجا مسکرا کر بولا۔ "میں بس جا ہی رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سر!" ڈاکٹر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

"اچھے بچے اب تو آرام کر۔ کل انشاء اللہ ہم سب بھائی چلیں گے۔"

"یار وہ نامراد کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں سر تو اسی شام کو گھر آ گیا تھا۔ اس کے جسم پر معمولی سے زخم تھے لیکن اس کی گاڑی ناکارہ ہو گئی ہے۔ کل وہ بھی یہاں آئے گا۔" یہ کہہ کر راجا اٹھ کھڑا ہوا۔

"نمی! تم بھی راجا صاحب کے ساتھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ نمی اسپتال کے باہر رہ کر میری حفاظت کرے گا۔ موسم خاصا سرد ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نمی اس سردی میں باہر ٹھٹھرتا رہے۔ میں نے نیلم سے کہا۔ "نیلم، تم بھی چلی جاؤ۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"نیلم کو یہیں رہنے دیں۔" نمی نے کہا۔ "نرس چوبیس گھنٹے تو یہاں بیٹھی نہیں رہتی۔" راجا نمی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے پیر دبا رہا ہو۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ نیلم پلنگ پر میرے پیروں کی طرف بیٹھی تھی اور آہستہ آہستہ پیر دبا رہی تھی۔

میں نے پیر سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کر رہی ہو نیلم؟"

"بھاگنے کی وجہ سے آپ کے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔" نیلم نے میرے تلوے سہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ سو جائیں۔"

"میں ٹھیک ہوں، تم بھی سو جاؤ۔" میں نے کہا۔

نیلم بدستور میرے پاؤں دباتی رہی۔ پاؤں دبانے سے مجھے واقعی سکون مل رہا تھا۔ میں نہ جانے کب سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی سات بجا رہی تھی۔ پھر میری نظر نیلم پر پڑی۔ وہ میرے پیروں کے پاس ہی گٹھری بنی سو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔

"نیلم۔"

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بستر سے اتر گئی۔ مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے پانی مانگا۔ اس نے پانی کا گلاس بھرا اور سہارا دے کر مجھے اٹھایا۔

میں پانی پی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دواؤں کی ٹرے لیے نرس اندر آ گئی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "گڈ مارننگ سر! رات کیسی گزری؟"

"نائس!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "رات مجھے بہت اچھی نیند آئی۔"

نرس نے مجھے دو کیپسول اور ایک ٹیبلٹ دی جو نیلم نے مجھے کھلائی۔ پھر اس نے میرا ٹمپریچر لیا، بلڈ پریشر چیک کیا اور چارٹ میں لکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اسپتال کا ملازم ناشتا لے کر آ گیا۔ ناشتے کے بعد کافی نے تو گویا تن مردہ میں نئی جان ڈال دی۔

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب راجا کے ساتھ ایک باوقار سے صاحب بھی آ گئے۔ راجا نے بتایا کہ وہ افتخار صاحب ہیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہیے صاحب!" وہ مسکرا کر بولے۔ "اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"اب تو خاصی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے افتخار صاحب! میں زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔"

"ارے صاحب! شکریہ تو آپ اپنی بیگم کا ادا کریں۔ یہ بہت باہمت خاتون ہیں۔" انہوں نے نیلم کی طرف اشارہ کیا۔

ان کی بات پر نیلم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ راجا نے بھی آنکھیں گول گول... گھما کر مجھے دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "افتخار صاحب! یہ میری بیگم نہیں، سیکرٹری ہیں۔"

"او سوری!" وہ بے چارے شرمندہ ہو گئے۔ "میں معذرت چاہتا ہوں خاتون۔" وہ نیلم سے بولے۔

اس طرز تخاطب پر نیلم مزید شرما گئی۔ یہ بیگم اور خاتون جیسے الفاظ اس کے لیے کبھی کسی نے استعمال نہیں کیے تھے۔

"آپ کو صحت یاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔" افتخار صاحب نے کہا۔

"آپ کی بہت نوازش ڈی سی صاحب!" راجا نے کہا۔ "اب منشی صاحب کی حالت خاصی بہتر ہے۔ ہم شاید آج ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ کبھی ست بدحالی آئیے نا!" میں نے کہا۔ "یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔"

افتخار صاحب نے میرا وزیٹنگ کارڈ جیب میں رکھ لیا پھر وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہوئے۔ "ڈاکٹر صاحب! کیا نواب صاحب سفر کے قابل ہیں؟"

"سر! نواب صاحب کی طبیعت اب خاصی بہتر ہے۔ یہ سفر کر سکتے ہیں۔"

"تھینکس صاحب!" افتخار صاحب مسکرا کر بولے۔ "لیجیے ڈاکٹر صاحب نے بھی آپ کو اجازت دے دی۔ زندگی رہی تو ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔" افتخار صاحب مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

نیلم نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ راجا ڈی سی صاحب کو رخصت کر کے آیا تو مجھ سے بولا۔ "یار چھتے! اس ڈی سی میں تو بیوروکریٹس والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ تو بالکل انسانوں کی طرح بات کر رہا تھا۔"

"ہاں راجا! مجھے بھی حیرت ہے کہ یہ کیسا افسر ہے۔ اس کی نہ گردن اکڑی تھی، نہ آنکھوں میں حقارت تھی۔"

"سر! اس نے کسی عام آدمی کی مدد نہیں کی ہے بلکہ نواب رفیق احمد شیرازی کی مدد کی ہے۔ اچھے ہم جیسے لوگوں کے ساتھ اپنے بڑے افسر اسی طرح پیش آتے ہیں۔"

"ہاں یار! وہ مجھ سے بھی پوچھ رہا تھا۔ نواب صاحب! آپ خود چلنے کے قابل ہیں یا آپ کے لیے وہیل چیئر منگواؤں۔" میں نے راجا کو بتایا۔

"یہ تو ابھی مجھے خود بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں بستر سے اٹھوں گا تو اندازہ ہوگا!"

ڈی سی کے آنے سے پہلے ڈرپ بھی نکالی جا چکی تھی اور خون کی بوتل بھی ہٹائی جا چکی تھی۔ نیلم نے مجھے بتایا تھا کہ ان چار دنوں میں مجھے خون کے آٹھ بیگ لگے تھے۔ ڈرپ بھی مسلسل لگ رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے مجھے کمزوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

راجا نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ میں نے زمین پر قدم رکھا تو مجھے ہلکا سا چکر آیا لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ثنی نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن میں نے اشارے سے اسے روک دیا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے کمرے کا ایک چکر لگایا اور راجا سے کہا۔ "ہاں، میں چل سکتا ہوں۔"

راجا مجھے کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اسے آن کر کے بولا۔ "ہاں ناصر!......" وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ اچانک مجھے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دیے۔ "کیا؟......" وہ حیرت سے بولا۔ "کب؟...... تم نے خود دیکھی ہے؟...... اچھا...... ہاں میں ابھی گجرات ہی میں ہوں...... اچھا...... ہاں، میں سمجھ گیا...... نواب صاحب ٹھیک ہیں...... ہم لوگ بس نکلنے ہی والے تھے...... اچھا ٹھیک ہے...... اچھا ہوا تم نے مجھے اطلاع دے دی......" اس نے سیل فون آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔

اس کی یک طرفہ گفتگو سے مجھے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ فون ناصر کا تھا اور اس نے کوئی پریشان کن خبر دی ہے۔ میں نے راجا سے پوچھا۔ "کیا ہوا راجا؟ تیری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"چھتے پتر! خبر ہی ایسی ہے۔ تو سنے گا تو تیرا چہرہ بھی اس قابل نہیں رہے گا کہ اس پر نظر ڈالی جائے۔" پھر وہ ثنی سے بولا۔ "گاڑی اسپتال کے پورچ میں لے آؤ۔ جلدی کرو۔"

"گاڑی تو میں پہلے ہی اندر لے آیا ہوں سر!" ثنی نے کہا۔

"چل چھتے پتر، جلدی کر!" راجا نے مضطرب ہو کر کہا۔

"بات کیا ہے راجا؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"پہلے یہاں سے تو نکل!" راجا نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کی طرف بڑھا۔

گاڑی تک پہنچنے میں میرا سانس پھول گیا۔ میرے ساتھ نیلم بھی تھی۔ ثنی پہلے ہی باہر بھاگ چکا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ راجا لینڈ کروزر لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا۔ میرے ساتھ نیلم بیٹھ گئی، پھر وہ خود فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اور ثنی سے کہا۔ "بس نکل چلو۔"

ثنی نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور بہت احتیاط سے گاڑی اسپتال سے باہر نکال لی۔

"ہم ابھی ست بدحالی نہیں جا رہے ہیں۔" راجا نے کہا۔ "گاڑی پولیس اسٹیشن کی طرف لے چلو۔"

ثنی نے بغیر کوئی سوال کیے گاڑی کا رخ موڑا اور انتہائی تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔

"یار! اب تو بتا دے کیا بات ہے؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"کسی نے فریال کو قتل کر دیا ہے۔" راجا نے گویا میرے سر پر وزنی ہتھوڑا رسید کیا تھا۔

"کب؟" میں نے صدمے کے ابتدائی جھٹکے سے

سنبھل کر پوچھا۔

"پولیس کو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی لاش ملی ہے۔" راجا نے کہا۔ "ناصر بھی ابھی وہیں موجود ہے۔ وہ فوراً جائے واردات پر پہنچ گیا۔"

"لیکن تو اتنا خوف زدہ کیوں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا فریال کو تو نے قتل کیا ہے؟"

"نہیں چھتے پتر! میں نے نہیں، فریال کو تو نے قتل کیا ہے۔" راجا نے کہا۔

"تو پاگل تو نہیں ہو گیا؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "تو جانتا ہے کہ میں گجرات میں تھا۔"

"لاش کئی دن پرانی ہے چھتے پتر!" راجا نے کہا۔ "یہ تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ اسے کب قتل کیا گیا ہے۔ لاش کے نزدیک ہی تیرا سیل فون ملا ہے۔"

"میرا سیل فون؟" میں نے کہا۔ "میرا سیل فون تو اس رات کی بھاگ دوڑ میں گر گیا تھا۔"

"لیکن اب وہ پولیس کے قبضے میں ہے۔" راجا نے کہا۔ "ناصر بتا رہا تھا کہ پولیس کی ایک پارٹی تجھ سے تفتیش کرنے کے لیے ست بدحالی روانہ ہو چکی ہے۔ پولیس اگر کسی بااثر شخصیت کے کہنے پر حرکت میں آئی ہے تو وہ گجرات بھی ضرور پہنچیں گے۔"

"لیکن یار، میں تو گزشتہ کئی دن سے گجرات کے اس اسپتال میں تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کی گواہی اسپتال کا ڈاکٹر بھی دے گا اور ڈی سی بھی۔"

"چھتے پتر! اس مرتبہ بھی دشمنوں نے تیرے خلاف سازش کی ہے۔ تیرا سیل فون ان کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ تجھے قتل کے کیس میں پھنسانے کے لیے انہوں نے لاش کے پاس ڈال دیا ہوگا۔ مجھے امید نہیں کہ یہ کیس بھی انہوں نے خود ہی کیا ہو؟ تو یہ بتا کہ تو نے اپنے سیل فون سے آخری کال کب کی تھی؟" راجا نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ آخری کال میں نے ناصر کی ریسیو کی تھی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ سولہ تاریخ کو شام کے تقریباً سات بجے تک سیل فون تیرے ہی پاس تھا۔"

"تو پھر کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، سیل فون اس کے بعد ہی لاش کے پاس ڈالا گیا ہوگا۔ میں ابھی گزشتہ تاریخ میں سیل فون کی گمشدگی کی ایف آئی آر کٹوا دیتا ہوں۔"

"تھانے والے سب سے پہلے یہ سوال کریں گے کہ

قبل از.....

[illegible]

سیل فون کہاں گم ہوا؟"

"لگتا ہے تیرا دماغ بھی چل گیا ہے۔" راجا نے کہا۔ "ہم یہ کیوں بتائیں گے کہ سیل فون کب اور کہاں گم ہوا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میں گجرات کے ڈی سی کا حوالہ دوں گا۔ تو بھی جانتا ہے کہ ڈی سی کا نام کیا حیثیت رکھتا ہے، خاص طور پر چھوٹے شہروں میں۔"

ثنی نے پولیس اسٹیشن کے سامنے گاڑی روکی اور سوالیہ نظروں سے راجا کو دیکھنے لگا۔

"گاڑی کو تھانے کے احاطے میں لے چلو۔" راجا نے کہا۔

ثنی نے گاڑی کا رخ گیٹ کی طرف کر دیا۔ پولیس اسٹیشن کے گیٹ کا ایک دروازہ بند تھا۔ وہاں ایک سنتری بھی موجود تھا۔ ثنی نے ہارن بجایا تو اس نے سر اٹھا کر ہماری گاڑی کو دیکھا، پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہماری طرف آیا۔

راجا نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم کیا ڈیوٹی کے دوران میں سوتے رہتے ہو؟ گیٹ کھولو!"

وہ راجا کے تحکمانہ لہجے سے زیادہ چمچماتی ہوئی لینڈ کروزر سے متاثر ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر فوراً گیٹ کھول دیا۔

پولیس اسٹیشن کی عمارت خاصی پرانی تھی لیکن مضبوط اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا احاطہ بہت وسیع و عریض تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بجائے ہی بڑا سا ایک برآمدہ تھا جو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اس میں اندر کے رخ پر آمنے سامنے چار چار کمرے تھے۔

ہماری گاڑی دیکھ کر پولیس کا ایک ڈھیلا ڈھالا کانسٹیبل برآمدے میں نکل آیا۔

راجا نے اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کی، رے بین کا چشمہ لگایا اور بہت باوقار انداز میں گاڑی سے اترا۔ اس نے بہت مؤدب انداز میں گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور بولا۔ ''تشریف لائیے نواب صاحب!'' اس نے دانستہ اپنی آواز اتنی بلند رکھی تھی کہ اسے دوسرے لوگ بھی سن لیں۔

میں بھی بہت باوقار انداز میں گاڑی سے اترا۔ نخی بھی تیزی سے اتر کر میرے پیچھے آ گیا۔

''تم ہمیں کہاں لے آئے ہو سیکریٹری؟'' میں نے گردن اکڑا کر راجا سے پوچھا۔

''یہ پولیس اسٹیشن ہے نواب صاحب!'' راجا نے ادب سے جواب دیا اور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''یہ..... پولیس اسٹیشن ہے؟'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''یہ تو ہمیں کوئی حویلی لگ رہا ہے..... لیکن نہیں..... یہ پولیس اسٹیشن ہی ہے۔'' میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں نحوست تو ویسی ہی برس رہی ہے جیسے دوسرے تھانوں میں برستی ہے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ راجا نے تحکمانہ انداز میں کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''انچارج صاحب موجود ہیں؟''

''نہیں جناب!..... انچارج صاحب تو نہیں ہیں۔'' اس نے انچارج کی ''ز'' پر زور لگاتے ہوئے کہا۔

''علاقہ گشت پر ہوں گے؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وہ..... جی..... وہ..... ابھی گھر سے ہی نہیں آئے ہیں۔''

''نہیں آئے ہیں؟'' راجا نے اسے گھورتے ہوئے کہا، پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ ''انہیں فوراً بلاؤ۔'' راجا نے درشت لہجے میں کہا۔

کانسٹیبل جواب میں کچھ کہتے کہتے رک گیا اور گیٹ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لوجی، وہ انچارج صاحب بھی آ گئے۔'' میں نے مڑ کر دیکھا۔ گیٹ سے ایک سیاہ مرگلا اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس میں سے انچارج اترا۔ وہ عہدے کے لحاظ سے انسپکٹر تھا۔ اس کا حلیہ بھی روایتی پولیس افسروں کی طرح تھا۔ اس کا جسم چاروں طرف پھیل گیا تھا اور پولیس والوں کا ٹریڈ مارک یعنی اس کا پیٹ خمیری آٹے کی طرح اس کی وردی سے باہر نکلا پڑ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پینٹ سنبھالی، ایک نظر میری چمکتی ہوئی گاڑی اور دمکتی ہوئی نیم پلیٹ پر ڈالی اور ہماری طرف بڑھا۔

''انسپکٹر صاحب! کیا آپ کے آنے کا ٹائم ہے؟'' راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

انسپکٹر بھی بڑا کائیاں تھا۔ وہ راجا کے لہجے سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا اور بولا۔ ''ہم تو چوبیس گھنٹے کے ملازم ہیں جناب! اور کوئی ٹائم نہیں ہوتا۔ آپ تشریف لائیں۔''

''یہ نواب رفیق احمد شیر افزی ہیں۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''اور میں ان کا سیکریٹری ہوں..... یہاں ڈی سی صاحب کے مہمان ہیں۔''

ڈی سی کا نام سن کر اس کے چہرے پر رعونت کے بجائے خوشامدانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آ جائیے جناب!'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کے دروازے پر ''اسٹیشن ہاؤس آفیسر'' کی پلیٹ لگی تھی۔

ایک کانسٹیبل بہت مستعدی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھول چکا تھا۔ میں اور راجا اس کے پیچھے اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ نخی باہر ہی رہ گیا۔ انچارج نے ہمیں کرسیاں پیش کیں، پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ ''حکم کریں جناب!'' اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ ذرا اپنا رجسٹر دیکھ کر بتائیے کہ یہاں آخری ایف آئی آر کب درج ہوئی ہے؟''

انسپکٹر نے چونک کر راجا کی طرف دیکھا۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''افکار صاحب نے کہا تھا کہ انسپکٹر محسن صاحب آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔'' راجا نے محسن کا نام اس کی جیب پر لگی ہوئی پٹی میں پڑھ لیا تھا۔

''افکار صاحب؟'' انسپکٹر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''آپ اپنے ڈی سی کا نام بھی نہیں جانتے؟'' راجا نے سرد لہجے میں کہا۔ ''افکار نام ہے ان کا۔''

''سیکریٹری!'' میں نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''افکار کو فون کرو اور بتاؤ کہ ہم لنچ تک گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔''

راجا نے سیل فون نکال کر کوئی نمبر ملایا اور بولا۔ ''ہیلو ڈی سی صاحب! نواب صاحب آپ سے بات کریں گے۔'' اس نے سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے سیل فون اس سے لے لیا۔ میں جانتا تھا کہ دوسری طرف کوئی بھی نہیں ہوگا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''افکار! میں رفیق بول رہا ہوں۔''

''جی سر.....'' دوسری طرف سے نخی کی آواز آئی۔

''ابھی ہم نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ہم شاید لنچ کے وقت تک نہ پہنچ سکیں، کچھ دیر ہو جائے گی۔''

''کیوں سر؟'' نخی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''دیر کیوں ہوگی؟''

''نہیں نہیں، پولیس اسٹیشن میں دیر نہیں ہوگی۔ انسپکٹر محسن صاحب تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہمیں دراصل ایس پی صاحب سے بھی ملنا ہے۔'' پھر میں سیل فون کان سے ہٹا کر انسپکٹر سے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ ڈی سی صاحب سے بات کریں گے؟''

''نہیں سر!'' انسپکٹر جلدی سے بولا۔ ''میں ان سے کیا بات کروں گا؟''

میں نے سیل فون دوبارہ کان سے لگایا۔ ''ہاں بھئی افکار! تم ہماری بات سن رہے ہو؟..... ٹھیک ہے۔'' میں نے نخی کا جواب سنے بغیر ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

''محسن صاحب! مجھے گزشتہ تاریخ میں ایک ایف آئی آر درج کرانا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''سر جی! اب ڈی سی صاحب نے کہا ہے تو آپ کا کام تو کرنا ہی پڑے گا۔'' انسپکٹر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''لیکن آپ فکر مت کریں۔ میں آپ کی بھی خدمت کروں گا۔''

''نہیں سر، کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ ڈی سی صاحب کے مہمان ہیں۔''

''یہ بات تو ہمارے درمیان رہے گی۔'' راجا نے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ''ڈی سی صاحب کو معلوم نہیں ہوگی۔ ذرا میرے ڈرائیور کو بلوا دیں۔''

''فتح خان!'' انسپکٹر نے کسی کو آواز دی۔

فوراً ہی وہی ڈھیلا ڈھالا کانسٹیبل اندر آ گیا جو ہمیں برآمدے میں ملا تھا۔

''دیکھو، باہر نواب صاحب کا ڈرائیور ہوگا، ذرا اسے بلا لاؤ۔ ہاں، کرامت خان سے کہنا کہ ایف آئی آر کا رجسٹر لے آئے۔'' پھر وہ راجا سے مخاطب ہوا۔ ''جی سر! اب فرمائیں کیا حکم ہے؟''

''ابھی نواب صاحب کا بیگ گاڑی سے چوری ہو گیا ہے، اس میں نواب صاحب کے کچھ ضروری کاغذات اور سیل فون تھا، تقریباً دو لاکھ روپیہ نقد بھی تھا۔ نواب صاحب اس معمولی چوری کی رپورٹ بھی نہ کرتے لیکن بیگ میں اہم نوعیت کے کچھ کاغذات بھی تھے۔ بس اسی کی رپورٹ لکھوانی ہے۔'' راجا نے کہا۔

''تو سر، اس رپورٹ کو بیک ڈیٹ میں لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''ابھی بیگ کی ساری رپورٹ تو ہمارا ڈرائیور بھی لکھوا دیتا۔'' راجا نے کہا۔ ''اس بیگ میں جو کاغذات تھے، وہ نواب صاحب کے لندن والے بزنس سے متعلق تھے۔ وقت مقررہ پر ان کا بھیجنا ضروری تھا۔''

''میں سمجھ گیا۔'' انسپکٹر ہنس کر بولا۔

نخی نے اندر جھانکا تو راجا نے کہا۔ ''ڈرائیور! گاڑی میں میرا بریف کیس رکھا ہے، اسے لے آؤ۔''

فتح خان ویسا ہی ایک رجسٹر لے کر کمرے میں داخل ہوا اور وہ انسپکٹر کی میز پر رکھ دیا۔

سومنات کا بت

اسکول کے نئے ماسٹر صاحب پہلی مرتبہ کلاس میں آئے تو انہوں نے بچوں سے پوچھا۔ ''سومنات کا بت کس نے توڑا؟''

ایک طالب علم: ''صاحب! خدا کی قسم میں نے نہیں توڑا۔''

دوسرا طالب علم بولا: ''میں تو آدھے گھنٹے سے باہر ہی بیٹھا تھا۔'' انہیں پہلے ماسٹر صاحب کلاس میں دیکھ کر کہنے لگے۔ ''یہ بچے ہیں، یہ کس نے توڑا ہوگا؟''

نئے ماسٹر صاحب کو پرانے ماسٹر صاحب کا جواب بہت ناگوار گزرا اور وہ دونوں لڑکوں اور پرانے ماسٹر صاحب کو ہیڈ ماسٹر کے پاس لے گئے اور سارا ماجرا سنایا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوری بات سن کر کہا۔ ''چھوڑیے، کسی نے بھی توڑا ہو، ہم پیسے ملا کر نیا بنوا دیں گے۔''

مرسلہ: سید مظفر حیدری، کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''فتح خان نواب صاحب کے لیے کچھ لے کر آؤ۔''
وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''سر! کیا لیں گے آپ چائے، کافی، ٹھنڈا؟''

''شکریہ انسپکٹر صاحب!'' میں نے رعب لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پاس وقت کم ہے اور ابھی ایس پی صاحب کے پاس بھی جانا ہے۔''

راجا کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اس کی اسکرین پر نظر ڈال کر اسے کان سے لگا لیا۔ ''السلام علیکم ایس پی صاحب!'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''جی ہاں، نواب صاحب موجود ہیں۔'' پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''سر! ایس پی صاحب بات کریں گے۔'' دوسری طرف سے ناصری آواز آئی۔

میں نے سیل فون اس سے لے لیا۔ ''ہیلو! السلام علیکم نواب صاحب۔''

''وعلیکم السلام!'' میں نے کہا۔ ''بھئی، بس ہم نکلنے والے ہیں۔''

''سر! یہ سب کیا ہے؟''

''ارے کیس ایس پی صاحب! بس ہم پہنچتے ہیں دس منٹ میں......''

''آپ ہیں کہاں؟''

''بھئی ہم ابھی گجرات ہی میں ہیں۔ بس ایک ضروری کام میں الجھے ہوئے ہیں۔''

''میں نے یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے کہ پولیس وین گجرات کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔''

''اچھا اچھا! آپ فکر مت کریں، بس ہم نکلنے ہی والے ہیں۔'' میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''دیکھیے جناب!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''ہماری ایف آئی آر چودہ تاریخ کو درج ہوئی ہے۔''

''بھئی واہ!'' میں نے کہا۔ ''گویا اس کے بعد آپ کے تھانے کی حدود میں کوئی جرم ہی نہیں ہوا؟''

''جرم تو ضرور ہوا ہوگا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''لیکن ہمارے ریکارڈ کے مطابق نہیں ہوا۔ آپ فرمائیں، کیا چیزیں چوری ہوئی ہیں؟''

''ہماری لندن والی فرم نور شیرازی اینڈ کمپنی کے کاغذات اور دراصل ایک دوسری کمپنی گریوٹی انٹرنیشنل سے معاہدے کے کاغذات تھے۔''

''گریوٹی انٹرنیشنل!'' انسپکٹر نے لکھتے ہوئے کہا۔

''ایک ہیرے کا ایک سیل فون مع سم، اسپیکر بیٹری'' میں

راجا سے مخاطب ہوا۔ ''ہمارا سیل نمبر لکھواؤ۔''

راجا نے میرا سیل نمبر لکھوایا۔

''دو لاکھ ستاون ہزار روپے نقد، ہماری چیک بک وغیرہ!''

فتح بریف کیس راجا کو دے کر واپس چلا گیا۔

راجا نے بریف کیس سے ہزار ہزار روپے کے تین نوٹ نکالے اور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیے۔

نوٹ دیکھ کر انسپکٹر کی آنکھیں چمکنے لگیں، وہ بولا۔ ''نواب صاحب! یہ تکلف نہ کریں، آپ ڈی سی صاحب کے مہمان ہیں اور......''

''محسن صاحب!'' میں نے کہا۔ ''یہ تو میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، پھر بھلا ڈی سی کو یہ بات بتائے گا کون؟''

اس نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ راجا سے لے لیے، پھر وہ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ڈی سی اور ایس پی کے حوالے موجود ہوں اور کسی سرکاری اہلکار کی مٹھی بھی گرم کر دی جائے تو ہر کام چشم زدن میں ہو جاتا ہے۔ پانچ منٹ بعد انسپکٹر نے کہا۔ ''لیجیے نواب صاحب! رپورٹ کا اندراج ہو چکا، تاریخ کون سی ڈالوں؟''

''سولہ نمبر، بوقت شام چھ بجے!'' میں نے کہا۔

''اس رپورٹ کی ایک کاپی مجھے بھی دے دیں۔'' راجا نے کہا۔

اگلے پانچ منٹ میں انسپکٹر نے ایف آئی آر کی ایک نقل میرے سامنے رکھ دی۔ اس پر مہر بھی لگی ہوئی تھی۔

راجا نے اس نقل کا تفصیلی جائزہ لیا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بہت شکریہ محسن صاحب!''

انسپکٹر ہمیں باہر تک رخصت کرنے آیا۔ مجھے دیکھ کر فتح نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

''اب ست بھائی چلو!'' راجا نے کہا۔

''ایک منٹ فتح!'' میں نے کہا۔ ''نیلم کو شاید چنڈی جانا تھا۔''

''نہیں نواب صاحب! آپ تو پہلے ہی دکھی ہیں۔''

''نہیں بھئی، تمہیں بھی تو اپنے ابا سے ملنا ہے۔''

''نیلم کو بعد میں کسی یا سرور کے ساتھ بھیج دینا۔'' راجا نے کہا۔ پھر مجھ سے انگریزی میں بولا۔ ''میکے پتر! یہ تو بتا...... یہ تیری بیگم کب سے ہو گئی؟''

''زیادہ بکواس مت کر!'' میں نے جواب دیا۔ ''ڈاکٹر کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔''

''اور ڈی سی صاحب کو بھی غلط فہمی ہو گئی؟'' راجا نے

انگریزی لہجے میں کہا۔

''تیرا کیا مطلب ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔''

''حلیہ تو اس کا بیگموں والا ہی ہے۔''

''حلیہ تو تیرا بھی چوروں والا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس نے ڈی سی کی بیگم کے کپڑے وغیرہ رکھے ہیں۔''

''ویسے میکے پترا! آثار کچھ اچھے نہیں ہیں۔ تو تو ویسے ہی پردوں میں ایک محبوبہ رکھتا ہے۔ اب تو ایک چھوڑ تو دو دو ہو گئی ہیں۔''

''اب ذرا یہ بھی فرما دیں کہ دوسری کون ہے؟'' میں نے کہا۔

''اب یہ بھی میں ہی بتاؤں۔'' راجا نے شرارتی انداز میں کہا۔ ''ویسے یہ بھی ایک طرح سے خدمت خلق ہے میکے پترا! ہمارے ملک میں کتنی ہی لڑکیاں شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ اگر ہر آدمی شرعی طریقے پر عمل کرے تو یہ معاشرتی مسئلہ بھی بآسانی حل ہو سکتا ہے۔''

''اس کار خیر میں تو بھی تو حصہ لے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میری تو اکلوتی شادی بھی کھٹائی میں پڑی ہوئی ہے۔'' راجا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''فکر مت کر!'' میں نے کہا۔ ''ست بھائی پہنچ کر پہلا کام یہ کروں گا کہ تیری شادی کرا دوں گا۔''

اچانک مجھے پولیس کی موبائل وین نظر آئی۔ وہ ہماری مخالف سمت میں جا رہی تھی۔

''میکے پترا! وہ تیرے مہربان گجرات کی طرف جا رہے ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یار تو ماجد خان سے مشورہ تو کر لے۔ ہو سکتا ہے اس کیس میں بھی تجھے ضمانت قبل از گرفتاری کی ضرورت پیش آئے؟''

میں نے سیل فون اس سے لیا اور پہلے ٹائم دیکھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اس وقت تک ماجد خان کورٹ سے فارغ ہو جاتا تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے ماجد خان کی بھاری آواز سنائی دی۔

''السلام علیکم خان صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں رفیق بول رہا ہوں۔''

''رفیق صاحب! آپ نے کیا سیل نمبر تبدیل کر لیا ہے؟''

''میرا سیل فون کہیں گم ہو گیا ہے۔'' پھر میں نے کہا۔ ''خان صاحب! آپ سے ایک مشورہ کرنا تھا۔'' میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

''اب بتائیے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''بھئی اس کیس میں تو آپ کے خلاف پولیس کو ایک ثبوت بھی مل گیا ہے لیکن آپ کے گریبان بھی کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ویسے آپ ضمانت قبل از گرفتاری کرا لیں۔''

''یہ کام تو آپ ہی کریں گے۔''

''ظاہر ہے، میں ہی کروں گا۔'' ماجد خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ کو لاہور آنا پڑے گا۔''

''میں حاضر ہو جاؤں گا خان صاحب! کیا آج ہی آ جاؤں؟''

''جی ہاں، آج ہی آ جائیں۔'' ماجد خان نے کہا۔ ''میں آج ہی ضمانت کی کوشش کروں گا۔ مجسٹریٹ سے گھر پر بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔''

میں نے سلسلہ منقطع کیا تو راجا نے کہا۔ ''کیا ماجد خان تجھے لاہور بلا رہا ہے؟''

''ہاں یارا!'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ میں آج ہی لاہور پہنچ جاؤں۔ وہ آج ہی میری ضمانت قبل از گرفتاری کی کوشش کریں گے۔''

''لیکن تو اس وقت لاہور تک جانے کی پوزیشن میں ہے؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''یار، جانا تو پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ پولیس مجھے حوالات میں پہنچا دے گی۔''

''فتح!'' راجا نے کہا۔ ''سیدھے لاہور چلو۔''

فتح نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ یوں بھی ہم جی ٹی روڈ پر چل رہے تھے۔

''میکے پترا! تو ایسا کر، کچھ دن کے لیے لندن چلا جا!''

''یار، میں کب تک یہ بھاگ دوڑ کرتا رہوں گا۔ حالات دونوں جگہ یکساں ہیں، لندن میں کب مجھے سکون ملا

انتباہ

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام مشمولات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے؟ وہاں سے پریشان ہو کر پاکستان آیا تو یہاں بھی وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب میں اس وقت تک لندن نہیں جاؤں گا جب تک اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ جاتا۔“

”یار، مجھے تو یہ خدشہ ہے کہ کہیں اونٹ سے پہلے ہم ہی نہ بیٹھ جائیں ہمیشہ کے لیے؟“ راجا نے ہنس کر کہا۔

”اب تخت ہو یا تختہ!“ میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ”دشمن ابھی تک ہم پر اس لیے وار کر رہے ہیں کہ ہم نے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ اپنی بقا کے لیے ہمیں بھی وہی ہتھکنڈے استعمال کرنا پڑیں گے۔ جو وہ ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ بس بہت ہو گیا راجا! اب مزید نہیں۔ وہ کیا سمجھتے ہیں، میں کم عقل ہوں، کمزور ہوں، بزدل ہوں، میرے پاس دولت یا افرادی قوت کی کمی ہے؟ میں انہیں بتاؤں گا کہ حفاظت کیسے کی جاتی ہے، اذیت کیا ہوتی ہے؟“

”ہوش میں آ جھلیا پتر!“ راجا نے تیز لہجے میں کہا تو میں ہوش میں آ گیا۔ میں شاید جذبات سے مغلوب ہو کر زور زور سے چیخنے لگا تھا اور اب بری طرح ہانپ رہا تھا۔

نیلم نے تھرماس سے پانی نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

”غنی!“ راجا نے کہا۔ ”سڑک کے کنارے کوئی بھی ہوٹل دیکھ کر گاڑی روک لو۔ ہم لوگ کچھ آرام کر کے آگے بڑھیں گے۔“

”نہیں راجا!“ میں نے کہا۔ ”ہم اگر اسی رفتار سے چلتے رہے تو دو گھنٹے میں لاہور پہنچ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ راجا میری بے آرامی کی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ وہاں رک کر بھی مجھے کون سا آرام مل جاتا۔

”تو مجھے بیٹھے بیٹھے تھک تو نہیں گیا ہے؟“ راجا نے پوچھا۔

”نہیں یار، میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔

غنی نے عقل مندی کی تھی کہ روانگی سے پہلے تھرماس میں چائے، پانی، کچھ بسکٹ اور چپس وغیرہ رکھ لیے تھے۔ ہم نے ایک پرسکون جگہ رک کر کھایا پیا۔ غنی نے گاڑی کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور تازہ دم ہو کر ہم لوگ پھر لاہور روانہ ہو گئے۔ مجھے بیٹھے بیٹھے اونگھ آ گئی۔

میری آنکھ گاڑی کے دھچکے سے کھل گئی۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا، میں اس وقت گاڑی ہی میں تھا۔ غنی خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ راجا کچھ اس انداز میں سیٹ پر بیٹھا تھا کہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اس وقت گاڑی کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھا۔ میرا سر نیلم کے شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ میں گھبرا کر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور نیلم سے پانی مانگا۔

”ہم کہاں پہنچ گئے غنی؟“ میں نے پانی پینے کے بعد پوچھا۔

غنی نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”سر! بس ہم لاہور پہنچ چکے ہیں۔“

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہے اس وقت تک سورج غروب نہیں ہوا تھا۔

”غنی!“ میں نے کہا۔ ”اسپیڈ کم کرو، اس رفتار سے چلو گے تو ٹریفک پولیس تو بعد میں پکڑے گی اور ممکن ہے اس کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ ہم میں سے کوئی اس قابل ہی نہیں ہوگا کہ پولیس ہمیں گرفتار کرے۔“

غنی نے رفتار کم کر دی۔

راجا ہنس کر بولا۔ ”ٹھیک کہتا ہے پتر! تیرا لہجہ روز بہ روز کڑوا نہیں ہوتا جا رہا ہے۔ او یار! تو تو بہت زندہ دل ہوا کرتا تھا۔ تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟“

”یار، جب مصیبتیں اور پریشانیاں کسی کا گھر دیکھ لیں، وہ مسلسل گردش میں ہو، اسے بار بار پولیس کی قید سے بچنے کے لیے ضمانت کرانا پڑے، تیرے خیال میں وہ بندہ زندہ دل رہ سکتا ہے؟ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے شک [illegible] ہے یہ جانتا اگر تو اتنا تنگ کر رہا ہے؟“ پھر میں چونک کر بولا۔ ”یار، ہم اس نیلم کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ اسے تو ست بدحالی پہنچا دیتے۔ ہماری وجہ سے یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہے۔“

”لاہور پہنچ کر اسے ست بدحالی بھجوا دوں گا۔ ابھی تو اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ......“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں نواب صاحب!“ نیلم نے کہا۔ ”مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ مجھے تو آپ کی خدمت کر کے خوشی ہو رہی ہے۔“

☆☆☆

ماجد خان نے میری حالت دیکھی تو حیران رہ گئے۔ ”رفیق صاحب! آپ کی کنڈیشن تو ٹھیک نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کر لیں۔“

”خان صاحب! میں اب اپنے ہوٹل جا کر ہی آرام کروں گا۔“

”میں نے اس قتل کے بارے میں معلوم کیا تھا۔“ ماجد خان ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”کچی بات تو یہ کہ ابھی تک لاش کی شناخت نہیں ہو سکی ہے کہ وہ شخص واقعی فریال کی ہے یا نہیں۔ آپ کا سیل فون اس شخص کے پاس ملا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے لیے پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔“

”لیکن سیل فون تو کئی دن پہلے مجھ سے گم ہو گیا تھا، میں نے اس کی رپورٹ بھی درج کرائی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ کئی دن پرانی ہے۔“ ماجد خان نے کہا۔ ”آپ نے ایف آئی آر تو ابھی درج کرائی ہے۔“

”ایف آئی آر چودہ تاریخ کو درج کرائی گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

ماجد خان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ ایف آئی آر چودہ تاریخ کو لکھوائی گئی ہے اور آپ پانچ دن سے گجرات میں تھے۔“

”جی ہاں، میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کی حالت اتنی خراب ہے۔“ ماجد خان نے تشویش سے کہا۔ ”نہ آپ نے یہ بتایا تھا کہ ایف آئی آر کب درج کی گئی ہے؟“

”تو کیا اب ان کی ضمانت قبل از گرفتاری نہیں ہو سکتی؟“ راجا نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ ماجد خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اسی لیے کہتے ہیں کہ وکیل اور ڈاکٹر سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔“

میں ایک دم پریشان ہو گیا۔ گویا اب مجھے پولیس کا عذاب بھی سہنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں پولیس سے بچنے کے لیے فرار ہو جاؤں۔ فرار ہو کے میں کہاں جا سکتا تھا اور کب تک بچ سکتا تھا۔ اس طرح تو خود کو مجرم ثابت کر دیتا۔

”خان صاحب!“ راجا نے کہا۔ ”کوئی راستہ تو ہوگا اس صورت حال سے بچنے کا؟“

”کوئی راستہ نہیں ہے۔“ ماجد خان نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر ہنس کر بولے۔ ”کیونکہ نواب صاحب کی ضمانت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“

”جی؟“ راجا نے چونک کر پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وکیل صاحب مسکرائے۔ ”بھئی، سیل فون کی ایف آئی آر چودہ تاریخ کو درج ہو چکی ہے، نواب صاحب گجرات میں موجود تھے۔ ان کی موجودگی کے گواہ کوئی عام افراد نہیں بلکہ خاص الخاص لوگ ہیں۔ ایک تو ہے ضلع کا حاکم، دوسرا وہاں کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال کا ایم ایس یعنی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ۔ ان کے علاوہ اسپتال کے دوسرے ڈاکٹر اور نرسیں ہیں۔ اسپتال کا ریکارڈ ہے اور ڈی پی صاحب کی بیگم ہیں۔ اتنے گواہوں کے ہوتے ہوئے پولیس آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔“

میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وقتی طور مجھے قید سے رہائی مل گئی ہو۔

”اب اگر نواب صاحب مجھے سب کچھ تفصیل سے بتا دیتے تو اس وقت آرام سے اپنی حویلی میں بیٹھے ہوتے۔“

ماجد خان مسکرایا۔

”جی ہاں، یہ میری غلطی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کہ میں نے آپ کو ایف آئی آر کی تاریخ نہیں بتائی۔“

”جی ہاں۔“ ماجد خان نے کہا۔ ”اگر آپ بتا دیتے تو میں اسی وقت آپ سے کہہ دیتا کہ آپ بے خوف و خطر ہو کر گھومیں۔ پولیس آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ.......“

”نہیں خان صاحب! غلطی میری ہے۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے اجازت دیں۔“

”چائے تیار ہے، آپ مجھے میزبانی کا شرف نہیں بخش رہے۔ کم سے کم میرے ساتھ چائے تو پی لیں۔“

چائے خاصی پرتکلف تھی۔ میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا، اس لیے مجھے چائے بھی اچھی لگ رہی تھی اور دوسرے لوازمات بھی۔

ماجد خان نے چائے پیتے ہوئے اچانک کہا۔ ”بھئی نواب صاحب! آپ کی بیگم تو بہت تکلف کر رہی ہیں۔“ اس نے نیلم سے کہا۔ ”آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔“

”خان صاحب!“ میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”یہ میری بیگم نہیں ہیں۔“

”اوہ نہیں!“ ماجد خان چونک کر بولا۔ ”سوری.... آئی ایم ریئلی سوری.... ایکچولی....“

”اٹس آل رائٹ خان صاحب!“ میں نے ہنس کر کہا تاکہ ان کی شرمندگی کچھ کم ہو۔

”مجھے واقعی افسوس ہے۔“ ماجد خان نے کہا۔ ”آپ کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہے، بہرحال....“ وہ نیلم کی طرف مڑے۔ ”بیٹا، مجھے افسوس ہے۔“

نیلم کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ماجد خان اس کی طرف مڑا تو گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے چائے چھلک کر کپڑوں پر گر گئی۔

اس سے پہلے کہ ماجد خان مزید شرمندہ ہوتا، میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”خان صاحب، اب اجازت دیں۔ اتنی اچھی اور پرتکلف چائے کا بہت شکریہ۔ اب آپ بھی کسی دن ست بدحالی آ جائیں، میں آپ کو وکیل کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست، ایک خیر خواہ کی حیثیت سے بلا رہا ہوں۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں خود بھی کچھ دن ست بدحالی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میں بھی دن رات کی اس مصروفیت سے بہت تھک گیا ہوں۔ جوں ہی موقع ملا میں ست بدحالی آ جاؤں گا۔"

وہ ہمیں رخصت کرنے گاڑی تک آیا اور نیلم سے بولا۔ "ہماری بیگم اس وقت موجود نہیں ہیں ورنہ آپ کو اتنی بوریت نہ ہوتی۔"

نیلم نے سر جھکا لیا۔ وہ خود بھی حیران پریشان تھی کہ اتنا بڑا وکیل اس سے اس انداز میں بات کر رہا ہے۔ ورنہ بے چاری تو حویلی میں ملازموں کی طرح رہتی تھی بلکہ اس سے تو بیگم ہی اچھی تھی۔ اس کے ساتھ تو کوئی بھی اتنا بے تکلف نہیں تھا۔

گنی نے گاڑی فلیٹیز کے سامنے روک دی اور بولا۔ "آیئے سر!"

"تم پہلے کمرے تو بک کراؤ۔" راجا نے کہا۔

"میں کمرے بک کرا چکا ہوں۔" گنی نے کہا۔ "جس وقت آپ لوگ وکیل صاحب کے ساتھ چائے پی رہے تھے، میں نے فون کر کے کمرے بک کرا لیے تھے۔"

ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں پہنچ کر میں ایسا سویا کہ پھر اردگرد کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ میں نے تو روم سروس سے رات کا کھانا بھی نہیں منگوایا۔ میری آنکھ کھلی تو طبیعت خاصی گری گری سی تھی۔ میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں تقریباً بارہ گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔ ہاتھ میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ زخم تو میرے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ گجرات کے ڈاکٹر نے جو دوائیں مجھے کھلا دی تھیں، وہ بھی میں نے نہیں کھائی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "کون؟"

"کھولیے، میں ہوں راجا!" باہر سے راجا کی آواز آئی تو میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

راجا کمرے میں آ کر بولا۔ "کیا بات ہے ہیلے، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بخار تو نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "تو نے کل دوا بھی تو نہیں لی۔"

"یار کل تو میں اتنا تھک گیا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی ایسا غافل ہو گیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اب جلدی سے تیار ہو جا۔ میں نے روم سروس کو ناشتے کے لیے کہہ دیا ہے۔ گنی نے کئی مرتبہ تیرے کمرے کے چکر لگائے لیکن وہ لوگ دستک دینے کی جرأت نہ کر سکے۔"

میں باتھ روم سے نکلا تو ناشتا آ چکا تھا۔ کمرے میں راجا کے علاوہ نیلم بھی موجود تھی۔ اس وقت وہ خاصی نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "نواب صاحب! آپ ناشتا کر لیں تو میں آپ کو دوائیں دے دوں۔ میں نے گنی سے دوائیں منگوائی ہیں۔"

ہم ناشتا کر ہی رہے تھے کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، پھر باہر سے گنی کی آواز سنائی دی۔ "آپ لوگ پیچھے انتظار کریں۔ نواب صاحب اس وقت ناشتا کر رہے ہیں۔"

"اوئے ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ بیٹھے انتظار کرتے رہیں، سامنے سے ہٹ!" کوئی درشت لہجے میں بولا۔

راجا نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور دروازے کی طرف لپکا، باہر سے اس کے زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی۔ "آپ لوگ اوپر کیسے آئے؟ میں منیجر سے بات کرتا ہوں، یہاں شرفا کی کوئی عزت ہی نہیں ہے۔ آپ ٹھہریں، نواب صاحب اس وقت مصروف ہیں۔ وہ خود آپ کو بلا لیں گے۔ پولیس افسر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ جب چاہیں، کسی معزز آدمی پر چڑھ دوڑیں۔"

میں نے سیل فون نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، پھر مجھے خیال آیا کہ سیل فون تو میرے پاس ہے ہی نہیں۔

راجا غصے میں بھرا ہوا اندر آیا اور مجھ سے بولا۔ "ایک پٹر اوہ تیرے سر لے آئے ہیں۔"

"انہیں اپنے کمرے میں بٹھا، میں وہیں آ رہا ہوں۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یار! میں نے اس ڈی سی کا سیل نمبر بھی نہیں لیا۔ ورنہ میں اسی سے بات کرتا۔"

"تو فکر مت کر۔" راجا نے کہا۔ "میں نے گجرات کے ڈی پی او کا نمبر بھی لے لیا تھا۔"

گنی نے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ ناصر صاحب آئے ہیں۔ میں نے ناصر کو فوراً اندر بلا لیا۔

"سر! آپ تو گجرات میں تھے، یہاں کب آئے؟"

"ہم لوگ یہاں کل پہنچے تھے۔" میں نے کہا، پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت غور سے میری بات سنتا رہا۔

"باہر پولیس کا ایک انسپکٹر اور ڈی ایس پی یہاں پہنچ گئے ہیں۔" راجا نے کہا۔

"پولیس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔" ناصر نے کہا۔ "آپ کے پاس جائے واردات سے دور ہونے کے اچھے

ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ پولیس آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

وہ اور راجا اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ جاتے جاتے راجا نے کہا۔ "یار! جب تک میں تجھے نہ بلاؤں تو میرے کمرے میں مت آنا۔"

نیلم کچھ ہراساں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ تم تو مجھے دوائیں دینے والی تھیں۔"

"جی، میں ابھی لاتی ہوں۔" نیلم نے کہا۔ "پولیس کا آنا اچھی علامت نہیں ہوتا ہے صاحب جی!" اس نے پہلی دفعہ مجھے ریشم کی طرح صاحب جی کہا۔ "پولیس ہمارے گھر جب بھی آتی تھی، بابا کو لے جایا کرتی تھی۔"

"تم پریشان مت ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ دوائیں لینے چلی گئی۔ میں اس سے کیسے کہتا کہ تمہارا بابا ایک جرائم پیشہ آدمی تھا، گھٹیا درجے کا بدمعاش تھا۔ میں نواب رفیق احمد شیرازی ہوں، مجھ میں اور اس میں بہت فرق ہے۔

دوا کھانے کے بعد میں اخبار پڑھتا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد گنی کے بجائے راجا خود ہی آیا اور بولا۔ "ایک پٹر ا میں نے اس ڈی ایس پی سے کہہ دیا ہے کہ نواب صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے انہیں زیادہ ڈسٹرب مت کرنا۔"

"یہ پولیس آئی کس سلسلے میں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں موجود ہوں؟"

"یار! وہ لوگ اس سازش کے پیچھے ہیں، وہ خاصے باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ تو نے ماجد خان سے ملاقات کی ہے۔ تو بستر پر لیٹ جا، میں اس صورت حرام ڈی ایس پی کو یہاں بھیجتا ہوں۔"

وہ ڈی ایس پی کمرے میں آیا تو میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور نیلم میرے سرہانے کھڑی تھی۔

ڈی ایس پی نے ایک نظر نیلم پر ڈالی، پھر میری طرف بڑھا اور بولا۔ "رفیق احمد شیرازی آپ ہیں؟"

"نواب رفیق احمد شیرازی!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "کہو کیا کام ہے؟"

"آپ منگل کی رات کو کہاں تھے؟" ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"واٹ؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "اس سوال کا مقصد؟"

"مقصد بھی سمجھ میں آ جائے گا نواب صاحب!" وہ چبا چبا کر بولا۔ اس کا چہرہ کسی بل ڈاگ کی طرح لٹکا ہوا تھا، آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ میں نے اس سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔

میں نے نیلم سے پوچھا۔ "ہم منگل کی رات کو کہاں تھے؟"

"سر! آپ منگل کی رات کو گجرات کے ڈی سی افتخار صاحب کے ساتھ تھے۔" نیلم نے یوں کہا جیسے واقعی وہ میری پی اے ہو۔ حویلی میں رہ کر اسے بات کرنے کا سلیقہ تو آ گیا تھا۔ ریشم کے مقابلے میں وہ زیادہ ذہین اور پڑھی لکھی تھی، ہر بات سیکھنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔

"ہاں، ہم منگل کی رات کو گجرات میں تھے۔" میں نے ڈی ایس پی کو بتایا۔

اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ "ابھی افتخار صاحب بھی یہاں آنے والے ہیں۔" میں نے اسے مرعوب کرنے کو کہا۔ "تم ان ہی سے پوچھ لینا آفیسر کہ ہم کہاں تھے؟"

"آپ کا سیل فون کہاں ہے؟" اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سیل فون!" میں نے سوچنے کی اداکاری کی۔ "ہاں، کیا ہمارا سیل فون مل گیا؟"

"کیا مطلب!" ڈی ایس پی کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھئی وہ ہم سے کہیں گم ہو گیا تھا۔ وہ بہت مہنگا سیٹ تھا۔ ہم نے تو اس کی رپورٹ بھی درج کرائی تھی۔"

"رپورٹ درج کرائی تھی؟" ڈی ایس پی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ "رپورٹ کی کاپی تو ہوگی آپ کے پاس؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"واٹ ڈو یو مین آفیسر!" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "رپورٹ درج کرائی ہے تو اس کی کاپی بھی ہوگی۔ تمہیں کوئی شک ہے؟"

"مجھے وہ کاپی دکھائیں گے آپ؟"

"لیکن تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے آفیسر؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیا ہمارا سیل فون مل گیا ہے؟"

"جی ہاں!" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "آپ کا موبائل فون مل گیا ہے۔"

"مل گیا ہے تو ہمارا سیکریٹری یا چیف سیکیورٹی آفیسر لے آئے گا یا تم سیل فون لائے ہو آفیسر!"

"آپ کا سیل فون اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ وہ ایک لاش کے پاس پڑا ملا تھا؟"

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ "لاش کو سیل فون کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"وہ ایک مقتول کی لاش تھی نواب صاحب!"

"اوہ!" میں نے تشویش کا مظاہرہ کیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کا قاتل، چور بھی تھا۔ اسی نے ہمارا سیل فون چرایا ہوگا۔" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "ایف آئی آر کی کاپی ہمارے سیکریٹری کے پاس ہوگی۔" میں نے نیلم سے کہا۔ "ذرا ہمارے سیکریٹری کو بلا لاؤ۔" اس کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ میری بات سمجھ نہیں سکی کہ میں سیکریٹری کسے کہہ رہا ہوں۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے کہا۔ "راجا صاحب اپنے کمرے میں ہوں گے یا باہر کوریڈور میں ہوں گے۔"

تھوڑی دیر بعد راجا کمرے میں داخل ہوا۔ "یس سر!"

"سیکریٹری، ڈی ایس پی کو وہ رپورٹ دکھاؤ جو ہم نے گجرات میں درج کرائی تھی۔"

"سیکریٹری!" ڈی ایس پی اچھل کر بولا۔ "آپ تو صحافی ہیں جناب؟"

"ہاں، میں صحافی ہوں۔ کیا کوئی صحافی قانونی طور پر کسی کا سیکریٹری نہیں ہو سکتا؟" راجا نے سر جھکا کر پوچھا۔ "میں جرنلسٹ بھی ہوں اور سیکریٹری بھی، آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں جناب!" ڈی ایس پی جلدی سے بولا۔ "مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا۔"

"میں رپورٹ لے کر آتا ہوں۔" راجا کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ ڈی ایس پی ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک دفعہ بھی اس سے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ یوں بھی وہاں ایک ہی کرسی تھی جس پر نیلم بیٹھی تھی۔ وہ دراصل سویٹ تھا۔ اس کے سامنے والے حصے میں ایک صوفہ سیٹ اور کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈی ایس پی کا بس چلتا تو مجھے وہیں سے گھسیٹتا ہوا تھانے لے جاتا۔ میں اس سے بیٹھنے کو کہتا بھی کیوں؟ وہ لوگ تو اچھے خاصے شریف آدمی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے اتنا تشدد کرتے ہیں کہ وہ ہر جرم کا اعتراف کر لیتا ہے۔

راجا نے واپسی میں خاصی دیر لگا دی تھی۔ ڈی ایس پی جتنی دیر کھڑا رہا، بری طرح پیچ و تاب کھاتا رہا۔ میں بھی بے نیازی سے بظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ میں کن انکھیوں سے ڈی ایس پی کو دیکھ لیتا تھا۔

راجا نے واپس آ کر ایف آئی آر کی فوٹو کاپی اس کے حوالے کر دی۔

"فوٹو کاپی!" ڈی ایس پی نے غور سے رپورٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، اصل رپورٹ میرے پاس موجود ہے۔" راجا نے اسے اصل کاپی دکھاتے ہوئے کہا۔

اس نے غور سے وہ رپورٹ دیکھی، پھر اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات ظاہر ہونے لگے۔

میں نے اس کے غبارے کی ہوا بالکل نکالنے کو کہا۔ "سیکریٹری! آئی جی صاحب نے کب آنے کا کہا ہے؟"

"سر! وہ بس آنے ہی والے ہیں۔"

"گڈ!" میں نے کہا۔ "ڈی ایس پی صاحب! آپ آئی جی صاحب سے مل کر ہی جائیے گا۔"

"سوری سر!" ڈی ایس پی نے کہا۔ "میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"یہ بھی بتا دو افسر کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"سر! ظاہر ہے، مجھے اوپر سے حکم ملا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ قتل کا مفرور ملزم رفیق شیرازی اس وقت فلیٹیز کے اس کمرے میں موجود ہے...... لیکن سوری سر! مجھے غلط بتایا گیا تھا۔ مجھے اجازت دیں۔"

"اپنے آئی جی سے تو ملتے جاؤ افسر!" میں نے کہا۔ "میں ان سے بھی پوچھوں گا کہ پولیس محض شبے کی بنیاد پر کسی کو بھی گرفتار کرنے کی مجاز کب سے ہو گئی؟" میں نے کچھ توقف سے کہا۔ "یہاں تو آپ احکامات دے گئے کہ فلاں آدمی کو پکڑ لاؤ۔ کیا آپ نے ثبوت کی ضرورت محسوس نہیں کی افسر؟"

"سر! مجھے استعمال کیا گیا ہے۔" ڈی ایس پی نے آہستہ سے کہا۔ "کیس میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں پہلے تفتیش کرتا اس کے بعد ہی کسی پر ہاتھ ڈالتا۔ ایک پولیس پارٹی کل ست بدھالی گئی تھی۔ آپ وہاں نہیں تھے تو ان لوگوں نے فرض کر لیا کہ آپ فرار ہو چکے ہیں۔ ایک دفعہ پھر معذرت سر!" اس نے ایف آئی آر کی کاپی تہ کر کے جیب میں رکھی اور باہر نکل گیا۔

"شکیے پترا! یہ تو بہت آسانی سے ٹل گیا۔" راجا نے کہا۔ "ناصر نے تو پولیس کے کچھ لوگوں کو بھی ملا رکھا ہے۔ خیر، میں انہیں جانے پا کر روانہ کرتا ہوں۔" راجا باہر نکل گیا۔ میں نے کسی کو بلا کر کہا کہ مارکیٹ سے سیل فون لے آئے۔ پھر نیلم سے میں نے کافی منگانے کو کہا۔

نیلم نے روم سروس کو فون پر کافی لانے کو کہا۔

مجھے پھر اس کی صلاحیت کا معترف ہونا پڑا۔ وہ بے چاری چھوٹے سے ایک گاؤں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ شاید لاہور بھی پہلی دفعہ آئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بھی کوئی فائیو اسٹار ہوٹل باہر سے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اس نے صرف ایک مرتبہ راجا کو فون پر روم سروس سے ناشتا منگواتے دیکھا ہوگا یا ممکن ہے رات کے وقت اسے کسی نے بتایا ہوگا کہ روم سروس سے رابطہ کیسے کیا جاتا ہے۔

اس وقت اس نے بہت اعتماد سے فون پر بات کی تھی۔

اچانک میرے اندر سے آواز آئی۔ "نواب رفیق احمد شیرازی صاحب! آپ کو اس لڑکی سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ اگر وہ ذہین ہے تو آپ سے کیا تعلق؟"

"مجھ سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس نے میری جان بچائی ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے۔"

"جان تو اس نے کچھ دن پہلے ہی بچائی ہے۔ آپ تو اس سے پہلے بھی ہمدردی کرتے رہے تھے۔"

میں نے نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نظریں ملیں تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے خیالات پڑھتی رہی ہو۔

اس موقعے کے لیے راجا کہتا تھا کہ شکیے پترا تو انگریزی میں سوچا کر تاکہ عام آدمی سمجھ ہی نہ سکے۔

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ نیلم نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر خود بھی مسکرانے لگی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو نیلم اٹھ کر دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔ روم سروس کا ویٹر کافی لے کر آیا تھا۔ ہم کافی پی رہے تھے کہ راجا آ گیا اور بولا۔ "شکیے پترا! کیا اب زندگی بھر یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"یہ بات تو میں تجھ سے پوچھنے والا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں تو خود فوراً ست بدھالی جانا چاہتا ہوں۔"

نئی سیل فون اور سم لے آیا تھا۔

ہم لوگ ست بدھالی کے لیے روانہ ہوئے تو دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔

☆☆☆

ہم ست بدھالی پہنچے تو سب سے پہلے شہناز نے ہمیں دیکھا، پھر نور اور ڈاکٹر شہلا آ گئیں۔ نور مجھے دیکھ کر رونے لگی۔

"رفیق! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ میں اب یہاں نہیں رکوں گی۔ میں کل ہی تمہیں اپنے ساتھ لندن لے جاؤں گی۔" شہناز نے زخم دیکھ لیے تھے۔ "نور! مجھے ان کا زخم تو دیکھنے دو۔ مجھے خدشہ ہے کہ انفیکشن نہ ہو گیا ہو۔"

پھر ڈاکٹر حسن، شہناز اور ڈاکٹر شہلا کے مشترکہ طبی بورڈ نے میرا چیک اپ کیا اور متفقہ طور پر رائے دی کہ انفیکشن نہیں ہوا ہے لیکن مریض کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔

ڈاکٹر حسن نے میرا زخم اچھی طرح صاف کر کے اس پر پٹی کی اور بولا۔ "آپ کا زخم بہت تیزی سے مندمل ہو رہا ہے نواب صاحب! بس تھوڑی سی احتیاط کریں۔"

"میں تو پوری احتیاط کر رہا ہوں ڈاکٹر صاحب!" میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن مصروفیتیں اور پریشانیاں میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔"

"آپ کچھ دن کے لیے حویلی سے بالکل باہر نہ نکلیں۔" ڈاکٹر حسن نے کہا۔

میں اپنے کمرے میں آیا تو نور وہاں پہلے سے میری منتظر تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "رفیق! آخر ایسی زندگی ہم کب تک جیتے رہیں گے؟ اس سے اچھے تو ہم لندن میں تھے۔"

"نہیں نور!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میں بھی اپنے دشمنوں سے اسی طرح پیش آؤں گا۔ وہی سازشیں اور ہتھکنڈے استعمال کروں گا جو وہ میرے

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خلاف کرتے آئے ہیں۔ اگر بڑی محاورے کے مطابق اب میں ان ہی کے سکوں میں انہیں ادائیگی کروں گا۔ بہت شرافت ہوگئی۔ اب مزید نہیں۔"

"لیکن تم ان گھٹیا لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے رفیق!" نور نے کہا۔

"ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے خود بھی ان جیسا بننا پڑے گا تو پرابلم، میں ان جیسا بن جاؤں گا۔"

میں نے واقعی فیصلہ کرلیا تھا کہ اب میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ میں اس راٹھا اور اس کے خاندان پر زندگی حرام کردوں گا۔

یہی سب سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو ذہن ہلکا پھلکا اور طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ میں چہل قدمی کے لیے باغ میں نکل گیا۔ میری حالت کل سے قدرے بہتر تھی۔ مجھے پھولوں کے ایک کنج کے پاس نیلم نظر آئی۔ اس نے جھک کر مجھے سلام کیا اور حسرت سے مجھے دیکھا۔ میں جب سے واپس حویلی میں آیا تھا، نیلم سے ایک دفعہ بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ اچانک اس کی وہ اہمیت ختم ہوگئی تھی۔ اب وہ پھر حویلی کی عام سی ملازمہ تھی۔

میں نے ہنس کر پوچھا۔ "کیسی ہو نیلم؟"

"میں ٹھیک ہوں صاحب جی!" اس نے جواب دیتے ہوئے پھر میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے پھر وہی چمک نظر آئی تھی۔ میں ٹہلتا ہوا صوبیدار میجر صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہ دیر تک میری خیریت معلوم کرتے رہے۔ اچانک مجھے رابعہ کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دلاور کا خیال بھی آیا۔

میں نے گلی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا کیونکہ تہ خانے کی چابیاں اسی کے پاس تھیں۔ وہ نزدیک ہی تھا، میرے اشارے پر فوراً آگیا۔

رابعہ فرش پر گٹھری بنی سو رہی تھی۔ ان دنوں بہت شدید سردی پڑ رہی تھی۔ اسے گلی نے بستر بھی فراہم کیا تھا لیکن تہ خانے میں تو کچھ زیادہ ہی سردی تھی۔

گلی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اس نے چونک کر لحاف سے منہ باہر نکالا۔ اسے دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور چہرے پر ایک وحشت سی تھی۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "کیسی ہو رابعہ؟"

"تمہیں یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" وہ زہر میں بجھے لہجے میں بولی۔

"چلو یہ بتادو کہ تم نے مجھے دھوکے سے وہاں کیوں بلایا تھا؟"

"معلوم کرسکتے ہو تو کرلو۔" اس نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "اب تک میں نے سنا تھا یا کتابوں میں پڑھا تھا کہ دولت اور جاگیرداری کی خاطر لوگ اپنے اور پرائے کی تمیز بھول جاتے ہیں۔ تم نے تو وہ سچ کر دکھایا۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ابھی اچھی طرح جانتی ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟"

"وہ تو تمہارے عمل کا ردعمل تھا۔ میں نے بچپن سے صرف تمہارے خواب دیکھے تھے رفیق! خاندان کے بڑوں نے میرے ذہن میں یہی بٹھایا تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہوگی۔"

"بڑوں نے نہیں، صرف تمہاری ماں نے۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ تم لندن سے آئے تو اس گھٹیا عورت فریال کے عشق میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے برداشت کرلیا لیکن جب اس نے تمہیں دھوکا دیا، تب بھی تم نے میری قدر نہ کی۔"

"تم یہ سب کچھ کیوں دہرا رہی ہو؟" میں نے بیزاری سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں آج بھی تمہیں چاہتی ہوں۔" رابعہ نے وحشت بھرے انداز میں کہا۔

"بہت خوب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم تو اس مصرعے کی تفسیر بنی ہوئی ہو کہ میں جس سے پیار کرتا ہوں، اسی کو ماردیتا ہوں۔ تم مجھے چاہتی ہو؟" میں نے اچانک پوچھا۔ "تو مجھے بتاؤ کہ دلاور کون ہے۔ اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟" رابعہ نے کہا۔ "اگر میں نے سب کچھ بتادیا تو کیا تم مجھ سے شادی کرلوگے؟" اس نے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "تم مجھ سے ایک دفعہ وعدہ کرلو رفیق! جھوٹا ہی سہی!"

"تم جانتی ہو رابعہ کہ میں جھوٹے وعدے نہیں کرتا۔ ہاں، یہ وعدہ کرسکتا ہوں کہ اگر تم غیر مشروط طور پر مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو تو میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور تمہاری باقی زندگی بھی عیش و آرام سے گزرے گی۔"

"نہیں ڈیئر کزن!" رابعہ نے تلخی سے کہا۔ "اس سے بہتر ہے کہ تم مجھے ماردو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" رابعہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اوکے، مت بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "پھر زندگی بھر یہیں سڑتی رہو۔"

میں تہ خانے سے واپس آگیا۔

تہ خانے سے باہر نکلا تو راجا باغ میں بیٹھا تھا۔ اس کے نزدیک ہی شہناز کھڑی تھی۔ شہناز نے مجھے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ "اوہو، آج تو نواب صاحب کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔"

"تم جیسے ڈاکٹر ہوں تو کوئی کیسے بیمار رہ سکتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم دونوں شاید کسی اہم موضوع پر مذاکرات کررہے تھے۔ سوری، میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ اپنے مذاکرات جاری رکھو، میں کمرے میں جارہا ہوں۔"

"تو نے تو ہماری پوری زندگی کو ڈسٹرب کررکھا ہے۔" راجا نے منہ بنا کر کہا۔ "تو صرف مذاکرات کی بات کررہا ہے لیکے پتر!"

"ہاں یار! مجھے احساس ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کہ میری وجہ سے تمہیں بہت زیادہ پریشانی ہوئی ہے۔ اب اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ......"

"کہ مجھے مرغا بنا کر اوپر سے دو من وزن رکھ دیا جائے۔" راجا نے جھنا کر کہا۔ "مجھے ہو کیا گیا ہے لیکے پتر! تو اتنا قنوطی کب سے ہوگیا ہے؟"

"بات قنوطی ہونے کی نہیں ہے راجا!" مجھے واقعی احساس ہے کہ میری وجہ سے تم لوگوں کا پروگرام چوپٹ ہوگیا۔ اب تم لوگ پہلی فرصت میں شادی کرلو۔"

"تو پاگل تو نہیں ہوگیا ہے لیکے پتر؟" راجا نے آنکھیں نکالیں۔

"رفیق ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔" نوری کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب وہاں آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

"تم بھی اسی کی زبان بولنے لگیں میڈم نور جہاں!" راجا نے کہا۔

"یار! یہ بکھیڑے تو چلتے ہی رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک کے بعد دوسری پریشانی کھڑی ہوجاتی ہے۔ یہ سب پریشانیاں زندگی کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔ تو پھر دوسرے کام کیوں روکے جائیں۔"

"ہاں، جب مغل بادشاہ کسی جنگ پر بھی جایا کرتے تھے تو ان کا حرم بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ کئی شہزادے اور شہزادیاں تو میدان جنگ میں پیدا ہوئے ہیں۔" راجا نے ہنس کر کہا۔ "لیکن شکر ہے میں مغل ہوں نہ ہی شہزادہ۔"

"تو راجا تو ہے۔ برصغیر کے راجے مہاراجے بھی اس فعل میں کسی طور کم نہیں تھے۔ بس تو شادی پر راضی ہوجا، تیاری تو ساری میں کروں گا۔"

"ابھی میرا پیٹ خالی ہے۔" راجا نے ہنس کر کہا۔ "اس لیے میرا ذہن کام نہیں کررہا ہے۔ اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔"

"راجا! میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"پہلے تو ٹھیک ہوجا، پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔" راجا نے کہا۔ "تو آج صبح اٹھ کیسے گیا؟"

"موضوع بدلنے کی کوشش مت کر راجا!" میں نے کہا۔

"تو الیکشن جیت جا...... پھر میں شادی کروں گا۔"

"اور اگر میں الیکشن ہار گیا؟" میں نے کہا۔ "یا میرے دشمنوں نے مجھے الیکشن میں کھڑا ہی نہ ہونے دیا تو؟ نہیں راجا! یوں کام نہیں چلے گا۔"

"میرا مطلب ہے کہ تو الیکشن سے فارغ ہوجا، اس وقت تک صورت حال واضح ہوچکی ہوگی۔ تیرے الیکشن میں حصہ لینے یا نہ لینے، دونوں صورتوں میں تو الیکشن اور دشمن تیرا پیچھا چھوڑ چکے ہوں گے۔"

"یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"لیکے پتر! تو شاید بھول گیا کہ میں ایک صحافی بھی ہوں اور سیاسی تجزیہ کار بھی!" راجا نے ہنس کر کہا۔ "تو نے الیکشن میں حصہ لیا اور جیت گیا تو تیرے دشمن خود ہی مایوس ہوجائیں گے۔ اگر تو الیکشن ہار گیا تو بھی ان کی یہ دشمنی برقرار نہیں رہے گی۔ اپنی جیت سے انہیں یقین آجائے گا کہ تجھ سے انہیں کوئی خطرہ نہیں، وہ آئندہ الیکشن تک تیری طرف سے بے پروا ہوجائیں گے۔"

"میں جانتا ہوں اور تو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے لیکن چل، میں تیری بات مان لیتا ہوں۔ الیکشن بھی اب کون سے دور ہیں؟" میں نے کہا۔

راجا کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا، اسکرین پر نظر ڈالی، پھر خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "یہ کس کا نمبر ہے؟" اس نے سیل فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگالیا۔ "ہیلو...... جی ہاں موجود ہیں...... آپ کون؟...... ہاں ان کا سیل فون گم ہوگیا تھا...... آپ اپنا نام تو بتایئے...... جی...... مجھے نہ بتائیں...... لیجیے نواب صاحب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بات کیجیے۔'' اس نے سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نہ جانے کون ہے۔ اپنا نام کیں بتا رہا ہے، تجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگالیا۔ ''ہیلو!''

''نواب صاحب؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''جی ہاں، میں رفیق بول رہا ہوں، آپ کون؟''

''میں شاکر بول رہا ہوں نواب صاحب!''

''کون شاکر؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے، میرے بارے میں جاننے کے لیے آپ بے چین تھے، اب پوچھ رہے ہیں کہ کون شاکر؟''

''کام کی بات کرو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''کام کی بات یہ ہے کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ملنا چاہتے ہو تو سیدھے آجاؤ ملنے۔'' میں نے کہا۔

''میں اس وقت وہاں نہیں آسکتا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو لاہور آنا پڑے گا۔''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں لاہور نہیں آسکتا۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیے، بات آپ کے فائدے کی ہے۔'' شاکر نے کہا۔

''آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں ایک دو دن انتظار کروں گا۔'' اس نے کہا۔

''شاکر صاحب مجھے معمولی نزلہ بخار نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں زخمی ہوں، مجھے گولی لگی ہے۔''

''او، مجھے افسوس ہے۔'' شاکر نے کہا۔

''آپ کو اتنا ہی ضروری کام ہے تو یہاں کیوں نہیں آجاتے؟ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ کو کس بات کا خوف ہے؟''

''شاکر نے کسی سے خوف زدہ ہونا نہیں سیکھا ہے نواب صاحب!'' وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''میری اپنی کچھ مجبوری ہے۔''

''تو پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں، میری بھی مجبوری ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ خود نہیں آسکتے تو اپنے کسی آدمی کو یہاں بھیج دیں۔''

''نواب صاحب، میرا کوئی آدمی اس قابل نہیں ہے کہ آپ سے بات کرسکے۔''

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''او کے، میں انتظار کروں گا۔''

میں نے فون بند کردیا۔

''کون تھا؟'' راجا نے پوچھا۔

''کوئی شاکر تھا۔'' میں نے کہا۔

''شاکر!'' راجا نے کہا، پھر چونک کر بولا۔ ''یہ کہیں ایسا ہی شاکر تو نہیں جو دو ر کا خاص آدمی ہے؟ جس کے بارے میں ایس پی کہہ رہا تھا کہ اس نے تجھ پر حملہ کیا تھا۔''

''ہاں۔'' مجھے یاد آگیا۔ اس پی کی شاکر کی بات کر رہا تھا کہ میں اسے شناخت کروں۔

''یار! اسے مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ تو وہ خود ہی بتا سکے گا۔'' راجا نے کہا۔

''اس کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہورہا تھا کہ اسے میرے زخمی ہونے کا علم نہیں ہے۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا ہوتا تو اسے علم بھی ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ ضروری تو نہیں ہے۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ''اسے پتے معلوم ہوسکتا تھا کہ کس کی فائرنگ سے نواب صاحب زخمی ہوئے ہیں۔ اس نے کسی کی شکل تو نہیں دیکھی ہوگی۔''

''لیکن وہ یہاں آنے سے خوف زدہ کیوں ہے؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں؟'' راجا نے کہا۔ ''یہ تو اس سے مل کر ہی معلوم ہوگا۔''

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں خود چونک اٹھا۔ یہ میرا اپنا نمبر تھا۔ اس کے بارے میں سوائے گل اور راجا کے کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

میں نے سیل فون جیب سے نکالا اور کان سے لگا کر بولا۔ ''ہیلو!''

''سر، بہت گڑبڑ ہوگئی ہے۔'' گل کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''کیسی گڑبڑ؟'' میں نے پوچھا۔

''سر، وہ رابعہ...''

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

جواب میں گل نے کچھ کہا لیکن میری سمجھ میں نہ آیا، میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

یہ پر پیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ماریٹا قیدرپی کار ڈرائیو کرتے ہوئے ایک مکان تک پہنچ گئی تھی۔ وہ تقریباً پچیس سال کی دلکش عورت تھی۔ اس کا گول چہرہ اور حسین نقوش دیکھنے والوں کو متاثر کرتے تھے۔ متناسب سراپا اور اس کے شانوں پر سرسراتے بھورے بال اسے اور بھی جاذب نظر بناتے تھے۔ اس نے سفید بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ آخر اسے مطلوبہ مکان نظر آگیا۔ اس نے کار مکان کی دوسری طرف سڑک کے کنارے روک دی اور اتر کر مکان کے سامنے آگئی۔ اسے لکڑی کی باڑھ کی دوسری طرف نظر آنے والے چھوٹے سے جاپانی انداز کے خوبصورت باغ نے متاثر کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس باغ کی پوری طرح دیکھ بھال کی جاتی تھی، کہیں کوئی مرجھایا ہوا پتا یا سوکھی گھاس کا تنکا نظر نہیں آرہا تھا۔ اگرچہ

اپنا گھر

مریم کے خان

انسان مکان بنا کر بھول سکتا ہے مگر جب... مکان کو گھر بنا لیتا ہے تو اس میں اپنا خون جگر شامل کرتا ہے... اس کا چپا چپا اچھا ہے اور بے شمار یادوں کے حصار میں رہتا ہے اور جب اس سے جدائی کا لمحہ اس کے علم میں آجائے تو یادوں کا یہی حصار اسے اپنا قیدی بنا لیتا ہے۔ ایسا ہی اذیت ناک لمحہ جب اس کی زندگی میں در آیا تو اس سے ہٹ کر ایک سانس لینا بھی اسے منظور نہ تھا۔

مغربی معاشرے کی کربناک عکاسی..... ایک ستم رسیدہ کا غم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خزاں کا موسم شروع ہو گیا تھا اور وہ وہاں سے سرد ہوا چل رہی تھی لیکن یہ خزاں ابھی اس باغ تک نہیں آئی تھی۔ ایک لمحے کو اسے شبہ ہوا کہ وہ غلط جگہ آ گئی ہے۔ یہ گھر یقیناً اس خاتون کا نہیں ہے جس سے وہ ملنے آئی تھی، بلکہ یہ پتا درست ہو گا کہ مارینا کو اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔

مکان چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا تھا۔ سامنے باغ کے علاوہ دائیں بائیں دو چھوٹی گلیاں تھیں اور پورچ ایک بار ابھی نظر آ رہا تھا۔ دائیں طرف باغ میں ایک چھوٹے سے پنجرے میں چڑیاں پر مارے بند، سریلی آوازیں نکال رہے تھے۔ مارینا نے پہلے کبھی اس قسم کے پرندے نہیں دیکھے تھے۔

مارینا لکڑی کا سفید دروازہ ہٹا کر اندر آئی تو دروازے سے منسلک چھوٹی سی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کی سریلی آواز کانوں کو ناگوار نہیں گزری تھی لیکن اندر تک یہ اطلاع کرنے کے لیے کافی تھی کہ کوئی آیا ہے۔ مارینا رک گئی تھی۔ اس نے مزید آگے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک منٹ بعد سامنے والا دروازہ کھلا اور اس سے ایک بہت معمر اور مختصر سی عورت باہر آئی۔ اس نے فل اسکرٹ کے ساتھ اونی سویٹر پہنا ہوا تھا۔ اس کی عمر شاید ستر یا اسی برس تھی۔ قد مشکل سے پانچ فٹ ایک انچ ہو گا اور وزن شاید اسی پاؤنڈ تھا۔ وہ کم وزن تھی لیکن اس کا چمکتا چہرہ اور چست جسم بتا رہا تھا کہ وہ کمزور نہیں ہے اور اس نے اس عمر میں بھی خود کو فٹ رکھا ہوا تھا۔ اگر اس گھر اور باغ کی دیکھ بھال وہ کرتی تھی تو اس کی فٹنس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔

"یس؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مارینا کی طرف دیکھا۔ مارینا ہچکچاتی ہوئی آگے آئی۔

"مجھے مارینا فیور کہتے ہیں۔" اس نے ہاتھ آگے کیا۔ "کیا تم ہی مسز وائٹ ہو؟"

عورت نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہاں ٹھیک پہچانا۔ وائٹ کو اس دنیا سے گزرے بارہ سال ہو چکے ہیں لیکن اب بھی کوئی مجھے اس کے نام سے پکارتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ ویسے تم مجھے میگرڈ کہہ سکتی ہو۔"

"شکریہ میگرڈ۔" مارینا بولی۔ "میرا تعلق بوڑھے افراد کی دیکھ بھال کے لیے مخصوص محکمے سے ہے۔"

یہ سنتے ہی میگرڈ کے چہرے کی تازگی اور بشاشت جیسے بجھ گئی۔ مارینا کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے اپنا تعارف کیوں کرایا۔ اسے اس بوڑھی عورت کا زندگی سے بھرپور وجود پسند آیا تھا۔ اب وہ اتنی ہی بے جان لگ رہی تھی اور یہ سب مارینا کے چند الفاظ کی وجہ سے ہوا تھا۔ مارینا کو اس سے پہلے بھی اپنا کام پسند نہیں تھا لیکن اس وقت اسے اس کام سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت چند لمحے ساکت کھڑی رہی پھر اس کی نظریں مارینا کے چہرے سے پھسل ہوئی اس کے ہاتھوں تک آ گئیں۔ مارینا نے ایک مخصوص لفافہ تھاما ہوا تھا اور اس پر کالا مونوگرام بتا رہا تھا کہ اس کے اندر کیا ہے۔

"مجھے افسوس ہے...." مارینا نے کہنا چاہا لیکن میگرڈ اس سے پہلے حرکت میں آ گئی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے، میرے ساتھ آؤ۔"

"میری بات تو سنو...."

لیکن میگرڈ اس کی بات سنے بغیر اسے کھینچ کر اندر لے گئی۔ دروازے کے فوراً بعد ایک چھوٹا سا غلام گردش سے ہوتا لیونگ روم تھا۔ صوفوں پر صاف ستھرے کشن تھے اور فرش پر چھوٹا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں یقیناً میگرڈ کا بیڈ روم تھا اس چھوٹے سے گھر میں دوسرے بیڈ روم کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ اسے کچن کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر لے آئی جس پر سرخ خانے دار کپڑا بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک چھوٹی سی چاندی کی طشتری میں چائے کے لوازمات رکھے تھے۔ مارینا کی آمد سے پہلے میگرڈ اپنے بنائے بسکٹوں سے چائے کے ساتھ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ عقب کی طرف کچن کی بیشتر دیوار شیشے کی تھی اس میں کھڑکی بھی تھی اور دروازہ بھی اور یہاں سے اس چھوٹے سے باغ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں پھولوں کے بجائے سبزیاں اور دو درخت لگے تھے۔ ایک اسٹرابیری کا تھا اور ایک نارنگی کا۔ یہ باغ بھی صفائی اور سلیقے میں اپنی مثال آپ تھا۔

کچن اگرچہ بہت زیادہ آراستہ نہیں تھا اور وہاں سوائے گیس اوون کے کوئی جدید مشین نہیں تھی۔ برتن اور کراکری بھی خاصے پرانے زمانے کی تھی لیکن اس طرح سنبھال کر استعمال کی گئی تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ پرانی ہے۔ کاؤنٹر سینک اور کیبنٹ چمک رہے تھے۔ فرش ٹائلوں والا تھا اور اس کی صفائی بھی شاید روز کی جاتی تھی۔ مارینا اس گھر کی صفائی سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ وہاں آنے کا مقصد ہی بھول گئی تھی۔ شاید میگرڈ اسے اسی لیے اندر لائی تھی۔ باغ میں آڑو کے پودے بڑے ہو گئے تھے اور نارنگیوں سے درخت بھرا ہوا تھا۔ اگر میگرڈ اس سے روزانہ بھی نارنگیاں توڑتی تب بھی دو مہینے تک یہ ختم نہ ہوتیں۔

"خوب صورت۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ "یہ سب کتنا خوب صورت ہے۔"

"ہے نا۔" میگرڈ نے خوش ہو کر کہا۔ اس کے چہرے پر چمک اور رونق لوٹ آئی تھی۔ "بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"شکریہ۔" مارینا بیٹھ گئی۔ اس نے لفافہ جان بوجھ کر اپنی گود پر رکھ لیا تھا جبکہ اگر وہ میز پر رکھتی تو وہ مستقل میگرڈ کی نظروں کے سامنے رہتا۔ اسے پہلی نظر میں اس بوڑھی عورت سے محبت محسوس ہو رہی تھی اور وہ اسے تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔ میگرڈ اس کی حرکت بھانپ گئی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اس لیے اس کی مسکراہٹ میں حقیقی تیزی آ گئی تھی۔

"تم بہت خوب صورت ہو میری بچی۔"

"شکریہ مام۔" مارینا شرما گئی تھی۔

"میرا اندازہ ہے تم شادی شدہ اور شاید ماں بھی ہو؟"

مارینا نے سر ہلایا۔ "میرے دو بچے ہیں، بڑا بیٹا آٹھ سال کا اور بیٹی ابھی پانچ سال کی ہے۔"

میگرڈ کے چہرے پر ستائش نظر آئی تھی۔ "یعنی تم نے ٹھیک عمر میں شادی کر لی تھی۔"

"بیس سال کی عمر میں، اسی سال میرا گریجویشن مکمل ہوا تھا۔ مائیکل انجینئر ہے۔ شارلین کی پیدائش کے دو سال بعد میں نے جاب کر لی تھی۔"

"میرے بھی دو بچے تھے۔" میگرڈ کی نظر ایک طرف شیلف میں رکھی تصویر کی طرف اٹھ گئی۔ جس میں ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ ایک جوان مرد اور ایک لڑکی تھی۔ بوڑھا یقیناً مسٹر وائٹ تھا۔ "یہ جان ہے، آج کل سعودی عرب میں ہوتا ہے۔ جوزیانا آخری بار مجھ سے پانچ سال پہلے ملی تھی اس کے بعد اس کا صرف کرسمس کارڈ آتا ہے۔ جو ہر بار مختلف شہر کا ہوتا ہے۔"

میگرڈ یہ سب بتاتے ہوئے بظاہر نارمل لگ رہی تھی لیکن مارینا کو اس کے لہجے کی گہرائی میں کہیں دکھ کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ اس نے بتایا نہیں تھا کہ جان کب سے اس سے نہیں ملا تھا لیکن مارینا کو یقین تھا کہ یہ عرصہ سالوں پر محیط ہو گا۔ میگرڈ نے ان کی جدائی کو اپنی تقدیر جان کر قبول کر لیا تھا اور اب اس کے لہجے میں شکوہ بھی نہیں تھا لیکن وہ انہیں اب بھی اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مارینا سے سب سے پہلے ان کا ذکر کیا تھا۔ مارینا تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تصویر کم سے کم پندرہ سال پرانی تھی اس کا مطلب تھا کہ جان پچاس برس کا تھا اور جوزیانا پینتالیس برس کی۔ وہ بھی بڑھاپے کی دہلیز پر تھے۔ اس نے سوال کیا۔

"ان کے بچے بھی ہیں؟"

"جان کے دو بچے ہیں، بڑا بیٹا ولیم انجینئر ہے اور کینیڈا میں کہیں ہوتا ہے۔ اس سے چھوٹا ابھی پڑھ رہا ہے۔"

"تم ان سے ملی ہو؟"

"نہیں وہ کبھی اس گھر میں نہیں آئے۔" میگرڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے ان سے ملنے کا شوق ہے لیکن.... خیر چھوڑو، یہ بتاؤ چائے پیو گی؟ میں بہترین چائے بناتی ہوں۔"

"میں ضرور پیوں گی۔" مارینا اس کے لہجے کے خلوص سے متاثر ہوئی تھی۔ میگرڈ کھل اٹھی۔ اس کی زندگی میں یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہی خوشیاں تھیں۔ اس نے گرم چائے تھیں پیالی میں انڈیلی، مارینا سے دودھ اور چینی کا پوچھا۔ "میں دودھ نہیں لیتی، چینی بس تھوڑی سی۔"

میگرڈ نے چینی ڈال کر پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ مارینا نے چائے چکھی۔ "واقعی لاجواب ہے۔ میں نے بہت کم ایسی چائے پی ہے۔"

"ہاں۔" میگرڈ خوش ہو گئی تھی۔ اس نے بسکٹ بھی نکالے۔ "یہ بھی لو، میں گھر پر خود بناتی ہوں۔"

مارینا نے شکریہ ادا کر کے بسکٹ لے لیے۔ "میں دیکھ رہی ہوں تم نے کچن بہت صاف اور اچھا رکھا ہوا ہے۔"

"ہاں میں خود اس کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔" میگرڈ کے لہجے میں فخر آ گیا۔ "چھوٹی موٹی مرمت بھی خود کر لیتی ہوں۔ پچھلے دنوں سینک بند ہو گیا تھا میں نے اسے کھولا اور اس کی صفائی کر کے خود ہی اسے پھر لگایا۔ میں اس کے علاوہ بھی چھوٹے موٹے کام کر لیتی ہوں۔"

"مثلاً؟"

"جیسے رنگ کرنا، میں دو سال بعد خود رنگ کر لیتی ہوں۔ روز تھوڑا تھوڑا کر کے ہر دو ہفتے میں سارا رنگ مکمل ہو جاتا ہے۔"

مارینا کو اس بار حیرت ہوئی تھی۔ یہ خاصا مشقت طلب کام تھا۔ اس نے خود اپنے مکان پر رنگ کا کام کیا تھا جبکہ شوہر اور بیٹا بھی اس کی مدد کر رہے تھے اس کے باوجود وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت مشکل کام ہے۔"

میگرڈ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "انسان جو کام مشکل سمجھتا ہے وہ مشکل ہوتا ہے اور جسے آسان سمجھتا ہے وہ آسان ہو جاتا ہے۔"

مارینا نے دیکھا کہ گھر کا فرنیچر چمک رہا تھا جیسے اس پر باقاعدگی سے وارنش پھیری جاتی ہو۔ یہ کام بھی یقیناً میگرڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خود کر رہی تھی۔ میگرز کو اپنی ہمت سے بڑھ کر محنت کرنا پڑتی ہو
گی۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور پیالی رکھ دی۔
"چائے کا بہت شکریہ۔" اس نے کہا۔ "اب ہم اصل
کام کی طرف آتے ہیں۔"
"اتنی جلدی کیا ہے؟" میگرز بولی۔ "میں تمہیں کچھ
اور بھی دکھانا چاہ رہی ہوں اگر تمہارے پاس وقت ہو
تو...؟" اس کے لہجے میں التجا آ گئی۔
ماریتا کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ بے کار کی کوشش
کر رہی تھی اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ وہ اس سے
جو بات کرنے آئی تھی وہ اسے میگرز سے کرنا ہی تھی لیکن اس
کمزور اور بوڑھی عورت کا دل توڑنا ماریتا کو گوارا نہیں تھا اس
لیے اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے مجھے کوئی
جلدی نہیں ہے۔"
"بہت دن بعد اس گھر میں کوئی آیا ہے۔" میگرز نے
کہا۔ "میری خواہش ہے تم کچھ دیر یہاں رکو۔"
"میں ضرور رکوں گی۔" ماریتا نے مسکرا کر
کہا۔ حالانکہ اس عورت کو دیکھ کر اس کا دل رونے کو چاہ رہا
تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ماریتا کیوں آئی تھی لیکن وہ
اس وقت کو ٹال رہی تھی۔ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی
اور یہ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ سامنا کرنے سے کترا
رہی ہے۔ اس لیے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے
چائے کے برتن اٹھائے اور انہیں دھو کر مطلوبہ کھونٹیوں پر رکھنے
لگی۔ چینی اور دودھ کے پاٹ اپنی جگہ رکھے۔ یہ کام اس نے
اتنی محنت اور لگن سے کیا جیسے عبادت کر رہی ہو۔ اس نے اتنی
ترتیب سے کپ رکھے تھے کہ ان کے انداز میں معمولی سا
فرق بھی نہیں تھا۔ سب ایک ہی رخ اور ایک ہی انداز میں
رکھے تھے۔ پھر اس نے کپڑے سے چاندی کی طشتری
صاف کی اور اسے بھی اپنی جگہ رکھ دیا۔
"تمہاری گزر اوقات کیسے ہوتی ہے مام؟"
ماریتا کے اس سوال پر اس کا جسم کچھ دیر کے لیے
ساکت ہو گیا جیسے یہ سوال تکلیف دہ ہو۔ پھر اس نے آہستہ
سے کہا۔ "میری ضروریات زیادہ نہیں ہیں لیکن مجھے کوئی
مشکل نہیں ہوتی۔"
"کیا تمہیں سوشل سیکیورٹی کی طرف سے پنشن ملتی
ہے؟"
"ہاں یہ بھی ہے اور پھر والٹ کچھ شیئرز چھوڑ گیا تھا ان
کی طرف سے سال میں کچھ رقم مل جاتی ہے۔"
"شیئرز تو آج کل بہت ڈاؤن جا رہے ہیں۔"

"ہاں۔" میگرز نے بے پروائی ظاہر کرنے کی کوشش
کی۔ "لیکن گزارا تو ہو جاتا ہے۔"
"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔" ماریتا نے اسے یاد دلایا۔
"یہ بھی ٹھیک ہے لیکن میرا خرچا زیادہ نہیں ہے۔ میرا
تو سوشل سیکیورٹی کے چیک سے گزارا ہو جاتا ہے۔"
ماریتا اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ غلط بیانی
کر رہی ہے سوشل سیکیورٹی کی قلیل رقم میں گزارا اس مشکل
ہو جاتا ہے۔ صرف اس کی ذات نہیں تھی بلکہ وہ پورا ایک
گھر چلا رہی تھی۔ یہاں ہر چیز کی دیکھ بھال اور درستگی کے
لیے رقم درکار تھی۔ ماریتا سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کس طرح یہ
سب کر رہی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ ان دو ذرائع کے سوا اس کی
آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس نے باہر لان میں لگی
سبزیوں اور پھلوں کی طرف دیکھا۔
"تم ان کا کیا کرتی ہو؟ کیا یہ تم اپنے لیے لگاتی ہو؟"
"نہیں میں اتنا کہاں استعمال کر سکتی ہوں۔" میگرز
نے جواب دیا۔
"پھر تم ان کا کیا کرتی ہو؟"
"آؤ میں تمہیں اپنی سبزیاں اور ترکاریاں دکھاتی
ہوں۔" میگرز اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کھڑی ہو
گئی۔ وہ ماریتا کو باہر لائی۔ یہ زیادہ بڑی جگہ نہیں تھی۔ مشکل
سے بیس فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ لمبا ایک پارچہ تھا لیکن میگرز
نے اس کا ایک ایک انچ استعمال کیا ہوا تھا۔ نارنگی اور
اسٹرابیری کے پودے باڑ کے ساتھ تھے۔ ان کے آس
پاس مختلف سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر سبزی کی الگ قطار تھی۔
ایک طرف ایک چھوٹے سے شیڈ کے پیچھے باغبانی میں کام
آنے والے اوزار رکھے تھے۔ ٹماٹر، شملہ مرچ اور مرچ کے
پودوں پر آخری سبزی تھی البتہ آلو، پیاز، گاجر اور بند گوبھی تیار
تھی اور اب انہیں زمین سے نکالنا تھا۔
"یہ بہت شاندار سبزیاں ہیں۔" ماریتا نے میگرز کی
طرف دیکھا۔ "ان پر بہت محنت کرنا پڑتی ہے تم نے آسان
سبزی کیوں نہیں لگائی؟"
"ان کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔" میگرز نے آہستہ
سے کہا۔
ماریتا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم اس عمر میں
کمانے کے لیے کام کرتی ہو؟"
"یہ کام کرنا نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے وضاحت
کی۔ "میرا فارغ اوقات کا مشغلہ ہے۔ اس طرح میں مصروف
بھی رہتی ہوں اور میرا جسم کام کرنے سے فٹ رہتا ہے۔"

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید داغ قابل علاج مرض ہے

مطب الٰہی

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی (ریسرچ اسکالر) کے نئے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام

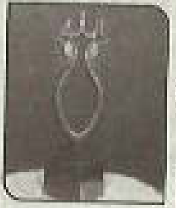

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

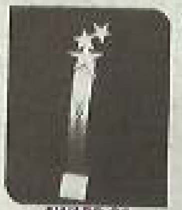

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد
9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
مستقل پتہ
فون (051) 2854595 - 2255880
موبائل 0300-8566188
فیکس 2261636

لاہور
ہوٹل طاہر
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27 اکتوبر
قیام
فون (042) 7115015-19
موبائل 0300-8566188

پشاور
ہوٹل امین
یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر
قیام
فون (091) 2218215-9
موبائل 0300-8566188

ملتان
ہوٹل سٹی سینٹر
28 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
قیام
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

کراچی
لورین سینٹر
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر
قیام
آفس 706، ساتویں منزل
K.F.C
فون 021-7012068-9
موبائل 0300-8566188

www.leucodermatologist.com
E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ بہت مشقت والا کام ہے۔"

"میں نے بتایا نا کہ میں صرف اتنا کام کرتی ہوں جتنا میرا جسم اجازت دیتا ہے۔ جب میں تھک جاتی ہوں تو آرام کرتی ہوں۔ میں خود کو مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کرتی۔" میگرڈ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تم اس سبزی کو فروخت کر دیتی ہو اس سے تمہیں کتنی رقم مل جاتی ہے؟"

"اتنی ضرور مل جاتی ہے کہ میری ذات کے علاوہ اس گھر میں جتنے بھی اخراجات ہیں وہ سب پورے ہو جاتے ہیں۔"

مارینا کو تعجب ہوا۔ "کیا واقعی اس سبزی کی اتنی قیمت مل جاتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔" میگرڈ نے فخر سے کہا۔ "یہ شہر کے باہر سے آنے والی سبزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ اس کا ذائقہ رنگ اور خوشبو بہتر ہوتا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔"

وہ واپس کچن میں آگئیں اور میگرڈ نے اپنے چھوٹے سے فریج سے سبزی کے چند نمونے نکال کر اس کے سامنے رکھے۔ یہ گاجر، ٹماٹر، شملہ مرچ اور بند گوبھی تھی۔ مارینا نے اتنی اچھی اور صاف سبزی بہت کم دیکھی تھی۔ میگرڈ نے اسے دکھا کر سبزی واپس رکھ دی۔ "مجھے گوشت کھانے کا شوق نہیں ہے اور میں زیادہ تر سبزیاں کھاتی ہوں۔ یہ میری صحت کے لیے اچھی ہوتی ہیں۔"

"لیکن تمہاری صحت کے لیے پروٹین بہت ضروری ہے۔" مارینا نے اعتراض کیا۔ "اس کے بغیر تم کمزور اور بیمار بھی ہو سکتی ہو۔"

"نہیں، میں گوشت اور انڈے بھی لیتی ہوں۔" میگرڈ نے کمزور لہجے میں کہا۔ "لیکن زیادہ نہیں لیتی۔"

"اس سے کیا مراد ہے؟" مارینا نے تفتیش کرنے والے انداز میں کہا۔

"مہینے میں دو تین بار۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"یہ بہت کم تعداد ہے اور ہر بار میں تم کتنا گوشت استعمال کرتی ہو؟"

"سو یا ڈیڑھ سو گرام۔"

مارینا کو ڈائٹ چارٹ زبانی یاد تھا۔ اس کے مطابق میگرڈ جتنی عمر اور وزن رکھنے والی عورت کو ایک مہینے میں کم سے کم دو یا ڈھائی کلوگرام گوشت اور کم سے کم ایک درجن انڈے اپنی خوراک میں شامل کرنا چاہیے تھے۔ میگرڈ اس کا تیسرا حصہ استعمال کر رہی تھی۔ پروٹین کی کمی اسے مختلف بیماریوں کا شکار بنا سکتی تھی۔ میگرڈ، مارینا کے تاثرات دیکھ رہی تھی اس نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ "مجھے پروٹین کی کمی سے کوئی تکلیف نہیں ہے، بالکل ٹھیک ہوں۔"

لیکن مارینا جانتی تھی وہ بالکل ٹھیک نہیں تھی، مسئلہ تھا اور مارینا اسی وجہ سے یہاں آئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس پر واضح ہو رہا تھا کہ میگرڈ ایک مشکل زندگی گزار رہی ہے۔ ظاہر ان کا طرز رہائش اور اس کا گھر دیکھ کر کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میگرڈ کو مالی مشکلات کا سامنا تھا اگرچہ اس نے ہر چیز اچھے طریقے سے سنبھال کر رکھی تھی، لیکن مارینا کا کام ان چیزوں کو مختلف نظر سے دیکھنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

"تم نے جو جاپانی باغ بنا رکھا ہے اور پرندے پال رکھے ہیں ان پر بہت خرچا آتا ہوگا؟"

"نہیں یہ اپنا خرچا خود پورا کر دیتے ہیں۔" میگرڈ بولی۔ "میں باغ میں اگنے والے لطف پھول فلاور شاپ پر فروخت کر دیتی ہوں۔ اسی طرح میں نے جہاں سے پرندے لیے تھے، ان سے میرا معاہدہ ہے کہ ان کی خوراک اور ادویات وہ فراہم کریں گے اس کے بدلے میں انہیں سال میں چار جوڑے دوں گی۔ میں ان کی دیکھ بھال ضرور کرتی ہوں لیکن مجھے ان پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ پھول فروخت کرنے سے مجھے کچھ اضافی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

مارینا دیکھ رہی تھی کہ میگرڈ اسے مطمئن کرنے کی ممکن کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ اس نے اس گھر کو اس حالت میں رکھنے کے لیے اپنی صحت خراب کر لی تھی۔ خرچ کم کرنے کے لیے اس نے اپنی خوراک حد سے زیادہ سادہ کر لی تھی۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ نہ ہونے کے برابر کھا رہی تھی۔ اپنی زیادہ تر رقم وہ اپنے گھر کو اس حالت میں برقرار رکھنے پر خرچ کر رہی تھی۔

"مام، کیا تم اس زندگی سے خوش ہو، یہاں تم بالکل اکیلی ہو؟"

"نہیں، میں اکیلی نہیں ہوں۔ یہاں آس پاس سب جاننے والے ہیں اور بہت اچھے لوگ ہیں۔ میں روز صبح واک پر نکلتی ہوں۔ مارکیٹ سے سامان لاتی ہوں یا کبھی بیچنے کے لیے لے جاتی ہوں۔ اس دوران میں لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں بالکل بھی اکیلی نہیں ہوں۔"

"کیا محلے میں سے کوئی تمہارے پاس آتا ہے؟"

"نہیں۔" میگرڈ نے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا۔ "آج کل لوگوں کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی

کہ وہ ایک دوسرے کے گھر آئیں۔"

"تم کسی کے گھر جاتی ہو؟"

"نہیں میں بھی کسی کے گھر نہیں جاتی۔" اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنے گھر پر رہنا، یہاں کام کرنا اور وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔"

"یعنی تم تنہائی پسند ہو گئی ہو؟"

"ایسا نہیں ہے، میں گھر سے نکلتی ہوں، لوگوں سے رابطہ بھی کرتی ہوں۔ بس مجھے زیادہ وقت گھر پر رہنا اچھا لگتا ہے۔"

"تم نے کبھی سوچا نہیں کہ اس طرح اکیلے رہ کر تم معاشرتی تنہائی کا شکار ہو رہی ہو؟"

میگرڈ نے سوچا اور سادگی سے کہا۔ "میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ میں اکیلی یا تنہا ہوں۔"

"تمہاری صحت کیسی ہے؟" مارینا نے وہ سوال کر دیا جو وہ بہت دیر سے کرنا چاہ رہی تھی۔

"تمہارے سامنے ہے۔ میں اپنے سارے کام اور اس گھر کی ساری دیکھ بھال خود کرتی ہوں تو اس کا مطلب ہے میری صحت ٹھیک ہے۔"

"پچھلے دنوں تم نے سالانہ چیک اپ کرایا تھا۔"

وہ کچن کی میز پر تھیں اور اس کے سوال پر میگرڈ کا کمزور جسم تن گیا تھا۔ وہ اس طرح ساکت ہوئی کہ چند لمحے تو مارینا کو لگا کہ وہ اس دنیا سے گزر گئی ہے لیکن بالآخر اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے ایک گہری سانس لی پھر اس نے کہا۔ "اس میں ایک ہفتہ پہلے چیک اپ کرانے گئی تھی لیکن سب کچھ نارمل آیا تھا۔ بلڈ پریشر، گردے، جگر، دل اور دماغ۔ سب ٹھیک تھا۔"

"تمہارا بلڈ سیمپل لیا گیا تھا اور ایکسرے بھی ہوئے تھے؟"

"ہاں یہ تو سالانہ چیک اپ میں لازمی ہوتے ہیں۔"

"اس کے علاوہ تم کتنے عرصے بعد چیک اپ کرانے جاتی ہو؟"

"ہر دوسرے مہینے، اس میں نارمل چیک اپ ہوتا ہے۔"

"کیا واقعی تم جاتی ہو مام؟" مارینا نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں۔" میگرڈ شرمندہ ہو گئی تھی۔ پھر اس نے جلدی سے وضاحت کی۔ "مجھے معلوم ہے کہ مجھے کوئی بیماری یا جسمانی مسئلہ نہیں ہے۔"

مارینا نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو جب تک کہ تم ڈاکٹرز سے معائنہ کراؤ۔ تم نے ہر دو مہینے بعد ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا؟"

اس بار جواب دیتے ہوئے میگرڈ ہچکچائی۔ "وہ... دراصل ہر وزٹ پر مجھے بیس ڈالرز ادا کرنے پڑتے تھے کیونکہ میری سوشل سیکورٹی میں یہ شامل نہیں ہے۔ وزٹ نے میرے لیے لائف ٹائم انشورنس کرا دی تھی مگر وزٹ چارج دینا پڑتا ہے۔"

مارینا نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم نے اچھا نہیں کیا مام، کاش تم ہر دو مہینے بعد چیک اپ کراتی رہتیں تو نوبت یہاں تک نہیں آتی۔"

میگرڈ کی آنکھیں کسی قدر پھیل گئی تھیں۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "کیا مجھے کوئی مہلک بیماری ہو گئی ہے؟"

مارینا نے جلدی سے کہا۔ "نہیں... نہیں، تمہیں کوئی مہلک بیماری نہیں ہے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟"

مارینا نے ہاتھ بڑھا کر ساتھ لایا ہوا لفافہ کھولا اور اس میں سے چند ایکسرے نکالے۔ یہ میگرڈ کے ایکسرے تھے جو سالانہ معائنے کے دوران میں لیے گئے تھے۔ اس نے ایکسرے میگرڈ کے سامنے رکھ دیے۔ "ان کے مطابق تمہارے جوڑوں کا مرض خاصا بڑھ چکا ہے۔"

"جوڑوں کا مرض؟" میگرڈ نے حیرت سے کہا۔ "لیکن مجھے تو جوڑوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"ابھی یہ بہت بڑھ جانے کے مرحلے میں نہیں آیا ہے اس لیے تمہیں محسوس نہیں ہوگا لیکن کیا تم نے درد محسوس نہیں کیا؟"

"بالکل بھی نہیں، مجھے تو کوئی تکلیف ہوئی اور نہ ہی کام کرتے ہوئے مسئلہ ہوا۔" میگرڈ نے زور دے کر کہا۔

مارینا نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ میگرڈ اپنے مرض کو چھپا رہی ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اسے فیصلہ سنانے آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "اگر ابھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی ہے تو آنے والے وقت میں لازمی ہوگی اور اس وقت تمہیں بہت مشکل ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں یہ مشکل برداشت نہ کرنی پڑے۔"

"ہم... کون؟"

"میں نے بتایا تا میرا تعلق بوڑھوں کی دیکھ بھال کے محکمے سے ہے اور میں تمہارے لیے یہاں آئی ہوں۔"

"میرے لیے کیوں؟" میگرڈ تیکھے لہجے میں بولی۔

"اس مرض کے ساتھ اس عمر میں تم اکیلے نہیں رہ سکتیں۔"

"میں رہ سکتی ہوں۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ بارہ سال سے اکیلے ہی رہ رہی ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن اب تم اکیلے نہیں رہ سکتیں۔" ماریانا نے نرمی سے کہا۔ میگرڈا لرز گئی۔

"تو... تو پھر؟"

"پھر یہ کہ تمہیں اولڈ ہاؤس جانا ہوگا۔ ریاست نے بوڑھوں کے لیے بہت اچھا اور تمام سہولیات سے آراستہ اولڈ ہاؤس بنا رکھا ہے جس میں کھانے پینے، رہائش اور علاج کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ تمہیں وہاں کچھ نہیں کرنا پڑے گا اور تم صرف آرام کرو گی۔"

"لیکن میں اولڈ ہاؤس نہیں جانا چاہتی اور نہ ہی میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔" میگرڈا کا لہجہ ناخوشگوار ہو گیا۔ "میں اپنے گھر میں اور کام کر کے بہت خوش ہوں۔"

"لیکن تمہارا مرض بڑھ جائے گا تو تم خوش نہیں رہو گی اور نہ یہاں رہ سکو گی۔ ابھی تمہیں اولڈ ہاؤس بھیجا جا رہا ہے جہاں تمہارے جوڑوں کی نگرانی ہوگی اور یہ قابل درست حالت میں رہیں گے۔ اگر دیر کی تو مرض کی شدت بڑھ جائے گی اور پھر تم اولڈ ہاؤس نہیں بلکہ اسپتال جاؤ گی اور وہاں ایک بستر پر پڑی رہو گی۔" ماریانا نے اس کے سامنے مستقبل کا نقشہ کھینچا جو خاصا ہولناک تھا لیکن میگرڈا صرف ایک مفروضے کی بنیاد پر اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

"تم اس مہنگائی میں بہت معمولی خوراک کے ساتھ گزارا کر رہی ہو اس طرح تو تم بھوک سے مر جاؤ گی یا کسی خطرناک بیماری کا شکار ہو جاؤ گی۔"

"یہ صرف ایک خدشہ ہے، میں ابھی تک بہت اچھی طرح رہتی آئی ہوں۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے اور اس عمر میں انسان کی خوراک ویسے ہی کم ہو جاتی ہے۔"

"میگرڈا یہ بتا رہا ہے کہ تم زیادہ دن اس طرح نہیں رہ پاؤ گی کیونکہ مرض کی شدت بڑھ گئی تو تمہارے لیے بہت نقصان دہ ہوگا۔"

میگرڈا نے اپنے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے سینے پر باندھ لیے تھے اور یہی سختی اس کے چہرے پر بھی نمودار ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ فیصلہ کر چکی ہے۔ پھر اس نے یہی بات منہ سے بھی کہہ دی۔ "میں اپنا گھر چھوڑ کر اولڈ ہاؤس نہیں جاؤں گی۔"

ماریانا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی جیسے کہنے کے لیے موزوں الفاظ تلاش کر رہی ہو پھر اس نے کہا۔ "مام... آئی ایم سوری... لیکن تمہیں جانا ہوگا تم انکار نہیں کر سکتیں۔"

میگرڈا کا بت بڑی دیر یونہی ساکت رہا... پھر اس میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ وہ ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ پھر وہ ماریانا کے سامنے ڈھے گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ انکار نہیں کر سکتی تھی اس کے الفاظ پر تر آئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "پلیز... میں یہاں سے نہیں جا سکتی۔"

"مام تمہیں جانا ہوگا۔" ماریانا نے دل پر جبر کر کے کہا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے نکل جائے۔ مگر یہ اس کی ذمے داری تھی۔

"پلیز..."

"مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن تم جانتی ہو میں ریاست کی ملازم ہوں اور اپنی مرضی سے تمہیں چھوٹ نہیں دے سکتی۔"

میگرڈا کانپنے لگی۔ "کیا تم مجھے زبردستی لے جاؤ گی۔ اس گھر کو میری ضرورت ہے، میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔"

"یہ گھر ایک بے جان چیز ہے لیکن تم جاندار ہو اور تمہیں علاج اور آرام کی ضرورت ہے۔"

"یہ گھر اور اس کی چیزیں بے جان نہیں ہیں یہ جاندار ہیں۔ یہ میرے احساسات سمجھتے ہیں۔ جب میں اپنے بچوں کو یاد کر کے اداس ہو جاتی ہوں تو یہ میری دل جوئی کرتے ہیں۔ اس کی ایک ایک چیز..."

"مام تمہاری یہ بات میں سمجھ رہی ہوں لیکن ریاست اس قسم کی باتیں نہیں سمجھتی۔" ماریانا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اس لیے تم خود کو تیار کر لو تمہیں یہاں سے جانا ہے اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اولڈ ہاؤس میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"اولڈ ہاؤس۔" بوڑھی عورت نے تلخی سے کہا۔ "اس جگہ کا کمرہ وہاں کا بستر اور چیزیں کیا میری ہوں گی۔ نہیں، وہ میری نہیں ہوں گی چاہے میں وہاں برسوں رہوں۔ کیونکہ وہ مجھ سے پہلے کسی اور کی تھیں اور میرے بعد کسی اور کی ہو جائیں گی۔"

"ایسا تو ان چیزوں کے ساتھ بھی ہے۔" ماریانا نے اس کے گھر اور سامان کی طرف اشارہ کیا۔ "تم سے پہلے بھی یہ کسی اور کے پاس تھیں اور تمہارے بعد بھی یہ کسی اور کے پاس چلی جائیں گی۔"

میگرڈا نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسا نہیں ہے۔ یہ تمام چیزیں میں نے نئی لی تھیں یہ صرف میری ہیں اور مجھے یقین ہے میرے بعد یہ بھی ختم ہو جائیں گی۔ ٹوٹ پھوٹ کر

کباڑ بن جائیں گی لیکن کسی اور کی نہیں ہوں گی۔"

ماریانا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بوڑھی عورت کو کس طرح سمجھائے کہ اولڈ ہاؤس جانا ہی اس کے مفاد میں ہے۔ ویسے اگر اس کے جوڑوں کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنے گھر میں رہنے کی اہل تھی۔ آج صبح جب ماریانا دفتر پہنچی تو اس کی باس این نے اسے طلب کر کے رپورٹ اور میگرڈا کا پتا دیا تھا۔ اسے اولڈ ہاؤس منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا کیونکہ اس کی حالت خراب ہونا شروع ہو گئی تھی اور اسے دیکھ بھال اور طبی امداد کی اشد ضرورت تھی جو اسے صرف اولڈ ہاؤس میں مل سکتی تھی۔

"اس عورت کو اولڈ ہاؤس منتقل کرنا ہے اور یہ کام جتنی جلد ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

ماریانا نے پتا دیکھا۔ "میں آج ہی جاتی ہوں، لیکن یہ کام بہت مشکل ہے اکثر بوڑھے مزاحمت کرتے ہیں اور روتے دھوتے بھی ہیں۔"

"بوڑھا اور بچہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔" این نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "وہ نہیں جانتے کہ ان کی بہتری کس میں ہے اس لیے مجبوراً ان کے ساتھ سختی کرنا پڑتی ہے۔ اس عورت کو فوری اولڈ ہاؤس منتقل کرنا ہے کیونکہ اس کے جوڑوں کا مرض اس اسٹیج پر پہنچ گیا ہے کہ چند مہینے بعد اسے حرکت کرنے میں بھی دشواری ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، میں ابھی دوپہر میں نکلتی ہوں۔" ماریانا نے پتا اٹھایا تھا۔ "کیا اسے آج ہی شفٹ کرنا ہے؟"

"آج ورنہ کل... تم جا کر اس سے بات کرو پھر میں گاڑی بھیج دوں گی۔"

ماریانا اب سوچ رہی تھی کہ وہ این سے گاڑی بھیجنے کو کہے جو میگرڈا کو اولڈ ہاؤس میں منتقل کرے گی۔ لیکن میگرڈا کی حالت دیکھ کر وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ایک دن کی مہلت اور دے تاکہ وہ ذہنی طور پر خود کو تیار کر سکے۔ وہ سوچ رہی تھی اور میگرڈا اسے پرامید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ آخر وہ سمجھ گئی کہ ماریانا اس کی بات نہیں مان سکتی۔ وہ چاہے بھی تو نہیں مان سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میگرڈا نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "میں تیار ہوں لیکن کیا مجھے دو دن کی مہلت مل سکتی ہے؟"

"نہیں، صرف ایک دن کی مہلت ہے اور کل دوپہر تک تمہیں لازماً اولڈ ہاؤس منتقل ہونا ہے۔"

میگرڈا نے اب خود کو سنبھال لیا تھا۔ "میں کل تیار ہو جاؤں گی۔"

بجلی

مالک: "میں جب بھی تمہیں کہیں بھیجتا ہوں تم تین چار گھنٹے بعد واپس آتے ہو۔"

نوکر: "جناب آپ نے خود ہی تو کہا ہے کہ بجلی کی طرح جاؤ اور بجلی کی طرح آؤ۔"

عون عباس بابر کی حاضر جوابی ..... اوکاڑہ سے

ماریانا نے سکون کا سانس لیا کہ چلو آخر معاملہ نمٹ گیا اور میگرڈا مان گئی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ "شکریہ... اچھی بچی بننے کا اور میری بات مان جانے کا۔"

میگرڈا اب ایک فرض شناس عورت نہیں رہی تھی اس کے چہرے پر شفقت اور ممتا آ گئی۔ اس نے ماریانا کا ہاتھ پکڑا۔ "تم بھی بہت اچھی لڑکی ہو تم نے مجھ سے نرمی اور پیار سے بات کی۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"میں تم سے بعد میں بھی ملتی رہوں گی مام..." ماریانا بولی۔ "میرا دفتر اولڈ ہاؤس کی عمارت کے ساتھ ہے۔"

"ہاں ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر ہماری ملاقات نہ ہو۔"

"میں ضرور ملنے آؤں گی۔" ماریانا نے اسے یقین دلایا۔ "دفتر سے بھلا کتنی دور ہے اولڈ ہاؤس۔"

وہ باہر آئی تو میگرڈا نے ایک بار پھر اسے گلے لگایا۔ ماریانا کار میں بیٹھی اور دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسے خوشی تھی کہ میگرڈا نے بہت زیادہ مزاحمت نہیں کی اور آسانی سے مان گئی ورنہ اسے ایسے بوڑھے افراد کا تجربہ بھی تھا کہ جب اس نے انہیں یہ خبر سنائی کہ ان کو اولڈ ہاؤس منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تو وہ لڑنے اور مرنے کو تیار ہو گئے۔ ایک بڑی بی نے تو اس پر چھری سے حملہ کر دیا تھا اور ماریانا نے بڑی مشکل سے خود کو زخمی ہونے سے بچایا تھا۔ اس کے بعد وہ محتاط ہو گئی تھی اور اپنے پرس میں دستی [illegible] کرنٹ مارنے والا آلہ رکھتی تھی۔ اس کا ایک ہی جھٹکا انسان کو خاصی دیر کے لیے مفلوج کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا اور آدمی سر تا پیر بھی نہیں۔

وہ دفتر پہنچی تو اسے این کا پیغام ملا کہ فوراً اس سے مل لے۔ وہ اس کے کمرے میں پہنچی تو این خاصی غصے میں تھی۔ اس نے کہا۔ "میں تمہارے سیل پر مسلسل کال کر رہی تھی تم نے سیل بند کیوں کیا ہوا ہے؟"

"وہ بند نہیں ہے بلکہ خراب ہے آج صبح مجھ سے واش روم میں گر گیا تھا ایک دو دن میں دوسرا لے لوں گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ایں... ذرا غلطی ہو گئی تھی۔" "آج مجھ سے ایک بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے تمہیں صبح جو رپورٹ دی تھی وہ غلط بچے کے ساتھ تھی۔ اصل میں یہ ایمی اورت کی رپورٹ نہیں تھی بلکہ ایک دوسری عورت کی رپورٹ تھی۔"

ماریتا کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ "کیا مطلب، یہ مسز وائٹ کی رپورٹ نہیں ہے؟"

"نہیں بلکہ یہ مسز رائٹ کی رپورٹ ہے، ملتے جلتے ناموں کی وجہ سے غلطی ہو گئی۔"

ماریتا خوش ہو گئی تھی۔ "اگر یہ مسز وائٹ کی رپورٹ نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے جوڑوں کا مرض یا کوئی اور مرض نہیں ہے۔"

"نہیں اس کی رپورٹ بالکل ٹھیک آئی ہے۔" ایمی نے اس کے سامنے ایک اور لفافہ رکھا۔ "اسے کال کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"لیکن میں اس سے مل کر اسے تیار کرکے بھی آ گئی ہوں۔" ماریتا پریشانی سے بولی۔ "وہ بے چاری تو بالکل تیار نہیں تھی۔ اس نے ستر سال کی عمر میں خود کو اور اپنے گھر کو بہت اچھی طرح سنبھال رکھا ہے۔ تم اس کا گھر دیکھو تو تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ اس کی دیکھ بھال اور تمام کام وہ خود کرتی ہے۔ وہ تو مرمت اور رنگ کا کام بھی خود کر لیتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ایمی بے نیازی سے بولی۔ "اب غلطی ہو گئی ہے۔ ایسا کرو تم اسے کال کرکے بتا دو کہ یہ سب غلطی سے ہوا ہے اور اسے اولڈ ہاؤس نہیں بھیجا جا رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے خود جانا چاہیے۔" ماریتا نے کہا۔ "میرے پاس اس کا فون نمبر نہیں ہے۔ پھر میں اس سے معذرت بھی کروں گی اور اسے قائل بھی کروں گی کہ اس معاملے میں کوئی قانونی چارہ جوئی خود اس کے لیے بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔" ایمی قائل ہو گئی۔ "بس تم کل جا کر یہ معاملہ سیٹ کر لو۔"

"میں کل صبح چلی جاتی ہوں۔" ماریتا نے کہا اور سوچا کہ کل جب وہ جا کر میگرڈ کو بتائے گی کہ اب اسے اولڈ ہاؤس نہیں جانا پڑے گا تو وہ کتنی خوش ہوگی اور ممکن ہے اسی خوشی میں وہ ماریتا اور اس کے ادارے کو معاف کر دے۔ شام تک وہ کچھ کام نمٹا کر گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اتفاق سے میگرڈ کا گھر راستے میں آتا تھا۔ جب وہ اس علاقے میں پہنچی تو اسے خیال آیا کہ صبح کے بجائے وہ ابھی چلی جائے۔ لیکن پھر سے یاد آیا آج اس کے بچے کو اسکول میں ہونے والے ٹیسٹ کا نتیجہ ملنا تھا اور وہ بے چینی سے گھر میں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس نے گاڑی موڑنے سے گریز کیا اور گھر آ گئی۔ اس کا بیٹا واقعی شدت سے اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی لپٹ گیا اور ماریتا سب بھول گئی۔

اگلی صبح وہ گھر سے نکلی تو اسے میگرڈ یاد آئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ دفتر جانے سے پہلے اس کے گھر جائے گی اور اس سے معذرت کرنے اور اس کی دل جوئی کرنے کی بھرپور کوشش کرے گی۔ اس نے کار میگرڈ کے گھر کی طرف موڑ دی۔ وہ اس کے گھر کے سامنے پہنچی۔ میگرڈ کا باغ ویسا ہی خوب صورت تھا۔ وہ اتر کر لکڑی کے دروازے سے اندر آئی تو گھنٹی بجی۔ وہ رک کر انتظار کرنے لگی کہ میگرڈ آئے۔ لیکن پانچ منٹ گزرنے کے بعد بھی اندر سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تو وہ خود دروازے کی طرف بڑھی اور اس نے دستک دی۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا تو اس کا دل خدشات سے دھڑک اٹھا۔ کہیں میگرڈ کی طبیعت خراب تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس نے اولڈ ہاؤس جانے کی خبر کا بہت زیادہ اثر لیا تھا۔ اس نے دوبارہ زور سے دستک دی۔ اس بار بھی جواب نہیں آیا تو اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور وہ کھل گیا۔ اس نے اندر جھانکا۔

"مادام تم کہاں ہو؟"

وہ بولتے ہوئے اندر آ گئی تھی۔ اس نے میگرڈ کو کچن کی کھڑکی کے سامنے کرسی پر ساکت بیٹھے دیکھا تو وہ اس کی طرف لپکی۔ میگرڈ سیدھی اور ساکت بیٹھی تھی۔ میز پر خواب آور گولیوں کی شیشی خالی رکھی تھی اور ماریتا اس کی نبض دیکھے بغیر بتا سکتی تھی کہ وہ مر چکی ہے۔ اس کی کھلی آنکھیں ایک جگہ ساکت تھیں۔ اس کے باوجود ماریتا نے لرزتے ہاتھوں سے اس کی نبض دیکھی جو شاید کئی گھنٹے پہلے ڈوب چکی تھی۔ خواب آور دوا کی شیشی کے نیچے ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ماریتا نے وہ کاغذ نکالا۔ اس پر میگرڈ کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ "کچھ مہینے پہلے ڈاکٹر نے مجھے نیند کی کمی پوری کرنے کے لیے یہ دوا دی تھی لیکن میں نے اسے کبھی استعمال نہیں کیا۔ کل سے میں بے چین تھی کہ اس گھر سے جدا ہونے کا سوچ کر میرا دل رک جائے گا لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو مجبوراً مجھے یہ کام خود کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے اس میں کسی کا نقصان نہیں ہے۔ میگرڈ مسز وائٹ۔"

ماریتا نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور پرچہ میز پر رکھ کر ایک طرف رکھا فون اٹھا کر پولیس کو کال کرنے لگی۔

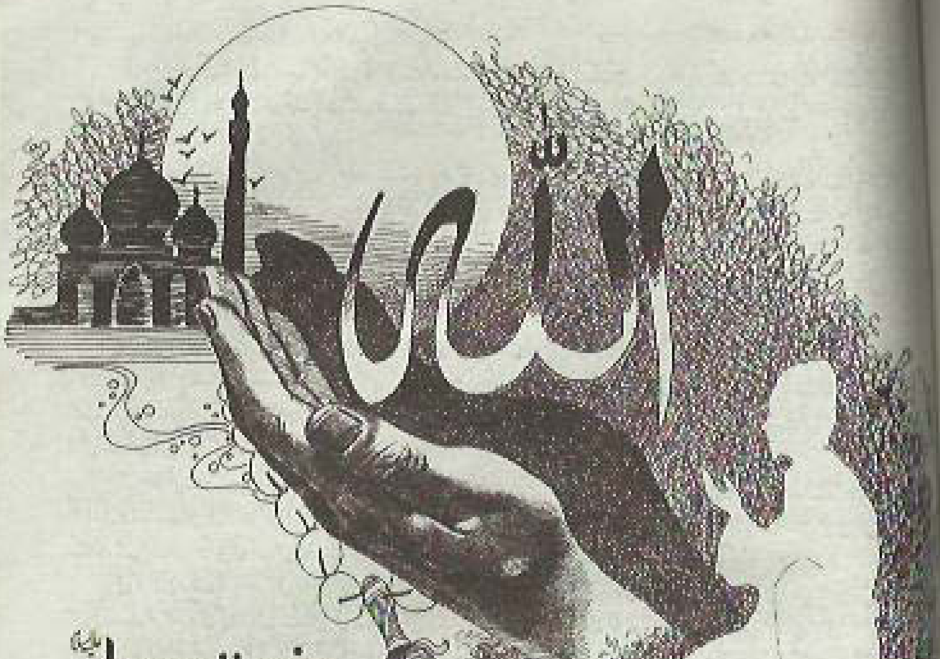

حضرت یرمیاہ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بنی اسرائیل کی تاریخ رفتہ رفتہ صدیوں کے سینے پر سفر کرتے ہوئے بالآخر اس مقام پر آ گئی جب ان کے سروں سے بزرگی کا تاج اترنے والا تھا... ایسے میں حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے ایک بار پھر انہیں مخاطب کیا... "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ کمہار اپنے چاک پر مٹی رکھتا ہے اور کوئی برتن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ برتن بگڑ جاتا ہے۔ کمہار اس مٹی کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اس سے جیسا مناسب سمجھتا ہے ایک دوسرا برتن بنا لیتا ہے۔ سو تم بھی بگڑی ہوئی مٹی ہو... خدا اس مٹی سے تم جیسی کوئی اور قوم بنائے گا۔"

بنی اسرائیل کی سرکشی...... بت پرستی اور انبیائے کرام کی جہد مسلسل کا احوال

حضرت طالوت بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ تھے۔ جنہیں بنی اسرائیل نے قتل کر دیا۔ ان کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کی بادشاہت چالیس برس تک قائم رہی۔ پھر بنی اسرائیل کی خوش حالیوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کا دور دیکھا۔ چالیس سال مزید گزر گئے۔ ان کا بیٹا رحبعام تخت پر بیٹھا اور اپنے ساتھ کفر و ضلالت کی ایسی آندھی لایا کہ خوش حالی کا ہر چراغ ایک ایک کر کے بجھتا چلا گیا۔ اس نے باپ کا دین ترک کر کے اعلانیہ بت پرستی اختیار کر لی۔ اس کی دیکھا دیکھی عوام بھی کافر و بت پرست ہو گئے۔ خدا پرستی کا ہر قلعہ اس طرح زمیں بوس ہو گیا جیسے یہ قوم کسی بڑے زلزلے سے گزری ہو۔ بکھرنے، منتشر ہونے کا عمل شروع ہوا۔ یہ شیرازہ ایسا بکھرا کہ ہر قدم تباہی کی طرف اٹھتا گیا۔ پیغمبران خدا آتے رہے، تبلیغ کرتے رہے لیکن حال یہ تھا کہ بت پرستی کی دھوپ ہر جگہ سایہ دار کو جلاتی رہی۔ کسی شاخ نبوت کی چھاؤں سے کچھ دیر کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امید کے سائے دراز ہوتے اور پھر وہی دھوپ کی دھوپ۔

بنی اسرائیل کی تاریخ دھوپ چھاؤں کا سفر طے کرتے ہوئے، صدیوں کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے اس قوم کے اس حکمران تک پہنچی جس کا نام منسی تھا۔ تخت نشیں ہوتے وقت اس کی عمر بارہ سال تھی اور اس وقت اسرائیلی حکومت اسوریوں کی باجگزار یعنی خراج ادا کرنے پر مجبور تھی۔

اس کم عمر بادشاہ نے "اسوریوں" کو خدا سے زیادہ طاقتور سمجھا اور اپنے دادا کے مشرکانہ عقائد کو اس عروج تک لے گیا کہ پھر خدا کے تصور کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ بت پرستی عام تھی لیکن وہ تو ایسا دور تھا کہ غیر خدا کی پرستش نے دیوانگی کا روپ دھار لیا۔

اس نے اونچے مقامات تعمیر کرائے۔ یسیرتیں اور بعل کے لیے قربان گاہیں بنائیں اور یہوداہ کو ایسی بدترین بت پرستی میں دھکیل دیا جیسی کہ اخی اب اور ایزبل کے عہد میں شمالی سلطنت میں رائج تھی۔

مذہبی رسومات اور تقریبات کے ذریعے ستاروں اور سیاروں کی پرستش کو رواج دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ عبرانی بادشاہ عمون کے دیوتا مولک کو بھی ماننے لگا اور یروشلم کے باہر ہنوم کی وادی میں اس کے لیے بچوں کی قربانیاں چڑھانے لگا۔ پھر غیب گوئی اور جادوگری کو سرکاری طور پر رواج دیا گیا۔ خدا کی صریح نافرمانی کر کے آسمانی لشکروں کی پرستش کے لیے قربان گاہیں ہیکل کے صحن میں رکھی گئیں۔

اس معاشرے میں کچھ نیک لوگ بھی تھے جو اس گھناؤنی بت پرستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے تھے۔ تلوار کی نوک سے ان کی قوت گویائی چھین لی جاتی تھی۔ بادشاہ نے اپنے گناہوں میں ایک اضافہ یہ بھی کرلیا کہ انسانی خون اس کے دور میں ارزاں ہو گیا حتیٰ کہ اس دور کے نبی حضرت یسعیاہ کو بھی بادشاہ کے حکم سے آرے سے چیر دیا گیا۔

نبی کا خون رنگ لایا اور منسی، اسوریوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر بابل پہنچ گیا۔ رہائی کے بعد یروشلم واپس آیا لیکن اب اس کی مدت عمر کم رہ گئی تھی۔ اس نے اسیری کے دوران توبہ کرلی تھی اور خدا کو ماننے لگا تھا لیکن اب وقت نہیں تھا کہ ان رسومات کو ختم کر سکتا جن کی وہ برسوں سے سرپرستی کر رہا تھا۔ یہ اصلاحات موثر ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ کیونکہ جتنے خدا پرست اور نیک لوگ تھے وہ موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے اور جنہیں مشرکانہ رسومات کی عادت پڑ گئی تھی، انہیں راہ راست پر لانا مشکل تھا۔

☆☆☆

یروشلم سے دو میل کے فاصلے پر بن یامین کا ایک شہر آباد تھا جس میں لاوی بن یعقوب کی نسل کے بہت سے گھرانے آباد تھے۔ ان میں ایک خلقیاہ نامی شخص بھی تھا۔ وہ اس وقت اپنے چار سالہ بیٹے یرمیاہ کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ شاہی محل سے اعلان ہوا۔ شاہی خاندان میں ایک فرد کا اضافہ ہوا تھا۔ منسی کے بیٹے امون کے گھر بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام یوسیاہ رکھا گیا تھا۔

"ایک بت پرست کا اور اضافہ ہوا۔" خلقیاہ نے اپنی زوجہ سے کہا۔

"کیا پتا یہ بت پرست نہ ہو، بت شکن ہو۔"

"تو بڑی بھولی ہے۔ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے۔ دیکھتی نہیں ہو منسی کو۔ اس نے خدا کے ہوتے ہوئے بتوں کو اس طرح پوجنا شروع کر دیا جیسے بے وفا عورت اپنے خاوند کے ہوتے ہوئے کسی اور سے دوستی گانٹھ لے۔"

"اب تو سنا ہے اس نے توبہ کرلی ہے۔"

"ارے تو بہت بھولی ہے۔ اس نے دکھانے کو توبہ کرلی ہے۔ اس کی وجہ سے تو اسرائیل قوم ذلت کے گڑھے میں گر گئی ہے۔ ہم اسوریوں کو خراج دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کسی وقت بھی کوئی آئے گا اور یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا کر چلا جائے گا۔"

"اب کوئی پیغمبر بھی تو نہیں ہے جو اسے سمجھا سکے۔"

"یسعیاہ نبی کو اس نے قتل کرادیا۔ اسی سے اندازہ لگا لو وہ کیسا آدمی ہوگا۔"

"کوئی نہ کوئی نبی ضرور آئے گا جو اس قوم کو ذلت سے نکالے گا۔"

"نبی تو جب آئے گا تب آئے گا۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ یہوداہ کے جتنے شہر ہیں اتنے ہی ان کے معبود ہیں۔"

"ہمیں کیا ہم تو چھپ چھپ کر خدا کو یاد کرہی لیتے ہیں۔"

"مجھے اپنی نہیں، یرمیاہ کی فکر ہے۔ یہ جب تک بڑا ہو، خدا جانے بت پرستی کس منزل پر ہو۔ ایک کو دیکھ کر دوسرا رنگ پکڑتا ہے۔ مجھے ڈر ہے یہ بھی نہ بہک جائے۔"

"ہم اس کی تربیت اس طرح کریں گے کہ یہ خدا پرست ہوگا، بت پرست نہیں۔"

یرمیاہ ان کا بیٹا اب بھی ان کے سامنے بیٹھا مٹی سے کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی کھیل سے دھیان ہٹا کر ماں باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لیتا تھا اور پھر کھیل میں لگ جاتا تھا۔

"جب امون کا بیٹا یوسیاہ جوان ہوگا تو اس وقت ہمارا بیٹا بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے گا لیکن دونوں کی قسمت الگ ہوگی۔ یوسیاہ شاہی تخت پر بیٹھے گا اور یرمیاہ ہماری طرح ریوڑ چرائے گا۔" یرمیاہ کے باپ نے کہا۔

"اب قسمت کو تو کوئی نہیں بدل سکتا۔ یرمیاہ بت پرستی سے محفوظ رہے، یہی ہمارے لیے بہت ہے۔"

یہ وہ دور تھا جب منسی مذہبی اصلاحات کے لیے کوشاں تھا لیکن اس کی کوششیں ضائع ہو رہی تھیں۔ قوم کی عادتیں خود اس نے اتنی بگاڑ دی تھیں کہ اب وہ لوگ اس کے قابو سے باہر ہو گئے تھے۔

خلقیاہ کے گھر میں منسی کی باتیں روز ہوا کرتی تھیں۔ یرمیاہ اب کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ گھر میں ہونے والی باتوں کو نہ صرف سمجھنے لگا تھا بلکہ چھوٹے موٹے سوال بھی اٹھانے لگا تھا۔ وہ سنا کرتا تھا کہ منسی نے بت پرستی کو فروغ دیا تھا اور اب وہ توبہ کر چکا ہے اور اصلاحات پر کمربستہ ہے۔ اس لیے وہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کا باپ جب بھی منسی کے خلاف بولتا تھا وہ اس کی حمایت کرنے لگتا تھا۔

ایک دن اطلاع آئی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ "اب اصلاحات کا کیا ہوگا؟" یرمیاہ نے اپنے باپ سے پوچھا۔

"یہ تو اس کے بیٹے امون پر منحصر ہے۔" خلقیاہ نے کہا۔

امون تخت پر بیٹھا تو نیک دل لوگوں کو اس سے بہت سی امیدیں تھیں لیکن اس نے تخت نشیں ہوتے ہی ان تمام مشرکانہ رسوم کو پھر سے جاری کر دیا جن کی اصلاحات کی طرف اس کا باپ متوجہ ہوا تھا۔ حضرت یرمیاہ ایک مرتبہ پھر اداس رہنے لگے تھے۔ وہ چھوٹے تھے لیکن یہ شعور اب بھی تھا کہ منسی کی اصلاحات کو فروغ ملتا، اگر اس کا جانشیں اس کی اصلاحات کو جاری رکھ سکتا۔ خلقیاہ کو یہ کہنے کا موقع مل گیا تھا کہ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے۔ اس کی بیوی کو بھی چپ سی لگ گئی تھی کیونکہ وہ اکثر کہا کرتی تھی، ضروری تو نہیں کہ منسی کا بیٹا بھی اسی کی طرح ہو۔

بنی اسرائیل دیکھ رہے تھے کہ انہیں ایک مرتبہ پھر مشرکانہ رسوم کی طرف راغب کیا جارہا ہے۔ وہ پریشان تھے کہ آخر وہ کس دین پر چلیں۔ کبھی انہیں لکڑی اور پتھر کے بت تراشنے کو کہا جاتا ہے، کبھی حکم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے ہاتھوں سے توڑ دو جن ہاتھوں سے بنایا تھا۔ بت پرستی فروغ پاتی جارہی تھی۔ منسی تو طاقتور بادشاہ تھا۔ کوئی اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن امون میں وہ انتظامی صلاحیت نہیں تھی۔ عوام بہت دنوں سے دیکھ رہے تھے کہ یروشلم کا صحن بتوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ ان کا غم و غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ راست بازوں کی تعداد گو کم تھی لیکن قتل کرنے کو ایک آدمی بھی بہت ہوتا ہے۔

اس کے خلاف سازشیں تیار کی جارہی تھیں۔ اسے قتل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن اسے قتل کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا کیونکہ عوام کی بڑی تعداد اس کے ساتھ تھی۔ کچھ ہی لوگ تھے جو امون کے خلاف ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے محل کے ملازموں کے ساتھ مل کر ایک سازش تیار کی۔ محل کے غلاموں میں سے کچھ کو خرید لیا گیا اور بالآخر انہوں نے موقع دیکھ کر امون کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس وقت امون کو بادشاہت کرتے ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے۔

امون کے قتل کے بعد اس کے آٹھ سالہ بیٹے یوسیاہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ وہ اتنا کم سن تھا کہ مذہبی اصلاحات کی جانب مائل نہیں ہو سکتا تھا۔ بت پرستی اسی زور و شور سے جاری رہی۔

ایسی بدترین بت پرستی کے دور میں یہوداہ سوائے غضب الٰہی کے اور کس بات کی امید کر سکتے تھے لیکن جب وہ جوان ہوا تو بت پرستی کی طرف مائل ہونے کے بجائے خلوص نیت سے خدا کا طالب ہوا۔ شاہی اختیارات کو نہایت دلیری سے استعمال کیا اور نہ صرف یہوداہ بلکہ شمالی قبائل سے بھی بے دینی اور بت پرستی کی رسومات کو ختم کر دیا۔ بعل کے مذبح توڑ ڈالے، یسیرتیں تباہ کردیں اور بت پرستی کے لیے مخصوص ظروف کو دور کردیا۔ مذہبی کسبیوں کے حجرے ڈھا دیے۔ گھوڑے جو سورج دیوتا کے لیے مخصوص تھے ان کو ہیکل سے ہٹا دیا۔ بچوں کی قربانی کی ہولناک رسم کو ختم کر دیا۔ اس نے ان کاہنوں کو بھی نکال دیا جو بت پرستی کے لیے مخصوص تھے۔ سامریہ کے علاوہ کے سارے شہروں میں اصلاحات کا چرچا ہونے لگا۔ اونچے مقامات ڈھا دیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے اور بت پرستی کے کاہنوں کو قید کر دیا گیا۔

ہیکل کی مرمت کے دوران اسے توریت کا ایک نسخہ بھی ملا۔ اس کے دادا منسّی نے توریت کے تمام نسخے ضائع کرا دیئے تھے تاکہ لوگ حضرت موسیٰ کی شریعت سے واقف نہ ہو سکیں۔ ایک نسخہ کی عبارت کی بنیاد میں تھا جو یوسیاہ کو مل گیا۔ اس نے یہوداہ کے بزرگوں، کاہنوں اور یروشلم کے عام لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا اور دریافت شدہ توریت کی کتاب سب کو پڑھ کر سنائی۔ یوسیاہ بادشاہ نے سچے دل سے وعدہ کیا کہ میں اس شریعت کی پوری پابندی کروں گا۔

اس وقت بادشاہ یوسیاہ نے حکم دیا کہ اپنے خدا کے لیے "عید فسح" مناؤ جیسا کہ عہد کی اس کتاب میں لکھا ہے۔

"پہلے مہینے کی چودھویں تاریخ کو شام کے وقت خداوند کی فسح ہو کرے گی اور اسی مہینے کی پندرہویں تاریخ کو خداوند کے لیے عید فطیر ہو۔ اس میں تم سات دن تک بے خمیری روٹی کھانا۔ پہلے دن تمہارا مقدس مجمع ہو۔ اس میں تم کوئی خادمانہ کام نہ کرنا اور ساتوں دن تم خداوند کے حضور آتشیں قربانی گزراننا اور ساتویں دن پھر مقدس مجمع ہو۔ اس روز تم کوئی خادمانہ کام نہ کرنا۔"

تیاریاں شروع ہو گئیں اور یہ عید اس بڑے پیمانے پر منائی گئی کہ قاضیوں کے زمانے سے جو اسرائیل کی عدالت کرتے تھے اور اسرائیل کے بادشاہوں اور یہوداہ کے بادشاہوں کے کل ایام میں ایسی عید کبھی نہیں ہوئی تھی۔

حضرت یرمیاہ اصلاحات کے اس دور کو بڑی خندہ پیشانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ خوش تھے کہ برسوں کے بعد سیاسی حالات بدلے بھی ہوں اور ان کے ملک میں حضرت موسیٰ کی شریعت کا بول بالا ہو رہا ہے۔ وہ بچپن سے اپنے باپ کی زبانی سنتے چلے آئے تھے کہ سانپ کا بچہ سانپ ہوتا ہے لیکن یوسیاہ نے اس قول کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ اس نے اپنے باپ اور دادا دونوں سے انحراف کیا تھا۔ ہیکل میں خدا کی عبادت دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔

حضرت یرمیاہ کی عادت تھی کہ وہ قریبی قبرستان میں جا کر بیٹھ جاتے تھے اور خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ یوسیاہ کی اصلاحات کے زمانے میں یہ آمد و رفت کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ ایک ایسے بادشاہ کے دور میں ہیں جو بت پرست نہیں ہے۔

ایک روز وہ اسی قبرستان میں موجود تھے کہ کسی نے بہت نزدیک سے انہیں پکارا۔ دور و نزدیک کوئی نہیں تھا۔ حضرت یرمیاہ کو سخت حیرانی نے پکڑ لیا۔ کون ہے جو انہیں ان کا نام لے کر پکار رہا ہے۔ کوئی ان سے کہہ رہا تھا۔ "یرمیاہ! میں نے تجھے نبوت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔"

"مجھ میں تو کوئی ایسی بات نہیں۔" حضرت یرمیاہ نے کہا۔ "میں تو کاہن بھی نہیں کہ یہ منصب تو کاہنوں کو زیب دیتا ہے۔"

"ہم جس کو چاہتے ہیں اور جو چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ میں نے تجھے بطن میں خلق کیا، میں تجھے جانتا تھا اور تیری ولادت سے پہلے میں نے تجھے مخصوص کیا اور قوموں کا تجھے نبی ٹھہرایا۔"

اب حضرت یرمیاہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ خداوند اس کی روح سے ہم کلام ہے۔ انہوں نے اپنے باپ کی زبانی نبیوں کے قصے سنے تھے کہ کس طرح ان کی بلاہٹ ہوئی اور خدا ان سے ہم کلام ہوا۔ یہی سب ان کے ساتھ ہو رہا تھا لیکن وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔

"میں تو روحانی طور پر بالکل بچہ ہوں۔ میں تو بول بھی نہیں سکتا۔"

"یوں مت کہہ کہ تو بچہ ہے۔ میں نے تیرے چلنے پھرنے کے قابل ہونے سے پہلے تجھے نبی بنا دیا تھا اور بالغ ہونے سے پہلے تجھے چن لیا تھا۔ جس کسی کے پاس میں تجھے بھیجوں گا تو جائے گا اور جو کچھ میں تجھے فرماؤں گا تو کہے گا۔"

"یا اللہ میں کمزور ہوں۔ یا اللہ میں عاجز ہوں۔ یا اللہ! میں غلطی کرنے والا ہوں۔"

"ایسا مت کہہ۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ کیا تجھے معلوم نہیں تمام امور میری مشیت کے تابع ہیں اور تمام دل اور زبانیں میرے قبضے میں ہیں۔ میں اللہ ہوں۔ میرا جیسا کوئی نہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں، لہٰذا میرے ہوتے ہوئے تجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے تجھے اپنی مخلوقات میں سے بہت بڑی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ تو میرا پیغام پہنچائے۔"

"میں عاجز ہوں۔ میں تو کسی کے آگے کچھ بول بھی نہیں سکتا۔"

"دیکھ میں نے اپنا کلام تیرے منہ میں ڈال دیا۔ دیکھ آج کے دن میں نے تجھے قوموں پر اور سلطنتوں پر مقرر کیا کہ اکھاڑے اور ڈھائے اور ہلاک کرے اور گرائے اور تعمیر کرے اور لگائے۔"

اس کے بعد اس آواز نے خاموشی کا لباس پہن لیا۔ حضرت یرمیاہ سخت پریشان تھے کہ یہ آواز مزید کوئی پیغام دیے بغیر

غائب ہو گئی۔ اب انہیں کیا کرنا ہے؟

وہ اسی عالمِ سراسیمگی میں واپس آئے اور سوچنے لگے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کسی نبی کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب لوگ خدا کا نام لینا بھول جاتے ہیں۔ یوسیاہ کی مذہبی اصلاحات تو اپنے عروج پر ہیں پھر میرا کیا کام رہ جاتا ہے۔ وہ اس وقت یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ انہیں کسی آنے والے وقت کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ وہ کئی دن اسی کشمکش میں مبتلا رہے۔ پھر اپنی اس پریشانی میں انہوں نے باپ کو شریک کرنا مناسب سمجھا۔ انہوں نے وہ تمام گفتگو جو غیبی آواز نے کی تھی والد کے گوش گزار کر دی۔ جہاں دیدہ والد نے انہیں مبارک باد دی اور حضرت یرمیاہ کا وہ مسئلہ بھی حل کر دیا جس میں وہ کئی دن سے گرفتار چلے آتے تھے۔

"میرے بیٹے! جو خدا جانتا ہے وہ ہم نہیں جانتے۔ تجھے یہ نبوت آج کے لیے نہیں بلکہ کل کے لیے دی گئی ہے۔ اسرائیلیوں کا کل، آج کی طرح نہیں ہوگا۔ وہ دن دور نہیں جب یوسیاہ نہیں رہے گا اور اس کے جانشین خدا کا نام بھلا دیں گے۔ اس وقت ایک سچے نبی کی ضرورت پڑے گی اور وہ تو ہوگا۔"

"مجھے اس وقت کیا کرنا ہوگا میرے باپ؟"

"اس آواز کا انتظار کر جو تجھے ہدایت دے گی۔"

☆☆☆

یہ وہ دور تھا جب یہوداہ کی سرحدوں کے پار اہم شخصیات اور واقعات تاریخ کی تشکیلِ نو میں مصروف تھے۔ یہ قدیم مشرقِ قریب کی تاریخ کا نازک ترین دور تھا جس نے یہوداہ کی تاریخ کو بھی متاثر کیا۔

اسوری سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ بابل اور مصر بالادستی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ آشور کی شکست اور نینوا کی تباہی کی خبریں یروشلم میں گردش کرنے لگیں تو یوسیاہ نے بھی اسوری علاقوں کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ فوجی طور سے وہ تیار تھا مگر اس سے ایک مہلک غلطی سرزد ہوئی۔ اسوری حاران میں پسپا ہو رہے تھے۔ شاہِ مصر اسوریوں کی کمک کے لیے اپنی فوجوں کو فلسطین میں سے لے گیا۔ یوسیاہ کو اسوریوں کے تحفظ سے کوئی غرض نہیں تھی، اس لیے وہ اپنی فوجیں لے کر تیزی سے "مجدو" کی طرف بڑھا تاکہ شاہِ مصر کو روک دے۔ یہ لڑائی اس کے لیے موت کا پیغام بن گئی۔ اس کی فوجوں کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ یوسیاہ کو ایسے مہلک زخم لگے کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ یہوداہ کی مذہبی اور قومی امیدیں بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں۔ حضرت یرمیاہ نے اس نیک دل بادشاہ کے لیے نوحہ لکھا۔

وہ بستی جو خلقت سے معمور تھی
کیسی خالی پڑی ہے
وہ خاتونِ اقوام بیوہ سی ہو گئی
وہ ملکۂ ممالک باج گزار ہو گئی
وہ رات کو زار زار روتی ہے
اس کے آنسو رخساروں پر بہتے ہیں
اس کے چاہنے والوں میں کوئی نہیں
جو اسے تسلی دے
صیون کی راہیں ماتم کرتی ہیں
کیونکہ عید کے لیے کوئی نہیں آتا
اس کے سب پھاٹک سنسان ہیں
اس کے کاہن آہیں بھرتے ہیں
اس کی کنواریاں مصیبت زدہ ہیں
اس کے مخالف غالب آئے
دخترِ صیون کی سب شان و شوکت جاتی رہی
اس کے امرا ان ہرنوں کے مانند ہو گئے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جن کو یہ اگاؤ نہیں ملتی
اور شکاریوں کے سامنے عاجز ہو جاتے ہیں

یوسیاہ کی وفات کے بعد ملک کے لوگوں نے اس کے بیٹے یوآخز کو یروشلم میں بادشاہ بنایا لیکن تین مہینے بعد ہی مصر کے امور میں مداخلت کے الزام میں شاہ مصر نے اسے تخت سے اتار دیا اور ملک پر سو قنطار چاندی اور ایک قنطار سونا جرمانہ کیا اور اس کے بھائی الیاقیم کو یہوداہ اور یروشلم کا بادشاہ بنایا اور اس کا نام بدل کر یہویقیم رکھا۔ یوآخز گرفتار ہو کر مصر پہنچا دیا گیا۔ اس کی موت مصر ہی میں واقع ہوئی۔

☆☆☆

پیغمبروں کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ حضرت یرمیاہ بھی اس رات سونے کے لیے لیٹے تو ایک خواب نے ان کی آنکھوں میں جگہ بنالی۔ آنکھ کھلی تو خواب تازہ تھا لیکن تعبیر سمجھ میں نہ آئی تھی۔ ایک آواز نے پھر پکارا۔ یہ وہی آواز تھی جو اس سے پہلے وہ قبرستان کے سناٹے میں سن چکے تھے۔

"اے یرمیاہ تو نے کیا دیکھا؟"

"میں نے عالم رؤیا میں بادام کے درخت کی ایک شاخ دیکھی ہے۔"

"تو نے خوب دیکھا کیونکہ میں اپنے کلام کو پورا کرنے کے لیے بیدار رہتا ہوں۔"

اس کلام سے حضرت یرمیاہ نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ خدا انہیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس نبوت کے کلام کا پورا ہونا یقینی ہے۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ کس کلام کے پورا ہونے کی بشارت دی جا رہی ہے۔ یہ علامت دوسری شب کے خواب میں نظر آ گئی۔

"اے یرمیاہ تو کیا دیکھتا ہے؟"

"ابلتی ہوئی دیگ دیکھتا ہوں جس کا منہ شمال کی طرف ہے۔"

"یہ دیگ اس بات کی علامت ہے کہ شمال کی طرف سے اس ملک کے تمام باشندوں پر آفت آئے گی۔ میں شمال کی سلطنتوں کے تمام خاندانوں کو بلاؤں گا۔ وہ آئیں گے اور ہر ایک اپنا تخت یروشلم کے پھاٹکوں کے مدخل پر اس کی سب دیواروں کے گرداگرد اور یہوداہ کے تمام شہروں کے مقابل قائم کرے گا۔"

"تو ایسا کیوں کرے گا۔ میرے شہروں کو ویران کیوں کرے گا؟"

"اس لیے کہ انہوں نے مجھے ترک کیا اور غیر معبودوں کے سامنے لوبان جلایا اور اپنی ہی دستکاری کو سجدہ کیا۔"

"جب یہ ہوگا تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تو اپنی کمر کس کر اٹھ کھڑا ہو اور جو کچھ میں تجھے فرماؤں ان سے کہہ۔ ان کے چہروں کو دیکھ کر نہ ڈر کیونکہ دیکھ میں آج کے دن تجھ کو اس تمام ملک اور یہوداہ کے بادشاہوں اور اس کے امیروں اور اس کے کاہنوں اور ملک کے لوگوں کے مقابل ایک فصیل دار شہر اور لوہے کا ستون اور پیتل کی دیوار بناتا ہوں۔"

"میں ان لوگوں سے لڑنے کی سکت نہیں رکھتا۔"

"وہ تجھ سے لڑیں گے لیکن تجھ پر غالب نہ آئیں گے کیونکہ خداوند فرماتا ہے، میں تجھے چھڑانے کو تیرے ساتھ ہوں۔"

"میں انہیں کس بات پر شرمندہ کروں؟"

"کیا تو نہیں جانتا کہ یہ قوم تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی ہے۔ اس کے پادریوں اور بڑوں نے میرے بندوں کو یہ پیغام بنایا کہ وہ مجھے چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔ میری کتاب کو چھوڑ کر ان سے فیصلے کرواتے ہیں۔ مجھے میرے جلال کی قسم میرے بندے کے لیے جائز نہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرے۔ تو یہ باتیں قوم کو بتا تاکہ وہ شاید سمجھ جائیں تو میں ان کی دعا پھر قبول کروں اور ان کے دشمنوں کو ان سے دور کروں۔ اگر وہ توبہ نہیں کرتے تو میں انہیں بابل کے ہاتھوں ہلاک کروں گا۔"

یہ کلمات ہی ایسے تھے کہ حضرت یرمیاہ نے عالم وحشت میں اپنا لباس چاک کر لیا اور پریشانی میں زمین کی مٹی سر پر ڈالی اور آہ و زاری کرنے لگے۔

"میں اپنی قوم کو ہلاک ہوتے ہوئے دیکھوں گا؟ بنی اسرائیل کا آخری نبی ہونا میرے لیے آزمائش بنا۔ اگر تو میرے

قدوقامت

معلوم ہوا کہ چوپایوں کو کھانے کے لیے سر جھکانا لازمی ہے اور انسان کے لیے خود کھانا جھکتا ہے، جس کھانے کھانے کے لیے تیرا سر نہیں جھکایا تو تجھے بھی چاہیے کہ اللہ کی عبادت کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے۔

قدوقامت کے موجب سعادت کی راہ دیدہ ور ضروری ہے۔ کیونکہ قد و قامت، نیز جسمانی ساخت کے اعتبار سے تو کافر بھی ہم جیسے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے مسلمان اور کافر میں کیا فرق ہوا۔ جبکہ ایک دین دار اور بے دین میں فرق کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ جس خدا نے آنکھ، منہ اور کان عطا کیے ہیں، عقل و فہم اور انسانیت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ کمزوری کی وجہ سے تو اگر دشمن سے جہاد نہیں کر سکتا تو خدا کے واسطے اپنے دوستوں سے تو جنگ نہ کر۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے مصالحت رکھ۔

عقل مند احسان شناس نعمت پاتا ہے تو شکر گزار ہوتا ہے۔ اس لیے یہ لازمی ہے کہ اگر کوئی شخص احسان کرے تو اس احسان کا اعتراف یہ ہے کہ اس محسن کا ممنون رہے۔ ورنہ وہ محسن اپنا احسان روک بھی سکتا ہے۔

("حکایات سعدی" سے ایک حکایت)

ساتھ تیرا کار اور کرتا تو مجھے آخری نبی نہ بناتا۔ میری وجہ سے بنی اسرائیل پر بدبختی اور ہلاکت آئی۔"

جب اللہ تعالیٰ نے آپ کی آہ و زاری دیکھی تو آواز دی۔ "اے یرمیاہ! جو وحی میں نے تیری طرف بھیجی ہے کیا وہ تجھ پر شاق گزری ہے؟"

"مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔" حضرت یرمیاہ نے کہا۔ "وہ تلی والا دن آنے سے پہلے مجھے موت دے دیجیے۔"

"مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم۔" اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ "میں بیت المقدس اور بنی اسرائیل کو اس وقت تک ہلاک نہیں کروں گا جب تک اس کی ابتدا تمہاری طرف سے نہ ہو (یعنی جب تک تم خود دعا نہ کرو)"

حضرت یرمیاہ یہ جواب سن کر از حد خوش ہوئے اور فرمایا۔ "اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا کہ میں بنی اسرائیل کی ہلاکت کی کبھی دعا نہیں کروں گا۔"

حضرت یرمیاہ نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی قوم کو بدی سے دور رہنے کی تلقین کریں گے تاکہ وہ عذاب کی مستحق نہ بنے اور وہ وقت نہ آئے جب خود انہیں عذاب کی دعا کرنی پڑے۔

حضرت یرمیاہ یروشلم کے اردگرد کے گلی کوچوں میں جا کر لوگوں کو خبردار کرنے لگے۔ انہیں وہ نعمتیں یاد دلائیں جو خدا نے انہیں عنایت کی تھیں۔

"تو کو خداوند کا یہ کلام سنا خداوند فرماتا ہے، میں تمہیں ملک مصر سے نکال لایا اور میں تم کو باغوں والی زمین میں لایا کہ تم اس کے میوے اور اس کے اچھے پھل کھاؤ لیکن جب تم داخل ہوئے تو تم نے میری زمین کو ناپاک کر دیا اور میری میراث کو مکروہ بنایا، کاہنوں نے منہ پھیر لیا، اہل شریعت نے مجھے نہ جانا اور چرواہوں نے مجھ سے سرکشی کی اور بعل کے نام سے نبوت کی اور ان چیزوں کی پیروی کی جن سے کچھ فائدہ نہیں۔ اپنی ان حرکتوں سے اب بھی باز آ جاؤ تاکہ خدا تم پر مہربان ہو۔"

بدکاری اور گناہوں میں لتھڑی ہوئی یہ قوم ان کی باتوں کو ٹھٹھا گی اور منہ پھیر کر گزر جاتی تھی۔ اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا پھر آپ کو حکم ہوا کہ یروشلم کے دروازے پر کھڑے ہو کر منادی کرو کہ تباہی آنے والی ہے۔

"دیکھو وہ گھٹا کی طرح چڑھ آئے گا۔ اس کے رتھ گردباد کے مانند اور اس کے گھوڑے عقابوں سے تیز تر ہیں۔ اے یروشلم! تو اپنے دل کو شرارت سے پاک کر تاکہ تو رہائی پائے۔ میرے خیالات کب تک تیرے دل میں رہیں گے کیونکہ دان سے ایک آواز آتی ہے اور افرائیم کے پہاڑ سے مصیبت کی خبر دیتی ہے۔ اے لوگو! محاصرہ کرنے والے دور کے ملک سے آتے ہیں اور یہوداہ کے شہروں کو للکارتے ہیں گے۔ کھیت کے رکھوالوں کے مانند وہ اسے چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔"

لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کاہنوں نے حضرت یرمیاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا کہ یہ کیسا شخص ہے جو یروشلم کی تباہی کا اعلان کرتا پھر رہا ہے۔

"تم یروشلم کے پردے میں بادشاہ کو چوکس دے رہے ہو اور اسے یہ جتا رہے ہو کہ اس کی بادشاہت ختم ہو جائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گی۔"

"میں ہر اس شخص کو سرزنش کر رہا ہوں جس نے خدا سے بے وفائی کی ہے۔ ان میں بادشاہ بھی شامل ہے جس نے یروشلم کو بت کدہ بنا دیا ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو تلوار سے قتل کرے گا اور کال سے مار دے گا۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔ یہ سب تمہارے اپنے اوہام ہیں جن میں تم پوری قوم کو مبتلا کر رہے ہو۔"

"میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔" حضرت یرمیاہ نے فرمایا۔ "خداوند جو مجھ سے کہلواتا ہے، میں تو وہ کہتا ہوں۔"

"کیوں خدا پر بہتان باندھتے ہو۔ وہ تم سے کیا یہ کہتا ہے کہ یروشلم کو تباہ کر دے گا۔"

"وہ مجھ سے یہی کہتا ہے کہ شیر ہر جھاڑی سے نکلا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے نکلا ہے کہ تیری زمین کو ویران کرے۔"

"بادشاہ کی فوجیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھی رہیں گی۔"

"خداوند فرماتا ہے اس وقت یوں ہوگا کہ بادشاہ اور سردار بے دل ہو جائیں گے اور کاہن حیرت زدہ اور نبی امرا پریشان ہوں گے۔ تم میری آگاہی کو نظر انداز کرتے آئے ہو چنانچہ اب خدا اپنے خادم بخت نصر کو لا رہا ہے اور وہ ستر برس تک کے لیے ہر ایک میں بیٹھے گا۔ عداوت یروشلم سے شروع ہوگی اور آس پاس کی متعدد قوموں تک پھیل جائے گی اور بابل کا قہر یہاں پر جا ٹھہرے گی۔"

"ایسے میں بادشاہ کی حکمت و دانائی ہمارے کام آئے گی۔ تم کیوں فکر میں دبلے ہو رہے ہو۔"

"تم ایک انسان کی دانائی پر بھروسا کرتے ہو اور خدا کو بھول جاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اجداد کا تقویٰ یاد دلاتا ہے کہ تم اسے یاد کرو، پرہیزگاری اختیار کرو اور اس کا اجر حاصل کرو۔ وہ تمہیں واپس بلاتا ہے۔ تم موسیٰ کی شریعت کی پاسداری کرو اور اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش چھوڑ دو تو خدا تم پر مہربان ہو سکتا ہے مگر تم تو اس بیوی کی طرح ہو جو بے وفائی سے اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی ہے۔"

"بس بہت ہو گئی یرمیاہ۔ تو اپنے خدا سے کہہ دے کہ جب ایسا وقت آئے تو وہ ہمیں بچانے نہ نکلے۔ ہمارا بادشاہ اور ہم سب مل کر دشمن کا مقابلہ کر لیں گے۔"

"دنیاوی بادشاہ کو خدا سمجھنے والو! تمہارے بادشاہ کا حال تو یہ ہونے والا ہے کہ اس کی لاش یروشلم کے پھاٹک سے باہر پھینک دی جائے گی اور اس کی لاش دن کو گرمی اور رات کو پالے میں پڑی رہے گی۔ یہ شہر 'سیلا' کے مانند ہو جائے گا اور خدا اس شہر کو زمین کی سب قوموں کے نزدیک لعنت کا باعث ٹھہرائے گا۔"

یہ باتیں ایسی نہیں تھیں کہ چھوٹے بڑے نبی اور کاہن جو اس وقت موجود تھے انہیں برداشت کرتے۔ انہوں نے عام لوگوں کو جو وہاں موجود تھے بھڑکانا شروع کر دیا اور تشدد پر اتر آئے۔ کچھ لوگوں نے رائے دی کہ حضرت یرمیاہ کو مار پیٹ کر نکال دیا جائے لیکن کاہن کچھ زیادہ ہی بپھرے ہوئے تھے۔ ان کی روزی ان حرکات سے منسلک تھی جن سے حضرت یرمیاہ روک رہے تھے۔ یہ کاہن بہت عرصے سے حضرت یرمیاہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے اور آج انہیں موقع مل گیا تھا۔ ان کی زبان سے ایسی باتیں سرزد ہو گئی تھیں جو گرفت میں آ سکتی تھیں۔ کاہن اس موقع کو کیسے کھو سکتے تھے۔ انہوں نے حضرت یرمیاہ کو پکڑ لیا اور ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

"اب تمہیں قتل ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم نے کیوں خداوند کا نام لے کر نبوت کی اور کہا کہ یہ گھر 'سیلا' کے مانند ہوگا اور یہ شہر ویران اور غیر آباد ہوگا۔"

جس نے بھی سنا خداوند کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ شہر میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ حضرت یرمیاہ کو کون نہیں جانتا تھا۔ شہر کے لوگ بہت دن سے ایسی باتیں سن رہے تھے جن پر لوگوں کو بھی اعتراض تھا۔ اب ان کا مجرم پکڑا گیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔

"یرمیاہ نے بہت دن ہمارے دیوتاؤں کو برا کہہ لیا۔ اب یہی دیوتا انہیں سزا دیں گے۔"

"انہیں ہمارے شہر سے جانے کیا پرخاش ہو گئی ہے کہ کہتے ہیں یہ ویران ہو جائے گا۔"

"شہر تو شہر وہ ہیکل کے بھی دشمن ہو گئے ہیں۔ اسے بھی مسمار کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔"

"کہتے ہیں وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ان سے خدا کہلوا رہا ہے۔ بھلا خدا ایسی باتیں کہہ سکتا ہے جبکہ ہم خدا کے چہیتے ہوتے ہوئے

دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔"

جتنے منہ تھے اتنی باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت یرمیاہ کے لیے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے لیکن یہ بہت تھوڑے تھے۔ حضرت یرمیاہ کی گرفتاری کی خبر بادشاہ کے محل میں بھی پہنچ چکی تھی۔ بادشاہ نے اپنے امرا کو ہیکل کی طرف بھیجا کہ وہ جائیں اور کاہنوں کے کہنے کے مطابق حضرت یرمیاہ کا فیصلہ کریں۔

"آپ یرمیاہ کو کیا پاتے ہیں؟" امرا نے بادشاہ یہویقیم سے پوچھا۔

"وہ بے حد گستاخ ہے اور ایسی باتیں منہ سے نکالتا ہے جو کبھی پوری ہونے والی نہیں۔ ہم اس کی پیشینگوئیوں کو آگ میں جلانے کے لائق سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتا ہے۔ وہ ہرگز رعایت کا مستحق نہیں۔"

امرا نے بادشاہ کی مرضی کو جان لیا تھا۔ اب وہ جو بھی فیصلہ کرتے بادشاہ کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کڑکڑ کرتے ہوئے چلے اور خداوند کے گھر کے پھاٹک پر بیٹھ گئے۔ کاہنوں کو طلب کیا کہ وہ حضرت یرمیاہ کے خلاف الزامات پیش کریں۔

"یہ شخص واجب القتل ہے کیونکہ اس نے شہر کے خلاف نبوت کی ہے۔ یہاں کھڑے تمام لوگوں نے وہ تمام باتیں سنی ہیں جو اس نے کہی ہیں۔"

امرا نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا۔ ان سب نے حضرت یرمیاہ کو قصوروار گردانا اور وہ تمام باتیں دہرائیں جو انہوں نے کہی تھیں بلکہ بعض باتیں اپنی جانب سے بھی لگا دیں۔

امرا نے حضرت یرمیاہ کو اپنے سامنے طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ وہ اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ حضرت یرمیاہ نے ایک مرتبہ پھر تقریر کی۔

"خداوند نے مجھے بھیجا کہ اس گھر اور اس شہر کے خلاف وہ سب باتیں جو تم نے سنی ہیں، وہ میں تم سے کہوں۔ میں نے اپنی طرف سے نہ ایک لفظ کم کیا ہے نہ بڑھایا ہے۔ اس لیے اب تم اپنی روش اور اپنے اعمال کو درست کرو اور اپنے خدا کی آواز پر کان دھرو تاکہ خداوند اپنے عذاب سے جس کا تمہارے خلاف اعلان کیا ہے باز رہے۔ میں اس وقت تمہارے قابو میں ہوں۔ جو چاہو سلوک کرو لیکن یقین جانو اگر تم مجھے قتل کرو گے تو بے گناہ کا خون اپنے آپ پر اور اس شہر کے باشندوں پر لاؤ گے کیونکہ یہ سب میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ اس لحاظ سے میں بے گناہ ہوں۔"

حضرت یرمیاہ کی تقریر اتنی پُراثر تھی کہ خود امرا دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کہتا تھا، حضرت یرمیاہ واجب القتل ہیں جبکہ دوسرے گروہ کا اصرار تھا کہ وہ واجب القتل نہیں کیونکہ انہوں نے خداوند ہمارے خدا کے نام سے ہم سے کلام کیا۔ چند لوگ اٹھے اور انہوں نے دلیل پیش کی۔

"میکاہ نبی نے شاہ یہوداہ حزقیاہ کے ایام میں نبوت کی اور یہوداہ کے سب لوگوں سے مخاطب ہو کر یوں کہا کہ رب الافواج فرماتا ہے، صیہون کھیت کی طرح جوتا جائے گا اور یروشلم کھنڈر ہو جائے گا اور اس گھر کا پہاڑ جنگل کی اونچی جگہوں کے مانند ہوگا۔ تو کیا شاہ یہوداہ حزقیاہ نے اس کو قتل کیا؟"

ایک اور امیر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ بات ٹھیک ہے لیکن اوریاہ کو کیوں بھولتے ہو۔ اس کو تو یہویقیم نے اپنی تلوار سے قتل کیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یرمیاہ کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔" تمام امرا نے بہ یک آواز کہا۔

اب امرا کی صوابدید پر تھا کہ حضرت یرمیاہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ آپس میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ شہزادے اور امرا جمع تھے۔ بیشتر کا خیال یہی تھا کہ حضرت یرمیاہ سے جان چھڑائی جائے۔ اس طرح بادشاہ بھی خوش ہو جائے گا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اخیقام بن سافان اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ یہ ان امرا میں سب سے زیادہ بااثر سمجھے جاتے تھے کیونکہ یہ یوسیاہ کے دور سے چلے آ رہے تھے۔ بادشاہ بھی ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ حضرت یرمیاہ کی طرف سے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ انہوں نے سفارش کی کہ حضرت یرمیاہ کو قتل کرنے کے لیے لوگوں کے حوالے نہ کیا جائے۔ ان کی سفارش آئی تو کچھ دیگر امرا نے بھی ان کا ساتھ دیا اور یوں حضرت یرمیاہ کی جان بچ گئی۔

انہیں اپنی جان کی فکر نہیں تھی۔ انہیں تو یہ غم تھا کہ ان کی قوم اور نادان حکمران ان کی بات نہیں سن رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی روش نہیں بدلی تو بربادی ان کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ ان کی شکست عذاب کی صورت ان پر طاری ہونے والی ہے۔ ان کا دل درد سے لبریز تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہائے میرا دل!
میرا دل بے تاب ہے
میں چپ نہیں رہ سکتا
کیونکہ اے میری جان تو نے نرسنگے کی آواز
اور جنگ کی للکار سن لی ہے
شکست پر شکست کی خبر آئی ہے
یقیناً تمام ملک برباد ہوگا
میرے لوگ احمق ہیں
انہوں نے مجھے نہیں پہچانا
وہ بے شعور بچے ہیں اور امتیاز نہیں رکھتے
برے کام کرنے میں ہوشیار ہیں
پر نیکوکاری کی سمجھ نہیں رکھتے۔

حضرت یرمیاہ کچھ دنوں سے خاموش تھے کہ ایک مرتبہ پھر کلام الٰہی نازل ہوا۔
''تو جا کر اپنے لیے ایک کتانی کمربند خرید لے اور اپنی کمر پر باندھ لیکن اسے پانی میں مت بھگو۔''
آپ نے اس حکم کو نہ سمجھتے ہوئے بھی کمربند خرید لیا اور اپنی کمر پر باندھ لیا۔ خدا کا کلام دوبارہ نازل ہوا۔ ''اس کمربند کو جو تو نے خرید ا اور جو تیری کمر پر ہے لے کر اٹھ اور فرات کو جا اور وہاں چٹان کے ایک شگاف میں اسے چھپا دے۔''
حضرت یرمیاہ نے ویسا ہی کیا۔ بہت دن بعد خدا نے فرمایا کہ اٹھ فرات کی طرف جا اور اس کمربند کو جسے تو نے میرے حکم سے چھپا رکھا ہے، نکال لے۔
حضرت یرمیاہ گئے اور اس کمربند کو نکال لیا۔ دیکھا تو وہ کمربند ایسا خراب ہو گیا تھا کہ کسی کام کا نہ رہا تھا۔ تب خدا نے آپ کو مخاطب کیا۔
''اس کمربند کو دیکھ۔ اسی طرح میں یہوداہ کے گھمنڈ اور یروشلم کے غرور کو ختم کروں گا۔ یہ شریر لوگ جو میرا کلام سننے سے انکار کرتے ہیں اور اپنے ہی دل کی ضد کے پیرو ہوتے ہیں وہ اس کمربند کے مانند ہوتے ہیں جو کسی کام کا نہیں کیونکہ جس طرح کمربند انسان کی کمر سے لپٹا رہتا ہے اسی طرح میں نے اسرائیل کے تمام گھرانے اور یہوداہ کے تمام گھرانے کو لیا کہ مجھ سے لپٹے رہیں تاکہ وہ میرے لوگ ہوں مگر انہوں نے نہ سنا۔''
حضرت یرمیاہ نے اس خدائی کلام کی روشنی میں اپنی قوم کو گھمنڈ سے باز رکھنے کی تلقین کرنی شروع کر دی۔ وہ پھر یروشلم کی گلیوں میں نکل کھڑے ہوئے۔
''اس سے پہلے کہ تاریکی تمہیں گھیر لے اور اس تاریکی پر موت کے سائے منڈلانے لگیں غرور سے منہ موڑ لو۔ یہی وہ مرض ہے جو تمہیں خطروں سے آگاہ نہیں ہونے دیتا۔ عاجزی اختیار کرو۔ تمہاری بزرگی کا تاج اترنے کو ہے۔ ہوش کے ناخن لو۔ زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔''
یہ بھی اس قوم کے لیے ایسی نئی بات تھی کہ اسے تعجب ہوتا تھا کہ یرمیاہ کو کیا چڑ ہے جو وہ ہماری شان و شوکت کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ جو نعمتیں ہمیں مل گئی ہیں اب وہ کیونکر ہم سے چھینی جا سکتی ہیں۔
''اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کمہار اپنے چاک پر مٹی رکھتا ہے اور کوئی برتن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ برتن بگڑ جاتا ہے۔ کمہار اس مٹی کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اس سے جیسا مناسب سمجھتا ہے ایک دوسرا برتن بنا لیتا ہے۔ سو تم بگڑی ہوئی مٹی ہو۔ خدا اس مٹی سے تمہیں کوئی اور قوم بنا دے گا۔ ان نعمتوں کے لیے وہ کسی اور کو منتخب کر لے گا۔''
آپ عرصہ دراز تک قوم کو اور بادشاہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن یہ قوم کی بدقسمتی تھی۔ وقت ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا تھا۔ قوم کی بد اعمالیاں اسے عظیم شکست سے دوچار کرنے والی تھیں۔ خدا کا وعدہ سامنے تھا۔ اگر میرے لوگ راہ راست پر نہ آئے تو کوئی دوسری قوم ان پر مسلط ہوگی اور ان کے چراغ دھواں دینے لگیں گے۔
حضرت یرمیاہ لوگوں کو اپنا درد سناتے رہے۔

میں نے زمین پر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ
ویران اور سنسان ہے
افلاک کو بھی بے نور پایا
میں نے پہاڑوں پر نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ
وہ کانپ گئے
اور سب ٹیلے متزلزل ہو گئے
پھر میں نے نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ
زرخیز زمین بیابان ہو گئی
اور اس کے سب شہر خداوند کی حضوری
اور اس کے قہر کی شدت سے برباد ہو گئے
سواروں اور تیر اندازوں کے شور سے
تمام شہری بھاگ جائیں گے
وہ جنگلوں میں جا گھسیں گے
اور چٹانوں پر چڑھ جائیں گے
سب شہر ترک کیے جائیں گے اور کوئی آدمی
ان میں نہ رہے گا۔

☆☆☆

حضرت یرمیاہ علیہ السلام قوم کی طرف سے مایوس ہو کر حسب عادت قبرستان میں بیٹھے تھے کہ ایک آواز نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ کلام خداوندی نازل ہو رہا تھا۔
''وہ تمام کلام جو میں نے اسرائیل یہوداہ اور تمام اقوام کے خلاف تجھ سے کیا وہ سب ایک کتاب میں لکھ اور بادشاہ کے پاس بھیج شاید یہ گھرانا اس تمام مصیبت کا حال جو میں ان پر لانے کا ارادہ رکھتا ہوں سنے اور اپنی اصلاح کرے اور میں ان کی بدکرداری اور گناہ کو معاف کروں اور اسے جتلا دے کہ یہ آخری موقع ہے جو اسے مل رہا ہے۔''
حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے یہ کلام سنا اور اسی وقت اپنے با اعتماد دوست بارُوک ابن نیریاہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا یہ دوست ان کا منشی بھی تھا جو ان کی نبوتوں کو لکھا کرتا تھا اور لوگوں کو پڑھ کر سنا تا تھا۔ بارُوک اس وقت گھر پر ہی تھا۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی آواز سن کر باہر آیا۔ رات کا وقت تھا۔ بارُوک موم بتی اٹھائے باہر نکلا۔
''خیر تو ہے۔ اس وقت؟''
''میرے خدا نے اسی وقت مجھے مخاطب کیا ہے اور اسی وقت میں تمہارے پاس آ گیا ہوں۔''
''آپ چہرے سے پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا کوئی خاص ہدایت ملی ہے؟''
''ہاں۔ مجھے لگتا ہے خداوند خدا کسی فیصلے پر پہنچ چکا ہے۔ اب یہ شہر ویران ہونے کو ہے۔ تم مجھ کو کمرے میں لے چلو۔ میں سب تفصیل تمہیں بتاتا ہوں۔''
موم بتیوں کی روشنی میں وہ زینہ چڑھ کر بالا خانے پر پہنچ گئے۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے پوری تفصیل انہیں بتائی اور انہیں آمادہ کر لیا کہ جو کچھ وہ زبانی بتاتے جائیں گے وہ اسے لکھتے جائیں گے۔
کئی راتوں کے بعد سب باتیں تحریر ہو گئیں اور طومار تیار ہو گیا (اس وقت کپڑے کے تھان پر کتاب تحریر کی جاتی تھی۔ دونوں طرف لکڑی کی ڈنڈیاں لگائی جاتی تھیں۔ ایک طرف سے پڑھا جاتا تھا اور دوسری طرف سے ڈنڈی پر لپیٹتا جاتا تھا)
''میں تو مجبور ہوں کہ خداوند کے گھر میں نہیں جا سکتا۔'' حضرت یرمیاہ نے فرمایا۔ ''تو جا اور خداوند کا وہ کلام جو تو نے میرے منہ سے لکھا اس طومار میں لکھا ہے خداوند کے گھر میں روزے کے دن لوگوں کو پڑھ کر سنا اور تمام یہوداہ کے لوگوں کو بھی جو اپنے شہروں سے آئے ہوئے ہوں۔ شاید وہ خداوند کے حضور منت کریں اور سب کے سب اپنی بری روش سے باز آ جائیں۔''
بارُوک اس دن کا انتظار کرنے لگا جب روزے کی منادی ہو۔ سال کے نویں مہینے میں یروشلم کے سب لوگوں اور ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب نے جو یہوداہ کے شہروں سے یروشلم میں آئے تھے، خداوند کے حضور روزے کی منادی کی۔

باروک نے طومار اٹھایا اور خداوند کے گھر میں پھاٹک کے قریب پہنچ گیا۔ اس دن معمول سے زیادہ لوگ یہاں موجود تھے۔ اسی لیے اس دن کا انتخاب کیا گیا تھا۔ باروک نے لوگوں کو مخاطب کیا اور کتاب میں لکھی ہوئی باتیں انہیں سنانا شروع کیں۔

یہاں موجود کاہنوں میں سے ایک اپنی کوٹھری سے نکلا اور بادشاہ کے محل کی طرف بھاگا۔ اس نے دیکھا کہ سب امرا اس وقت منشی کی کوٹھری میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

"غضب ہوگیا۔" وہ چلاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ "یرمیاہ تو خداوند کے گھر میں آ نہیں سکتا تھا اس نے اپنے دوست باروک کو بھیجا ہے۔ اسے ہم روک بھی نہیں سکتے اور وہ......"

"اگر وہ آ گیا ہے تو ایسا کیا غضب ہے؟"

"وہ صرف آیا نہیں ہے بلکہ یرمیاہ کی سنائی ہوئی باتیں تحریر کر کے لے آیا ہے اور لوگوں کو سنا رہا ہے۔ حکومت کے خلاف بغاوت پھیلا رہا ہے۔"

"اس سے کہو وہ طومار لے کر یہاں چلا آئے۔"

"وہ ایسی خطرناک باتیں کر رہا ہے کہ اسے تو بادشاہ کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے۔ یہ اس کی نہیں یرمیاہ کی چال ہے۔ اسے بادشاہ کے خلاف زہر اگلنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس کا منہ بند کرنا ضروری ہے۔"

"نہیں، پہلے ہم سب اس کی زبانی سنیں گے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اس کے بعد اسے بادشاہ تک لے جائیں گے۔" کاہن واپس آیا اور باروک کو اپنے ساتھ لے آیا۔

"تو نے یہ طومار کہاں سے تیار کیا؟"

"میرے آقا یرمیاہ اپنے منہ سے کہتا گیا اور میں سیاہی سے کتاب میں لکھتا گیا۔"

"ہمیں پڑھ کر سنا، اس میں کیا لکھا ہے۔"

باروک نے پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا امرا کے چہرے خوف سے زرد پڑنے لگے۔ جب وہ پڑھ چکا تو وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ باروک سے کیا کہیں۔

"باروک تو نے یہ کیا لکھ لیا اور کیا ہمیں سنا دیا۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے۔"

"اس میں ایسی کیا بات ہے؟"

"یہ سراسر بغاوت ہے۔"

"میں تو یہ چاہتا تھا کہ اسے بادشاہ کو سنایا جائے۔"

"ہم یقیناً یہ سب باتیں بادشاہ تک پہنچا دیں گے لیکن اس سے پہلے اپنے آپ کو اور یرمیاہ کو چھپا لے۔ کوئی نہ جانے کہ تم کہاں ہو۔ اسے سن کر بادشاہ کا ردعمل نہ جانے کیا ہو اس لیے حفاظت ضروری ہے۔"

سردیوں کے دن تھے۔ بادشاہ اس وقت اپنے محل میں بیٹھا تھا۔ کوئلوں سے دہکتی ہوئی انگیٹھی اس کے سامنے رکھی تھی اور چند امرا اس کی پشت پر کھڑے تھے کہ کاہن نے بادشاہ کو وہ سب باتیں سنائیں جو باروک نے کی تھیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ طومار اسے دکھایا جائے۔

طومار بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ جب تین چار ورق پڑھے جا چکے تو بادشاہ نے طومار اٹھا کر انگیٹھی میں پھینک دیا۔ امرا دیکھتے رہ گئے اور طومار جل گیا۔

بادشاہ نے فوری حکم جاری کیا کہ باروک منشی اور یرمیاہ نبی کو گرفتار کر کے اس کے حضور پیش کیا جائے۔ حکم ملتے ہی سپاہی دوڑ پڑے لیکن خداوند نے حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو چھپا لیا۔ سپاہی سر مارتے رہے مگر کوشش کے باوجود ان میں سے کوئی بھی تلاش نہ کر سکے۔

جاری ہے

ماخذات: توریت۔ تاریخ طبری۔ قصص الانبیا۔ قصص القرآن

اصلی نقلی

قمر عباس

جو منظر میں پس منظر دیکھ لے... بصارت کا یہ کمال ہر آنکھ کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی چھٹی حس نے بھی کمال کر دکھایا جب "دو جمع دو چار" کے فارمولے سے کام نہ چلا تو اسے پانچ کرنے ہی پڑے... اصلی چہروں کے درمیان یہاں کون کسی کی اصلیت کو تلاش کر سکتا ہے۔

بے نقاب ہو کر بھی عقل پر پردے ڈالنے والی حسینہ کی دلکش چال

ایلس کو اخبار پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اخبار میں اشتہاروں کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے۔ ویسے بھی ٹیلی وژن پر چوبیس گھنٹے بریکنگ نیوز چلتی رہتی ہیں جبکہ ٹاک شوز دیکھنے کے بعد اخبار میں چھپنے والے مضامین اور کالم پڑھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس نے بے دلی سے ناشتے کی میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھایا اور سرسری طور پر دیکھنے لگی۔ یونہی اس کی نظر ایک چھوٹے سے اشتہار پر گئی جو کافی منفرد اور حیران کر دینے والا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"عارضی نوعیت کے کام کے لیے ایک خاتون کی ضرورت ہے۔ ایسی امیدوار کو ترجیح دی جائے گی جو خطرات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ معقول تنخواہ دی جائے گی۔ فوراً رابطہ کریں۔"

اس نے اشتہار کی عبارت پر غور کیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ خطرات کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ یقیناً کوئی بھی مالک اپنے ملازم کو جان بوجھ کر خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ اس کے لیے یقیناً کوئی قانون موجود ہوگا۔ ایلس کی زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی۔ اس لیے یہ اشتہار اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ ایک اور اشتہار کے جواب میں درخواست دے چکی تھی جس کا نتیجہ بہت اچھا نکلا اور اس نے اس سارے عمل سے پوری طرح لطف اٹھایا گو کہ اسے ملازمت نہ ملی تھی لیکن درخواست دینے اور انٹرویو دینے کے دوران اسے بہت مزہ آیا۔ اس نے سوچا کہ شاید اس بار اسے کچھ زیادہ دلچسپ صورت حال سے واسطہ پڑ جائے۔ اس میں حرج بھی کیا تھا۔ وہ ایک صاف ستھرے اور آراستہ گھر میں رہ رہی تھی۔ تمام بل وقت پر ادا ہو رہے تھے۔ اس کے شوہر کی بینک میں بہت اچھی ملازمت تھی اور اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ اگر وہ اس ملازمت کے لیے درخواست دیتی تو اس کا کوئی نقصان نہ ہوتا بلکہ اس کی زندگی میں کچھ رنگ ضرور آسکتے تھے۔

اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور درخواست لکھنے بیٹھ گئی۔ اپنے کوائف بیان کرنے کے بعد اس نے استدعا کی کہ اسے کام کی نوعیت کے بارے میں بھی آگاہ کیا جائے۔ پھر اس نے درخواست کے ساتھ اپنی ایک تصویر منسلک کی اور لفافے میں بند کرکے اس پر ٹکٹ چسپاں کر دیے اور پوسٹ آفس کی جانب روانہ ہوگئی۔

بہار کی آمد آمد تھی اور درختوں پر نئے نئے پتے پھوٹنا شروع ہوگئے تھے۔ سڑک پر چلتے ہوئے ایڑیوں کی ٹھک ٹھک نے اسے اس ٹائپ رائٹر کی یاد دلا دی جس پر وہ ایک قانونی فرم کے دفتر میں کام کیا کرتی تھی۔ اس نے شادی کے چار برس بعد تک بھی یہ ملازمت کی تھی لیکن اب اسے کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہیری کی معقول آمدنی تھی اور وہ لوگ ایک خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب اس کے بچوں کی تعلیم بھی ختم ہو چکی تھی اور وہ بھی ملازمت کر رہے تھے۔

پوسٹ آفس پہنچ کر اس نے قدرے توقف کیا۔ اس کے اندر سے آواز آئی۔ "اب بھی وقت ہے۔ اچھی طرح سوچ لو۔" وہ اس طرح کے کاموں میں زیادہ سوچ بچار کرنے کی قائل نہ تھی۔ اس نے جلدی سے وہ لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں کوئی منفی سوچ اس کا ارادہ بدل دے۔

اس نے اپنے ذہن سے تمام خیالات کو جھٹکا اور گھر کی خریداری کے لیے گروسری اسٹور کی راہ لی۔ ابھی اسے خیال آیا کہ اس نے کافی عرصے سے کوئی کپڑا نہیں خریدا۔ ... ٹراؤزر سوٹ ٹھیک رہے گا۔

ویسے تو وہ عام طور پر گھٹنوں تک لمبا اسکرٹ اور بلاؤز پہنا کرتی تھی لیکن کام پر جانے کے لیے ٹراؤزر سوٹ ہی مناسب تھا۔

دو دن بعد ایک عالی شان کار اس کے دروازے پر رکی۔ ایلس نے کبھی کاروں کے ماڈل اور میک پر توجہ نہیں دی تھی۔ کار تو بس کار ہی ہوتی ہے جس میں آپ بچوں کو اسکول لے جاتی ہیں یا ویک اینڈ پر شاپنگ کے لیے سپر مارکیٹ چلے جاتے ہیں لیکن اس کار کو دیکھ کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ دوسری گاڑیوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے ایک باوردی شوفر چلا رہا تھا جس نے اسے بڑے ادب سے میڈم کہہ کر مخاطب کیا لیکن اس کے بعد راستے بھر اس سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید وہ غیر ضروری گفتگو سے پرہیز کرتا تھا یا پھر اس کے بولنے پر پابندی تھی۔

کار ایک طویل مسافت طے کرکے شہر کے مضافات میں واقع ایک شاندار حویلی کے گیٹ پر پہنچی تو وہ خودکار طریقے سے کھل گیا اور گاڑی شاہانہ انداز میں ڈرائیو وے سے ہوتے ہوئے پورچ میں جا کر رک گئی۔ شوفر نے بڑے ادب سے دروازہ کھولا اور وہ وقار طریقے سے باہر آگئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے استقبال کے لیے چادر بچھا دی گئی ہو۔ ایک بٹلر آگے بڑھا اور اس نے جھک کر اسے تعظیم دی اور اسے اپنے ہمراہ اندر لے گیا۔ اس بڑے ہال میں قدم رکھتے ہی ایلس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہاں کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سونے کی ... دیدہ زیب قالین، نادر فرنیچر اور کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے رنگین بھاری پردے اس ہال کی شان و شوکت میں اضافہ کر رہے تھے۔ کمرے کی ایک جانب کھڑکی کے ساتھ بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ بٹلر نے اس طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود خاموشی سے چلا گیا۔

میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے اسے دیکھا اور مطمئن انداز میں بولا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی۔" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کا تعلق مشرق وسطیٰ کے کسی ملک سے ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور گرم جوشی سے اس نے مصافحہ کیا۔ اس کے ہاتھ عام مردوں کی نسبت کافی نرم تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سخت کام کرنے کا عادی نہیں ہے۔ اس نے نرمی سے ایلس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اسے اپنی میز کے سامنے والے صوفے پر بٹھا دیا اور خود بھی اپنی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اس کی ... آنکھیں بھوری اور قد لمبا تھا۔

"میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ کہیں تم اپنی تصویر سے مختلف نہ ہو کیونکہ کبھی کبھی تصویر بھی دھوکا دے جاتی ہے لیکن تمہیں دیکھنے کے بعد مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ تم اس کام کے لیے بالکل موزوں ہو۔"

"کام کی نوعیت کیا ہے؟" ایلس نے پوچھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس شخص نے کچھ پوچھے بغیر ہی اسے اس ملازمت کے لیے موزوں قرار دے دیا تھا۔ شاید وہ ڈر رہا ہو کہ کہیں وہ اس ملازمت سے انکار نہ کر دے۔

وہ اطمینان سے بولا۔ "بے فکر رہو، تھوڑی دیر میں سب کچھ واضح ہو جائے گا۔"

اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ایک بٹن دبا دیا۔ ایلس نے کمرے کے آخری سرے پر واقع دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ کمرے میں داخل ہونے والی ایک عورت تھی اور ایلس یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ عورت ہو بہو اس جیسی تھی۔ ایک جیسا قد، ویسا ہی رنگ، گھنگھریالے بال، یہاں تک کہ کندھوں کی ڈھلان بھی ایک جیسی تھی۔ صرف لباس کا فرق تھا۔ ایلس نے ایک مشہور بجٹ اسٹور کا ٹراؤزر سوٹ پہن رکھا تھا جو وہ دو روز قبل ہی خرید کر لائی تھی جبکہ دوسری عورت نے خوب صورت سلک کا لباس پہنا ہوا تھا جو کسی بڑے بوتیک سے خریدا گیا تھا۔

اس عورت نے رکھی انداز میں ایلس سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ بھی اپنے شوہر کی طرح نرم تھا۔ اس کے لہجے میں بھی چاشنی تھی لیکن وہ چہرے سے ... اور مہذب معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ دوسروں کی توجہ کا مرکز بننے کی عادی ہے اور اسے پورا اعتماد ہے کہ وہ اپنی شرطوں کے مطابق زندگی گزار رہی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے کام کے لیے موزوں رہے گی۔ تم کیا کہتی ہو؟" شوہر نے بیوی کی رائے جاننا چاہی۔

"میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ جب تمہاری گفتگو ختم ہو جائے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔ اس شخص نے جس کا نام شریف تھا، ایلس سے کہا۔

"کیا تم اس ملازمت کے لیے تیار ہو؟"

"مجھے کام کیا کرنا ہوگا؟" ایلس نے پوچھا۔

"تمہاری شکل حیرت انگیز حد تک میری بیوی سے ملتی ہے۔ اگر ہمارے جاننے والوں میں کوئی تمہیں دیکھے تو وہ تمہیں میری بیوی ہی سمجھے گا۔ دراصل ہمیں آنے والے دنوں میں کچھ سماجی تقریبات میں شرکت کرنی ہے۔"

"تم نے اشتہار میں کسی خطرے کا ذکر کیا تھا؟"

"خطرہ ہو سکتا ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں۔ ہمارے پاس اپنے باڈی گارڈز ہیں اور سیکیورٹی کا دوسرا انتظام بھی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تمہاری حکومت بھی ہمیں سیکیورٹی فراہم کرتی ہے۔"

"تمہاری بیوی ان تقریبات میں کیوں نہیں جانا چاہتی؟"

"اسے ہائی بلڈ پریشر اور گھبراہٹ کی شکایت رہتی ہے۔ یہ تقریبات اس کے لیے ٹھیک نہیں ہیں کیونکہ ان میں جانے کے بعد وہ بہت تھکن محسوس کرتی ہے اور ان سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پاتی۔ اس کی وجہ سے یہ خطرہ بھی لاحق رہتا ہے کہ لوگوں میں ہماری پوزیشن متاثر نہ ہو۔ ہم کچھ تقریبات ایسی ہیں جن میں اس کا شرکت کرنا ضروری ہے ورنہ میرے کاروبار کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تم ہو بہو اس کی ہم شکل ہو اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی جگہ میری بیوی کے روپ میں ان تقریبات میں شرکت کرو۔ اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو میں تمہیں ان تقریبات کی ایک فہرست مع تاریخ اور وقت دے دوں گا۔ تم وہاں میری بیوی بن کر جاؤ گی، تمہیں ضرورت پڑنے پر لوگوں سے مختصر گفتگو کرنا ہوگی۔ کوشش کرنا کہ اس کی بھی نوبت نہ آئے۔ میں تمہیں فی تقریب دو سو پاؤنڈ دوں گا۔"

ایلس نے سوچا کہ چند گھنٹوں کی اداکاری کے عوض یہ معاوضہ برا نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، نہ جانے کس طرح اس کے منہ سے ایک بالکل مختلف بات نکل گئی۔

"اس کام میں خطرہ بہت ہے۔ اگر بھانڈا پھوٹ گیا تو میں دھوکا دہی کے الزام میں جیل بھی جا سکتی ہوں۔ پھر مجھے اپنے شوہر اور بچوں کو بھی اعتماد میں لینا ہوگا۔ شاید وہ اس کے لیے راضی نہ ہوں۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے تمہاری پیشکش بہت کم ہے۔ اس کام کا معاوضہ کم از کم ایک ہزار پاؤنڈ تو ہونا چاہیے۔ پھر مجھے تمہاری بیوی سے بھی ملنا ہوگا تاکہ اس کے بارے میں وہ سب کچھ جان سکوں جو میرے لیے ضروری ہے۔"

شریف کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ایک تقریب میں چند گھنٹوں کی شرکت کے لیے یہ معاوضہ بہت زیادہ ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید بلا معاوضہ ہی اس کام کے لیے تیار ہو جاتی۔ ان تقریبات میں شرکت کرنا ہی اعزاز سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ دیگر سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی۔ مثلاً قیمتی لباس اور جیولری، تمہاری آمدورفت کا انتظام وغیرہ وغیرہ۔"

"ٹھیک ہے پھر تم اپنے مطلب کی عورت تلاش کر لو۔ مجھے یقین ہے کہ دوبارہ اشتہار دینے کے باوجود تمہیں اپنی بیوی کی ہم شکل عورت نہیں ملے گی۔ یہ سپلائی اور ڈیمانڈ والا معاملہ ہے۔ شاید مجھے دو ہزار پاؤنڈ مانگنے چاہیے تھے۔"

وہ بظاہر پرسکون نظر آ رہی تھی لیکن اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور نبض کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں شریف بھڑک نہ جائے لیکن اس کا خدشہ غلط نکلا۔ شریف کی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک ابھری۔ اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم اچھی سودے بازی کر لیتی ہو۔ مجھے تمہارا معاوضہ منظور ہے۔ تمہیں دو دن کے اندر ڈاک کے ذریعے تقرر نامہ مل جائے گا۔ پہلی تقریب اگلے جمعہ کو ہے۔ ہمیں ایک لنچ میں شرکت کرنی ہے۔"

ایلس نے بھی جواب میں ایک دلکش مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی اور بولی۔ "بہتر ہوگا کہ میں تمہاری بیوی سے مل کر اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لوں۔"

رات کو اپنے شوہر کی آمد سے قبل ڈنر ٹیبل سجاتے ہوئے وہ تنقیدی نظروں سے اپنے گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ بارہ گھنٹے پہلے یہ گھر اس کے لیے ایک جنت تھا۔ صاف ستھرا، چمکتا ہوا جہاں ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی لیکن شریف کے ہاں سے آنے کے بعد وہی گھر اسے کسی مفلس کی کٹیا کے مانند لگ رہا تھا۔ وہ شریف کی بے انداز دولت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اپنی حیثیت دیکھتے ہوئے اسے شبہ ہونے لگا کہ آیا وہ اس کی نقلی بیوی بننے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ پھر اس نے کندھے اچکاتے ہوئے ایک سرد آہ بھری اور لباس تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے شوہر کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اسے شریف کے لیے کام کرتے ہوئے تین ہفتے ہو گئے تھے اور وہ ان معمولات کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ شروع شروع میں تو اسے بہت اچھا لگا جب وہ کسی تقریب میں شریف کے ساتھ جانے کے لیے اس کے گھر آئی تو گھر کے تمام ملازمین اس کے آگے پیچھے بچھے جاتے۔ شریف نے اس کے لیے ایک ذاتی ڈیزائنر، ہیئر ڈریسر اور میک اپ مین کا انتظام کر دیا تھا جو کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہونے میں اس کی مدد کرتے۔ گو کہ وہ ان تقریبات میں جا کر بہت بوریت محسوس کرتی تھی کیونکہ وہاں اس کی جان پہچان کا کوئی نہ تھا جس سے وہ تھوڑا بہت گپ شپ کر لیتی۔ ویسے بھی شریف کی طرف سے اس پر پابندی تھی کہ وہ کسی سے غیر ضروری گفتگو کرے نہ بے تکلف ہو لیکن اس کی شخصیت میں اتنی کشش تھی کہ لوگ خود ہی اس کی جانب متوجہ ہو جاتے۔

اسے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی اور نہ ہی وہ خود کو دھوکے میں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سب لوگ شریف کو متاثر کرنے کے لیے اس سے قریب ہونا چاہتے ہیں کیونکہ وہ سماجی اور سیاسی اعتبار سے ایک اہم شخصیت تھا اور اسے خوش کر کے وہ بے تحاشا فوائد حاصل کر سکتے تھے۔ جب بھی کوئی مہمان اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش کرتا تو وہ شریف کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیتی جسے سن کر شریف کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور اسے یقین آ جاتا کہ ایلس اس کی بیوی کا رول خوش اسلوبی سے ادا کر رہی ہے۔

بعض اوقات کوئی مہمان بری طرح چپک جاتا تب وہ بڑے پیار سے اسے سمجھاتی۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ میرا شوہر اس معاملے میں کتنا سخت ہے۔"

یہ سنتے ہی مہمان کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگتیں۔ شریف کی ناراضی مول لینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ ایلس اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتی۔ "وہ چاہتا ہے کہ میں اسے ہر بات بتاؤں۔ شاید تم کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔"

یہ سنتے ہی مہمان کی سٹی گم ہو جاتی اور وہ خاموشی سے کھسک لیتا۔ بعض اوقات ایلس کی یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ جو لوگ شریف سے زیادہ با اثر اور دولت مند تھے، ان پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ بدستور ایلس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے۔ ایسی صورت میں اسے شریف کو مدد کے لیے بلانا پڑتا۔ شریف جانتا تھا کہ ایسے لوگوں سے کس طرح نمٹنا چاہیے۔ وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے ان کے قریب آتا اور بڑی خوش اسلوبی سے صورت حال کو سنبھال لیتا۔

اس کے باوجود ایلس کا اصرار تھا کہ وہ معاہدے کے مطابق کسی غیر اخلاقی حرکت میں شامل نہیں ہوگی اور نہ ہی کسی

صورت حال سے سمجھوتا کرے گی۔ اس نے کئی بار شریف کو جتا دیا تھا کہ وہ اس کی حقیقی بیوی نہیں ہے بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ لہٰذا وہ اس پر شوہروں کی طرح پابندی لگانے یا حکم چلانے کی کوشش نہ کرے۔

شریف کو اس کا یہ انداز پسند نہیں تھا کہ وہ اسے قانون سکھانے کی کوشش کرے۔ اس کے ملک کی عورتیں ہمیشہ مردوں کے بنائے ہوئے قوانین اور اصولوں پر عمل کرتی تھیں۔ خود اس کی بیوی ان قوانین پر چلتی تھی گو کہ اس کے والدین انگریز تھے لیکن اس کی پرورش مشرق میں ہوئی تھی لیکن ایلس کا تعلق اس سرزمین سے نہیں تھا۔ اس لیے وہ شریف کے خود ساختہ اصولوں کی پابند نہیں تھی اور شریف کو یہی بات پسند نہیں تھی۔ اسے سن کر اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل جاتے لیکن یہ ناراضی زیادہ دیر قائم نہ رہتی۔ ایلس اس کی ضرورت تھی اور وہ اس سے بگاڑ کر اپنے لیے مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا تھوڑی دیر بعد ہی وہ کوئی اچھا سا جملہ کہہ کر اس کا موڈ بحال کر دیتا۔

کئی ہفتے گزر گئے پھر ایک روز ایلس کو معلوم ہوا کہ انہیں لندن سے جرسی بذریعہ طیارہ سفر کرنا ہے جہاں وہ سہ پہر میں ایک میٹنگ اور شام کے وقت ایک تقریب میں شرکت کریں گے اور ان کی واپسی تقریباً ایک بجے تک ہوگی۔ ایلس کے لیے یہ ایک مشکل صورت حال تھی۔ وہ اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے لیے شوہر کو بتانا ضروری تھا لیکن شریف نے اسے سختی سے منع کر دیا کیونکہ اس طرح ان کا راز افشا ہو سکتا تھا۔ اس نے ایلس کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے شوہر سے کوئی بہانہ بنا دے مثلاً یہ کہ وہ اپنی کسی سہیلی کی شادی میں شریک ہونے کے لیے شہر سے باہر جا رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆

وہ دونوں شریف کے چھوٹے سے ذاتی جیٹ طیارے میں سفر کر رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھی فضا میں روئی کے گالوں کے مانند بادلوں کو اڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ برابر میں بیٹھے ہوئے شریف نے اس کا خوبصورت ہاتھ تھام لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں آج کی میٹنگ اور شام میں ہونے والی تقریب کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ وہاں تمہاری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگی جو میری بیوی کو شادی سے پہلے سے جانتا ہے۔ تمہیں اس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے ورنہ وہ سمجھ جائے گا کہ تم میری حقیقی بیوی نہیں ہو۔"

"مجھے امید ہے کہ تم معاہدے میں کسی تبدیلی کی بات نہیں کرو گے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی تندی تھی۔

"میں تمہیں صرف اتنا بتانا چاہ رہا ہوں کہ دوپہر کی میٹنگ میں تم ہی میری بیوی کی حیثیت سے شرکت کرو گی لیکن شام کی تقریب میں تمہاری جگہ میری بیوی لے لے گی۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری بیوی تو سرے گئی ہوئی ہے۔"

"وہ اب جرسی میں ہے اور شام سے پہلے جرسی پہنچ جائے گی۔"

"لیکن جرسی تو بہت چھوٹی جگہ ہے۔ وہاں وہ پہچان لی جائے گی اور تمہارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ اپنا چہرہ نقاب میں چھپا کر رکھے گی اور شام کی پارٹی شروع ہونے تک ہوٹل کے کمرے میں ہی بند رہے گی۔ جب وہ پارٹی میں جائے گی تو تم اس کی جگہ بستر پر لیٹ جاؤ گی۔"

"میں اس پلان سے متفق نہیں ہوں۔ مجھے اس میں خطرہ نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے کہ تم نے اشتہار میں ایسے ہی خطرات کی جانب اشارہ کیا تھا۔ ویسے بھی تمہیں یہ بات پہلے بتانا چاہیے تھی۔"

"مجھے تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جب مجھے اس شخص کے بارے میں معلوم ہوا تو مجھے اپنے پلان میں تبدیلی کرنا پڑی۔ میں نے ایئرپورٹ سے اپنے موبائل فون پر بیوی سے بات کر کے اسے پوری صورت حال سمجھائی۔ اسے سن کر میری بیوی بھی پریشان ہو گئی۔ تم نہیں جانتیں کہ یہ میٹنگ ہمارے لیے کتنی اہم ہے۔ اس میں ہمیں صورت حال سے نمٹنے کے لیے مناسب اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ میں تم سے کسی ایسے کام کے لیے نہیں کہہ رہا جس سے معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔"

ایلس کچھ نہ بولی۔ وہ صورت حال کی پیچیدگی پر غور کر رہی تھی۔ بظاہر تو یہ ایک سیدھا سادا معاملہ تھا۔ شام میں کسی وقت وہ شریف کی بیوی سے اپنا رول تبدیل کر لیتی اور اس کا کام ختم ہو جاتا لیکن نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس کسی آنے والے خطرے کے بارے میں خبردار کر رہی تھی۔ اس نے وقت گزاری کے لیے وہ رومانی ناول پڑھنا شروع کر دیا جو اس نے ایئرپورٹ پر خریدا تھا۔ پرائیویٹ پارٹی رات دیر سے ختم ہوتی اور انہیں رات ایک بجے واپس آنا تھا کیونکہ دوسری صبح شریف کو ناشتے پر ایک ٹیلی ویژن انٹرویو دینا تھا۔

جہاز سے اترتے ہی وہ کاروں کے ایک قافلے کے ہمراہ ہوٹل پہنچے جہاں دیگر شرکا پہلے سے موجود تھے۔ ایلس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب کچھ بھلا کر اپنی ڈیوٹی دینے لگی۔ اسے سب لوگوں سے مسکرا کر ملنا اور خوشگوار جملوں کا تبادلہ کرنا تھا۔ پروگرام کے پہلے حصے میں رسمی گفتگو تھی اور اس کے بعد ڈنر سے پہلے تقریروں کا دور ہونا تھا۔ وقت تک سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ وہ خواتین کے ایک گروپ سے باتیں کرنے کے بعد واپس آرہی تھی کہ ہوٹل کی راہداری میں اس کا سامنا ایک طویل قامت اور کرخت چہرے والے شخص سے ہوگیا۔ اس نے دیکھا اس کے ہاتھ کی انگلی میں جو انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ اس میں سیاہ قیمتی پتھر جڑا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایلس کو گمان گزرا کہ ہونہ ہو یہ وہی شخص ہے جس سے دور رہنے کے لیے شریف نے اس سے کہا تھا پھر دوسرے ہی لمحے اس کے شک کی تصدیق ہوگئی۔

"ہائی ڈیئر، کیا حسین اتفاق ہے۔" وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس طرح کھڑا ہوگیا جیسے اس کا راستہ روک رہا ہو۔

ایلس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس مصیبت سے کیسے جان چھڑائے۔ وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری تقریر بعد میں ہوگی۔"

ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو بے حد مختصر تھی لیکن اس دوران اس شخص نے جو کچھ کہا۔ اسے سن کر ایلس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور وہ کہیں کانپنے لگیں۔ وہ اس کی باتوں کے جواب میں مسکراتی رہی۔ جب سب لوگ ضیافت میں مصروف تھے تب بھی اس کے دماغ میں اس شخص کی باتیں گونج رہی تھیں خصوصاً اس کا ایک جملہ تو اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا جس کا مطلب سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "میں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ تمہیں بہتر طور پر سمجھ سکوں۔"

جب سیشن ختم ہوا تو سب لوگ شام کی پارٹی کی تیاری کے لیے اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے لگے۔ وہ طویل قامت شخص ایک بار پھر اس کے سامنے آگیا اور اس کی شریر مسکراہٹ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگی۔ وہ ایسی مسکراہٹوں کا مطلب خوب جانتی تھی۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ اس کے جھانسے میں آنے والی نہیں ہے۔

ان کا سوٹ کئی کمروں پر مشتمل تھا جو سب آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ منصوبے کے مطابق شریف کی بیوی آخری کمرے میں بیٹھی پارٹی شروع ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایلس سیدھی اس کے پاس چلی گئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔ تھوڑی سی ہمت سنبھلی تھی کہ پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ "میرے ساتھ ایک گلاس پیو اور اس شام کی کامیابی کو سلام کرو۔"

مہمانوں کے ساتھ ڈرنک کرنا ان کے ملک کی روایت تھی۔ ایلس کے لیے اسے قبول کرنا لازمی تھا لیکن اس کے نتیجے میں سارا عمل سست ہوگیا جبکہ ایلس چاہ رہی تھی کہ وہ دونوں جلد از جلد اپنی ڈیوٹی بدل لیں۔ وہ اس لمبے آدمی کا دوبارہ سامنا کرنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن شاید گرم ملکوں میں پینے پلانے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور اسی لیے یہاں کے لوگوں نے اس رسم کو شغل اختیار کر لیا ہے۔

اس کے اعصاب بے قابو ہو رہے تھے۔ گلاس پکڑنے کی کوشش میں وہ وہاں رکھے ایک بڑے برتن سے ٹکرائی اور گلاس کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے۔ ان میں سے کچھ شریف کی بیوی کو بھی لگے۔ وہ کسی بلی کی طرح اچھلی اور اپنا گاؤن سنبھالتے ہوئے بولی۔ "تم ہمارے ملک میں کام کرنے کے لیے بالکل موزوں نہیں ہو۔ وہاں تو ہر جگہ اس طرح کے برتن رکھے ہوتے ہیں۔"

ایلس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے اپنے گلاس ٹکرائے اور ہونٹوں سے لگالیے۔

☆☆☆

واپسی کا سفر زیادہ پرسکون اور پرلطف تھا۔ وہ اپنی نشست کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ شریف بھی بہت اچھے موڈ میں تھا۔ دن بھر کی مصروفیت اور تھکن کے باوجود اس کے چہرے پر وہی چمک اور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جس کے ذریعے وہ مشکل سے مشکل صورت حال کو کنٹرول کر لیتا تھا۔

"تھینک یو مائی ڈیئر۔" اس نے بے تکلفی سے ایلس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کرنا چاہا تو وہ چونک گئی۔ اسے شریف سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ پھر بھی سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا۔ پلان کے مطابق شریف کی بیوی کو بھی اس کے ساتھ ہی سفر کرنا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بیوی سمجھ کر بے تکلف ہو رہا تھا۔ ایلس نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ اصلیت بتا کر شریف، اس کی بیوی اور اپنے لیے مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اس نے حوصلہ افزا مسکراہٹ کے ساتھ ایک بھرپور انگڑائی لی اور ٹانگیں پھیلا کر اپنی نشست پر نیم دراز ہوگئی۔ وہ مطمئن تھی کہ سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوگیا اور کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔

شریف کی بیوی کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں شربت نوشی نے اس کا کام آسان کردیا۔ وہ جانتی تھی کہ طویل قامت

شخص شریف کی بیوی کو گھور کے پھر تنگ کرے گا۔ چنانچہ اس نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے فوری طور پر ایک ترکیب سوچی اور اس نے شریف کی بیوی کے گلاس میں خواب آور دوا ڈال دی تاکہ وہ اپنے کمرے میں ہی سوتی رہ جائے اور اس کی جگہ ایلس پارٹی میں شرکت کرے۔ اس طرح شریف کے ساتھ وہ اس لمبے آدمی کی بری چھیڑ چھاڑ سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

"آج کی شام بڑی شان دار رہی۔" شریف خوشی سے جھومتے ہوئے بولا۔ "تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے پاگئے اور کاغذات پر دستخط بھی ہوگئے۔ تم نے اپنا پارٹ بڑی خوبصورتی سے ادا کیا۔"

اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا تو اس نے بھی جواب میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اسے گزری شام کا وہ منظر یاد آرہا تھا جب وہ شریف کی بیوی کے کمرے سے باہر آئی تو اس نے اس کے باہر کھلنے والے دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سنی پھر چٹخنی گرنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر کمرے کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہی طویل قامت شخص کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے بستر کے قریب پہنچ کر سوئی ہوئی عورت کو غور سے دیکھا اور اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگا۔ ایلس نے اس سے زیادہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنے پروگرام کے اگلے حصے پر عمل کرنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔

"ذرا سوچو کہ اس وقت اس انگریز عورت پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اسے پارٹی میں شرکت نہ کرنے اور ہمارے ساتھ واپس نہ آنے کا افسوس ہو رہا ہوگا۔ خیر کوئی بات نہیں، کل صبح اس کے معاوضے کی رقم اس کے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گی جو اسے خوش کردینے کے لیے کافی ہوگی۔"

ایلس ایک بار پھر مسکرادی۔ وہ خود بھی یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے وہاں سے آنے کے بعد شریف کی بیوی پر کیا گزری ہوگی۔ کیا اس نے اس صورت حال کو خوشی سے قبول کرلیا ہوگا۔ ایلس کو اپنے اس اقدام پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو شریف کی بیوی کی جگہ اسے اس کمرے میں ٹھہرنا پڑتا اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا وہ اسے کبھی برداشت نہ کرپاتی۔ وہ ساری زندگی اپنے شوہر کی وفادار رہی تھی۔ اب اس ملازمت کی خاطر اپنے آپ کو کسی دوسرے کے حوالے نہیں کرسکتی۔ البتہ اسے یہ خطرہ ضرور تھا کہ اگر شریف نے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوکر اپنی مادری زبان میں گفتگو شروع کردی تو وہ کیا کرے گی۔ اسے کوشش کرنی چاہیے کہ ایسی نوبت ہی نہ آئے۔

☆☆☆

صبح سورج نکلنے سے پہلے ان کا جہاز منزل مقصود پر پہنچ چکا تھا۔ شریف ایئرپورٹ سے ہی اپنے دفتر کے لیے روانہ ہوگیا جہاں سے اسے انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ ایلس اب آزاد تھی۔ اس کا معاہدہ ختم ہو چکا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اب تک جو کچھ بھی ہوا اس میں اسے کوئی گھاٹا تو نہیں ہوا پھر اسے خیال آیا کہ شریف کی بیوی جب نیند سے بیدار ہوگی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ بیرون چلی جائے اور اس رات کے بارے میں اپنی زبان بند رکھے۔ شریف اس بارے میں کبھی نہ جان پائے گا اور نہ ہی اسے یہ معلوم ہوسکے گا کہ اسی کی قربانی کی وجہ سے وہ اتنی بڑی ڈیل کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ اس لیے خاموش رہنے میں ہی سب کی بھلائی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اخبار میں اشتہار دیکھ کر ملازمت کے لیے درخواست دینا اس کے حق میں بہتر ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ کارآمد وہ آئیڈیا تھا جب اس نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشروب میں دوا ڈال دی تھی۔ شریف اور اس کی بیوی کا اصل پلان یہ تھا کہ ایلس یہ مشروب پینے کے بعد ہوٹل کے کمرے میں آرام سے سوتی رہے اور صبح جب اس کی آنکھ کھلے تو اس وقت تک تمام مہمان جاچکے ہوں گے اور کوئی اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لے گا۔

وہ مطمئن تھی کہ اس ملازمت کے نتیجے میں اس کے بینک بیلنس میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا اور اب وہ گھر کو اپنی مرضی کے مطابق آراستہ کرسکتی تھی۔ سورج پوری طرح نکل آیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہ کر کے ایک اطمینان بھری سانس لی اور گھر کی طرف چل دی جہاں اس کا محبوب شوہر اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

اس اطمینان کے باوجود اس کے دل میں ایک بے کلی سی تھی۔ پرواز کے دوران شریف بہت ہی رومانی اور پرجوش ثابت ہوا۔ وہ حیران تھی کہ اس نے شریف کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ عقل نے دلیل دی کہ وہ شریف سے باتیں کرنا نہیں چاہتی تھی اگر وہ اپنی مادری زبان میں گفتگو شروع کردیتا تو اس کا بھید کھل جاتا۔ اتفاق سے جہاز کے پچھلے حصے میں آرام کرنے کا مناسب انتظام موجود تھا چنانچہ شریف کو گفتگو کرنے سے روکنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی تھی۔ شاید اسی لیے سورج بے محابا گہرے آسمان سے مشرق میں نکلا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انجانے پہلو

انجم اقبال

"محبت راز ہے ایسا کسی پر جو نہیں کُھلتا... کبھی یہ خواب کی مورت، کبھی یہ چاند کی صورت... چنکتی مسکراتی ہے... حسین اک گیت گاتی ہے..." چاہت کے دلگداز لمحات میں ہر دل کچھ ایسے ہی گنگناتا ہے... آنکھوں میں کسی کے ساتھ کے سپنے ڈیرے ڈالے ہیں... کسی کی باتوں کی خوشبو اپنے حصار میں رکھتی ہے۔ وہ بھی چاہتوں کے اس سفر پر بڑی سبک رفتاری سے گامزن تھی کہ اچانک پھولوں کی روش پر چلتے چلتے کانٹوں نے پیروں کو لہولہان کر ڈالا... وہ کہ جس پر محبت سایہ فگن تھی... دولت اس کی باندی اور حسن اس کا غلام تھا، اس کے باوجود وہ تہی داماں رہی... کبھی چاہتیں ضرورت بن کر اس کا امتحان لیتی رہیں اور کبھی ضرورتیں چاہتوں میں ڈھلتی رہیں... اس کے ساتھ بھی عجیب معاملات درپیش رہے۔ اسے کیا خبر تھی جسے وہ ذرہ سمجھ کر نظر انداز کر رہی ہے، کل وہی اس کے مقدر کا ستارہ بن کر اس کی نظر کا انداز ہی بدل ڈالے گا... جبکہ اس کے سر پر رسوائی کی خاک ڈالنے والے بھول رہے تھے کہ رفتہ رفتہ انہیں بھی اک روز خاک میں ہی مل جانا ہے۔

سنسنی خیز حالات اور معاشرتی استحصال کا شکار، ایک حسینہ کی پُرفکر داستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ ... سسپنس کے آخری صفحات پر نجی اقبال کے قلم سے جس کہانی کے رنگ بکھیرے اس کا کچھ حصہ ان سطور میں شامل کیا جا رہا ہے جو گزرے حصوں میں شائع ہوئے وہاں ان خوبصورت تحریر کا تسلسل آپ کے ذہنوں میں برقرار رہے۔

گاؤں میں رہائش پذیر حیدر کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا جس نے مشکل حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے نہ صرف تعلیمی سلسلہ جاری رکھا بلکہ زندگی کی مشکلات کو آسان کرنے کی خاطر وہ نوکری کے ارادے سے شہر چلا آیا جہاں خوش قسمتی سے اسے مقدر سنوارنے کا ایک شارٹ کٹ مل گیا مگر... زندگی کی آسانیاں تلاش کرتے کرتے وہ ایک ایسے گرداب میں پھنس گیا جہاں سے نکلنا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا... کیونکہ نوکری کے سلسلے میں جب اس کی ملاقات شارب فاروقی سے ہوئی تو اس نے اپنی بہن کے لیے اس کا انتخاب کر لیا اس کی بہن نہ صرف کسی کی ہوس پرستی کا شکار ہو چکی تھی بلکہ ایک ناجائز بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ لہٰذا شارب فاروقی کو کسی ایسے ہی غریب اور بے بس انسان کی ضرورت تھی جو دولت کی خاطر سب کچھ کرنے کے لیے اس کے جال میں پھنس جائے۔ مریبہ سے شادی سے قبل اسے حقائق کا علم نہیں ہوا۔ شادی کے بعد دولت تو مل جاتی ہے مگر اس کا سکون سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کی مجبوری کا عالم یہ ہوتا ہے کہ جب گاؤں سے اس کے والدین اور معصوم بہن حمیدہ اس سے ملنے شہر آتے ہیں تو حیدر ان سے ایک اجنبی کی طرح پیش آتا ہے۔ نفرت سے پیش آتا ہے مگر اس موقع پر اس کے سارے والدین اور معصوم بہن بہت بھاری دل سے ان مسائل کا سامنا کرتے ہوئے حیدر کی مشکل کو سمجھتے ہیں۔ مزید واقعات اس دوسرے و آخری حصے میں ملاحظہ کریں۔

ماں باپ کے جانے کے بعد حمیدہ نے روانگی کی تیاری شروع کی۔ اس نے شمع کو فون نہیں کیا۔ اس نے اسے بتانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ خود رکشے میں بیٹھ کر جانا چاہتی تھی۔ اسے خود پر خاصا اعتماد تھا۔ لاہور میں بھی وہ اکیلی ہی اپنی دوستوں سے ملنے یا کچھ خریدنے بازار بھی چلی جایا کرتی تھی۔ اسے ذرا بھی خوف نہیں تھا کہ ایک اجنبی شہر میں اس کا کہیں آنا جانا دشوار ہوگا۔

وہ تیار ہو کر نکلی۔ کوارٹر میں اس نے تالا لگایا اور پھاٹک کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں بیٹھا ہوا چوکیدار پہلے ہی اسے بہت غور سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حمیدہ نے ایک اچھا لباس زیب تن کیا تھا جس میں اسے کسی طرح ملازمہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

لاہور سے آتے ہوئے تو حمیدہ نے جان بوجھ کر بہت معمولی سا لباس پہنا تھا کیونکہ ٹرین کے سفر کی گرد و غبار اس کا اچھا لباس بھی خستہ کر دیتا۔

کوارٹر کی چابی اس نے چوکیدار کو دی اور اس سے کہا کہ جب اس کے والدین میں سے کوئی آئے تو وہ چابی انہیں دے دے۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹا؟" چوکیدار نے بزرگانہ انداز میں پوچھا۔

حمیدہ پہلے ہی اس انداز سے سمجھ چکی تھی کہ ادھیڑ عمر چوکیدار ایک شریف انسان تھا۔ ورنہ وہ کوارٹر کی چابی ہرگز نہ دیتی۔ وہ اسے بہت معقول لگا تھا۔

"بازار سے کچھ خریدنے جا رہی ہوں بابا۔" حمیدہ نے چوکیدار کو جواب دیا اور پھاٹک کی طرف بڑھ گئی۔ ہر چند اس نے چوکیدار کو ایک اچھا آدمی سمجھا تھا لیکن وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ پہلو اس کے لیے اطمینان بخش تھا کہ اس وقت امجد سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

پھاٹک کے ذیلی دروازے سے وہ باہر نکلی۔ اس کا رخ سڑک کے اس موڑ کی طرف تھا جہاں وہ کے ایف سی کا ریسٹورنٹ دیکھ چکی تھی۔ اسٹیشن سے آتے ہوئے اس نے وہاں کئی ٹیکسیاں اور رکشے کھڑے دیکھے تھے۔

وہ ایک رکشے میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔

گزشتہ رات اس نے حمیدہ سے جو باتیں کی تھیں، وہ اس دوران میں بھی اس کے ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ حیدر، مریبہ کے چنگل میں کیسے پھنس گیا تھا لیکن وہ کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

مریبہ کے بارے میں اس کے خیالات پہلے سے زیادہ خراب ہو چکے تھے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مریبہ نے اس سے اپنے رویے دور رکھے تھے۔ حمیدہ کو در اصل اس کا کردار اچھا نہیں لگا تھا۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی وہ ریحان نام کے کسی شخص سے تعلق قائم رکھے ہوئے تھی۔ حمیدہ نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ریحان کو بہت پسند کرتی تھی۔

حمیدہ نے فون پر اپنے بھائی کو ان باتوں سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ سب کچھ جان کر اس کے بھائی کو اذیت پہنچے گی۔ یہ تصور بھی کر کے اس کے لیے تکلیف دہ تھا کہ حیدر کو ریحان اور مریبہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا۔

گزشتہ شام سے حمیدہ کے ذہن میں یہ خیال مسلسل چکرا رہا تھا کہ اسے شاید شمع سے کچھ ایسی معلومات حاصل ہو سکیں جن سے مریبہ اور حیدر کے معاملات پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ حمیدہ کو یہ خیال یوں آیا تھا کہ شمع کا شوہر تاج احمد شارب موٹرز میں ملازم تھا۔ موبائل فون پر باتوں ہی باتوں میں یہ بات حمیدہ کے سامنے آ گئی تھی۔

اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا کہ تاج احمد شارب موٹرز میں ملازم تھا اور لاہور میں حیدر نے بھی شارب موٹرز ہی میں ملازمت کی تھی لیکن اب وہ شارب فاروقی کی بہن مریبہ کا شوہر تھا۔

"غلام شوہر۔" حمیدہ کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ بڑبڑا اٹھتی تھی۔

رکشا ایک پانچ منزلہ عمارت کے سامنے رک گیا۔ حمیدہ نے دیکھا اور پھر یاد کیا کہ ان اپارٹمنٹس کا نام وہی تھا جو شمع نے اسے بتایا تھا۔ اس نے رکشے سے اتر کر کرایہ ادا کیا اور عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

شمع کا اپارٹمنٹ چوتھی منزل پر تھا۔ شمع لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے شرارت سوجھی۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر اس پر شمع سے رابطہ کیا۔

"ہاں حمیدہ!" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کیا تم نے مجھے اس لیے فون کیا ہے کہ میں تمہیں لینے آ جاؤں؟"

"نہیں۔" حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں خود آ جاؤں گی۔"

"کب تک آؤ گی؟"

"تم اپنے گھر کا دروازہ کھولو تو ابھی آ جاؤں!"

"وہ کیسے؟"

"میں تمہارے دروازے پر کھڑی ہوں بدھو!" حمیدہ نے ہنس کر کہا۔

"ارے!" شمع کے منہ سے نکلا۔

فوراً ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ حمیدہ نے موبائل فون شلوار کے نیفے کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے قدموں کی ایسی آوازیں سنیں جیسے کوئی دوڑتا ہوا دروازے کی طرف آ رہا ہو۔

دوڑ کر دروازے کی طرف آنے والی شمع ہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو حمیدہ اسے دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھی۔ تین سال سے بچھڑی ہوئی دوست ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

حمیدہ تو فرط جذبات سے اسے بھینچے ڈال رہی تھی۔

شمع ہنس کر بولی۔ "دروازہ تو بند کر لینے دو۔"

حمیدہ اس سے الگ ہوئی۔ شمع نے دروازہ بند کیا۔ پھر وہ مڑی۔ اس نے حمیدہ کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

"اچھا!" حمیدہ نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ایسا لگتا ہے کہ جیجا جی کی تنخواہ اب خاصی بڑھ گئی ہے۔"

شمع نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ انڈین ٹی وی چینلز نے تمہارا دماغ بھی خراب کر دیا ہے۔ جسے دیکھو وہ جیجا جی اور جیجا جی کی رٹ لگائے رہتا ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے بھائی جان کہنا۔"

حمیدہ نے اس کی بات کاٹی۔ "ارے بدھو! مذاق میں کہا تھا۔ کیا پہلے کبھی میں نے جیجا جی کہہ کر ان کا ذکر کیا ہے؟ ہمیشہ تاج بھائی ہی کہتی ہوں۔" پھر وہ ہنسی۔ "تم تو انہیں سرتاج کہتی ہوگی۔"

"وہ میرے سرتاج تو ہیں ہی!" شمع نے مسکرا کر کہا۔

اسی وقت کسی اندرونی کمرے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔

"ارے!" شمع جلدی سے اٹھی۔ "یہ صوفیا کہاں چلی گئی۔" پھر اس نے حمیدہ سے کہا۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

اس نے تیزی سے اندرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ حمیدہ اس سے اتنی بے تکلف تھی کہ وہ بھی اس کے پیچھے چلی۔

اس طرف لاؤنج تھا۔ وہاں ڈیڑھ دو سال کا ایک بچہ قالین پر پڑا رو رہا تھا۔ اس کے قریب چھوٹے چھوٹے کچھ کھلونے بھی بکھرے ہوئے تھے۔

"ارے لے لے لے۔" شمع نے بڑی محبت سے کہتے ہوئے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔

اسی وقت لگ بھگ چالیس سال کی عمر کی ایک اینگلو انڈین عورت اسکرٹ میں ملبوس تیزی سے وہاں آئی۔

"کہاں چلی گئی تھیں تم؟" شمع اس پر بگڑی۔

"ہم کو واش روم جانا پڑا تھا بیگم صاحب!" وہ بولی۔ "اس وقت بابا بہت خوش تھا۔"

"کمال ہے صوفیا!" شمع نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "اتنے دن میں بھی تم نہیں جان سکیں کہ یہ جب اکیلا رہ جاتا ہے تو کبھی کبھی رونے لگتا ہے۔"

"سوری بیگم صاحب!" صوفیا نے کہتے ہوئے بچے کو شمع کی گود سے لینا چاہا۔

"نہیں، اب رہنے دو۔ تم میرے پاس سے ذرا کچن میں جا کر بڑی بی سے کہو کہ میری ایک بہت اچھی دوست آئی ہے۔ وہ چائے وغیرہ کا کچھ بندوبست کریں۔" پھر وہ حمیدہ سے بولی۔ "آؤ چلو وہیں بیٹھیں گے۔"

حمیدہ اس وقت اسے بڑی تیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر بیٹھنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر ناراضی کے آثار تھے۔

"اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟" شمع ہنس کر بولی۔

"غصہ آ رہا ہے تم پر۔"

"کیوں؟"

"فون پر تو ہماری باتیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ تم نے مجھے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ تم ماں بن چکی ہو!"

شمع سنجیدہ ہو گئی، پھر کچھ افسردگی سے بولی۔ "میں ابھی ماں نہیں بنی ہوں حمیدہ!"

"کیا؟" حمیدہ حیرت سے بولی۔ "تو پھر یہ بچہ؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا ہے۔ ہاں اس کی پرورش میں نے ضرور کی ہے۔ اسی لیے مجھے اس سے بہت محبت ہوئی ہے۔ یہ سات آٹھ دن کا تھا جب میری گود میں آیا تھا۔"

"کہاں سے آیا تھا؟" حمیدہ نے تیزی سے پوچھا۔

شمع نے ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔ "سب کچھ ایسا ہے جیسے کوئی کہانی ہو۔"

"کہانی ہی کی ابتدا مجھے بتاؤ۔ کیا قصہ ہے؟"

"یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں کہ تاج شارب موٹرز میں ملازم ہیں۔"

"ہاں۔"

شمع پھر بولی۔ "ان کی ڈیوٹی ایسی ہے کہ بعض اوقات رات کو بھی انہیں شارب فاروقی صاحب کے گھر جانا پڑتا ہے۔ شارب فاروقی شارب موٹرز کے مالک ہیں۔"

حمیدہ نے بیچ میں بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ شارب فاروقی کے بارے میں جانتی ہی تھی۔

"ایک بار ایسا ہوا" شمع بچے کو شانے سے لگائے تھپکتے ہوئے بولی۔ "تاج کسی کام سے ان کے گھر گئے تو وہاں ان کا سامنا اپنی دور دراز کی ایک رشتے دار سے ہو گیا۔ ان کا نام خورشید بیگم ہے۔ تاج سے ان کا رشتہ اتنی دور کا ہے کہ گھریلو تعلقات نہیں تھے۔ وہ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے نرسنگ کا کورس کر لیا تھا۔ کسی اسپتال میں ملازم ہو گئی تھیں۔ بعد میں ان کی رسائی کسی طرح جناب شارب تک ہوئی۔"

شمع نے جناب شارب کے بارے میں بھی وضاحت کی جو حمیدہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"جناب فاروقی صاحب کی ایک بیٹی چار سال کی تھی۔ مریم نام ہے اس کا۔ اب تو خیر اس کی شادی بھی ہو چکی ہے لیکن جب وہ چار سال کی تھی تو جناب فاروقی صاحب نے خورشید بیگم کو اس کی گورنس کی حیثیت سے اپنے گھر میں ملازم رکھ لیا تھا۔"

مریم کا نام سامنے آتے ہی حمیدہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔

شمع نے اپنی بات جاری رکھی۔ "خورشید بیگم کا کوئی قریبی عزیز تو دنیا میں تھا نہیں اس لیے مستقل طور پر جناب کے بنگلے میں رہنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مریم بڑی ہوئی تب بھی وہ وہیں رہتی رہیں۔ دراصل مریم کو ان سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اس نے انہیں جناب شارب سے جانے ہی نہیں دیا۔" اتنا کہہ کر شمع خاموش ہو گئی۔

"ہوں... ہوں!" حمیدہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"دراصل مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ میں شاید کچھ غیر ضروری باتیں بھی بتا رہی ہوں۔"

"ضروری اور غیر ضروری کے چکر میں نہ پڑو۔" حمیدہ نے کہا۔ "بتاتی رہو... میں بڑی توجہ سے سن رہی ہوں۔"

"اچھا۔" شمع نے کہا۔ "تو میں یہ بتا رہی تھی کہ تاج سے خورشید بیگم کا سامنا ہوا تو انہوں نے رسماً خورشید بیگم کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ ایک دن وہ ملنے آ بھی گئیں۔ کیونکہ وہ عمر میں تاج سے خاصی بڑی ہیں اس لیے انہیں عزت سے بٹھایا گیا۔ ان کی خاطر مدارات کی گئی۔ تاج بہت اچھے موڈ میں ان سے باتیں کرتے رہے مگر ان کا موڈ کچھ عجیب سا رہا۔ وہ بہت سنجیدہ بلکہ کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے خود بس دو ایک ہی سوال کیے۔ ہماری شادی کے بارے میں پوچھا۔ یہ بھی کہا کہ شادی شدہ جوڑے کے گھر میں کوئی بچہ نہ ہو تو کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے۔ تاج نے بھی کہہ دیا کہ انہیں بچوں کا بہت شوق ہے لیکن جب بھی خدا کو منظور ہو۔"

حمیدہ کے دماغ میں ایک سوال پیدا ہوا جو اس کی زبان پر بھی آ گیا۔ اس نے کہا۔ "ابھی تم نے بتایا تھا کہ یہ بچہ جب تمہاری گود میں آیا تو ہفتہ آٹھ دن کا تھا۔ اب یہ ڈیڑھ دو سال کا تو ہوگا۔ اس سے میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ جب خورشید بیگم سے یہ باتیں ہوئی تھیں اس وقت تمہاری شادی کو سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں ہوا ہوگا۔"

"ہاں۔"

"تو صرف اتنے ہی عرصے کے بعد تاج بھائی کی مایوسی کیوں؟"

"مایوسی؟"

"ہاں۔" حمیدہ نے کہا۔ "جب خدا کو منظور ہو یہ جواب تو کچھ مایوسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"

شمع نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بات کچھ ایسی ہی ہے حمیدہ۔"

حمیدہ الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"دراصل حمیدہ!" شمع نے کچھ شرمندگی سے کہا۔ "تاج کو بچوں کی اتنی ہی چاہت ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے چار پانچ بچے ہوں۔ شادی کے صرف ایک سال بعد ہی وہ فکرمند ہو گئے تھے کہ بچہ ہونے کے آثار کیوں نظر نہیں آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے بتایا کہ مجھ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں ماں نہ بن سکوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ صرف ایک سال بعد بچے کے آثار پیدا نہ ہونے کے باعث انہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم اگر وہ زیادہ بے چین ہیں تو اپنا چیک اپ بھی کرا لیں۔"

شمع خاموش ہوئی تو حمیدہ جلدی سے پوچھ بیٹھی۔ "پھر؟"

"چیک اپ کرایا تھا انہوں نے۔" شمع نے کچھ شرمندگی سے کہا۔ "علاج جاری ہے ان کا۔"

"اوہ!"

"جب ان کا علاج ہو جائے گا، تبھی میں ماں بن سکوں گی۔"

"امید ہے تو ہو جائے گا علاج۔ اس میں اتنا غمزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی دس بیس سال تو علاج ہوگا نہیں۔ ابھی عمر ہی کیا ہے، فرض کرو ایک سال میں بڑھیا تو نہیں ہو جاؤ گی۔"

حمیدہ کا یہ لہجہ تھا کہ شمع دھیرے سے ہنس دی۔ حمیدہ کا مقصد بھی یہی تھا کہ اپنی سہیلی کا دل بڑھائے اور اس کی اداسی ختم کرے۔

شمع نے صوفیہ کو آواز دی۔ پھر حمیدہ سے کہا۔ "یہ گورنس اسی بچے کے لیے ملازم رکھی گئی ہے جو اس بچے کی تربیت کے لیے مناسب ہے۔"

شمع کی باتوں سے حمیدہ نے سمجھ لیا تھا کہ جو بچہ اس کی گود میں تھا، وہ لے پالک ہوگا لیکن شمع کی آخری بات نے اسے چونکا دیا۔

"کیا مطلب!" وہ بے اختیار بولی۔ "تمہیں اس بچے کی تربیت کے لیے یہ مناسب ہے؟"

"ہاں۔"

اسی وقت صوفیہ آ گئی۔ شمع نے بچے کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "نواب سوتے سوتے سو گیا ہے۔ بڑی بی سے کہنا تھا کہ چائے لے آئیں۔"

"کہہ دیا تھا بیگم صاحبہ! وہ آ رہی ہیں۔"

صوفیہ نے ٹھیک کہا تھا جب وہ وہاں سے جا رہی تھی تو ایک بڑی عمر کی لیکن صحت مند عورت چائے اور اس کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں ایک ٹرالی میں رکھے اندر آ رہی تھی۔ قریب آ کر اس نے ٹرالی حمیدہ اور شمع کے سامنے رکھ دی جو ایک ہی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

بوڑھی ملازمہ کے جانے کے بعد شمع نے حمیدہ کو چائے کی طرف متوجہ کیا۔

حمیدہ بولی۔ "چائے بھی پی لی جائے گی۔ پہلے تم میری بے چینی ختم کرو۔ مجھے اس بچے کے بارے میں بتاؤ۔"

شمع نے بسکٹوں کی ایک پلیٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ "باتیں ہوتی رہیں گی لیکن چائے تو ٹھنڈی نہ ہو۔" پھر وہ خود ہی کچھ جھک کر پاٹ سے پیالیوں میں چائے بناتے ہوئے بولی۔ "یہ جو تم ٹھاٹ باٹ دیکھ رہی ہو نا، یہ سب اس بچے کی وجہ سے ہے۔"

"شروع سے بتاؤ ساری بات!" حمیدہ نے پہلو بدل کر کہا۔

"بتاتی ہوں۔" شمع نے کہا۔ چائے بناتے ہوئے بھی اس کے چہرے سے سوچ بچار کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ "لیکن یہ بھی بتا دوں کہ تمہارے علاوہ دنیا میں یہ سب کچھ کسی کو بھی نہیں بتا سکتی۔ میں کسی پر اتنا اعتماد نہیں کرتی اور تاج بھی نہیں چاہتے کہ یہ راز کسی پر افشا ہو۔ مجھے تم سے امید ہے کہ اس کا خیال رکھو گی۔"

حمیدہ نے پر تجسس چہرے کے ساتھ سر ہلا دیا تاکہ شمع جلد از جلد اصل کہانی بھی سامنے آ سکے۔

شمع نے چائے کی پیالی حمیدہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "پھر ایک دن خورشید بیگم پھر ہمارے یہاں آ گئیں۔ اس مرتبہ انہوں نے ایک عجیب سی بات چھیڑ دی۔ میں حیران بھی ہوئی کہ انہوں نے وہ معاشرتی مسئلہ کیوں چھیڑا۔ انہوں نے مجھ سے اور تاج سے سوال کیا کہ اگر کوئی عورت اور مرد شادی سے پہلے ہی کوئی غلطی کر بیٹھیں اور اس کے نتیجے میں ایک ناجائز بچہ وجود میں آ جائے تو اس معاملے میں اس بچے کا کیا قصور ہے؟ معاشرہ اسے کیوں حقارت سے دیکھتا ہے؟ اس بارے میں جو میرا خیال تھا، وہ بتا دیا۔ تمہیں حیرت ہوگی کہ اس بارے میں میری اور تاج کی سوچ ایک سی تھی۔ ہم دونوں کے خیال کے مطابق معاشرے میں اس بچے کو وہی مقام ملنا چاہیے جو کسی بھی جائز بچے کو ملتا ہے کیونکہ اس کے وجود پانے میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اسے تو اس اعتبار سے بھی مظلوم کہا جا سکتا ہے کہ اسے اس کے باپ کا نام بھی نہیں ملتا۔ ہماری ان باتوں کے جواب میں خورشید بیگم نے کہا کہ تم دونوں کتابی باتیں کر رہے ہو۔ کیا عملی طور پر بھی اس کا ثبوت دے سکتے ہو؟ ان کا یہ سوال بھی ہمارے لیے حیران کن تھا۔ بہرحال تاج نے کہا کہ یہ کتابی باتیں نہیں ہیں اور اگر ان کی زندگی میں کوئی ایسی صورت حال پیش آئے تو وہ ناجائز بچے کی حمایت میں بے جھجک کھڑے ہو جائیں گے۔"

حمیدہ واقعی بڑی غیر معمولی دلچسپی اور توجہ سے اس لیے بھی سن رہی تھی کہ ان باتوں کا تعلق ایک ایسی عورت سے تھا جو مریم کی گورنس رہ چکی تھی۔

شمع نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ "اس پر خورشید بیگم نے ایک ایسا سوال کیا کہ میں اور تاج ان کا منہ تکتے رہ گئے۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ کیا ہم کسی ناجائز بچے کی پرورش اور تربیت کر سکتے ہیں؟ تاج اس سوال کا جواب ذرا دیر کے بعد دے سکے۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس بچے کے ناجائز ماں باپ اس بچے سے اپنی جان چھڑانا چاہیں تو یقیناً اس بچے کی پرورش اور تربیت کر کے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسانی زندگی سے ہوگا جو ہم ضرور ادا کریں گے۔ تجھیں کر حمیدہ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ جواب سن کر خورشید بیگم کے چہرے پر فکرمندی کا تاثر بہت گہرا ہو گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ تاج چونکہ بچوں کے خواہش مند ہیں اس لیے اگر وہ چاہیں تو انہیں ایک ایسا بچہ مل سکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ شاداب فاروقی کے خاندان کی ایک لڑکی ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے اور اس معاملے میں اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کسی نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ خورشید بیگم اس لڑکی کو بچانا چاہتی ہیں اور وہ لڑکی اس بچے کو کسی طرح ختم بھی نہیں کرنا چاہتی ہے کہ کسی کو اس کا پتا چلے۔

یہ باتیں سنتے ہوئے حمیدہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ اسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ اس بچے کی ماں کہیں مرینہ تو نہیں؟

اس دوران میں حمیدہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ صرف اس لیے لیتی رہی کہ وہ ایسا نہ کرتی تو شاید اسے کسی اور طرح اس کہانی میں رکاوٹ پڑتی جسے آخر تک سننے کے لیے وہ بہت بے چین تھی۔

شمع کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "خورشید بیگم نے کہا تھا کہ وہ اس معاملے میں تاج سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد کیا تاج اور میں اس بچے کی تربیت اور پرورش کے لیے تیار ہیں؟ تاج نے فوراً جواب دیا کہ وہ اس کے لیے بالکل تیار ہیں۔ مگر وہ اس معاملے میں کسی قانونی پیچیدگی کا شکار نہیں ہونا چاہتے۔ تاج نے یہ بات اس خیال سے بھی کہی کہ اس بچے اور اس کی ماں کا تعلق ایک بہت بڑے گھرانے سے تھا۔ میں اس لیے خاموش رہی کہ مجھے تاج سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس پر خورشید بیگم نے مجھ سے بھی پوچھا کہ مجھے اس بچے کو گود میں لیتے ہوئے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ میں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ مجھے تو اس بچے سے ابھی سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ اس پر خورشید بیگم نے مسکرا کر کہا کہ وقت گزرنے کے ساتھ وہ ہمدردی محبت میں بھی تبدیل ہو جائے گی۔ میں نے ان کی اس بات سے بھی اتفاق کیا۔ پھر انہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ ہم کبھی کسی قانونی پیچیدگی کا شکار نہیں ہوں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب وہ بچہ ہمارے حوالے کر دیں گی تو اس بچے کی ماں کبھی ہم سے نہیں ملے گی اور نہ بعد میں کبھی اپنے بچے کو دیکھنے آیا جایا کرے گی۔ پھر جب خورشید بیگم ہماری طرف سے پوری طرح مطمئن ہو گئیں تو انہوں نے ماں بننے والی اس لڑکی کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ وہ شاداب فاروقی کی بہن مرینہ ہے۔"

اگرچہ حمیدہ کے دماغ میں یہ خیال گردش کر رہا تھا لیکن شمع کی زبان پر وہ نام آتے ہی اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے پسلیوں سے ٹکرا گیا ہو۔ پیالی بھی اس کے ہاتھ میں لرز گئی۔ اس وقت تک اس نے چائے ختم کر لی تھی۔ اس نے پیالی رکھ دی۔

"کیوں؟" شمع اسے گھورنے لگی۔ "مرینہ کا نام سن کر تم اس طرح چونک کیوں گئیں؟"

"کوئی معمولی بات تو نہیں بتائی تم نے۔" حمیدہ نے کہا۔ "مرینہ ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اس کے ساتھ یہ زیادتی کون کر سکتا ہے؟"

"ہاں۔" شمع نے حمیدہ کی تائید کی۔ "یہ واقعی بہت عجیب ہے۔ خورشید بیگم نے کہا تھا کہ زیادتی کرنے والے کا ابھی تک پتا نہیں چلا ہے۔ بس ایک بات طے ہے کہ وہ یہ بات راز میں رکھنا چاہتی ہیں کیونکہ مرینہ بھی یہ بات چھپانا چاہتی ہے۔ انہوں نے بالکل درخواست کرنے والے انداز میں کہا تھا کہ ہم ان سے اس بارے میں جاننے پر اصرار نہ کریں تو وہ ہماری شکر گزار ہوں گی۔"

اس وقت حمیدہ کا سارا جسم سنسنانے لگا تھا۔

"ہاں سب کچھ میں تمہیں مختصر طور پر بتا رہی ہوں۔" شمع بولی۔ "مرینہ کے بھائی شاداب فاروقی نے کسی شخص کو اس بات پر تیار کر لیا تھا کہ وہ مرینہ سے شادی کر لے۔ یہ سب کچھ بھی ہمیں خورشید بیگم ہی نے بتایا ہے۔ شادی کے بعد وہ دونوں مری چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد بچے نے وہیں جنم لیا۔ موبائل فون پر مرینہ کا خورشید بیگم سے رابطہ رہتا تھا۔ مرینہ واپسی کے لیے جب ایئرپورٹ پہنچی، جب خورشید بیگم وہاں پہنچیں تو مرینہ نے بچہ ان کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی آ گئی۔ یہاں کسی کو بھی نہیں بتایا گیا کہ وہ ایک بچے کی ماں بن گئی ہے۔"

"شاداب فاروقی کو بھی نہیں؟" حمیدہ نے پوچھا۔ "اس نے تو مرینہ سے شادی کرنے کے لیے کسی کو تیار کیا تھا۔ اس سے تو یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ اس کی بہن مری میں کسی بچے کو جنم دے کر لوٹی ہے۔"

"ہاں اسے تو اس بچے کی پیدائش کا علم ہوگا لیکن اس معاملے کا یہ پہلو بڑا عجیب ہے۔ یہ بات شاداب فاروقی سے بھی چھپائی گئی ہے۔ تاج کو خورشید بیگم نے تاکید کی تھی کہ اس کا علم شاداب فاروقی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"یہ مجھے خورشید بیگم نے نہیں بتایا۔"

"تم نے پوچھا تھا؟"

"ہاں۔" شمع نے جواب دیا۔ "یہ بات مرینہ بھی چھپانا چاہتی ہے کہ وہ بچہ اب کس گھر میں پرورش پا رہا ہے۔"

حمیدہ چونک پڑی تھی۔ وہ شمع کے خاموش ہوتے ہی بولی۔

"...ہے...؟"

"میں تمہیں ایک بات بتانا بھول گئی۔ بچے کو ہمارے پاس لانے سے قبل خورشید بیگم نے ہمیں یہ اپارٹمنٹ دکھایا تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لیے خریدا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ جب وہ بچہ ہمیں ملے تو ہم اسی روز اپنے گھر سے اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو جائیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جہاں ہم رہتے تھے وہاں کے لوگ سوچیں کہ یہ بچہ اچانک میری گود میں کیسے آ گیا؟ بچے کو دے کر پانچ فرلانگ دور جانا پڑتا ہے۔ اس لیے اپارٹمنٹ میں سب سے کہا جا سکتا تھا کہ یہ بچہ میرا ہی ہے۔"

"مرینہ یہاں آتی رہتی ہے؟"

"ہاں۔ ملنے ایک دو مرتبہ ضرور آتی ہے اور کچھ وقت بچے کے ساتھ گزارتی ہے۔ بچے کے ساتھ کھیلتی ہے اور وہ اسے گود میں لیے رہتی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ آتی ہوتی تو میں اس سے کیسے پوچھتی کہ وہ اس بچے کو اپنے بھائی سے کیوں چھپانا چاہتی ہے جبکہ وہ اس بات سے واقف ہو گیا تھا کہ اس کی بہن ماں بنے گی۔ مرینہ نے میری بات کے جواب میں کہا تھا کہ وہ اپنے باپ کی زندگی تک اس بچے سے کسی کو بے خبر رکھنا چاہتی ہے۔"

حمیدہ کے لیے ان سبھی باتوں میں الجھاؤ تھا لیکن اس کے لیے سب سے اہم بات یہی تھی کہ اس کے بھائی نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی تھی جس نے ایک ناجائز بچے کو جنم دیا تھا۔ شمع کے بیان کی روشنی میں یہ بات بھی ثابت تھی کہ اس کا بھائی اس بات سے بے خبر نہیں ہوگا۔ وہ مرینہ کے ساتھ مری گیا تھا اور وہیں اس بچے کی پیدائش ہوئی تھی۔

حمیدہ کہہ رہی تھی۔ "اس بچے کی پرورش کے سارے اخراجات بھی مرینہ ہی دیتی ہے۔ تاج اس سے لینا نہیں چاہتے تھے مگر لینا اس لیے پڑا کہ مرینہ جس انداز میں پرورش کروانا چاہتی تھی، ان اخراجات کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ صوفیہ جو اس کی گورنس ہے، اس کی تنخواہ ہم کہاں سے دیتے اور اس خوبصورت اپارٹمنٹ کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ایک ملازم بھی رکھنا ضروری تھا۔ ان بڑی بی کو بھی ملازم رکھ لیا گیا ہے تاکہ میں بھی بچے کا خیال رکھ سکوں اور اس کے معاملے میں صرف صوفیہ پر انحصار نہ کروں۔ یہ بڑی بی رات کے کھانے کے بعد اپنے گھر چلی جاتی ہیں۔ تیمر تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ آگے چل کر اس بچے کو کوئی بڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسکول میں بھی داخل کرنا ہوگا۔ اس کے تعلیم کے اخراجات بھی
"ہم اس کے اسکول کے اخراجات کا خرچ تو دے رہے ہیں..."
"کیا اس وقت تک مریم کا باپ زندہ رہے گا؟"
"کسی کی زندگی کتنی ہے یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔"
حمیدہ کی زبان پر یہ سوال اس لیے آ گیا تھا کہ ابھی دن اس نے مریم کے باپ کی غیر معمولی بیماری کی ساری تفصیل سن رکھی تھی۔
حمیدہ نے ایک اور سوال کیا۔ "مریم کے باپ کے انتقال کے بعد کیا وہ بچہ تم سے واپس لے لے گی؟"
"نہیں۔" شمع نے جواب دیا۔ "اس کی خواہش ہے، بچے کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکے کہ میں اور تاج اس کے سگے ماں باپ نہیں۔"
"ابھی تم نے بتایا تھا کہ وہ بچے باپ کی زندگی تک اس بچے کو اپنے شوہر سے بھی چھپائے رکھنا چاہتی ہے۔ گویا باپ کے بعد یہ بات چھپانے کی اسے کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔"
"دراصل اس نے جو کچھ جواب دیا تھا وہ بڑا الجھا ہوا سا جواب تھا۔ نہ جانے وہ کیا چاہتی ہے۔ ہاں یہ بات وہ واضح طور پر کہہ چکی ہے کہ یہ بچہ اب ساری زندگی مجھے اور تاج کو ہی اپنے والدین سمجھے گا۔"
"خورشید بیگم سے پوچھا ہوتا تم نے! وہ اب کہاں ہیں؟"
"انہوں نے بھی مبہم سے جواب دیے تھے حمیدہ۔ وہ مریم کی شادی کے بعد جاب وغیرہ چھوڑ چکی تھی۔ مریم نے ان کی خدمات کے پیش نظر انہیں کوئی گھر دلوا دیا ہے اور کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مستقل ہی ہوگا۔"
حمیدہ یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ مریم وہاں کس دن آئی تھی لیکن اسے سوال کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر شمع جلدی سے کھڑی ہو گئی تھی۔
"یہ سوتا ابھی تک اس چاہت کیوں ہو رہی ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا..." شمع بڑبڑاتے ہوئے تیزی سے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
اس وقت حمیدہ اس کے پیچھے نہیں گئی تھی۔ اس کا ذہن بہت سے سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔
گھنٹہ بھر مزید گزار کر اور خاصی دیر باتیں کر کے حمیدہ نے واپس جانے کے لیے شمع سے اجازت لی۔ شمع نے اسے کھانے کے لیے روکنا چاہا لیکن حمیدہ نے زیادہ رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے والدین پریشان ہو سکتے تھے۔
واپس بنگلے پہنچ کر اس نے چوکیدار سے چابی لیتے ہوئے پوچھا۔ "ابو آ گئے تھے؟"
"ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آپ چابی مجھے دے گئی ہو مگر انہوں نے چابی مجھ سے نہیں لی۔ وہ بس کہیں ہی دیکھنے آئے ہوں گے۔"
حمیدہ نے کوئی اور بات نہیں کی۔ چوکیدار سے چابی لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت ساڑھے دو بجے تھے۔
ابھی وہ وقت گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔
حمیدہ نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اپنے سامنے امجد کو کھڑا پایا۔
"آ گئیں!" وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ... رہا تھا۔
"کیوں آئے ہو؟" حمیدہ نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔
"کہاں گئی تھیں؟"
"تم سے مطلب؟"
امجد نے منہ بنایا پھر بولا۔ "تمہارے ابا کو تمہاری فکر لگی ہوئی تھی۔ ابھی میں نے ابھی چوکیدار سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم آ گئی ہو۔ اب میں جا کر تمہارے ابا کو بتا دوں گا۔"
"یہاں اب تالا لگا ہوا نہیں تھا۔" حمیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں چوکیدار سے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں آ گئی ہوں۔ پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی کیا ضرورت تھی؟"
امجد وہاں سے بغیر جانے کے لیے مڑ گیا۔ حمیدہ نے بڑی زور سے دروازہ بند کر کے اپنے غصے کا اظہار کیا۔
رات کو عدیل احمد آئے تو وہ حمیدہ کے لیے کچھ لے کر آیا تھا۔
"امجد نے بتایا تھا کہ تم آ گئی ہو تو اطمینان ہو گیا تھا۔" بولا۔
"میں دیر سے تو نہیں لوٹی ابا!"
"وہ تو ہے لیکن تنہا شہر ہے تو فکر ہو رہی تھی۔ پھر اتنی گرمی بھی ہے۔"
"ٹھیک ہے ابا!"
عدیل احمد واپس چلا گیا۔
حمیدہ نے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گئی۔ جن خیالات نے اس کے دماغ میں شمع سے ملنے کے بعد جنم لیا تھا وہ مسلسل اس کے دماغ میں چکراتے رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مریم کے ایک بہت بڑے راز سے آگاہ ہو گئی ہے اور اس راز سے آگاہ ہونے کے باعث اب وہ مریم کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔

☆☆☆

دوسری صبح حمیدہ کی آنکھ کسی شور کی آواز سن کر کھلی۔ اس

نے دیکھا کہ عدیل احمد دروازہ کھول رہا تھا۔
"ناشتا لایا ہوں تو کوئی کام۔" امجد کی آواز سنائی دی۔
"ارے امجد تم کیوں لے آئے؟ میں ابھی آنے والا تھا بیٹے۔"
"مجھے ادھر آنا ہی تھا اس لیے لیتا آیا۔ بیگم صاحبہ نے حمیدہ کو بلایا ہے۔"
"اتنی صبح؟" عدیل احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔
"کہہ دو ابا! میں ابھی آتی ہوں۔" حمیدہ وہیں سے بولی۔
عدیل احمد ناشتے کی ٹرے لے کر دروازہ بھیڑتا ہوا واپس لوٹا۔
حمیدہ جلدی جلدی منہ دھو کر تیار ہوئی اور جلدی جلدی صرف چائے پی لی۔ اس دن تو وہ مریم کا سامنا کرنے کے لیے بہت بے چین تھی۔ عدیل احمد نے کوشش بھی کی کہ وہ ٹھیک سے ناشتا کرے لیکن حمیدہ نے اس کی کچھ نہ سنی۔ جب وہ کوارٹر سے نکلی تو دیکھا کہ امجد ابھی تک وہیں اس کا منتظر تھا۔
"تم اب تک کیوں کھڑے ہو؟" وہ منہ بنا کر بولی۔
"تمہیں لے جانے کے لیے۔" امجد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے حمیدہ کے ساتھ قدم بڑھانا شروع کر دیے تھے۔
حمیدہ بولی۔ "کل میں ان کا کمرہ دیکھ چکی ہوں۔"
"اس وقت وہ اپنے کمرے میں نہیں، اسٹڈی روم میں ہیں۔ وہ تو تم نے نہیں دیکھا!"
"کیا مصیبت ہے!" حمیدہ زیر لب بڑبڑا کر رہ گئی۔
امجد کے ساتھ ساتھ چلنا اسے بہت برا لگ رہا تھا۔
بنگلے میں داخل ہونے کے بعد وہ ایک طرف بڑھ رہے تھے کہ سامنے سے مریم آتی دکھائی دے گئی۔ اسے دیکھ کر امجد کا تو حمیدہ بھی رک گئی۔
قریب آ کر مریم نے امجد سے کہا۔ "تم جاؤ۔" پھر وہ بڑے سلیقے سے حمیدہ کی طرف دیکھنے لگی۔ "اتنی دیر میں آئی ہو؟"
"ابھی آئی تھی۔" حمیدہ نے منہ بنا کر کہا۔ "پھر بھی صرف چائے پی کر آئی ہوں۔ ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔"
"ناشتا کر کے میری خدمت سے زیادہ ضروری تھا؟"
"کیا آج صبح ہی صبح پھر دورہ پڑا ہے؟" حمیدہ کہتی بولی۔
مریم نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر بولی۔ "آج تمہارا رویہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"
حمیدہ ہنسی۔ "آج ہی تو ٹھیک ہوا ہے۔ اب میں وہ حمیدہ نہیں ہوں جس نے کل تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ آج تو میں تمہارے سے پیر دبواؤں گی۔"
"بدتمیز!" مریم نے ہاتھ اٹھایا۔
تھپڑ حمیدہ کے گال پر پڑتا لیکن اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر مریم کی کلائی پکڑ لی۔
"ہوش میں رہو مریم بیگم!" حمیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیا تم نے اندازہ نہیں لگایا کہ آج میرے تیور بدلے ہوئے ہیں۔"
مریم نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑائی اور حمیدہ کو اس طرح گھورنے لگی جیسے اسے کچا چبا جانا چاہتی ہو۔
حمیدہ ہنس کر بولی۔ "اپنے کمرے میں چلو۔ آج میں تمہارے بستر پر بیٹھوں گی اور تم میرے پیر دباؤ گی اور اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہارے بھائی شاہد فاروقی کے پاس جا کر اسے بتا دوں گی کہ تم نے اپنے ناجائز بچے کو پرورش کے لیے کہاں چھپایا ہے۔"
مریم کا منہ کھلا اور کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اب ساکت کھڑی ہوئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے حمیدہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"کیا خیال ہے؟" حمیدہ مسکرائی۔ "پیر دباؤ گی میرے؟"
"کس نے بتایا ہے تمہیں یہ سب بکو!" مریم کی آواز ایسی تھی جیسے تیر سر کو چھو گئی ہو۔
حمیدہ بولی۔ "تمہارا راز تو مجھے معلوم ہو گیا۔ میں اپنا راز تم پر کیوں کھول دوں؟"
"تمہارا گلا گھونٹ دوں گی میں۔" مریم نے دانت پیس کر اپنے لباس کے اندر چھپایا ہوا ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا۔
پوری طرح پر حمیدہ ٹھٹھر گئی۔ پستول کی نال اس کے سینے کی طرف تھی۔
"بولو!" مریم غرائی۔
حمیدہ نے خود کو سنبھالنے کے لیے سوچا کہ مریم سے کوئی بعید نہیں تھی۔ قاتل بننا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ بڑے لوگ پستول وغیرہ اپنے پاس رکھتے تو ہیں مگر انہیں استعمال نہیں کرتے۔
"ذرا دماغ سے کام لو!" حمیدہ نے منہ بنا کر کہا۔ "تم یہ نہ سمجھنا کہ گولی چلنے کی آواز کوئی نہیں سنے گا، بنگلے کے باہر تک نہ جائے اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں پھانسی کی سزا سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔"
"حمیدہ!" مریم نے اب بڑے سکون سے کہا۔ "یہ راز جاننے والے کو زندہ نہیں رہنے دیا جاتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیکن..."

حمیدہ کی بات پوری نہیں ہو سکی۔ مریبہ نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ گولی چلی اور حمیدہ کی گردن میں پیوست ہو گئی۔

"نہیں!" حمیدہ چیخ کر اپنے بستر پر اٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟" عدیل احمد اس کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا بیٹی!" قدسیہ بھی اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف آئی۔

حمیدہ اس وقت بستر پر بیٹھی ہوئی بہت لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے ایک ایسا خواب دیکھا تھا جسے ڈراؤنا کہا جا سکتا تھا۔

قدسیہ نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا خواب دیکھا تھا کوئی؟"

"ہاں۔" حمیدہ کو خود اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

عدیل احمد بولا۔ "آج کچھ زیادہ تو کھانا نہیں کھا لیا تھا؟"

"بس چپ۔" قدسیہ بولی۔ "لیٹ جا میری بچی! بھول جا کیا دیکھا تھا۔ ہوتا ہے ایسا بھی کبھی..... شیطان دکھاتا ہے یہ خواب۔"

"مجھے پانی پلا دو امی۔" حمیدہ کو اپنا حلق خشک محسوس ہو رہا تھا۔

پانی پینے کے بعد حمیدہ لیٹ گئی۔ عدیل احمد اور قدسیہ بھی اپنی اپنی جگہ جا کر لیٹ گئے۔ حمیدہ نے اپنا موبائل اٹھا کر اس میں وقت دیکھا۔ دو بج چکے تھے۔

خواب کی ہر بات حمیدہ کے ذہن میں اب بھی چکرا رہی تھی..... وہ سوچنے لگی، اگر اس نے بچے کے حوالے سے مریبہ کو اپنے دباؤ میں لینا چاہا تو کیا مریبہ واقعی اسے گولی مار سکتی ہے؟

نہیں! اس کے دماغ میں آیا۔ خواب کی باتیں حقیقی دنیا میں نہیں ہوتیں۔ یہ بس خواب تھا اور کچھ بھی نہیں۔

صبح نے جو باتیں کی تھیں وہ سب اس کے ذہن میں چکرا رہی تھیں اور اسے بارہ ایک بجے کے درمیان نیند آئی تھی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب اس نے کار کی آواز سنی تھی تو کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا۔ وہ مریبہ کی کار تھی۔ حمید اس کے ساتھ تھا۔ صبح کے گئے ہوئے وہ دونوں اس وقت لوٹے تھے۔ اس کا مطلب یہی لیا جا سکتا تھا کہ جواب فاروقی کی حالت اس وقت تک نہایت تشویش ناک رہی تھی۔ اب وہ کچھ سنبھلا ہو گا تو مریبہ واپس اپنے گھر لوٹی ہو گی۔

لیکن وہ سنبھلا وقتی بھی ہو سکتا ہے! حمیدہ نے سوچا تھا۔ ممکن ہے کہ اب جواب فاروقی کا آخری وقت قریب آ گیا ہو۔ ایسی صورت میں حالات اب کسی وقت بھی کوئی خاص کروٹ لے سکتے تھے۔ مریبہ نے بھی یہ کہا تھا کہ وہ اپنے باپ کی زندگی تک اپنے بچے کا معاملہ اپنے بھائی شارب فاروقی سے بھی چھپائے رکھنا چاہتی تھی۔

مگر کیوں؟

حمیدہ اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ وہ دوبارہ ان سب باتوں پر اور اپنے خواب پر غور کرتے کرتے نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔

دوسرے دن وہ اپنے ماں باپ کے بنگلے میں جانے کے بعد بستر پر پڑی سوچتی رہی کہ مریبہ آج اسے بلائے گی یا نہیں؟ اسے یہ بھی خیال آیا کہ مریبہ شاید آج بھی گھر پر نہ ہو۔ ممکن تو تھا کہ وہ آج بھی اپنے باپ کی وجہ سے صبح ہی صبح نکل گئی ہو۔ حمیدہ اس بارے میں اپنے باپ سے پوچھ سکتی تھی مگر اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

دوپہر کو اس کا باپ اسے کھانا دینے کے لیے آیا تو وہ اس سے پوچھ سکتی تھی۔

حمیدہ نے سوچا کہ اگر مریبہ نے گھر میں ہوتے ہوئے بھی اسے نہ بلایا تو؟

تو پھر وہ خود جائے گی، حمیدہ نے فیصلہ کیا۔ وہ مریبہ سے تعارف کا حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔ اسے مریبہ سے اس بات کا انتقام لینا تھا کہ اس نے اس سے اپنے پیر دبوائے تھے، اسے ذلیل کیا تھا۔ اس ذلت کا جواب وہ مریبہ کو ذلیل کر کے دینا چاہتی تھی۔ رات کو ایک خواب نے اسے خوف زدہ تو کیا تھا لیکن وقتی طور پر۔ حمیدہ نے خود کو اس خوف سے قطعی باہر نکال لیا تھا۔

دن بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی اور حمیدہ نے جا کر دروازہ کھولا تو امجد کو سامنے کھڑا دیکھا۔

"تمہیں بیگم صاحبہ یاد کر رہی ہیں۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

حمیدہ کو فوراً اپنا خواب یاد آ گیا۔ خواب میں بھی امجد نے صبح صبح نہایت غیر متوقع طور پر یہ پیغام لا کر دیا تھا اور اس وقت بھی اس کی آمد غیر متوقع تھی۔

"اتفاق ہے۔" حمیدہ نے خود کو سمجھایا اور تالا چابی لانے کے لیے مڑی۔ جب وہ دروازے سے باہر نکل کر تالا لگانے لگی تو امجد اس وقت بھی وہیں موجود تھا۔

"تم اب یہیں کھڑے ہو۔" حمیدہ نے تالا لگاتے

ہوئے کہا۔ "میں خود چلی جاؤں گی۔ میں دیکھ تو چکی ہوں ان کا کمرا۔"

"اس وقت وہ اپنے کمرے میں نہیں ہیں، گیسٹ روم کی طرف کے لاؤنج میں ہیں۔" امجد نے جواب دیا۔

حمیدہ کے دماغ کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ خواب میں بھی امجد نے بالکل اسی قسم کی بات کی تھی۔

امجد کے ساتھ بنگلے کی طرف بڑھتے ہوئے حمیدہ کے دل و دماغ پر پھر ہلکا سا خوف طاری ہونے لگا تھا۔ بنگلے میں داخل ہوتے وقت اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کم از کم آج مریبہ سے اس کے بچے کے بارے میں کوئی بات نہیں کرے گی۔ اس کے اس نئے فیصلے کا سبب وہ خواب ہی تھا۔

بنگلے میں داخل ہونے کے بعد بھی حمیدہ کا دماغ خواب جیسے اس اتفاق میں الجھا ہوا تھا۔

ایک جگہ پہنچ کر امجد نے خود دروازہ کھولا اور ایک قدم اندر رکھ کر کسی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آ گئی ہے بیگم صاحبہ!" پھر اس نے باہر کی طرف حمیدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آؤ۔"

حمیدہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ خواب کا وہی کمرا ہو سکتا تھا۔ وہاں مریبہ اسے نہیں دکھائی دی۔ اس نے چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ امجد دروازہ بھیڑ کر اپنی پشت اس سے لگائے، حمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"کہاں ہیں بیگم صاحبہ؟" حمیدہ نے تیزی سے پوچھا۔

"آ جائیں گی تھوڑی دیر میں۔" امجد نے جواب دیا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ جب تک وہ نہ آ جائیں، تم بستر پر بیٹھی رہو اور میں تمہاری نگہبانی کروں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم!" حمیدہ اس کی طرف مڑی۔ "ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔"

لیکن امجد نے ہٹنے کے بجائے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں دبوچ لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم!" حمیدہ چیخ پڑی۔

امجد اسے زبردستی بستر کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔ "تم بچی نہیں ہو جو یہ نہ سمجھ سکو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ تم زور زور سے چیخو تب بھی تمہاری آواز کسی تک نہیں پہنچے گی۔ یہ گیسٹ روم بنگلے کے پچھلے کونے کی طرف ہے۔ تمہارا باپ باہر لان میں ہے اور تمہاری ماں کوٹھی کے دوسرے حصے میں، وہاں سے وہ بھی تمہاری آواز نہیں سن سکے گی۔"

حمیدہ اس وقت گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا سارا جسم سن سا ہونے لگا تھا۔ وہ ہکا بکا ہو کر سوچ رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا اور کیا ہونے جا رہا ہے۔

امجد نے اسے بستر پر گرا دیا تھا۔

"نہیں۔" حمیدہ نے ہذیانی انداز میں چیخ کر بستر سے اٹھنا چاہا لیکن اٹھ نہیں سکی۔ امجد نے بے دردی سے اس کی گردن دبوچتے ہوئے اسے پھر لٹا دیا تھا۔

"میں نے کہا نا کہ چیخ کر [illegible] سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" امجد بولا۔ "اور یونہی چیخ پکار کرتی رہو گی تو اچھا نہیں ہو گا۔"

گردن پر امجد کے ہاتھ کا دباؤ اتنا تھا کہ حمیدہ کو اپنی سانس گھٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔

امجد نے اس کی گردن چھوڑتے ہوئے کہا۔ "اب شور مت مچانا ورنہ گردن اتنی زور سے دباؤں گا کہ تم مرو گی تو نہیں لیکن بے ہوش ضرور ہو جاؤ گی۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ تو میں کر ہی گزروں گا لیکن یہ اچھا نہیں لگے گا کہ تم اس وقت بے ہوش رہو۔"

اس وقت امجد نے اپنے جسم کا سارا وزن اس پر ڈال دیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود نہیں اٹھ سکی تھی۔ صرف چیخ پکار ہی کر سکتی تھی لیکن اس صورت میں امجد پھر اس کی گردن دبا دیتا۔

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" حمیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"واہ!" امجد ہنسا۔ "اتنے دن صبر کرنے کے بعد تو آج ہاتھ آئی ہو تو پھر کیسے چھوڑ دوں۔" امجد نے اس کے گلے میں پڑا دوپٹا کھینچ کر نکالا اور اسے ہوا میں اچھال دیا۔

حمیدہ یوں محسوس کرنے لگی تھی جیسے اس کے جسم سے جان نکلتی چلی جا رہی ہو۔ اس کی حالت کسی ایسے معصوم جانور کی سی تھی جو کسی قصائی کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر سہم گیا ہو اور شدید بے بسی کے عالم میں ہو۔

امجد نے اس کا دوپٹا تو اس کی گردن سے کھینچ کر پھینک ہی دیا تھا، اس سے زیادہ وہ کچھ اور نہ کر سکا۔

"یہ کیا کر رہے ہو مردود!" یکایک دروازے کی طرف سے ایک غصیلی آواز سنائی دی تھی۔

یہ آواز سن کر امجد نہ صرف چونکا بلکہ بری طرح گھبرا گیا اور حمیدہ کو چھوڑ کر بستر سے اتر گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم سے فق ہو گیا تھا۔

بری طرح چونکی حمیدہ بھی تھی جب اس نے دروازے میں مریبہ کو کھڑا دیکھا تھا۔ جو اس وقت قہر آلود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظروں سے امجد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم مردوں کو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔" مریمہ نے نفرت سے دانت پیسے۔

حمیدہ بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھی اور اس نے ایک طرف پڑا ہوا چادر نما دوپٹا اٹھا کر اپنی گردن میں ڈال لیا۔

"مجھے...... مجھے معاف کر دیں...... بیگم صاحبہ!" امجد کچھ ہکلا سا گیا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

"معاف!" مریمہ تیزی سے قریب آئی اور انتہائی حقارت سے اس نے امجد کی گردن پکڑ لی۔ "تجھے تو کسی گٹر میں پھینک دینا چاہیے کمینے!...... چل!" اس نے امجد کی گردن پکڑے پکڑے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

اس وقت حمیدہ نے دیکھا کہ دروازے کے باہر چوکیدار بھی کھڑا ہوا تھا۔

مریمہ امجد کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے کمرے سے نکال کر لے گئی۔ گھبرائی ہوئی حمیدہ بھی ان کے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ اس دوران میں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ایک ایک پور کسی نے بھر کر دیا ہو۔ امجد قد و قامت اور عام سے ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اگر وہ چاہتا تو جھٹکا دے کر خود کو بآسانی چھڑا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ مریمہ سے بہت زیادہ مرعوب تھا یا شاید اس کی وجہ چوکیدار ہو جو ان سب کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ امجد سے زیادہ قد آور اور ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود توانا جسم کا مالک تھا۔

مریمہ امجد کو دھکیلتے ہوئے لے جاتی اور بولتی رہی۔ "جس دن یہ لڑکی اس گھر میں آئی تھی، میں نے اسی دن تیری نظریں بھانپ لی تھیں اور غلام داد کو ہدایت کر دی تھی کہ تجھ پر نظر رکھے۔"

غلام داد چوکیدار کا نام تھا۔

مریمہ کہہ رہی تھی۔ "میں نے غلام داد سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر اسے کسی وقت کچھ شبہ ہو یا میری عدم موجودگی میں تو اس لڑکی کو بنگلے میں لے جائے تو مجھے فوراً اطلاع دے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس وقت گھر سے گئی ہوئی ہوں لیکن یہ اس لڑکی کی خوش قسمتی تھی کہ جب غلام داد نے موبائل پر مجھے اطلاع دی تو میں گھر ہی کی طرف آ رہی تھی اور بہت قریب آ چکی تھی۔"

حمیدہ کی آنکھیں اس وقت بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس کے دل میں مریمہ کے خلاف جو جذبات تھے وہ دم توڑ چکے تھے۔ اس وقت مریمہ اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن گئی تھی۔

برآمدے میں پہنچ کر اس نے امجد کو دھکا دیتے ہوئے اس کی گردن چھوڑتے ہوئے کہا۔ "چلا جا یہاں سے، میں اس لڑکی کو تماشا نہیں بنانا چاہتی ورنہ تجھے پولیس کے حوالے کر دیتی۔" پھر اس نے چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیال رکھنا۔ یہ اب کبھی بنگلے کے پھاٹک پر بھی نظر نہ آئے۔"

امجد اپنی گردن چھوٹتے ہی اس طرح پھاٹک کی طرف بھاگتا چلا گیا جیسے کوئی درندہ اس کے تعاقب میں ہو۔

"اب تم اپنی جگہ جاؤ۔" مریمہ نے چوکیدار سے کہا۔ "تم نے اس لڑکی پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچا لی ہے تم نے!"

"یہ تو آپ نے کیا ہے بیگم صاحبہ!" چوکیدار نے کہا اور مریمہ کے کچھ کہنے سے پہلے برآمدے سے اتر کر تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

مریمہ اب توجہ سے حمیدہ کی طرف دیکھ رہی تھی جو بڑے جذباتی انداز میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہو تم؟" مریمہ بولی۔

حمیدہ قریب آ کر مریمہ سے لپٹ گئی۔ "میری اچھی باجی!...... میری اچھی باجی!...... میری اچھی باجی!" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑائے چلی گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اس کی زبان سے "باجی" کا لفظ سنتے ہی مریمہ کے دماغ کو جھٹکا سا لگا تھا حالانکہ وہ خود بھی جانتی تھی کہ اس کا شوہر اس لڑکی کا بھائی تھا۔ اس کے چونکنے کا سبب شاید یہ ہو کہ حمیدہ نے اسے اس طرح مخاطب کرنے کی توقع نہیں کی تھی۔

اسی وقت کسی طرف سے قدیرہ ادھر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں پھول جھاڑو اور ایک کپڑا تھا۔ اس نے حیرت سے مریمہ اور حمیدہ کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا؟" اس کے منہ سے نکلا۔

مریمہ کچھ سوچتے ہوئے شاید اس کے سوال کو نظر انداز کر گئی۔ حمیدہ کی پیٹھ اس طرح تھپک رہی تھی جیسے اس کی ڈھارس بندھا رہی ہو۔ وہ قدیرہ کی آواز پر چونکی۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ ایک بدلی ہوئی مریمہ ہو۔ اس کے اندر اذیت رسانی کا جو جذبہ بیدار ہو گیا تھا، وہ اسی وقت یکسر ختم ہو گیا تھا جب اس نے حمیدہ کو امجد کی خباثت سے بچایا تھا۔

عزیز احمد اسی وقت پھاٹک سے ان کی طرف بڑی تیزی سے آ رہا تھا۔ غالباً اس کے دونوں ہاتھوں میں سامان کے خاصے بھاری تھیلے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆

اس دن حیدر، مرینہ کے جاگنے سے پہلے ہی گھر سے نکل پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے وعدے کے مطابق گزشتہ روز اس کال گرل سے ملنا تھا جس سے اس کے تعلقات خاصے دن سے چل رہے تھے۔ وہ وعدے کے مطابق اس سے ملنے اس لیے نہیں جا سکا تھا کہ صبح ہی صبح جاذب فاروقی کی حالت خراب ہو جانے کی اطلاع آ گئی تھی۔ یہ اطلاع ملتے ہی مرینہ اسے اپنے ساتھ لے کر جاذب پیلس کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ حیدر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کال گرل سے ملنے کے لیے وہ مرینہ کو چھوڑ سکتا۔ جب وہ دونوں جاذب پیلس پہنچے تو انہیں اطلاع ملی کہ شاہ جاذب فاروقی پچھلے پہر کو آغا خان اسپتال لے گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چچا زاد بھائی انور بھی چلا گیا تھا۔ اس قسم کی صورت حال میں انور کے بھائی اظہر کو بھی جانا چاہیے تھا لیکن اس وقت تک وہ نیند سے بیدار ہوا تھا نہ اسے بیدار کیا جا سکتا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت رات گئے گھر لوٹا تھا تو دوسرے دن اس کی آنکھ دوپہر سے پہلے نہیں کھلتی تھی۔

مرینہ حیدر کو اپنے ساتھ لیے ہوئے آغا خان اسپتال پہنچ گئی تھی۔ جہاں جاذب فاروقی کو داخل کیا جا چکا تھا۔

جاذب فاروقی کی حالت خاصی تشویش ناک تھی لیکن ڈاکٹرز اسے سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شام سے اس کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ نو بجے تک وہ اس قابل ہو گیا کہ تکیے کے سہارے بیٹھ کر اپنے بیٹوں سے باتیں کر سکے۔ دس بجے سے اس نے ضد شروع کر دی کہ وہ اسپتال میں نہیں رہے گا اور گھر جائے گا۔ ڈاکٹرز چاہتے تھے وہ اسپتال میں کم از کم ایک دن اور رہے لیکن جاذب فاروقی نہیں مانا۔ سب لوگ مجبور ہو گئے کہ اسے اسپتال سے گھر لے آئیں۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے دو نرسیں جاذب فاروقی کی دیکھ بھال کے لیے بھیج دی تھیں۔ ان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ایک سوئے تو دوسری جاگے اور دوسری سوئے تو پہلی جاگے تاکہ جاذب فاروقی کی حالت پر ہر لمحہ نظر رکھی جا سکے اور اگر کسی وقت جاذب فاروقی کی حالت میں کوئی تغیر دکھائی دے تو اسپتال کو فوراً اس کی اطلاع دی جائے۔

مرینہ نے حیدر کے ساتھ صبح سے اس وقت تک کا وقت اسپتال ہی میں گزارا تھا۔ دوپہر کو اظہر اور انور کی ماں بھی آ گئی تھی لیکن اظہر نہیں آیا تھا۔ جب وہ لوگ اسپتال سے واپس جاذب پیلس پہنچے تھے اس وقت اظہر کو گھر سے گئے بہت دیر ہو چکی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب جاذب فاروقی سو گیا تھا۔ نرسوں کے بیان کے مطابق اس کی حالت نہایت تسلی بخش تھی۔ یہ جاننے کے بعد مرینہ، حیدر کو لے کر واپس اپنے گھر آ گئی تھی۔ وہ دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے۔

صبح حیدر، مرینہ سے پہلے جاگ گیا تھا اور اس نے فوراً سوچا تھا کہ مرینہ کے جاگنے سے پہلے ہی گھر سے نکل بھاگے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کال گرل اس سے بہت ناراض ہوگی۔ اس کے باوجود حیدر کو یہ ڈر بھی تھا کہ اگر جاذب فاروقی کی حالت پھر بگڑ گئی اور مرینہ کو جاذب پیلس جانا پڑا تو وہاں اس کی عدم موجودگی پر بہت برہم ہوگی۔ وہ جاذب پیلس جاتی تو حیدر کو اپنے ساتھ ضرور رکھتی تھی۔

ایک بار اس نے حیدر سے کہا تھا۔ "ڈیڈی کو ہمیشہ یہ کھٹکا رہتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور ایک پل کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔"

حیدر نے مرینہ کی برہمی کے خیال کے باعث جلدی سے روانگی سے پہلے جاذب پیلس فون کیا تھا۔ اس کی بات انور سے ہوئی تھی جو اس سے ہمیشہ بہت شائستگی سے بات کرتا تھا۔

انور سے معلوم ہوا تھا کہ جاذب فاروقی کی حالت بالکل ٹھیک تھی۔ اس وقت نرس اسے ناشتا کرا رہی تھی۔

یہ اطلاع ملنے کے بعد حیدر بہت مطمئن ہو گیا تھا۔ مرینہ کیونکہ بہت تھکی ہوئی تھی لہٰذا امکان تھا کہ دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں جاگے گی۔ جاذب پیلس میں بھی کسی ہنگامی صورت حال کا امکان نہیں تھا کہ مرینہ کو فون کر کے بلایا جاتا۔

حیدر یہی سوچ کر گھر سے روانہ ہوا تھا کہ گیارہ بجے تک لوٹ آئے گا۔ ان دنوں اس کا ذہن بہت منتشر رہنے لگا تھا۔ اپنے گھر والوں کی آمد اور ان کے ساتھ مرینہ کے ناروا رویے کی وجہ سے وہ اذیت میں مبتلا تھا لیکن ضمیر کی ملامت اسے "بچا" نہیں سکی تھی۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر اسے جو اذیت ہو رہی تھی وہ اپنی جگہ۔

اس اذیت ہی کی وجہ سے وہ ان دنوں شراب بھی پینے لگا تھا لیکن زیادہ نہیں کہ مرینہ کے سامنے جانے تو نشے کی حالت میں ہو۔ مرینہ شراب پینے والوں کو سخت ناپسند کرتی تھی۔

اس دن نہ جانے کیا ہوا کہ کال گرل کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے وہ کچھ زیادہ ہی پی گیا لیکن اس نے اتنی زیادہ بھی نہیں پی تھی کہ کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ اس نے محسوس کیا

کہ اگر وہ گیارہ بجے گھر پہنچا تو اس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ سے مرینہ پر بھید کھل جائے گا۔

اس صورت حال سے بچنے کے لیے اس نے کال گرل کے ساتھ کچھ زیادہ وقت گزارا اور ایک بجے کے قریب گھر پہنچا۔ اسے اطمینان تھا کہ کوئی غیر معمولی صورت حال نہیں ہوئی ورنہ مرینہ اس سے موبائل فون پر رابطہ ضرور کرتی اور اسے طلب بھی کرتی یا جو کچھ بھی ہوتا۔

جب اس کی کار پھاٹک سے گزر کر پورچ کی طرف جا رہی تھی تو اس نے اس سرونٹ کوارٹر کی طرف بھی دیکھا جو اس کے ماں باپ کو دیا گیا تھا۔ کوارٹر میں تالا لگا دیکھ کر وہ کھلا گیا۔ تالے سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مرینہ نے اس روز بھی ان لوگوں کو کہیں گھمانے کے لیے حیدر کو بنگلے میں بلا لیا ہوگا۔

کار پورچ میں کھڑی کر کے وہ اپنے بنگلے میں داخل ہوا۔ اسے اپنے ہی کمرے کا رخ کرنا پڑا۔ جب تک مرینہ خود ہی اسے اپنے کمرے میں نہ بلاتی، وہ اس کے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی نوبت بھی ڈھائی سال کے عرصے میں دو تین بار سے زیادہ نہیں آئی تھی۔ مرینہ نے تو اس کے کمرے میں ایک بار بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ گھر میں ان کی ملاقات ڈرائنگ روم ہی میں یا ڈائننگ ہال میں ہوا کرتی تھی۔

اذیت میں مبتلا حیدر اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ دروازے کو ہلکا سا کھٹکا کر مرینہ اندر آ گئی۔ حیدر نے دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ مرینہ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

مرینہ قریب آ کے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کچھ کہنے سے پہلے ہی حیدر سے بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس وقت وہ بہت مشتعل نظر آ رہی تھی۔ حیدر نے اسے ایسی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" وہ قریب ہی بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈی کی طبیعت......"

"وہ ٹھیک ہیں۔" مرینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں دس بجے کے قریب اٹھی تھی تو فون کر کے ان کی خیریت معلوم کر لی تھی۔ پھر میں اسپتال چلی گئی تھی۔ دراصل میں جاننا چاہتی تھی کہ ڈیڈی کی حالت کے بارے میں کوئی بات مجھ سے چھپائی تو نہیں جا رہی ہے۔ ڈاکٹروں سے باتیں کر کے مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرا اندیشہ درست نہیں تھا۔ اس کے بعد میں گھر لوٹ آئی اور خدا کا شکر ہے کہ بہت بروقت لوٹی۔"

"بروقت...... کیا مطلب؟"

مرینہ چپ رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ بتاتے ہوئے تذبذب کا شکار ہو۔ حیدر کو اس پر بھی حیرت ہوئی۔ مرینہ اس کے سامنے ہمیشہ بہت دبنگ رہتی تھی۔

"پندرہ منٹ پہلے بھی میں نے فون کیا تھا۔" وہ کچھ توقف سے بولی۔ "ڈیڈی کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔"

حیدر کی حیرت میں کمی نہیں آئی۔ مرینہ اس سے جو بات کہہ رہی تھی اس کے لیے اس کو اتنا متذبذب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یقیناً بات کچھ اور تھی جو ابھی اس کی زبان پر نہیں آئی تھی۔ اس نے پہلے کبھی اس کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا اور اس وقت اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہ بھی حیدر نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

"میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں حیدر!" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

حیدر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مرینہ بھی کسی بات پر اس سے معافی مانگے گی۔

"کس بات کی معافی مرینہ؟" وہ حیرت سے بولا۔

"اپنے رویے کی۔" مرینہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ "میرے اندر نہ جانے کون سی روح گھس آئی تھی کہ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر مجھے لذت حاصل ہوتی تھی۔ یہ تم جانتے ہی ہو کہ میں ایک ناجائز بچے کی ماں ہوں لیکن ماں بننے میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں شاید پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ مجھے اس شخص سے شدید نفرت ہے جس کی وجہ سے ماں بنی۔ اس کم بخت نے مجھے بالکل بے بس کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں ستم کا شکار ہونے ہی کی وجہ سے اذیت رساں بن گئی تھی۔ صرف اس شخص سے انتقام لینے کے بجائے میں ساری دنیا سے اپنی بربادی کا انتقام لینے پر تل گئی تھی۔ خصوصاً مردوں سے میری نفرت انتہائی درجے پر پہنچ گئی تھی۔ تمہارے ساتھ میرا رویہ اسی باعث ایسا تھا۔ میرے اندر جو ایک بری روح گھس گئی تھی وہ آج اچانک میرے جسم سے نکل گئی ہے شاید...... جب میں نے ایک لڑکی پر اس درندگی کا مظاہرہ دیکھا جس درندگی نے مجھے تباہ کیا تھا۔"

وہ بول رہی تھی اور حیدر اس کا منہ تکتا ہوا خاموشی سے سن رہا تھا۔

"میری بروقت دخل اندازی سے وہ لڑکی اس درندگی کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئی ورنہ وہ لڑکی کوئی اور نہیں...... تمہاری بہن جمیلہ ہے۔"

"کیا!" حیدر اچھل پڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور سارا واقعہ دہرا دیا۔

حیدر نے وہ سب کچھ حیرت اور غصے کے عالم میں سنا۔ اسے غصہ اجو پر آیا تھا اور حیرت اس پہ تھی کہ مرینہ کو اس کے اور مہرو کے رشتے کا علم تھا۔ حیدر اس بارے میں سوال ضرور کرتا لیکن مرینہ نے خود ہی بتا دیا کہ اس کا علم اسے حیدر کے پیچھے گھومتے ہوئے ایک گروپ فوٹو کو دیکھ کر ہوا تھا۔

"اب وہ لوگ کہاں ہیں؟" حیدر نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "میں نے سرونٹ کوارٹرز میں تالا لگا ہوا دیکھا تھا۔"

"اب اس سرونٹ کوارٹر میں دوسرے ملازم آ گئے ہیں۔ فی الحال میں نے تمہارے والدین کو گیسٹ روم دے رکھا ہے۔ وہ تینوں وہاں ہیں۔ تم جا کر ان سے مل سکتے ہو لیکن اس سے پہلے کہ تم ان سے ملنے جاؤ میری ایک اہم بات سن لو۔"

مرینہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ حیدر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر تم جاذب کے بچے کی ماں کے شوہر بن کر نہیں رہنا چاہتے تو مجھے طلاق دے دو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی کر کے تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔"

حیدر کچھ نہیں بول سکا۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ مرینہ کے خلاف اس کے جو جذبات تھے وہ ختم سے ہو چکے تھے۔ وہ مرینہ سے ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسے ایک مظلوم عورت نظر آنے لگی تھی۔

وہ بولی۔ "اگر تم فوری طور پر جواب نہیں دے سکتے تو میں اس کے لیے اصرار نہیں کروں گی۔ تم سوچ سمجھ لو۔"

"نہیں مرینہ!" حیدر نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "اگر تم مجھے واقعی ایک شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے تیار ہو تو میں تمہیں ہرگز طلاق نہیں دوں گا۔ تم نے میری بہن کو بچا کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس کے علاوہ آج تم مجھے ایک مظلوم عورت نظر آ رہی ہو۔"

مرینہ نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ "یقیناً تم ایک اچھے انسان ہو۔ مظلوموں سے ہمدردی صرف اچھے ہی انسان کر سکتے ہیں۔ اب تم مجھے ایک بہت بدلی ہوئی مرینہ پاؤ گے۔ آج سے ہم ایک ہی خواب گاہ میں سوئیں گے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی تو "آپ" دیدی گی۔ وہ حیدر کے سینے سے لگ گئی۔ "مستقبل میں مجھے شاید تمہارے تعاون کی ضرورت پڑے۔ میں نے شاید کہا ہے یہ ضروری نہیں ہے۔"

"تم ہر حال میں مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی۔" حیدر نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے جس سے..."

"ابھی کوئی سوال نہ کرو۔" مرینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مناسب وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ میں تمہیں بتا دوں گی۔ بس ایک وعدہ کرو مجھ سے۔ اب تم اس کال گرل سے کبھی نہیں ملو گے۔"

"میں اسی وقت لعنت بھیجتا ہوں اس پر۔"

مرینہ اس کے سینے سے الگ ہوئی اور اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔ "جاؤ، اب تم جا کر اپنے والدین اور بہن سے ملو۔ ان سے یہ بھی کہنا کہ میں ان سے اپنے رویے پر معافی کی خواستگار ہوں۔"

حیدر نے کچھ کہنا چاہا لیکن مرینہ نے بڑی محبت سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے بولنے سے روک دیا۔

"جاؤ۔" وہ بولی۔ "مل لو ان لوگوں سے جا کر۔"

حیدر اس کمرے سے نکل کر بڑی تیزی سے گیسٹ روم کی طرف روانہ ہوا۔ گیسٹ روم کے کئی کمرے تھے۔ مگر اسے اپنے والدین اور بہن کو تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

"بھیا!" مہرو جیسے تڑپ کر اٹھی اور حیدر کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

"سب ٹھیک ہو گیا ہے اب۔" حیدر نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "مرینہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

اس وقت حیدر اپنے والدین سے نظریں چرا رہا تھا۔

دوسرے کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ اونچی ایڑی کے سینڈل فرش پر بج رہے تھے۔ حیدر کچھ گیا کہ وہ مرینہ ہے۔

"حیدر!" مرینہ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

حیدر مہرو کو چھوڑ کر تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھلا۔ مرینہ اندر آ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتے بچے۔

"میرے ساتھ چلو حیدر!" مرینہ نے کہا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ حیدر کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

حیدر کو شبہ ہوا کہ شاید جاذب فاروقی کا انتقال ہو گیا ہے۔ بنگلے سے نکل کر کار تک پہنچتے پہنچتے حیدر کے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ مرینہ نے روتے ہوئے بتایا کہ ابھی ابھی اسے فون پر اطلاع ملی تھی کہ جاذب فاروقی کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی اور اس سے پہلے کہ انہیں اسپتال لے جایا جا سکتا، ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اس وقت کار کی ڈرائیونگ سیٹ حیدر نے سنبھالی ہوئی تھی۔ مرینہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ڈرائیو کر سکتی۔ وہ جاذب ہاؤس پہنچے۔ وہاں آہ و بکا مچی ہوئی تھی۔ سبھی رو رہے تھے۔ شارب فاروقی، اس کے بیوی بچے، انور اور افسر کی ماں،

خود انور اور افسر بھی۔ افسر اس وقت تک گھر سے نہیں گیا ہوگا جب جاذب فاروقی کا انتقال ہوا تھا۔ اسے حیدر نے انور سے زیادہ اشک بار دیکھا۔

مرینہ روتے ہوئے جاذب فاروقی کی چادر سے ڈھکی لاش پر گر پڑی لیکن افسر اور انور کی ماں نے اسے سنبھال لیا۔

☆☆☆

شام کو جاذب فاروقی کی تدفین کر دی گئی۔ حیدر اور مرینہ رات گئے اپنے گھر لوٹے۔ مرینہ بہت نڈھال تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ حیدر نے اسے بستر پر لٹانے کے بعد آہستہ سے کہا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔ اماں ابا کو بتا آؤں کہ آج کیا ہوا ہے۔"

مرینہ نے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

حیدر وہاں سے نکل کر گیسٹ روم میں جا پہنچا۔ وہ تینوں ابھی جاگ رہے تھے۔ انہیں حیدر کا انتظار تھا۔ حیدر نے ماں باپ کے قدموں پر گر کر ان سے معافی مانگی کہ اس کی نظروں کے سامنے وہ لوگ اس گھر کے ملازم بنے رہے اور وہ خاموشی اختیار کیے رہا۔

"اب ہمیں یہ سب باتیں بھول جانا چاہیے۔" عدیل احمد نے سنجیدگی سے کہا۔ "مرینہ اب بالکل بدل گئی ہے۔ جس کے سلسلے میں ہم اس کے احسان مند ہو چکے ہیں۔"

اس وقت حیدر نے نظریں جھکا لیں۔

حیدر ان سے چند اور باتیں کر کے کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے مہرو بھی باہر آ گئی۔ حیدر نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"ہاں بھیا!" مہرو نے آہستہ سے کہا۔ "بھابی میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی ہیں لیکن ماضی میں ان سے ایک غلطی ہو چکی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ آپ کو بھی ان کی اس غلطی کا علم ہو گا۔"

حیدر نے چونک کر کہا۔ "کس غلطی کی بات کر رہی ہو تم؟"

"آپ نہیں جانتے کچھ؟" مہرو نے پوچھا۔

حیدر سوچ میں پڑ گیا کہ مہرو کو اس کا علم کیسے ہو گیا۔

وہ بولی۔ "شاید آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو گا کہ مجھے اس کا علم کیسے ہو گیا۔ اب تو میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس غلطی کا نتیجہ اس وقت کہاں ہے؟"

"کہاں ہے؟" حیدر نے جلدی سے پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"ہاں۔ یہ بات مرینہ نے مجھ سے بھی چھپائی ہے۔"

"وہ بچہ شیخ کی گود میں پرورش پا رہا ہے۔ میری ایک دوست تھی، وہ اور میں، وہ شادی ہو کر یہیں آئی تھی۔ کل میں اس سے ملنے اس کے گھر گئی تھی۔"

مہرو نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اسے شیخ سے معلوم ہوا تھا۔

سب کچھ بتانے کے بعد حیدر نے پوچھا۔ "تم نے اماں اور ابا کو بھی بتا دیا ہو گا؟"

"نہیں ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا۔"

حیدر نے اطمینان کی سانس لی۔ "بتانا بھی مت۔ اس طرح تمہاری دوست کی طرف سے بھی مرینہ کا راز کھلا ہو گا۔ میں تم کو اس وقت صرف اتنا ہی بتاؤں گا کہ اس معاملے میں تمہاری بھابی ایک مظلوم عورت ہے۔"

حیدر نے مہرو کو واپس بھیجنا چاہا تھا کہ عدیل احمد اور قدسیہ باہر آ گئے۔

عدیل احمد نے حیدر سے کہا۔ "ابھی تمہاری ماں کہہ رہی تھیں کہ ہمیں تمہاری بیوی سے تعزیت تو کرنا چاہیے۔"

حیدر نے سر ہلایا۔ "مناسب تو یہی ہو گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ سب مرینہ کے کمرے میں پہنچے۔ مرینہ بستر پر بیٹھی چھت کو تک رہی تھی اور چہرہ بے حد اداس نظر آ رہا تھا۔ اس نے عدیل احمد اور قدسیہ کو دیکھ کر اٹھنا چاہا۔

"لیٹی رہو بیٹی۔" قدسیہ نے تیزی سے اس کے قریب جا کر اسے دوبارہ لٹا دیا کیونکہ وہ بستر پر بیٹھ چکی تھی۔

جب قدسیہ اور عدیل احمد نے اس سے اس کے باپ کی تعزیت کی تو اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ قدسیہ بستر پر بیٹھ کر بڑی محبت سے اس کا سر دبانے لگی۔

ذرا دیر بعد حیدر کے اشارے پر وہ تینوں کمرے سے چلے گئے۔ حیدر، مرینہ کے پہلو میں لیٹ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ دونوں بستر پر ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوئے۔

حیدر نے اس سے کہا۔ "میرا خیال ہے، کم از کم سوئم تک تمہیں جاذب جیلس میں رہنا چاہیے تھا۔"

"میں وہاں نہیں رہ سکتی حیدر!" مرینہ نے آہستہ سے کہا۔ "وہ کتا اسی گھر میں رہتا ہے جس نے میری زندگی داغدار کی ہے۔"

"میرا خیال ہے، آج تم مجھے بتا دو گی کہ وہ کون ہے۔"

"نہیں۔" مرینہ نے کہا۔ "ابھی نہیں بتاؤں گی لیکن وہ وقت غالباً قریب آ گیا ہے جب تم سب کچھ جان لو گے۔"

حیدر چپ ہو گیا۔

"ہاں اتنا میں ضرور بتا سکتی ہوں کہ میں نے اپنے بچے کی پرورش ایک اچھی عورت سے کرا دی ہے۔"

حیدر نے اس عورت کے بارے میں نہیں پوچھا۔ حیدر سے بتا چکی تھی۔

"ابھی۔" مرینہ نے کہا۔ "جاذب جیلس سے آتے ہوئے میں نے تم سے اپارٹمنٹس کی ایک عمارت کے سامنے کار رکوائی تھی۔ میں تمہیں کار ہی میں چھوڑ کر اس عمارت کے اپارٹمنٹ میں گئی تھی۔ وہ عورت وہیں رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں آج میں اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے بہت بے قرار ہو گئی تھی۔ میں اسے صرف پانچ منٹ اپنی گود میں لیے بیٹھی رہی اور پھر واپس آ گئی۔ تم نے مجھ سے یہ پوچھا بھی تھا کہ میں کہاں گئی تھی لیکن میں نے تمہیں جواب نہیں دیا۔ میں الٹی گئی۔ شاید تم نے سوچا ہو کہ وہاں ریحان رہتا ہو گا مگر یقین کرو حیدر، جو ساتھ مجھ پر گزرا تھا اس کے بعد میں ریحان سے کبھی نہیں ملی لیکن اب شاید وقت آ گیا ہے کہ مجھے اس سے ملنا ہو گا۔ تمہیں ہو سکتا ہے یہ یاد ہو کہ میں نے تمہیں اس کال کرنے سے ملنے سے روک دیا ہے مگر خود اب بھی ریحان سے ملنا چاہتی ہوں۔ نہیں حیدر! اب اس سے ملاقات میری چاہت کی وجہ سے نہیں، صرف ایک ضرورت کی وجہ سے ہو گی اور وہ ریحان سے میری آخری ملاقات ہو گی۔ اب جبکہ میں نے طے کر لیا ہے کہ میں ایک اچھی بیوی بنوں گی اور اپنی زندگی تمہارے ہی ساتھ گزاروں گی تو پھر اس بات کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا کہ میری زندگی میں ریحان کا عمل دخل رہے۔" مرینہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولتی چلی گئی۔

"آج تم پہلی مرتبہ میرے اتنے قریب لیٹے ہوئے ہو۔ میں چاہوں گی کہ ابھی اس سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ ابھی تم میرے شوہر نہیں ہو۔"

حیدر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" مرینہ نے کہا۔ "جب ہمارا نکاح ہوا تھا میں حاملہ تھی اس لیے وہ نکاح نہیں، صرف ایک دھوکا تھا جو معاشرے کو دیا گیا۔"

حیدر نے ایک طویل سانس لی۔ مرینہ کی بات غلط نہیں تھی۔

مرینہ پھر بولی۔ "چند ماہ انتظار کرو۔ پھر خفیہ طور پر نکاح کر لیں گے۔"

"لیکن تمہیں ریحان سے محبت ہے۔"

مرینہ چند لمحے خاموش رہی، پھر جذباتی سے انداز میں بولی۔ "میں اس کوشش میں ہوں کہ میں تمہیں اتنا چاہوں کہ اسے بھول جاؤں۔"

حیدر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ مرینہ کی شخصیت میں ایک انقلاب آ چکا تھا۔

موبائل فون کی گھنٹی نے مرینہ کو چونکا دیا۔ اس نے موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا وہ اس نے اٹھایا۔ اسکرین پر اس نے کوئی آئی ڈی دیکھ کر چونک پڑی اور پھر اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ دوسری طرف سے بولنے والے شخص کی آواز حیدر کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی نظریں مرینہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف کی بات سنتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ بار بار بدلتا رہا تھا۔

"میں فوراً آ رہی ہوں۔" آخر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ فوراً بستر سے اٹھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

☆☆☆

جس وقت مرینہ نے وہ کال ریسیو کی تھی، اس سے شاید دس منٹ پہلے تاج اور شمع بستر پر لیٹے فکرمندی سے باتیں کر رہے تھے۔ بچہ شمع کے پہلو میں سو رہا تھا۔

"ہاں تاج!" شمع ٹھنڈی سانس لے کر کہہ رہی تھی۔ "وہ بڑی ہمت سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ باپ کے مرنے پر کوئی بھی لڑکی خود کو آسانی سے سنبھال نہیں سکتی۔ اس وقت اس کی ذہنی حالت نہ جانے کیا ہو گی کہ وہ اپنے بچے کو دیکھنے آ گئی۔"

"اور صرف پانچ منٹ بعد چلی گئی۔"

تاج اور شمع، مرینہ ہی کے آنے کی وجہ سے جاگ رہے تھے۔ ورنہ وہ اسی وقت سو رہے ہوتے۔ گیارہ بجے تک انہیں نیند آ جاتی تھی لیکن اس وقت وہ جاگ رہے تھے جبکہ ایک بج چکا تھا۔

کال بیل کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

"اب کون آ گیا!" تاج کے منہ سے نکلا۔

"صوفیہ دیکھ لے گی۔" شمع نے کہا۔

صوفیہ کا کمرا بیرونی دروازے کے قریب ہی تھا۔

"کہیں مرینہ ہی نہ ہو۔" تاج بولا۔ "شاید اسے کچھ یاد آ گیا ہو، وہ تم سے کچھ کہنے آئی ہو۔"

"اب اتنی دیر بعد اسے کیا یاد آیا ہو گا۔ وہ تو بہت دیر پہلے اپنے گھر بھی پہنچ چکی ہو گی اور اگر اسے کوئی خاص بات یاد آئے گی بھی تو وہ فون کرے گی۔ نہ کہ پھر اتنی دور آئے گی۔"

"پھر کون ہو سکتا ہے۔" تاج کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔

شمع کے پہلو میں بچہ کسمسایا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

تاج بستر سے اٹھا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

کال بیل دوبارہ نہیں سنائی دی تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ صوفیہ نے دروازہ کھول دیا ہو گا۔

بچے کو تھپک کر شمع نے تاج کی طرف دیکھا اور منہ بنا کر بولی۔ "اب تمہیں سونا چاہیے اور آپ نے سگریٹ سلگا لی۔"

"کوئی آیا ہے تو دیکھ تو لیں کون ہے۔"

"اب کوئی نہیں ہو گا۔ کسی نے کسی اور اپارٹمنٹ کے دھوکے میں ہمارے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجا دی ہو گی۔"

اسی وقت دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔ پھر صوفیہ کی آواز سنائی دی۔ "بیگم صاحب!" اس کی پکارتی ہوئی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

تاج چونکا۔ "یہ تو کچھ گھبرائی ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔"

"آپ دیکھیے۔" شمع بھی فکرمند نظر آئی۔

تاج جلدی جلدی سگریٹ کے کش لیتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور پھر بوکھلا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

باہر سے کسی نے صوفیہ کو دھکا دیا اور وہ کمرے میں آ گری۔ اس کا سر فرش سے اس طرح ٹکرایا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے تیزی سے دو آدمی اندر آ گئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ چہرے سے ہی وہ برے آدمی معلوم ہو رہے تھے۔ ایک آدمی نے چمڑے کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ دوسرا آدمی اجرک اوڑھے ہوئے تھا۔

اجرک والے کے ریوالور کا رخ تاج کی طرف تھا۔ جیکٹ والے کے ریوالور کی نال شمع کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اس صورت حال نے شمع کو بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ بوکھلا کر بستر سے نیچے اتر آئی تھی۔

جیکٹ والے نے اجرک والے سے کہا۔ "تم جلدی سے بچے کو اپنے قبضے میں کرو۔"

اجرک والا بستر کی طرف بڑھا۔

"نہیں۔" شمع خوف زدہ ہونے کے باوجود اس کے سامنے آ گئی۔ "تم میرے بچے کو نہیں لے جا سکتے۔"

"تمہارا بچہ!" جیکٹ والا غرایا۔ "ہمیں ہر قیمت پر چاہیے۔"

تاج ساکت اور منہ کھولے اس طرح کھڑا رہ گیا تھا جیسے اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔

اپنے اور بستر کے بیچ میں آ جانے والی شمع کو اجرک والے نے ایک طرف دھکا دینا چاہا تھا کہ کہیں قریب ہی سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس آواز نے ان دونوں بدمعاشوں کو چونکا دیا۔

"مجرو نے تو کسی پر گولی نہیں چلا دی؟" اجرک والے کے منہ سے نکلا۔ یہ بات اس نے جیکٹ والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی۔

"تم جلدی سے جا کر دیکھو۔" جیکٹ والے نے کہا۔

"میں بچے کو لے کر آتا ہوں۔"

اجرک والا تیزی سے چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

شمع نے جلدی سے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بچہ میرے حوالے کر دو۔" جیکٹ والے نے تیزی سے کہا۔ "میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ وہ ہر ایک گولی چل چکی ہے۔ اب ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ لاؤ بچہ۔"
جیکٹ والا آگے بڑھا۔

"نہیں۔" شمع پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔"

"نہیں دو گی تو میں تمہیں گولی مار کر بچہ لے لوں گا۔" جیکٹ والے نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"مار دو گولی!" شمع نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "بچہ تم مجھ سے نہیں لے سکتے۔"

تاج محسوس کر رہا تھا کہ جیکٹ والا اس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔

"شمع!" تاج بہ مشکل بول سکا۔ "بچہ دے دو۔ یہ بہت سفاک لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تمہیں واقعی گولی مار دے گا۔"

"مار دے۔ مار دے مجھے!" شمع دہشت زدہ سی نظر آنے لگی تھی اور اس کی نظریں جیکٹ والے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اسی دہشت زدگی میں بولی۔ "میری زندگی میں تم مجھ سے میرا بچہ نہیں چھین سکتے۔"

"تو پھر مرو۔" جیکٹ والے نے دوبارہ دانت پیسے۔

اس مرتبہ اس کا انداز ایسا تھا جیسے بس اب گولی چلا دے گا۔ تاج اس وقت اپنی جان پر کھیل کر اس پر چھلانگ لگا دینا چاہتا تھا۔ مگر اسی وقت ایک گولی چلنے کی آواز ابھری۔

اس بار جیکٹ والا بری طرح بوکھلا گیا۔ "کیا ہو رہا ہے یہ!" وہ بڑبڑایا۔ پھر وہ ان سب کی طرف منہ کیے اور انہیں اپنے ریوالور کی زد میں لیے ہوئے الٹے قدموں دروازے کی طرف جانے لگا۔ "خبردار جو کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔" اس نے دھمکی دی۔

شمع آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہوئے باتھ روم کے قریب پہنچ گئی۔ غالباً اس نے سوچا تھا کہ خود کو اور بچے کو بچانے کے لیے باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کر لے گی۔

جیکٹ والا الٹے قدموں چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی دروازے کو بھیڑتا ہوا باہر گیا تھا۔ جیکٹ والے نے ایک ہاتھ پیچھے کر کے دروازے کا ایک پٹ کھولا اور اپنا نصف دھڑ پیچھے کی طرف جھکاتے ہوئے باہر دیکھنا چاہا۔ اسی وقت ایسا لگا جیسے اس کے سارے جسم کو برقی جھٹکا لگا ہو۔ ایک پل پہلے گولی چلنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ جیکٹ والا اس طرح گرا کہ اس کا آدھا جسم کمرے کے باہر اور آدھا اندر تھا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ گولی اس کی گردن کے آر پار ہو گئی تھی۔

ایک خوب صورت نوجوان اس کے تڑپتے ہوئے جسم کو پھلانگ کر کمرے میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"شکر ہے کہ تم سب لوگ خیریت سے ہو۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "اور یہ بچہ بھی۔" اس نے شمع کی گود میں موجود بچے کی طرف دیکھا۔

تاج اور شمع اس نوجوان کو دیکھ رہے تھے جو ان کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ "تم لوگوں کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں مرینہ کے بچے کو بچانے کے لیے آیا تھا۔ یہ تینوں بدمعاش میرے ہی ہاتھوں مارے گئے ہیں۔" نوجوان نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کی طرف دیکھا اور پھر وہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"تم... تم... کون... کون ہو؟" شمع ہکلائی۔

"یہ تمہیں مرینہ سے معلوم ہو جائے گا۔" نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں دس بارہ منٹ پہلے مرینہ کو فون کر چکا ہوں۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ سات آٹھ منٹ میں یہاں پہنچ جائے گی۔"

"وہ دو لاشیں کہاں پڑی ہیں؟" تاج نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

نوجوان نے جواب دیا۔ "ایک تو تمہارے سامنے ہی پڑی ہے۔"

جیکٹ والے کا تڑپتا ہوا جسم اب ساکت ہو چکا تھا۔

"دوسری فلیٹ کے دروازے پر، لیکن فلیٹ کے اندر گری پڑی ہے۔" نوجوان نے مزید بتایا۔ "تیسری باہر ہے۔ وہ کم بخت مجھے اندر آتے دیکھ کر مجھے گولی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا بلکہ وہ ہی مجھے گولی مار دیتا، اگر میں نے پہل نہ کی ہوتی تو۔"

"تم مرینہ کا انتظار نہ کرو۔" شمع جلدی سے بولی۔ "وہ آئے گی تو ہم اسے سب کچھ بتا دیں گے۔ گولیاں چلنے کی آوازیں عمارت میں کسی نے تو سنی ہوں گی۔ کسی گھر سے پولیس کو فون کیا جا چکا ہوگا۔ پولیس کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتی ہے۔ تمہیں جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

"نہیں۔" نوجوان نے اطمینان سے کہا۔ "میں مرینہ کے محسنوں کو مصیبت میں پھنسا کر نہیں جاؤں گا۔"

"ہمارے لیے کیا مصیبت ہو سکتی ہے؟"

"یہ لاشیں۔" نوجوان نے کہا۔ "تم لوگ پولیس کو کیا بتاؤ گے۔ ان تینوں کو کس نے ہلاک کیا ہے؟"

شمع کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اس پہلو پر غور کیے بغیر ہی نوجوان کو فرار ہو جانے کا مشورہ دے ڈالا تھا۔

"میں سمجھاتا ہوں تم لوگوں کو۔" نوجوان پھر بولا۔ "تم لوگ پولیس کو یہ بیان دو گے کہ یہ لوگ ڈاکے کی غرض سے آئے تھے اور انہیں میں نے ہلاک کیا ہے۔ یہ مت بتانا کہ میں کون ہوں۔" وہ ٹھہرا۔ "تم لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہے کہ میں کون ہوں۔ پھر یہ میرا کام ہے کہ میں پولیس کو کیا بیان دوں۔ بچے کا ذکر تم لوگ نہ کرنا، وہ میں کروں گا۔"

اس وقت فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی صوفیہ کلبلائی۔

"شاید اسے ہوش آ رہا ہے۔" تاج جلدی سے بولا۔

نوجوان بولا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کون ہے اور کیوں بے ہوش ہو گئی ہے۔ کیا ہوا ہے؟"

تاج نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور وہ بول پڑا۔ اس نے مختصر طور پر صوفیہ کے بارے میں بتا دیا۔

"یہ تو نہیں جانتی ہوگی کہ یہ بچہ مرینہ کا ہے؟" نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں، اسے نہیں معلوم۔"

"تو پھر اچھا ہی ہوا کہ یہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس نے ہماری باتیں نہیں سنیں۔" نوجوان نے کہا۔

صوفیہ پلکیں جھپکتے ہوئے دھیرے دھیرے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شمع نے بچے کو بستر پر لٹا دیا اور لپک کر صوفیہ کے قریب پہنچی۔

"تم ٹھیک تو ہو صوفیہ؟"

صوفیہ اس کی آواز سنتے ہی بوکھلائے ہوئے سے انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظریں دروازے پر پڑی لاش کی طرف گئیں تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔" شمع نے اس کی ڈھارس بندھانے کے لیے اس کی پیٹھ تھپکی لیکن ہوائیاں اس کے چہرے پر بھی اڑ رہی تھیں۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کے اور تاج کے لیے بھی انتہائی غیر معمولی اور غیر متوقع تھا۔

اس وقت نیچے سڑک سے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔

"پولیس آ گئی۔" شمع نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بوکھلائے سے انداز میں کہا۔

"اسے تو آنا ہی تھا۔" نوجوان سنجیدگی سے بولا۔ "ایک لاش تمہارے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پڑی ہے۔ پولیس وہ لاش دیکھتے ہی تمہارا دروازہ پیٹ ڈالے گی۔"

لیکن اسی وقت دروازہ پیٹے جانے کی آوازوں سے پہلے شمع کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ شمع نے لپک کر ایک جگہ رکھا ہوا موبائل اٹھا کر اپنے کان سے لگایا۔

"شمع!" مرینہ کی پریشان آواز سنائی دی۔

"ہاں ہاں۔" شمع جلدی سے بولی۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں تمہارے گھر کے دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی ہوں۔ یہاں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ تم تو خیریت سے ہو؟" دوسری طرف سے جلدی جلدی کہا گیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آ رہی ہوں دروازہ کھولنے۔" شمع نے تیزی سے دروازے کی طرف لپکتے ہوئے کہا لیکن پھر لاش کی وجہ سے ٹھٹک کر رک گئی۔

"میں جاتا ہوں۔" تاج نے کہا۔

وہ لاش پھلانگ کر بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

نوجوان ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "یہ اچھا ہوا کہ پولیس سے پہلے مرینہ آ گئی۔ مجھے اس سے دو ایک باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

صوفیہ حیرت سے کبھی شمع کی طرف اور کبھی نوجوان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس سارے ہنگامے کے دوران میں مرینہ کا بچہ سوتا ہی رہا تھا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ اس کمرے کے دروازے ہی پر پہلے والی گولی کا دھماکا بھی اسے نہیں جگا سکا تھا۔ اگر وہ جاگ جاتا تو وہ بھی شور مچا کر رو دیتا اور شمع کے لیے مشکل ہو جاتی۔

مرینہ جب گھبرائی ہوئی وہاں آئی تو اس کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔

☆☆☆

اگر کوئی اور مرینہ کے ساتھ ہوتا تو وہ حیدر ہی ہو سکتا تھا لیکن وہ اس وقت مرینہ کے بنگلے ہی میں تھا اور کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مرینہ اپنے موبائل پر کسی کی کال ریسیو کرنے کے بعد نہایت پریشانی اور حواس باختگی کے عالم میں کہیں چلی گئی تھی۔ حیدر نے اس سے بار بار جاننے کی کوشش کی تھی کہ معاملہ کیا ہے لیکن اس نے اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ وہ واپس آ کر بتائے گی۔

حیدر بھی کمرے میں ٹہل رہا تھا، تھک جاتا تو کسی کرسی یا بستر پر بیٹھ جاتا۔ وہ زیادہ پریشان اس لیے تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرینہ بھی پریشانی ہی میں گھر سے گئی تھی۔ اسے موبائل فون پر یقیناً کسی غیر معمولی واقعے کی اطلاع ملی تھی۔ جاذب فاروقی کی زندگی میں حیدر سوچ سکتا تھا کہ مرینہ کو ملنے والی کوئی بری اطلاع شاید اس کے باپ کے بارے میں ہو لیکن جاذب فاروقی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس لیے حیدر یہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ مرینہ کو کس بارے میں کیا اطلاع ملی ہوگی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد اس کے موبائل پر مرینہ کی کال آئی تو اس نے بڑی جلدی میں ریسیو کی۔

"کہاں ہو مرینہ؟" اس نے بے چینی سے سوال داغ دیا اور پھر فوراً ہی دوسرا سوال۔ "تمہیں آخر کیا اطلاع ملی تھی؟"

"میں اس وقت ایک پولیس اسٹیشن میں ہوں۔ دراصل..."

"پولیس اسٹیشن!" حیدر گویا اپنی جگہ سے اچھل گیا۔ "کیوں؟"

"سکون سے میری پوری بات سنو! میں نے یہی بتانے کے لیے تو تمہیں فون کیا ہے۔ دراصل تین بدمعاشوں نے میری دوست شیخ کے گھر میں ڈاکا مارا تھا۔" پھر وہ بے قریب موجود کسی سے مخاطب ہوئی۔ "ایک منٹ! میں ابھی بیان ریکارڈ کروا رہی ہوں۔"

حیدر سمجھ گیا کہ وہ کسی پولیس آفیسر سے مخاطب ہوئی تھی۔

مرینہ حیدر سے مخاطب ہوئی۔ "میں نے تمہیں صرف اس لیے فون کیا ہے کہ تمہیں اپنی خیریت سے آگاہ کر دوں۔ تم یقیناً پریشان ہو گے۔ میرے پولیس اسٹیشن میں ہونے کی وجہ سے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یہاں گرفتار نہیں کیا جا رہا ہے۔ مجھے اپنا بیان ریکارڈ کروانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں گھنٹا بھر کے اندر گھر واپس آ جاؤں گی۔"

"ڈاکو گرفتار ہو گئے؟" حیدر نے جلدی سے پوچھا۔

"مارے جا چکے ہیں۔" مرینہ نے جواب دیا۔ "اچھا اب میں بند کر رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

مرینہ نے اگرچہ اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے فون کیا تھا لیکن اس کی ادھوری باتوں سے حیدر کی پریشانی اور بڑھ گئی تھی۔ پہلے وہ بے خبری کی وجہ سے پریشان تھا، اب اس کی یہ بے معنی باخبری اس کے لیے پریشان کن تھی۔

شیخ کے گھر میں! اور جہاں مرینہ کے بچے کی پرورش ہو رہی تھی۔ یہ اطلاع ایسی نہیں تھی کہ حیدر کی پریشانی دور ہو جاتی۔ وہ اسی عالم بے قراری میں ٹہلتا رہا...... اور کبھی بیٹھ جاتا۔

کوئی پون گھنٹے کے بعد اس نے پھر مرینہ کی کال ریسیو کی۔ "میں اب پولیس اسٹیشن سے روانہ ہو چکی ہوں۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "پولیس اسٹیشن سے میں نے جب تمہیں فون کیا تھا تو میں وہاں اکیلی نہیں تھی اس لیے تمہیں اصل بات نہیں بتا سکی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ان بدمعاشوں نے شیخ کے گھر سے میرے بچے کو اغوا کرنا چاہا تھا۔"

"اوہ!" حیدر کے منہ سے نکلا۔

"شکر ہے کہ میرا بچہ محفوظ رہا۔ اب اس کی حفاظت کا بے حد خیال رکھا جائے گا اور غالباً چند گھنٹے بعد اس کی حفاظت ضروری نہیں رہے گی۔ میری یہ بات تم شاید نہ سمجھو لیکن آج ہی تم پر وہ سب کچھ آشکار ہو جائے گا جو تم جاننا چاہتے ہو۔ میں تمہیں شاید اس بات سے بے خبر ہی رکھتی لیکن حالات بدل چکے ہیں۔ اب میں تم کو بتا سکتی ہوں۔"

مرینہ کے آخری فقرے نے حیدر کو چونکا دیا اور اس کے منہ سے "شکریہ" کا لفظ نکلتے نکلتے رہ گیا۔

مرینہ نے اس کے کسی جوابی فقرے کا انتظار نہیں کیا اور بولی۔ "جب میں گھر سے چلی تھی تو تم شب خوابی کے لباس میں تھے۔ تم فوراً تیار ہو جاؤ۔ میں بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گی۔ تم مجھے تیار ملنا۔ میں کار بنگلے کے اندر نہیں لاؤں گی۔ پھاٹک کے باہر ہی روک دوں گی کیونکہ ہمیں فوراً ہی یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گی کہ آ گئی ہوں۔ تم باہر آ جانا۔ میرا مطلب ہے پھاٹک کے باہر۔"

"اس وقت کہاں جانا ہے؟" حیدر نے حیرت سے کہا۔

رات تقریباً گزر چکی تھی۔ پانچ بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔

مرینہ بولی۔ "سوالات میں وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

حیدر کا دماغ الجھتا ہی چلا جا رہا تھا تاہم وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔ وہ پندرہ منٹ میں تیار ہو چکا تھا۔ تیار ہو کر پھر ٹہلنے لگا۔ اسے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ٹہلنا پڑا۔ مرینہ کی کال آ گئی۔

"کیا تم تیار ہو گئے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں تو پانچ منٹ سے ٹہل رہا ہوں۔"

"تو باہر آ جاؤ۔ میں پھاٹک کے باہر کار میں موجود ہوں۔"

"میں آ رہا ہوں۔" حیدر کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے موبائل اپنی جیب میں ڈالا اور باہر نکل آیا۔

بند پھاٹک کے قریب چوکیدار موجود تھا۔ اس کی نیند ایسی ہی تھی کہ وہ ذرا سی آہٹ پر جاگ جاتا تھا۔ اس کی آنکھ مرینہ کی کار کے انجن کی آواز سے کھلی اور وہ پھاٹک کھولنے کے لیے باہر نکل آیا لیکن مرینہ نے اسے پھاٹک کھولنے سے روک دیا۔

حیدر پھاٹک کے قریب پہنچا تو چوکیدار نے اسے سلام کیا۔ حیدر اشارے سے جواب دیتا ہوا پھاٹک کے ذیلی دروازے سے باہر نکلا۔

مرینہ کی کار کے اندر روشنی تھی۔ حیدر نے مرینہ کو ڈرائیونگ سیٹ پر ایستادہ دیکھا۔ اسے وہاں ایک کار اور بھی دکھائی دی تھی جو مرینہ کی کار کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کار کے اندر روشنی نہیں تھی، اس لیے حیدر نہیں دیکھ سکا کہ اس میں کون تھا۔

جب وہ مرینہ کی کار کا دروازہ کھول رہا تھا تو مرینہ انجن اسٹارٹ کرنے لگی تھی۔ حیدر نے اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ مرینہ کار حرکت میں لے آئی۔ حیدر نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ دوسری کار بھی حرکت میں آ چکی تھی۔

"ہمارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟" حیدر نے مرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

مرینہ نے زبان سے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر دکھائی دینے والے تاثرات ایسے تھے جنہیں تشویش ہی کہا جا سکتا تھا۔

"وہ ہے کون؟" حیدر نے پوچھا۔

"ریحان۔" مرینہ نے جواب دیا۔

یہ سن کر حیدر کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی ابھرا کہ مرینہ اس وقت کہاں جا رہی تھی اور جہاں بھی جا رہی تھی، وہاں اس نے ریحان کو اپنے ساتھ لے جانا کیوں ضروری سمجھا تھا۔

"کیا بات ہے؟" مرینہ بولی۔ "ریحان کا نام سن کر تم ایک دم چپ کیوں ہو گئے؟"

"نہیں تو۔ ایسی...... ایسے ہی......"

"بات ٹالنے کی کوشش نہ کرو حیدر!" مرینہ نے کچھ اداس لہجے میں کہا۔ "تم ابتدا ہی سے ریحان کے بارے

حیات کی تباہی

زمین کی پیدائش پر موجود حیات کی تباہی کے اسباب جو بتدریج وقوع پذیر ہو سکتے ہیں ان میں سے چند خاص کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔

(1) یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہمارا سورج توانائی کی بہت بڑی مقدار مسلسل خارج کر رہا ہے۔ اس کے اپنے اندر بھی ابھی خاصی توانائی پیدا ہو رہی ہے، لیکن اس کی مقدار خارج ہونے والی توانائی کی مقدار سے کم ہے۔ نتیجے میں سورج آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ایک زمانے کے بعد جو کہ کروڑوں سالوں پر محیط ہو سکتا ہے سورج کی حرارت میں اتنی کمی واقع ہو جائے گی کہ اس کی وجہ سے زمین پر حیات ممکن نہیں رہے گی۔

(2) ہم سب جانتے ہیں کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ سائنس دانوں کے خیال میں ایک دن کائنات کے پھیلنے کا عمل رک جائے گا اور پھر تمام ستارے سیارے ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے آئیں گے اور آخر کار ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے۔ یوں زمین کی تباہی بھی ان کے ساتھ ہو گی۔ ایک دوسرے سائنسی نظریے کے مطابق اگر یہ پھیلنے کا عمل جاری رہا تو ایک دن تمام کہکشائیں چل بجھیں گی اور ان کے ساتھ سیارے بھی محفوظ نہیں رہ سکیں گے اور زمین پر زندگی ممکن نہ ہوگی۔

(3) زمین کا مقناطیسی ہالہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے جو کہ زمین کو فلکی شعاعوں کی تباہی سے محفوظ رکھتا ہے۔ مقناطیسی ہالے میں واقع ہونے والی کمی بھی اس حد تک رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی کہ فلکی شعاعوں کی تابکاری کی یلغار سے زمین کو محفوظ نہیں رکھ سکے گی اور زمین پر زندگی ممکن نہ ہوگی۔

سید اظہر صدیقی کی کتاب

"ماورائے کہکشاں" سے اقتباس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سب کچھ جانتے ہو۔ پہلے تم ریحان کے بارے میں یقیناً اچھے جذبات نہیں رکھتے ہو گے لیکن اب جبکہ میں تمہارے ساتھ زندگی کے نئے موڑ کی طرف جانے کا فیصلہ کر چکی ہوں، ریحان کے بارے میں تمہیں منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔"

"میں نے کوئی منفی بات تو نہیں سوچی۔"

"اگر نہیں سوچی تو یہ بہت اچھا ہے۔ اب ایک طویل زندگی ہم دونوں کے سامنے ہے اس لیے ہم میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے تمہیں بتا بھی دیا تھا کہ میں اپنے بچپن میں ایک بچے کی آمد کے بعد ریحان سے بھی نہیں ملی۔ ہماری گفتگو صرف فون پر ہوتی تھی۔ بس یہ ایک موقع ایسا آ گیا ہے کہ ریحان سے میری دو ایک ملاقاتیں ضروری ہو گئی تھیں۔ میں نے تمہیں اس بارے میں بھی بتا دیا تھا کہ ان ملاقاتوں کے بعد میں ریحان سے اپنا رابطہ قطعی ختم کر دوں گی۔ کیا تمہیں یاد نہیں؟"

"یاد ہے۔"

"بس تو پھر اب تمہیں مطمئن ہو جانا چاہیے۔"

"میں مطمئن ہوں مریند!"

"مجھے یہ جواب سن کر خوشی ہوئی۔"

حیدر نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ مطمئن ہے لیکن اس نے سراسر جھوٹ بولا تھا۔ وہ مطمئن اس لیے نہیں تھا کہ ریحان کی محبت مریند کے دل میں اب بھی تھی۔ اسے مریند کا یہ فقرہ یاد تھا کہ وہ اسے بھولنے کی انتہائی کوشش کرے گی۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ریحان کو بھول جائے گی۔ حیدر نے کہیں پڑھا تھا کہ عورت کو جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ اسے نہ پا سکے، وہ اسے پھر بھی بھول نہیں پاتی، زندگی بھر وہ اس کے دل کے کسی گوشے میں موجود ضرور رہتا ہے لہٰذا مریند کے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ریحان کو بھول جائے۔ اس کا اندازہ اسے خود بھی تھا اور اسی لیے اس نے "کوشش" کا لفظ استعمال کیا تھا۔

وہ مریند کے جسم و جان کا مالک تو بن جاتا لیکن اس کی روح سدا ریحان ہی کی ملکیت کے گرد منڈلاتی رہتی۔ حیدر کو وہ سب کچھ برداشت کر کے ہی ایک پرآسائش زندگی گزارنا تھی، جس طرح وہ اب تک گزارتا آیا تھا جبکہ اس دور میں مریند کے جسم و جان بھی اس کے نہیں تھے۔

جب وہ ان خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا مریند بھی کسی گہری سوچ میں غرق ڈرائیونگ کرتی رہی تھی۔ اس کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ اپنی زندگی کے کسی انتہائی اہم مشن پر جا رہی ہو۔

سنسان سڑکوں پر کار بڑی تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ کبھی کبھار ہی کسی جگہ کوئی گاڑی آتی جاتی نظر آ جاتی تھی۔ سکوت بھی ایسا تھا کہ اگر کہیں کسی طرف سے کسی کتے کے بھونکنے کی مدھم سی آواز بھی آ جاتی تھی تو ایسا لگتا جیسے خاموشی میں بھونچال آ گیا ہو۔

حیدر اپنے خیالوں میں ایسا غرق تھا کہ ان راستوں پر اس کا دھیان ہی نہیں گیا جن راستوں پر کار چلتی رہی تھی۔ حیدر تو اس وقت چونکا جب وہ ایک بہت بڑے پھاٹک پر رکی۔

وہ پھاٹک جاذب پیلس کا تھا!

"یہاں!" حیدر نے چونک کر مریند کی طرف دیکھا۔ "تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

"دیکھتے رہو۔" مریند نے آہستہ سے کہا۔ "سب کچھ جان لو گے۔"

وہ کار کا ہارن دے چکی تھی اور چوکیدار اس کی کار پہچاننے کے بعد پھاٹک کھول رہا تھا۔ پھاٹک کھلتے ہی کار آگے بڑھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ریحان کی کار بھی جاذب پیلس کے احاطے میں داخل ہوئی۔

ایک جگہ رک کر جب وہ لوگ کاروں سے اترے تو حیدر نے دیکھا کہ دوسری کار سے اترنے والا شخص نہایت وجیہہ اور خوب صورت تھا۔ ریحان، جو پہچانا جا سکتا تھا کہ اسے کوئی بھی دوشیزہ ٹوٹ کر چاہ سکتی تھی۔ حیدر نے ریحان کے چہرے پر بھی ویسے ہی گمبھیر تاثرات دیکھے جو مریند کے چہرے پر تھے۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک ہلکا سا بریف کیس لیے ہوئے تھا۔

اس وقت جاذب پیلس پر سکوت چھایا ہوا ہونا چاہیے تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہاں ملازمین کی نقل و حرکت سے بھی محسوس کیا جا سکتا تھا کہ اس وقت جاذب پیلس میں شاید کئی جاگ رہے ہوں۔

وہ سوگ کا گھر تو یقیناً تھا کیونکہ جاذب فاروقی گزشتہ صبح ہی دنیا سے رخصت ہوا تھا لیکن حیدر کو حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سب رونے دھونے کے بعد اب تھکے ماندے، بے سدھ پڑے سو رہے ہوں گے۔

بنگلے میں داخل ہوتے ہی گھر کے کئی افراد کا سامنا ہوا۔ مریند ان سے ہم کلام ہوتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ ایک فرد سے اس کی مختصر بات چیت سے حیدر نے جانا کہ مریند اس وقت وہاں صرف شارب فاروقی سے ملنے آئی تھی۔

ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے حیدر نے نور اور اظفر کی ماں کے رونے کی آواز سنی اور وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکا کہ یہ عورت اپنے مرحوم شوہر کے بڑے بھائی سے اتنی ہی محبت کرتی تھی کہ ابھی تک اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

مریند نے ایک جگہ رک کر جس دروازے پر دستک دی، وہ حیدر کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ شارب فاروقی کی خواب گاہ تھی۔ جن لوگوں سے مریند کی مختصر بات چیت ہوئی تھی، انہوں نے ہی بتایا تھا کہ شارب فاروقی اپنے کمرے میں ہے۔

حیدر اور ریحان، مریند کے قریب ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ریحان کی وجہ سے حیدر کا ذہن جاذب پیلس کے پھاٹک ہی پر اور زیادہ الجھ گیا تھا۔ اس الجھن میں مزید اضافہ اس وجہ سے ہوا کہ مریند شارب فاروقی سے ملتے وقت ریحان کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ آخر کیوں؟

حیدر کا دماغ اس "کیوں" کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

مریند کی دستک کے جواب میں اندر سے شارب فاروقی کی بھاری آواز سنائی دی تھی۔ "کون ہے؟"

مریند نے جواب میں اپنا نام بتا دیا تھا۔

شارب فاروقی نے دروازہ کھولا تو حیدر کو مریند کے ساتھ دیکھ کر وہ شاید زیادہ نہ چونکا ہو لیکن ریحان پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔ "کیا اظفر..."

مریند نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کچھ اور بات ہے جو آپ سے اسی وقت کرنا ضروری ہے۔"

"چلو ڈرائنگ روم میں چلو۔"

"مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کمرے میں اکیلے ہی ہیں۔"

"ہاں، ہوں تو اکیلا ہی لیکن ڈرائنگ روم..."

"ڈرائنگ روم مناسب نہیں رہے گا۔" مریند نے اس کی بات پھر کاٹی۔ "وہاں ہماری باتیں کوئی بھی سن سکتا ہے۔ ان باتوں کے لیے آپ ہی کا کمرا بہتر رہے گا۔"

شارب فاروقی نے ایک مرتبہ غور سے مریند کی طرف دیکھا پھر پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "آؤ۔"

مریند نے ایک قدم پیچھے رہتے ہوئے حیدر اور ریحان بھی اندر داخل ہوئے۔ وہ خاصی کشادہ اور آراستہ خواب گاہ تھی۔ حیدر پہلے بھی ایک مرتبہ اس کمرے میں آ چکا تھا۔

وہ چاروں کمرے کے ایک گوشے میں لگے ہوئے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ شارب فاروقی نے اس وقت ریحان پر ایک گہری اور سوالیہ نگاہ ڈالی۔

مریند نے تعارف کرایا۔ "یہ مسٹر ریحان ہیں۔"

اس انکشاف نے حیدر کو چونکا دیا کہ ریحان بیرسٹر تھا۔

"خوب!" شارب فاروقی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کے ساتھ ہی چہرے پر نظر آنے والی الجھن مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے مریند کی طرف دیکھنے لگا۔

مریند اب تک بہت ہلکے ہلکے باتیں کرتی رہی تھی لیکن اب وہ بولی تو اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ "ڈیڈی کو دنیا سے رخصت ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے ہیں۔" وہ چپ ہوئی۔ شاید وہ اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پانا چاہتی تھی۔ پھر رک کر اس نے اپنی جذباتیت پر قابو پا لیا۔ "مناسب ہوتا کہ یہ بات ڈیڈی کے چہلم کے بعد کی جاتی لیکن میں مجبور ہو گئی ہوں کہ یہ معاملہ فوری طور پر ہی طے ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"کیا معاملہ؟"

مریند بولی۔ "ڈیڈی کے کاروبار، ان کی جائیداد، ان کا بینک بیلنس، سب کچھ ظاہر ہے کہ اب ان کی اولاد کو ملے گا۔ اس سلسلے میں رسمی قانونی کارروائی بھی ہوگی۔ اس میں ابھی خاصا وقت لگے گا اس لیے میں نے کاغذات کچھ اس طرح تیار کروائے ہیں کہ ڈیڈی کا جو کچھ بھی ہے، اس میں سے نصف مجھے ملے۔ آپ کو ان کاغذات پر دستخط کرنا ہیں۔"

مریند کی زبان پر "کاغذات" کا نام آتے ہی ریحان نے بریف کیس اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا تھا اور مریند کی بات مکمل ہونے تک اسے کھول بھی چکا تھا۔

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو مریند!" شارب فاروقی نے کڑوا سا منہ بنایا اور پھر ریحان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ بیرسٹر ہیں؟"

"جی۔" ریحان نے جواب دیتے ہوئے اپنا وزیٹنگ کارڈ شارب فاروقی کی طرف بڑھا دیا۔

شارب فاروقی نے کارڈ لے کر دیکھے بغیر ایک طرف ڈال دیا۔

مریند نے مزید بتایا۔ "یہ میرے ایک ایڈوائزر بھی ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کمال کے ایڈوائزر ہیں آپ!" شارب فاروقی نے ریحان کی طرف دیکھتے ہوئے نشتر جیسے لہجے میں کہا۔ "آپ نے مرینہ کو یہ بھی نہیں بتایا کہ باپ کی وراثت میں بیٹی نصف کی حق دار نہیں ہوتی۔"

"میں بتا چکا ہوں۔" ریحان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"اور بہت کچھ میں بھی جانتی ہوں۔" مرینہ تنک کر بولی۔ "مجھے معلوم تھا کہ ڈیڈی کی وفات کے بعد مجھ سے یہی کہا جائے گا۔ میں اس وقت یہ تو کہہ رہی ہوں کہ وراثت میں سے نصف مجھے دیا جائے لیکن میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اس بچے کو جنم دیا ہے جو ڈیڈی کا پوتا ہے اور جس کے باپ تم ہو شارب فاروقی!"

اس لمحے حیدر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کسی دھماکے کی آواز سنی ہو۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس ناجائز بچے کا باپ شارب فاروقی ہوگا۔

ریحان کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ غالباً مرینہ نے اسے اس معاملے کی ساری جزئیات بتا رکھی تھیں۔

مرینہ کی زبان سے آخری فقرہ ادا ہوتے ہی شارب فاروقی نے گھبرا کر بے اختیار ریحان اور حیدر کی طرف دیکھا۔

"میں آج ہر بات زبان پر لے آنا چاہتی ہوں شارب فاروقی! ہر بات سے پردہ اٹھا دینا چاہتی ہوں۔" مرینہ کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ "سارا خاندان یہی سمجھتا ہے کہ میں ڈیڈی کی سگی بیٹی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈیڈی نے خاندان والوں سے پوشیدہ رکھتے ہوئے جو دوسری شادی کی تھی، وہ اس بیوہ عورت سے کی تھی جو پہلے ہی ایک دو سالہ بچی کی ماں تھی۔ جب دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا تو ڈیڈی مجھے جاذب پیلس لے آئے تھے۔ اس وقت انہوں نے ظاہر کیا تھا کہ میں ان کی دوسری بیوی کی اولاد ہوں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ میرے اصل باپ کا انتقال تین سال پہلے ہو چکا تھا۔"

حیدر جیسے سکتے میں بیٹھا ہوا وہ سب کچھ سن رہا تھا۔ مرینہ وہ سب کچھ اس طرح کہہ رہی تھی جیسے حیدر ہی کو سب کچھ سنانا چاہتی ہو۔ شارب فاروقی تو پہلے ہی ان سب باتوں سے واقف ہوگا۔

"تم کو کسی طرح اس حقیقت کا علم ہو گیا تھا شارب فاروقی!" مرینہ جذباتی انداز میں بولتی رہی۔ "جب تم مجھے برباد کر چکے تھے، تبھی تم نے ہی مجھے اس بات سے آگاہ کیا تھا۔ میں ان دنوں کچھ علیل تو تھی ہی لیکن اس کے بعد میری طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اپنی بربادی کا علم ہو تو لڑکیوں کی طبیعت خراب تو ہوتی ہی ہے۔ میں نے چپ سادھ لی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ میری علالت کے دوران میں اضافہ ایک بہت بڑے صدمے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کے بعد میں جب ٹھیک ہوئی تو میں نے کسی طرح ڈیڈی سے بھی اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ تم واقعی کسی بھی حیثیت سے میرے بھائی نہیں ہو لیکن ڈیڈی مجھے اپنی سگی بیٹی ہی کی طرح چاہتے رہے۔ انہوں نے ہمیشہ میرے منہ سے نکلی ہوئی ہر فرمائش پوری کی۔ انہیں اس بات سے بھی دکھ تو ضرور ہوا ہوگا کہ حیدر سے شادی کے بعد میں الگ رہنا چاہتی تھی کیونکہ بار بار تمہاری صورت دیکھنا مجھے گوارا نہیں تھا۔ ڈیڈی نے مجھے الگ بنگلہ دلوا دیا تھا اور انہی کے حکم پر مجھے چار لاکھ روپے ماہانہ ملا کرتے تھے۔"

مرینہ خاصی دیر تک بولتی رہی تھی۔ شارب فاروقی ساکت بیٹھا سب کچھ سنتا رہا تھا۔ پھر یکایک وہ سنبھالا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"تم شاید پاگل ہو گئی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم میری بہن نہیں ہو لیکن دولت کے لالچ میں تم مجھ پر اتنا گھناؤنا الزام لگاؤ گی، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"یہ الزام ہے یا حقیقت، یہ تو عدالت میں بھی ثابت کر دیا جائے گا۔" مرینہ نے کہا۔ "بچے کی میڈیکل رپورٹ ثابت کر دے گی کہ اس کا باپ کون ہے اور وہ رپورٹ میں نے بہت محفوظ جگہ رکھی ہے۔ یہ اندازہ تمہیں بھی تھا کہ میں بچے کو جنم دینے پر کیوں اڑی ہوئی ہوں۔ تم اسقاط کرانا چاہتے تھے لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ تم نے حیدر سے میری شادی کروا دی اور اس کے لیے جواز یہ تراشا کہ میرے ناجائز بچہ ہونے پر ڈیڈی کو صدمہ پہنچے گا اور وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوں گے کہ میری شادی تم سے کرا دیں۔ خاندان تو یہی جانتا تھا اور جانتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سوتیلے بھائی بہن ہیں۔ سگی ماں نہ ہو لیکن باپ ایک ہی ہے۔ شارب فاروقی! اس شادی کے لیے میں بھی اسی وجہ سے تیار ہوئی تھی لیکن بعد میں مجھے شبہ ہوا تھا کہ تم اس بچے کو مروا دو گے۔ تمہیں یہ خوف ہوگا کہ اس بچے کی وجہ سے میں تمہیں بلیک میل کر سکتی ہوں لیکن آج میں جس عزم کے ساتھ تمہارے سامنے آئی ہوں، اس کا خیال شاید تمہیں نہ آیا ہو۔" مرینہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "تم اس معاملے میں کوئی جلد بازی نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے میں اور میرا

بچہ مری ہیں، بالکل محفوظ ہے لیکن جب میں خالہ کو کر چکی تھی تو تمہیں ضرور دھچکا لگا ہوگا۔ اس کے بعد تم مختلف حیلے بہانوں سے یہ جاننے کی کوشش کرتے رہے کہ بچہ کہاں ہے لیکن میں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ اس بچے کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دوں۔ میں نے تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں کیوں بتاتی؟ مجھے اس بچے کو زندہ رکھنا اور اسے اس کا حق دلوانا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے جسم میں تمہارا گندا خون بھی شامل ہے لیکن میرا خون بھی تو ہے اور میرا خون پکار رہا ہے کہ میں اپنی بربادی کا اتنا عوض تو لے لوں کہ میرا بچہ ایک شاندار زندگی گزار سکے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم تو دنیا بھر کے عیش کرتے رہو اور میرے بچے کا کچھ حق نہ ہو۔ یہ ٹھیک ہے لیکن میری بربادی کا صلہ تو ہونا چاہیے۔"

حیدر نے محسوس کیا کہ بچے کے میڈیکل سرٹیفکیٹ کی بات سنتے ہی شارب فاروقی کے چہرے کا سارا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

مرینہ کا ہیجان بڑھتا ہی جا رہا تھا اور وہ بولے جا رہی تھی۔ "تم نے بہت دن انتظار کیا کہ بچہ کسی طرح سامنے آ جائے۔ اس کے بعد تم نے میری نگرانی بھی شروع کرائی ہوئی تھی لیکن میں اپنے بچے سے ملنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے اس جگہ جایا کرتی تھی جہاں میرا بچہ پرورش پا رہا تھا۔ پھر تم نے کچھ بدمعاشوں کو بھی میرے پیچھے لگا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں ہمیشہ بہت محتاط رہتی تھی لیکن یہ رات جو اب ختم ہونے والی ہے اور جو دن گزر چکا ہے، یہ لمحے مجھے مسلسل صدمے سے نڈھال کیے رہے ہیں۔ اسی لیے رات جب میں اپنے بچے سے ملنے گئی تو محتاط نہیں رہ سکی۔ دھیان اس طرف گیا ہی نہیں کہ میری نگرانی ہو رہی ہوگی۔ حیدر کو میں کار میں پیچھے ہی چھوڑ کر اپارٹمنٹ میں چلی گئی تھی۔ شاید ان بدمعاشوں میں سے بھی کوئی میرے ساتھ تب میں اس اپارٹمنٹ کا دروازہ دیکھ آیا ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے تمہیں اس بارے میں اطلاع دی تو تم نے سوچا کہ وہ بچہ اسی اپارٹمنٹ میں ہونا چاہیے۔ تم ہی نے ان بدمعاشوں کو حکم دیا ہوگا کہ وہ بچے کو وہاں سے غائب کر دیں۔ شاید تم سفاک انسان، اس معصوم بچے کو اس طرح ختم کرا دیتے کہ اس کا نشان بھی کسی کو نہیں ملتا لیکن وہ بدمعاش خود ہی مارے گئے۔ یہ ساری کہانی تو تمہیں معلوم ہو چکی ہے۔"

حیدر نہیں سمجھ سکا کہ وہ کہانی شارب فاروقی کو کس طرح معلوم ہو چکی ہوگی۔

"تمہارا پاگل پن بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔" شارب فاروقی اس طرح بولا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص کسی تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کرے۔ "اب تم مجھ پر یہ الزام بھی لگا رہی ہو کہ میں نے بدمعاشوں کے ذریعے کسی بچے کو اغوا کرانے کی یا قتل کرانے کی سازش کی تھی۔"

"دونوں میں سے کوئی بھی محض الزام نہیں ہے۔" مرینہ نے شارب فاروقی کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں ہی باتیں عدالت میں ثابت کر دی جائیں گی اگر تم نے ان کاغذات پر دستخط نہیں کیے۔" مرینہ نے اس فائل کی طرف اشارہ کیا جو ریحان نے بریف کیس سے نکال کر اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ مرینہ نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ "مجبوری ہوئی تو میں عدالت کا رخ ضرور کروں گی۔ مجھے اب اپنی بدنامی کی پروا نہیں ہوگی جب میں ایک ناجائز بچے کی ماں کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آؤں گی۔ میں تو مظلوم ہوں۔ میرے ساتھ جبر ہوا تھا۔ رسوائی تو تمہاری ہوگی مگر تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاؤ گے جب عدالت میں یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" شارب فاروقی اکڑا۔ "بہتر ہوگا کہ تم عدالت جانے کا شوق پورا کر لو۔"

"اچھا!" مرینہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ "اگر یہ بات ہے تو میں تمہاری رسوائی کا سامان پہلے تو اسی گھر سے کرتی ہوں۔ تمہارے رشتے دار جو اس وقت ڈیڈی کے سوگ کا شکار ہیں، انہیں اسی وقت معلوم ہو جانا چاہیے کہ جاذب پیلس کا وارث کتنا گھٹیا انسان ہے۔"

مرینہ کے ساتھ ہی حیدر اور ریحان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ شارب فاروقی اس طرح مرینہ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔

یکایک مرینہ بڑے زور سے چیخی۔ "ارے کوئی ہے اس گھر میں؟"

اب شارب فاروقی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"سب کو یہاں جمع کرنا چاہتی ہوں۔" مرینہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "سب کو تمہاری کہانی سنانا چاہتی ہوں۔"

اسی وقت دو افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی جو اسی کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی اور پھر کسی نے زور سے دروازے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ "کیا ہو گیا شارب بھائی!" وہ نسوانی آواز تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کچھ نہیں۔" شارب نے جلدی سے بلند آواز میں
کہا۔ "مریبہ ذرا ڈیڈی کو یاد کر کے پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے سنبھال
لیا ہے۔ تم لوگ جاؤ۔"

مریبہ گہری حقارت سے شارب فاروقی کی طرف
دیکھتی رہی۔

"فائل لاؤ۔" شارب فاروقی نے ریحان کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں کاغذات پڑھنے کے بعد ہی دستخط
کروں گا۔"

"کاغذات پڑھنا بہر حال تمہارا حق ہے۔" مریبہ
نے کہا اور ریحان کی طرف دیکھا۔

ریحان نے اٹھ کر فائل شارب فاروقی کو دے دی۔
پھر آدھے گھنٹے تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔
شارب فاروقی فائل میں لگے ہوئے کاغذات بڑے غور سے
پڑھ رہا تھا۔

شارب فاروقی نے کاغذات پڑھ کر فائل بند کر دی
اور مریبہ کو گھورنے لگا۔

"بہت پریشان ہو گئے ہو گے۔" مریبہ نے طنزیہ
مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کاغذات بڑے ماہرانہ انداز میں
تیار کیے گئے ہیں۔"

غصے سے شارب فاروقی کی مٹھیاں بھنچ گئیں لیکن
چہرے پر بے بسی کا تاثر بھی تھا۔

"کہاں دستخط کرنا ہیں؟" اس نے اس طرح پوچھا
جیسے ڈانٹ رہا ہو۔

ریحان اٹھ کر اس کے برابر میں جا بیٹھا۔ اس نے
فائل کھول کر کاغذات پر شارب فاروقی سے کئی جگہ دستخط
کروائے۔

جاذب ولیج سے مریبہ کی واپسی بڑے فاتحانہ انداز
میں ہوئی تھی مگر اس فتح کی کوئی چمک اس کے چہرے پر
نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ جانے کیوں بہت اداس ہو گئی تھی۔

"کاش میرے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔" وہ
بڑبڑائی۔

اس وقت بھی ڈرائیونگ سیٹ پر حیدر ہی بیٹھا تھا۔
ریحان کی کار پیچھے آرہی تھی۔ اب سڑک پر گاڑیاں آتی
جاتی نظر آنے لگی تھیں کیونکہ صبح ہو چکی تھی۔ لوگ بیدار
ہونے کے بعد اپنی اپنی زندگی کے ایک نئے دن کا آغاز کر
رہے تھے۔

☆☆☆

اس دن کا آغاز افسر کے لیے اس کی زندگی کی ایک نہ
ختم ہونے والی رات کا آغاز تھا۔ اس کے لیے روشنی اب
اپنے معنی کھو چکی تھی۔ وہ حوالات میں ٹانگیں پھیلائے اس
طرح بیٹھا تھا کہ اس کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوئی تھی۔

وہی ان تین بدمعاشوں کا قاتل تھا جنہوں نے مریبہ
کے بچے کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اس بچے کو نہ
بچا پاتا تو خود کو زندگی بھر معاف نہیں کرتا۔ اسے مریبہ سے
اتنی ہی شدید محبت تھی۔

وہ صرف چھ سال کا تھا جب اپنی ماں اور بھائی کے
ساتھ جاذب ولیج آیا تھا۔ مریبہ اس وقت چار سال کی تھی۔
وہ ساتھ کھیلے کودے تھے اور جب ان کے بچپن نے جوانی
کی دہلیز چھوئی تھی تو افسر محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے مریبہ
سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ پریشان رہنے لگا تھا کہ
مریبہ سے اپنی محبت کا اظہار کیسے کرے۔ اسے اندازہ تھا کہ
مریبہ کے لیے اس کے جو جذبات تھے، وہ جذبات اس کے
لیے مریبہ کے نہیں تھے۔

دو سال تک افسر ایک کرب میں مبتلا رہا۔ پھر آخر اس
نے مریبہ سے اظہار محبت کر ہی ڈالا۔ جواب میں مریبہ نے
اسے اس بری طرح ڈانٹا تھا کہ بعد میں وہ اپنے کمرے کی
تنہائی میں بہت دیر تک روتا رہا تھا۔

مریبہ کے ردعمل نے افسر کے دل پر ایسے چرکے
لگائے تھے کہ پھر اس کے قدم بھٹکتے ہی چلے گئے۔ وہ
جواریوں اور شرابیوں میں بیٹھ کر اپنا ذہن بھٹکانے کی
کوشش کرنے لگا۔ اپنی ان عادات و اطوار پر اسے اپنی
ماں کی ڈانٹ ڈپٹ بہت سنا پڑتی تھی لیکن جاذب فاروقی
نے اسے صرف ایک مرتبہ سمجھانے بجھانے کے بعد نہ
صرف خاموشی اختیار کر لی تھی بلکہ اس کی حرکات و سکنات
کی طرف سے چشم پوشی بھی کرنے لگا تھا۔ اس نے شارب
فاروقی کو بھی ہدایت کی تھی کہ وہ افسر کو اس کے حال پر
چھوڑ دے اور اس وقت کا انتظار کرے جب افسر خود ہی
کوئی ٹھوکر کھا کے خود کو سنبھالے۔

افسر شراب پیتا تھا لیکن اتنی بھی نہیں جتنی لوگ کہتے
تھے۔ وہ صرف ظاہر کرتا تھا کہ وہ بہت زیادہ شراب پینے لگا
ہے۔ اس کی وہ سوچ عجیب ہی کہی جا سکتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ
جب مریبہ اس سے محبت نہیں کرتی تو باقی سب بھی اس سے
نفرت کرنے لگیں۔

پھر ایک رات اس کی زندگی میں جو حادثہ آیا، اس کا وہ
تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس شام خاندان کے کسی گھر میں کوئی تقریب تھی۔ سبھی
لوگ اس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ مریبہ کی
طبیعت کچھ مضمحل تھی اس لیے وہ جاذب ولیج ہی میں رہ گئی
تھی۔ طبیعت کی ناسازی اتنی تشویش ناک نہیں تھی کہ گھر
والوں میں سے کسی کا اس کے پاس رکنا ضروری ہوتا۔

افسر اس شام گھر ہی میں تھا لیکن کسی نے بھی اس
سے تقریب میں چلنے کے لیے نہیں کہا۔ جب سے اس کی
عادات بگڑی تھیں، گھر میں سبھی نے اسے نظر انداز کرنا
شروع کر دیا تھا اور اس کی خواہش بھی یہی تھی کہ سب اس
سے نفرت کرنے لگیں۔

اس شام وہ گھر میں اس لیے تھا کہ اسے مریبہ کی
طبیعت مضمحل ہونے کا علم ہو گیا تھا۔ یہ بات بھی معلوم ہو گئی
تھی کہ سب لوگ اسے گھر میں تنہا چھوڑ کر جانے والے تھے۔
اس پر افسر کو بہت غصہ آیا تھا۔ وہ کسی پر اپنے غصے کا اظہار تو
نہیں کر سکا لیکن اپنے معمول کے خلاف گھر میں رک گیا۔ اس
نے سوچا تھا کہ اگر مریبہ کی طبیعت زیادہ بگڑی تو کم از کم کسی
ڈاکٹر کو تو بلا لے گا۔

جب جاذب ولیج کے سب لوگ رخصت ہو گئے تھے
تو انہیں علم بھی نہیں تھا کہ افسر گھر ہی میں موجود ہے۔ عموماً اس
کی آمد و رفت کی خبر کسی کو نہیں ہونے پاتی تھی۔ وہ سب سے
نظر بچا کر ہی گھر سے چلا جایا کرتا تھا۔

کئی بار اس کا دل چاہا کہ جا کر مریبہ سے اس کی
طبیعت کے بارے میں پوچھ لے۔ وہ ایک مرتبہ تو وہ مریبہ
کے کمرے کی طرف گیا بھی لیکن کمرے میں جانے کی ہمت
نہیں ہو سکی۔ وہ پاگلوں کی طرح جاذب ولیج میں ادھر ادھر
گھومتا پھرا۔

ساڑھے نو بجے کے قریب اس نے شارب فاروقی کی
کار جاذب ولیج میں آتے دیکھی تو اسے حیرت ہوئی۔
جاذب فاروقی بھی تقریب میں گیا تھا۔ وہاں سے سب لوگوں
کی واپسی بارہ ایک بجے سے پہلے ممکن ہی نہیں تھی۔

افسر کی حیرت اس خیال سے ختم ہوئی کہ شارب
فاروقی ذرا دیر کے لیے اپنی بہن کو دیکھنے کے لیے تقریب
سے اٹھ کر آ گیا ہو گا۔ مریبہ کو دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔ اس
وقت تک افسر کو علم نہیں تھا کہ مریبہ شارب فاروقی کی بہن بھی
نہیں ہے۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ ان دونوں کا باپ ایک، بس
مائیں مختلف تھیں۔

افسر کو پھر لگا کہ کسی کو تو مریبہ کا خیال آیا۔

افسر لان میں ٹہلتا رہا۔ جب پندرہ بیس منٹ گزر گئے
اور شارب فاروقی واپس جاتا نظر نہیں آیا تو اسے کچھ تشویش
ہوئی۔ تشویش اس خیال سے ہوئی کہ شاید مریبہ کی طبیعت
زیادہ خراب ہو گئی ہو اس لیے شارب فاروقی نے دوبارہ
تقریب میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔

مریبہ کی طبیعت زیادہ خراب ہونے کا خیال افسر کے
لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ چپکے سے گھر میں داخل ہوا اور تیزی
سے مریبہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے اپنے
قدموں کی آواز نہیں ہونے دی تھی۔ وہاں اس نے مریبہ کی
چیخ و پکار سنی۔ وہ شارب فاروقی پر بگڑ رہی تھی اور روتی بھی
جا رہی تھی۔ جواب میں شارب فاروقی بڑے سکون سے بولا
تھا۔ ان دونوں کی باتوں سے افسر پر منکشف ہوا کہ مریبہ پر تو
قیامت گزر چکی ہے۔ شارب فاروقی نے اسے نہ جانے کیا
سنگھا دیا تھا کہ اس پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ
سے وہ کوشش کے باوجود خود کو شارب فاروقی کی ہوس کے
شعلوں سے نہیں بچا سکی تھی۔ شارب فاروقی نے اس کی
دوشیزگی لوٹ لی تھی۔ تقریب چھوڑ کر وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ
مریبہ اس وقت جاذب ولیج میں اکیلی تھی۔ اس کے کمرے
میں جانے سے پہلے اس نے ملازموں کو تاکید کر دی تھی کہ ان
میں سے کوئی مریبہ کے کمرے کی طرف نہ آئے۔ اس طرح
اسے اپنی ہوس مٹانے کا موقع آسانی سے مل گیا تھا۔

اسی وقت شارب فاروقی کی باتوں سے افسر کو یہ علم بھی
ہوا کہ مریبہ شارب فاروقی کی سوتیلی بہن تو کیا، سرے سے
بہن ہی نہیں تھی۔

شارب فاروقی مریبہ کو روتا دھوتا چھوڑ کر تقریب میں
شرکت کرنے کے لیے واپس چلا گیا۔

غصے سے افسر کا برا حال تھا۔ اس کی خواہش تو یہی تھی کہ
شارب فاروقی پر پل پڑے اور اس کی ہڈیاں پسلیاں ایک
کر دے لیکن اس نے خود پر اس لیے قابو پایا تھا کہ اس طرح
بات پھیلتی تو مریبہ کی بدنامی کا سبب بھی بنتی۔

تقریب سے سب لوگ واپس لوٹے تو مریبہ کی
طبیعت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ اس کے لیے فوراً ڈاکٹر کو بلایا
گیا۔ پھر ڈاکٹر روزانہ ہی آتا رہا لیکن مریبہ کی طبیعت کئی دن
تک نہ سنبھلی۔

ان چند دنوں میں افسر کو اندازہ ہو گیا کہ مریبہ نے کسی
کو نہیں بتایا تھا کہ اس پر کیا قیامت گزر گئی تھی۔

ٹھیک تو وہ ہو گئی لیکن پھر کسی نے اسے مسکراتے ہوئے
نہیں دیکھا۔ گھر والے بھی نہ جان سکے کہ وہ ہنسنا بولنا کیوں
بھول گئی تھی۔ یہ بدترین حقیقت صرف افسر ہی جانتا تھا کہ اس
کے پیچھے کس کی ہوس کی آگ تھی۔ شارب فاروقی سے وہ شدید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نفرت کرنے لگا تھا۔

دو ڈھائی ماہ بعد اس کے سننے میں آیا کہ گھر والے مرینہ کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ یہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شوشا چھوڑنے والا شارب فاروقی تھا۔ اس نے گھر والوں کو سمجھایا تھا کہ شادی کے بعد مرینہ پھر سنبھلنے لگے گی۔

شادی کے لیے دباؤ پڑا تو مرینہ نے یہ شرط رکھ دی کہ وہ کسی ایسے شخص سے شادی کرے گی جو گھر داماد بننے کے لیے تیار ہو۔

اس شرط سے مرینہ کا کیا مقصد تھا؟ یہ افسر کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ وہ مرینہ کو اب بھی قبول کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ خود کو پیش کرتا۔ اسے اندازہ تھا کہ مرینہ اب بھی اسے مسترد کردے گی۔

پھر شارب فاروقی نے کہیں سے حیدر کو ڈھونڈ نکالا۔ مرینہ کی شادی اس سے کردی گئی۔ مرینہ نے الگ رہنے کی خواہش ظاہر کی تو جاذب فاروقی نے وہ بھی پوری کردی۔

جب حیدر اور مرینہ مری گئے تھے تو افسر بھی مری چلا گیا تھا۔ جب سے مرینہ کی شادی ہوئی تھی، افسر کے چوبیس گھنٹے بڑی بے چینی میں گزر رہے تھے۔ اگر وہ مرینہ کو ایک آدھ بار دیکھ پاتا تھا۔ وہ مری بھی اسی مقصد سے گیا تھا کہ دن میں ایک آدھ بار مرینہ کو دیکھ لیا کرے گا۔ مری میں وہ اپنی رازداری اور اپنی احتیاط سے رہا کہ مرینہ اور حیدر اسے کہیں نہ دیکھ سکے۔

مری ہی میں افسر پر انکشاف ہوا تھا کہ مرینہ حاملہ تھی۔ وہ افسر کے لیے دوسرا صدمہ تھا۔ اتنی جلدی مرینہ کے حاملہ ہونے کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ وہ شارب فاروقی کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور اس کے لیے ایک ایسا شوہر تلاش کیا گیا تھا جو ایک ناجائز بچے کو برداشت کرسکے۔

یہ سب کچھ جان کر اور اندازہ لگا کر افسر پر جو کچھ گزری تھی، وہ تو گزری ہی تھی لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی جب راولپنڈی کے ایئر پورٹ پر مرینہ نے وہ بچہ ایک برقع پوش عورت کے سپرد کردیا تھا۔

وہ برقع پوش عورت خورشید بیگم تھی جو بعد کی ایک فلائٹ سے کراچی روانہ ہوئی۔ افسر اس کے تعاقب میں لگا رہا۔ اس طرح اسے معلوم ہوسکا کہ بچہ شیخ اور تاج کو دے دیا گیا تھا۔ وہ میاں بیوی بچے کو لے کر ایک شاندار اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئے تھے۔ افسر اندازہ لگا سکتا تھا کہ اپنے بچے ہی کی خاطر مرینہ نے شیخ اور تاج کو وہ اپارٹمنٹ دلوایا ہوگا لیکن

یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ مرینہ کے اس اقدام کا مقصد کیا تھا۔

پھر مہینوں پر مہینے گزرتے رہے۔ مرینہ جاذب فاروقی سے ملنے جاذب ہاؤس آتی رہتی تھی۔ دو ایک مرتبہ افسر کو چھپ کر مرینہ اور شارب فاروقی کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ اس طرح اسے معلوم ہوسکا کہ مرینہ نے شارب فاروقی کو بھی اس بچے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور شارب فاروقی وہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔ مرینہ سے ملنے کے بعد وہ تنہائی میں بڑا مضطرب سا نظر آتا تھا۔

کافی عرصے تک سوچ بچار کے بعد افسر اس نتیجے تک پہنچا کہ مرینہ مستقبل میں اس بچے کے حوالے سے شارب فاروقی کو کسی اعتبار سے اپنے دباؤ میں لینا چاہتی ہوگی اور شارب فاروقی کو اس خطرے کا اندازہ ہوگیا تھا۔

افسر کو خیال آیا کہ اگر شارب فاروقی کو اس بچے کا پتا چل گیا تو وہ اسے مروائے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

یہ خیال آنے کے بعد افسر کی یہ کوشش رہی کہ جس حد تک بھی ممکن ہو وہ شارب فاروقی پر نظر رکھے۔

نظر رکھنے ہی کی وجہ سے اسے گزشتہ رات یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ شارب فاروقی نے تین بدمعاشوں کو مرینہ کے پیچھے لگا رکھا تھا اور اس رات انہیں اس اپارٹمنٹ کا علم ہوگیا تھا جہاں شیخ اور تاج رہتے تھے اور جہاں مرینہ کے بچے کی پرورش ہورہی تھی۔

شارب فاروقی اس وقت لان میں تھا اور اس نے کسی کی کال ریسیو کی تھی۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر افسر نے خود کو ایک پودے کی آڑ میں چھپا رکھا تھا۔

کال پر کچھ سننے کے بعد شارب فاروقی نے پرجوش انداز میں کہا تھا۔

"اتنی رات کو اسے اس اپارٹمنٹ میں جانے کی اور کیا ضرورت ہوسکتی ہے۔ ضرور وہ بچہ اسی اپارٹمنٹ میں کسی کے پاس ہوگا۔ ممکن ہے میرا خیال درست نہ ہو مگر تم ابھی اس اپارٹمنٹ میں گھس پڑو اور اگر وہاں کوئی بچہ ہو تو اسے وہاں سے اٹھا لو۔ اسے محفوظ رکھو۔ کل مرینہ کی حالت سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس کا بچہ غائب ہوا ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس کا بچہ ثابت ہوا تو پھر تم لوگوں کو [illegible] ہوگا کہ وہ [illegible] نام بتا [illegible] تم نے؟"

دوسری طرف سے [illegible]
شارب فاروقی نے دوبارہ [illegible]

محسوس ہوئی تھی۔ وہ شیخ اور تاج کے اس اپارٹمنٹ سے اسی دن واقف ہوچکا تھا جب خورشید بیگم نے بچہ ان کے حوالے کیا تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد شارب فاروقی اپنا موبائل فون جیب میں ڈالتا ہوا تیزی سے گھر میں چلا گیا تھا۔

افسر نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے تیزی سے اپنے کمرے میں جا کر اپنا پستول نکالا اور پھر تیز رفتاری سے شیخ کے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہی اس نے موبائل پر مرینہ سے رابطہ کیا تھا اور اسے ساری صورت حال بتادی تھی۔ اس نے مرینہ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ جلد از جلد اپارٹمنٹ پہنچنے کی کوشش کرے لیکن وہاں پہنچنے کے بعد احتیاط سے کام لے۔

خود افسر جب وہاں پہنچا تو وہ بدمعاش وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس کا اندازہ اسے یوں ہوا کہ ایک شخص شیخ کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر جما ہوا تھا اور اس کی وضع قطع ظاہر کررہی تھی کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔

افسر پر اس وقت جنونی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ اس بدمعاش کو گولی مار کر اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا۔ اس کے بعد اسے دو فائر اور کرنا پڑے تھے۔ وہ مرینہ کے بچے کو بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ پھر مرینہ بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ آپس میں کچھ ہی باتیں کرسکے تھے کہ پولیس بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ افسر نے کسی مزاحمت کے بغیر خود کو پولیس کے حوالے کردیا تھا۔ اس نے بیان یہ دیا تھا کہ اس نے ان تینوں آدمیوں کو مشکوک انداز میں اس اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے دیکھا تو انہیں روکنے کے سلسلے میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا اور وہ تینوں اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

بدمعاشوں کی لاشیں اسپتال بھجوانے کے بعد پولیس افسر کو پولیس اسٹیشن لے گئی تھی۔ پھر وہاں جاذب ہاؤس کے کئی افراد آگئے تھے۔ خود مرینہ نے بھی پولیس کو بتا دیا تھا کہ وہ اس کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے پاس [illegible] پولیس کو جاذب ہاؤس کو [illegible] بتانا پڑا تھا۔

شارب فاروقی نے اس وقت بلا کی اداکاری کی تھی۔ یہ معلوم ہوجانے کے باوجود کہ وہ [illegible] افسر کی ضمانت کرانے کی کوشش کی لیکن ضمانت نہیں ہوسکی تھی۔ افسر خود ہی اپنے قاتل ہونے کا اعتراف کرچکا تھا۔

مرینہ کے بیان کے مطابق وہ اس کی دوست کا گھر تھا اور وہ اس واردات کی اطلاع پر وہاں پہنچی تھی۔

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کرکے رسید حاصل کرسکتے ہیں

رابطہ ثمر عباس (فون نمبر) 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پولیس کے لیے یہ اتفاقات بڑے عجیب تھے کہ جہاں واردات ہوئی تھی، وہ اپارٹمنٹ مریدہ کی دوست کا تھا اور ڈاکوؤں کو مدد دینے والا مریدہ کا چچازاد بھائی تھا۔

"بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" ملاقات ہونے پر ریحان نے مریدہ سے کہا۔ "پولیس اس معاملے کی چھان بین عرق ریزی سے کرے گی۔"

"دیکھا جائے گا۔" مریدہ نے جواب میں کہا تھا لیکن فکرمندی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

رات گزر جانے کے بعد دس بجے کے قریب افسر کو ہتھکڑیاں لگا کر پولیس وین میں عدالت لے جایا گیا۔ پھر اس کا چار روزہ ریمانڈ لے کر پولیس نے اسے دوبارہ حوالات میں پہنچایا تھا کہ پانچ منٹ بعد اسے اطلاع دی گئی کہ مسز مریدہ حیدر اس سے ملنے آئی ہیں۔

افسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ وہ مریدہ کو دیکھے۔

سلاخوں کے باہر مریدہ کا اُترا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔

"مبارک ہو مریدہ!" افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارا بچہ محفوظ رہا۔"

"تم نے خود یہ خطرہ کیوں مول لیا افسر!" مریدہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم پولیس کو بھی اطلاع دے سکتے تھے۔"

"اس صورت میں بات کھل جاتی۔ تمہارا اور اس بچے کا راز کھل جاتا۔"

مریدہ نے ٹھنڈی سانس لی، پھر پوچھا۔ "تمہیں یہ سب کچھ معلوم کیسے ہوا تھا؟"

افسر نے دھیمی آواز میں مختصر طور پر سب کچھ بتا دیا۔ اس کہانی میں بعض مواقع ایسے آئے تھے کہ مریدہ کی نظریں جھک گئی تھیں۔

جب افسر خاموش ہو گیا تو مریدہ کچھ توقف سے بولی۔ "سچ تو یہ ہے۔ وکلا گھروں ہی پر ملتے ہیں۔ میں نے کئی نامور وکیلوں سے ان کے گھروں پر ملاقات کی ہے۔ میرا ایک دوست بیرسٹر ریحان بھی اس کیس پر کام کرے گا۔ یوں سمجھو کہ وکلا کا ایک پینل ہے جو تمہارے مقدمے کی پیروی کرے گا۔ یہ امکان بھی ہے کہ کل کسی وقت تمہیں ضمانت پر رہا کرا لیا جائے۔"

"ایسا کیوں کیا تم نے مریدہ!" افسر نے کہا۔ "تم تو مجھ سے نفرت کرنے لگی تھیں۔"

"تمہاری اس قربانی کے بعد کیا وہ نفرت باقی رہ گئی ہے؟"

"شکریہ۔" افسر کھل کر مسکرایا۔ "تمہارے دل میں میری محبت نہ سہی لیکن میرے لیے یہی بہت ہے کہ اب تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں۔ اب لوگ مجھے پھانسی کے تختے پر بہت خوش دیکھیں گے۔"

"ایسا مت کہو۔" مریدہ تقریباً چیخ سی پڑی تھی اور پھر وہ روتے ہوئے واپسی کے لیے مڑ گئی۔

شب بیداری کی وجہ سے اس کی آنکھیں پہلے ہی سرخ ہو چکی تھیں۔ رونے سے وہ سرخی اور بڑھ گئی۔

وہ بہت نڈھال تھی۔ گھر پہنچ کر وہ بستر پر ڈھیر ہو جاتی لیکن اسے تکیے پر ایک لفافہ رکھا ملا۔ لفافہ بند نہیں تھا۔ مریدہ نے اس میں سے وہ کاغذ نکالا جس پر اس کے نام حیدر کا خط تھا۔

"مریدہ! سدا خوش رہو۔ میں اب یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ میرا اور تمہارا نکاح تو بہرحال فسخ ہے لہٰذا اب تم اپنے ریحان سے شادی کرنے کے لیے آزاد ہو۔ میں یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کر کے بھی نہیں بھول سکو گی اور میں نہیں چاہتا کہ چاہنے والے دو دلوں کے درمیان آؤں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ریحان تمہیں ہر حال میں قبول کرے گا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا ہے کہ تم سے ابھی میرا نکاح نہیں ہوا۔ یہ بات صرف عروہ جانتی ہے کیونکہ وہ شمع کی دوست ہے اور اس سے مل چکی ہے لیکن میں نے اس سے وعدہ لیا ہے کہ وہ یہ باتیں ایمان دار کو بھی نہیں بتائے گی۔ اس نے مجھ سے بہت باتیں کی تھیں مریدہ! اس نے میرے خوابیدہ ضمیر کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا ہے۔ اسی لیے ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گی... تمہارا بہت اچھا دوست، حیدر!"

خط مریدہ کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ خلا میں تکنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ محبت کے بھی کتنے روپ ہوتے ہیں۔ ایک ریحان تھا جسے وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی لیکن جو قیامت اس پر گزر چکی تھی، اس کے بعد وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ ریحان کے لیے وقف ہو جائے۔

ریحان کے علاوہ افسر تھا جس سے وہ نفرت کرتی تھی مگر جس نے اس کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

اور اب یہ حیدر! ... وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن یہ بھی محبت کا ایک نیا پہلو تھا۔

دوسرے دن کی ایک فلائٹ سے وہ لاہور روانہ ہو گئی... اور یہاں کی محبت کا بہت ہی عجیب پہلو تھا۔

▲▼▲

Courtesy www.pdfbooksfree.pk